بھٹو

خاندان کا قتل

منیر احمد

انتساب

سقراط شاہ شمس تبریز اور
سچائی کے ان
پیروکاروں کے نام جو
قتل کر دیئے گئے۔

فہرست

کچھ اس کتاب کے بارے میں

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بہت ہی کم ایسے خاندان گزرے ہیں جنہیں نہ صرف اپنی زندگی میں شہرت ملی' بلکہ موت کے بعد بھی ان کا نام عوام کے دلوں میں زندہ رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا خاندان اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ سندھ سے تعلق رکھنے والے اس خاندان کے مورث اعلیٰ سردار محمد خاں تھے۔ اس بارے میں مورخین کی رائے میں تضاد پایا جاتا ہے لیکن اگر بھٹو خاندان کی بات کو اہمیت دی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سردار محمد خاں بھٹو خاندان سے تعلق رکھنے والے وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ سردار محمد خاں سندھ کے شمال میں رتوز ڈیرو جیسے زرخیز علاقے میں آباد ہوئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خاندان سندھ میں اثر و رسوخ اور اہمیت اختیار کرتا چلا گیا۔ تاہم پہلی مرتبہ بھٹو خاندان کو سیاست میں اس وقت شہرت ملی جب سر شاہ نواز جوناگڑھ کے وزیراعظم بنے۔ سر شاہ نواز نے دو شادیاں کیں۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک ہندو خاتون لکھی بائی کے بطن سے پیدا ہوئے جنہوں نے سر شاہ نواز سے شادی کرنے کے لئے اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا اسلامی نام خورشید تھا۔ شادی کے وقت خورشید کی عمر صرف 18 سال تھی۔ ان کے بطن سے تین بچے پیدا ہوئے جن میں منا' بے نظیر اور ذوالفقار علی بھٹو شامل تھے۔ خورشید نے ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش کے موقع پر ایک جوتشی سے جب اپنے نحیف و ناتواں بچے کا زائچہ بنوایا تو یہ جان کر ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ان کا صاحبزادہ دنیا بھر میں نام کمائے گا اور بڑا ہو کر وہ مسند اقتدار پر فائز ہو گا۔ تاہم تمام جوتشی حضرات بھٹو کی زندگی کے آخری ایام کے بارے میں خاموش رہے اور وہ یہی کہتے رہے کہ "اس جگہ سے آگے ہمارا علم کام

نہیں کرتا" ممکن ہے کہ جوتشی حضرات کو ذوالفقار علی بھٹو کے انجام کا بھی علم ہو اور انہوں نے مصلحتاً اس کا خورشید بیگم سے ذکر نہ کیا ہو۔

بعدازاں جن پامسٹ حضرات نے ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ دیکھے انہیں بھی اس چیز کا علم تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی ذہانت انہیں پھانسی کے تختے تک لے جائے گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو کی آنے والے وقت پر نظر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ایک فوجی حکمران سے معافی مانگ کر انہیں زندگی کے کچھ دن تو مل جائیں گے مگر ان کی عمر بھر کی کمائی ضائع ہو جائے گی اور بھٹو کی یہ کمائی ان کی شہرت اور عزت تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے نہایت سوچ سمجھ کر ہی آزادی کی بجائے پھانسی کا پھندا منتخب کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی موت کے بعد بھی پاکستان پیپلزپارٹی کا نام زندہ ہے۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی قربانی ہی تھی کہ ان کی صاحبزادی، کو عوام نے دو مرتبہ وزیراعظم بنایا لیکن دونوں مرتبہ وہ سازشوں کا شکار ہو کر معزول کی گئیں۔ شائد وہ طاقتیں جو پارلیمانی سیاست میں بھٹو خاندان کو کچلنے میں ناکام ہو چکی ہیں آنے والے دنوں میں بے نظیر بھٹو کو بھی سیاسی منظر سے ہٹانے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ کسی طور پر بھی سانحے سے کم نہ ہوگا۔ پاکستان پیپلزپارٹی کا وجود بھٹو خاندان سے تھا اور ہے' اور کوئی بھٹو کی اولاد کے متبادل کی حیثیت سے پارٹی کو نہیں سنبھال سکے گا۔ بھٹو خاندان کو گزشتہ 27 برس کے دوران صرف 11 برس حکومت کرنے کا موقع ملا اور اس دوران اس کے تین افراد سیاست کی بھینٹ چڑھے جبکہ خود بے نظیر بھٹو کم از کم 2 مرتبہ قتل ہوتے ہوتے بچیں۔ اگرچہ ذوالفقار علی بھٹو کی حد تک تو بات کافی واضح ہو چکی ہے کہ انہیں کیسے اقتدار سے محروم کیا گیا اور انہیں پھانسی دینے کا سبب کیا تھا لیکن شاہ نواز بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے قاتلوں کے چہرے سے نقاب اٹھنا ابھی باقی ہے۔

1993ء کے انتخابات کے بعد جب محترمہ بے نظیر بھٹو دوسری مرتبہ برسراقتدار آئیں تو انہوں نے انتہائی خاموشی سے ایک سینئر انٹیلی جینس آفیسر کو فرانس بھیجا تاکہ وہ فرانس کے مہنگے ترین علاقے کینز میں جاکر اس سازش کا سراغ لگائیں' جس کے نتیجے میں 18 جولائی 1985ء کو ان کے چھوٹے بھائی شاہ نواز بھٹو پراسرار حالات میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ مذکورہ انٹیلی جینس آفیسر کے ذمہ بظاہر یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ فرانس جاکر

اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں' خصوصاً" نواز شریف کے اثاثوں کے بارے میں چھان بین کریں لیکن بے نظیر بھٹو کے عزائم خفیہ نہ رہ سکے اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ ظاہر ہے کہ جس مضبوط اور طاقتور ہاتھ پر ذوالفقار علی بھٹو اور شاہ نواز بھٹو کے خون کے دھبے تھے وہ اس قدر بے خبر تو نہ تھا کہ اسے بے نظیر بھٹو کی چالوں کا پتہ ہی نہ لگ پاتا۔ نتیجتاً" بے نظیر بھٹو اپنی چالیں چلتی رہیں اور ان پر نظر رکھنے والے اپنے مہرے استعمال کرتے رہے۔ محترمہ نے اپنے پہلے دور حکومت (90-1988) میں اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ قتل کو دوبارہ منظر عام پر لانے کی کوشش کی تھی اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ملکی اور غیر ملکی ماہرین قانون کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن قبل اس کے کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لئے عدلیہ کو استعمال کرنے والے عناصر کو بے نقاب کر پاتیں' دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مخالفین کو ان کے خلاف کھڑا کر دیا گیا اور 1989ء میں انہیں تحریک عدم اعتماد کے ذریعے اقتدار سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم عین اس وقت جب تحریک عدم اعتماد کو کامیاب بنانے کے لئے تمام انتظامات مکمل تھے' فیصلہ کرنے والوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر دی اور یوں غلام مصطفیٰ جتوئی وزارت عظمیٰ جیسا اہم منصب حاصل کرتے کرتے رہ گئے۔ جتوئی کی زندگی میں یہ دوسرا واقعہ تھا کہ فوج اور انٹیلی جینس ایجنسیوں نے انہیں وزیراعظم بنانے کے فیصلے پر آخری لمحات میں عمل درآمد رکوایا تھا۔ بہرحال 1989ء میں بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد تو کامیاب نہ ہو سکی مگر اتنا ضرور ثابت ہوگیا کہ فوج اور انٹیلی جینس ایجنسیاں ان کے خلاف ہوگئیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھر آنے والے ایام میں بے نظیر بھٹو کو ایک لمحہ بھی سکون میسر نہ آسکا۔ ان پر کبھی پنجاب کے وزیراعلیٰ (نواز شریف) وار کرتے اور کبھی ایم کیو ایم کو ان کے خلاف استعمال کیا جاتا۔ اور جب دونوں (نواز شریف اور ایم کیو ایم) تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوتے تو سرحد میں اے این پی اپنا کام شروع کر دیتی۔ گویا یہ طے تھا کہ بے نظیر بھٹو کو سکون سے نہیں بیٹھنے دینا اور ان تمام سازشوں کی کڑیاں ایوان صدر میں بیٹھے بیوروکریٹس کے امام غلام اسحاق خاں سے ملتی تھیں۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو بھی ان دنوں پاکستان واپس آنے

کے لئے بے چین تھے۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کے ذریعے اپنے بھائی سے التجا کی کہ وہ ان حالات میں وطن واپس نہ آئیں کیونکہ اپوزیشن الذوالفقار پر ماضی میں لگائے جانے والے الزامات کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے لئے میدان میں نکل آئے گی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو اگرچہ بے نظیر بھٹو کے موقف سے اتفاق نہ تھا لیکن اپنی والدہ کے سمجھانے پر انہوں نے وطن واپسی کا فیصلہ موخر کر دیا۔ بعدازاں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ بے نظیر بھٹو سازشی عناصر کے جال میں پھنستی ہی چلی گئیں اور اس وقت جبکہ پوری دنیا کو علم تھا کہ ان کی حکومت بس اب چند ہفتوں کی مہمان ہے' انہیں یقین تھا کہ غلام اسحاق خاں انہیں اقتدار سے محروم نہیں کریں گے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے جولائی 1990ء میں ہی اپنی والدہ کو بتا دیا تھا کہ غلام اسحاق خاں نے اسمبلیاں توڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن ایک خاص مقصد کے تحت غلام اسحاق خاں نے جولائی 1990ء میں اسمبلیاں توڑنے کے فیصلے پر چند ہفتوں کے لئے عمل درآمد موخر کر دیا کیونکہ جولائی ہی کا مہینہ تھا جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم کی گئی تھی اور جولائی (1985) ہی میں شاہ نواز بھٹو قتل ہوئے تھے۔ غلام اسحاق خاں نے اس لئے جولائی کی بجائے اگست 1990ء کے پہلے ہفتے کا انتخاب کیا اور بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے محروم کر کے لاڑکانہ بھیج دیا گیا۔ محترمہ کو اچھی طرح علم تھا کہ اگر انہوں نے ذرا سی بھی چالاکی دکھائی تو انہیں قتل بھی کیا جاسکتا ہے اس لئے انہوں نے غلام اسحاق خاں کے فیصلے کو سکون سے سنا اور وزیراعظم ہاؤس سے کراچی منتقل ہوگئیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو پر 1990ء میں دباؤ تھا کہ وہ سیاست سے ریٹائر ہو جائیں' دگرنہ انہیں فوجداری مقدمات میں سزا دلوا کر جیل بھیج دیا جائے گا۔ انہیں اس قسم کے مشورے دینے والوں میں پی پی پی کے سینئر رہنما بھی شامل تھے۔ لیکن آزمائش کے ان کٹھن لمحات میں بے نظیر بھٹو کو اپنے والد کی وہ تمام باتیں یاد آئیں جو انہوں نے جیل میں انہیں سیاست کے اسرار و رموز سکھانے کے لئے بتائی تھیں۔ 1990ء کے انتخابات کے موقع پر اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ ڈرگ مافیا' بین الاقوامی دہشت گرد تنظیمیں یا بے نظیر بھٹو کے سیاسی مخالفین ان پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس صورتحال کا کافی حد تک بے نظیر بھٹو کو بھی اندازہ تھا اس لئے انہوں نے انتخابی مہم

کے دوران دو ٹوک الفاظ میں عوام کو بتا دیا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ "میں شہید بابا کا مشن پورا کروں گی چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے"۔ بے نظیر بھٹو نے انتخابی جلسوں میں اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے غلام اسحاق خاں کو مخاطب کرتے ہوئے انتخابی جلسوں میں اعلان کیا کہ "بابا! ہم پھر آ رہے ہیں"۔ اور ظاہر ہے کہ "بابا" (غلام اسحاق خاں) بے نظیر بھٹو کے اس انداز پر مسکرا کر رہ گئے کیونکہ انہوں نے بڑے پکے کام کر رکھے تھے اور بے نظیر بھٹو کو انہوں نے اس لئے وزیراعظم ہاؤس سے نہیں نکالا تھا کہ وہ چند ماہ بعد دوبارہ ان کے سر پر مسلط ہو جائیں۔ جس روز بے نظیر نے کہا کہ بابا! ہم آ رہے ہیں"۔ اسی روز غلام اسحاق خاں نے ایوان صدر میں اپنے ملاقاتیوں کو بتایا کہ "کوئی بی بی کو بتائے کہ ہم جاگ رہے ہیں"۔ غرض پہلے سے طے شدہ پالیسی کے تحت دھاندلی ہوئی' انتخابی نتائج میں ردوبدل کیا گیا اور یوں بے نظیر اپوزیشن بنچوں پر جا کر بیٹھ گئیں۔ 1990ء سے 1993ء تک کا عرصہ بے نظیر بھٹو کی بہترین تربیت کا باعث بنا۔ اس دوران انہیں مخلص اور منافق افراد کے اصل چہرے دیکھنے کو ملے اور 1993ء کے شروع میں انہوں نے غلام اسحاق خاں کے ساتھ صلح کے لئے اس شرط پر حامی بھری کہ بابا اسمبلی توڑ دے گا۔ چنانچہ بے نظیر بھٹو اور غلام اسحاق خاں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کے نتیجے میں میاں نواز شریف کو اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔ تاہم سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت دوبارہ بحال کر دی اور پھر سازشوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ فوج کو مداخلت کرنا پڑی اور بے نظیر بھٹو کے دونوں مخالفین (اسحاق اور نواز شریف) اقتدار سے محروم کر دیئے گئے جبکہ 1993ء کے انتخابات کے نتیجے میں اقتدار دوبارہ بے نظیر بھٹو کو مل گیا۔ لیکن عوام کی توقعات کے بالکل برعکس بے نظیر بھٹو نے ایسے فیصلے کئے جن کے باعث عام آدمی کی زندگی اجیرن ہوگئی' مہنگائی نے خصوصاً" تنخواہ دار اور مزدور پیشہ افراد کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے عام آدمی کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کوئی قابل ذکر کام نہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف عام افراد بلکہ پی پی پی کے کارکن تک ان سے ناراض ہوگئے۔ بے نظیر بھٹو نے 1993ء کے انتخابی معرکے کو سر کرنے کے بعد سردار فاروق احمد لغاری کو صدر مملکت کی کرسی پر بٹھا کر یہ سمجھ لیا تھا کہ چاہے وہ اچھے کام

کریں یا غلط' اب ایوان صدر سے ان پر حملہ نہیں ہوگا اور یہی وہ غلط فہمی تھی جس کا وہ شکار ہوئیں۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری اور بے نظیر بھٹو جس سسٹم میں کام کر رہے تھے اس سسٹم میں دونوں کا جھگڑا ہو کر ہی رہنا تھا۔ (بالکل اسی طرح جیسے نواز شریف اور رفیق تارڑ میں کبھی نہ کبھی جھگڑا ہوگا) اور پھر ایسا ہی ہوا۔ بے نظیر بھٹو نے جب دیکھا کہ ان کے اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے بت نے انہیں آنکھیں دکھانا شروع کر دی ہیں تو انہوں نے اس سے بول چال تک بند کر دی۔ خصوصا 1996ء کے اوائل میں بے نظیر بھٹو اور سردار فاروق احمد خاں لغاری کے درمیان ورکنگ ریلیشن شپ نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اس وقت جبکہ حالات بے نظیر کے کنٹرول سے باہر نکل رہے تھے انہوں نے اپوزیشن کے مطالبات کو تسلیم کرنے میں تاخیر کر دی۔ اور اپوزیشن کا مطالبہ یہ تھا کہ ملک میں از سر نو منصفانہ الیکشن کرائے جائیں۔ بے نظیر بھٹو اگر چاہتیں تو وہ نواز شریف کو مذاکرات کی میز پر بلا کر ایک ایسا معاہدہ کر سکتی تھیں جس کے ذریعے سردار فاروق احمد لغاری کی چھٹی ہو جاتی اور قومی اتفاق رائے کی ایسی نگران حکومت بن جاتی جو تین ماہ کے اندر انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیتی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بے نظیر بھٹو کو خود بھی 1996ء تک اندازہ ہوگیا تھا کہ مسلسل قیمتوں میں اضافے سے وہ عوام میں خاصی غیر مقبول ہوگئی ہیں اور نئے انتخابات میں ان کی شکست یقینی ہے۔

بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان مذاکرات میں غیر ضروری تاخیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے میاں نواز شریف کے ساتھ صلح کا ڈول ڈال دیا اور ایوان صدر سے تعلق رکھنے والوں نے مسلم لیگ کی قیادت کو یقین دلایا کہ مناسب وقت پر بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ مناسب حالات پیدا کرنے کے لئے اپوزیشن خصوصا" جماعت اسلامی اور مسلم لیگ نے بے نظیر بھٹو کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والے احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کار خیر میں دہشت گردوں نے بھی مقدور بھر حصہ ڈالا جبکہ معاملات کو مزید الجھانے کے لئے سردار فاروق احمد خاں لغاری اور سید سجاد علی شاہ کے درمیان اتفاق رائے ہوگیا جس کے نتیجے میں، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس عدلیہ کی آزادی کے علمبردار بن کر سامنے آگئے اور

ان کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں نواز شریف بھی شامل تھے جبکہ سید سجاد علی شاہ نے اپنے ملنے والوں کو مسلسل یہی تاثر دیئے رکھا کہ فوج (جنرل جہانگیر کرامت) بھی ان کے ساتھ ہیں۔ یہ وہ حالات تھے جن کا بے نظیر بھٹو کو 1996ء میں سامنا تھا جبکہ دوسری طرف خاندانی محاذ پر انہیں اپنے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کی مخالفت کا سامنا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو اپنے والد کے جانشین کے طور پر سیاست کرنا چاہتے تھے اور بیگم نصرت بھٹو کی انہیں 100 فیصد حمایت حاصل تھی۔ میر مرتضیٰ بھٹو نومبر 1993ء میں وطن واپس آئے تھے اور 1993ء کے انتخابات میں انہوں نے دمشق بیٹھ کر حصہ لیا تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو وطن واپس آنے کے فورا" بعد گرفتار کرلیا گیا تھا اور ان کی رہائی جون 1994ء میں عمل میں آئی۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے درمیان اختلافات کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو سیاسی محاذ پر اپنا حریف سمجھتے تھے لیکن دونوں نے ایک دوسرے کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لئے انتظامات بھی کر رکھے تھے۔ مثلا" بے نظیر بھٹو نے سندھ حکومت کو واضح طور پر حکم دے رکھا تھا کہ مرتضیٰ کو گرفتار نہ کیا جائے جبکہ مرتضیٰ بھٹو نے اپنے چند جانثار ساتھیوں کو اپنی بہن کی حفاظت کے لئے فرائض سونپ رکھے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے درمیان سیاسی اختلافات اس حد تک نہیں پہنچے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو جاتے۔ ہاں البتہ میر مرتضیٰ بھٹو کے آصف زرداری کے ساتھ خوشگوار تعلقات بھی موجود نہ تھے جس کی بنیادی وجہ وہ انٹیلی جینس رپورٹیں بنی تھیں جن کے ذریعے آصف علی زرداری کو مسلسل یقین دلایا جا رہا تھا کہ ان کی زندگی کو مرتضیٰ سے خطرہ ہے جبکہ دوسری طرف مرتضیٰ کے پاس بھی یہ اطلاع پہنچانے والے موجود تھے کہ آصف علی زرداری نے جرائم پیشہ افراد کی خدمات حاصل کی ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو اس ساری صورتحال کا جب پتہ چلا تو انہوں نے ذاتی طور پر کوشش کر کے اپنے بھائی سے ملاقاتیں کیں اور انہیں یقین دلایا کہ ان کے شوہر اور وہ ان کے لئے ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو چاہتی تھیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی ان کے ساتھ صلح ہو جائے اور خاندان کے افراد بالکل اسی طرح اکٹھے ہو کر زندگی گزاریں جس طرح وہ مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے خوش رہا کرتے

تھے۔ بے نظیر بھٹو نے میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ بالواسطہ اور بلا واسطہ روابط کا سلسلہ خصوصاً" ستمبر 1995ء کے بعد اس وقت شروع کیا تھا جب چند فوجی افسروں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ فوجی افسر میجر جنرل ظہیر الاسلام عباسی کی سربراہی میں فوج کے سربراہ جنرل عبدالوحید اور بے نظیر بھٹو کو قتل کر کے انقلاب لانا چاہتے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو اس ناکام فوجی سازش کے بعد بتایا گیا تھا کہ باغی ان کے بچوں کو بھی قتل کرنا چاہتے تھے۔ بے نظیر بھٹو کی زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا کہ ان کو قتل کرنے کی سازش عین آخری لمحات میں ناکام بنائی گئی۔ پہلی مرتبہ یہ سازش ایک بین الاقوامی دہشت گرد رمزی یوسف نے تیار کی تھی جو انہیں قتل کرنے کے لئے اسلام آباد پہنچا تھا۔ تاہم آئی ایس آئی نے اسے گرفتار کرلیا۔ رمزی یوسف کو گرفتار کرانے میں ایف آئی اے کے ایک سینئر آفیسر نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ رمزی یوسف کو بعد ازاں امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس پس منظر میں جب بے نظیر کے خلاف دوسری سازش ناکام ہوئی تو انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ان کی اپنے بھائی کے ساتھ صلح ہو جانا چاہئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ صلح کرنے کے لئے کوششیں ثمر آور ثابت ہوئیں اور دونوں بہن بھائیوں میں اصولاً" یہ طے پایا کہ وہ اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر 5 جنوری 1997ء کو سندھ میں ایک پروقار تقریب کا انعقاد کریں گے۔ اس موقع پر بے نظیر بھٹو نے میر مرتضیٰ بھٹو کے سر پر خود دستار رکھنا تھی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کے بعد بے نظیر نے اپنے والد کی برسی اور سالگرہ کی تقریبات کو ہمیشہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ میر مرتضیٰ اور بے نظیر بھٹو ہمیشہ الگ الگ مقامات پر اپنے والد کی سالگرہ اور برسی کی تقریبات منعقد کرتے تھے۔ اس لحاظ سے 5 جنوری 1997ء کو بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر خاندان کے افراد پہلی مرتبہ اکھٹے بیٹھ سکتے تھے۔ مرتضیٰ اور بے نظیر بھٹو کے درمیان اختلافات اور غلط فہمیوں کو دور کرانے میں صنم بھٹو نے خصوصاً" بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ بے نظیر بھٹو ذہنی طور پر اس تجویز سے متفق ہوگئی تھیں کہ وہ 1997ء میں ہونے والے مجوزہ قبل از وقت انتخابات کے بعد وزارت عظمیٰ کے عہدے کی امیدوار نہیں ہوں گی۔ اس صورت میں وہ مرتضیٰ بھٹو کو سندھ کا وزیراعلیٰ بنوا سکتی تھیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی نظر ایوان صدر پر تھی۔ وہ 8 ویں ترمیم سمیت تمام اختیارات کے ساتھ ایوان صدر بیٹھنا چاہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1996ء میں معزول کئے جانے کے بعد انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ میں تیسری مرتبہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہونے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ محترمہ نے اگرچہ دعویٰ کیا کہ وہ سینٹ کی چیئرمن بننا چاہتی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی نظر ایوان صدر پر تھی مگر ان کے تمام منصوبے 20 ستمبر 1996ء کی رات اس وقت دھرے کے دھرے رہ گئے جب انہیں معلوم ہوا کہ مرتضیٰ کو پولیس نے کراچی میں 70 کلفٹن کے قریب گولی مار کر زخمی کر دیا ہے۔ بے نظیر بھٹو کے لئے یہ آزمائش کا وقت تھا۔ ان کے سامنے 18 جولائی 1985ء کا وہ منظر گھوم گیا جب فرانس میں انہیں اطلاع ملی تھی کہ شاہ نواز بھٹو کی حالت ٹھیک نہیں، اس نے کچھ کھا لیا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے شاہ نواز کے ساتھ صرف ایک رات قبل فرانس میں سمندر کے کنارے بیگم نصرت بھٹو، مرتضیٰ، صنم بھٹو، ناصر حسین، ریحانہ اور فوزیہ کی موجودگی میں کھانا کھایا تھا۔ شاہ نواز جنہیں ذوالفقار علی بھٹو پیار سے گگول کہا کرتے تھے 17 جولائی 1985ء کی رات بہت خوش تھے۔ وہ خصوصی طور پر بے نظیر بھٹو کو اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے کھلاتے رہے کیونکہ عرصہ دراز بعد یہ خاندان اکٹھا ہوا تھا۔ شاہ نواز بھٹو نے اپنی بہن کو بلٹ پروف جیکٹ خرید کر دی تھی اور ایسی ہی جیکٹ وہ خود بھی پہنا کرتے تھے کیونکہ انہیں اپنے ذرائع سے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ضیاء الحق نے بعض افراد کو انہیں قتل کرانے کے لیے فرانس بھیجا ہے۔ اس بات کا ذکر شاہ نواز بھٹو نے مرتضیٰ بھٹو سے بھی کیا تھا جو 17 جولائی 1985ء کی اس رات بہت چوکنے ہو کر بیٹھے تھے۔

شاہ نواز بھٹو نے بے نظیر بھٹو کو اصرار کر کے اپنے فلیٹ پر 18 جولائی 1985ء کو آنے کی دعوت دی تھی لیکن 17 جولائی 1985ء کی منحوس رات جب وہ اپنے فلیٹ پر واپس آئے تو آتے ہی ان کا اپنی بیوی ریحانہ کے ساتھ جھگڑا ہوگیا۔ ریحانہ کے بارے میں بعدازاں کہا گیا کہ وہ ایک غیر ملکی انٹیلی جینس ایجنسی کے لئے کام کر رہی تھی۔ ریحانہ کو 22 اکتوبر 1985ء کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ فرانسیسی حکام کے سامنے شاہ نواز بھٹو کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں متنازعہ بیان دے بیٹھیں۔

ریحانہ نے 22 اکتوبر 1985ء کو اقرار کیا کہ انہوں نے شاہ نواز کے کراہنے کی آواز سنی تھی۔ فرانسیسی پولیس نے ریحانہ کو اس الزام میں گرفتار کیا کہ جب ایک شخص جو رشتے کے اعتبار سے ان کا شوہر بھی تھا' مر رہا تھا تو وہ آرام سے اپنے کمرے میں نیند کے مزے لوٹتی رہیں۔ بعدازاں ریحانہ کو 13 دسمبر 1985ء کو ضمانت پر رہا کیا گیا اور اس دوران فرانس کے علاقے کینز کے علاقہ مجسٹریٹ مسٹر تھیلیو نے بار بار ریحانہ کی موجودگی میں وہ منظر کشی کی جن حالات میں شاہ نواز بھٹو ہلاک ہوئے تھے۔ شاہ نواز بھٹو کی وفات کے بعد ریحانہ نے یہ تاثر دیا کہ ان کے شوہر نے خودکشی کی تھی جبکہ بیگم نصرت بھٹو نے اپنی وکیل ایلزبتھ گارینی کے ذریعے فرانس کی عدالت میں جو بیان حلفی داخل کیا اس میں ریحانہ کے الزامات کی تردید کی گئی تھی جبکہ بے نظیر بھٹو نے بھی اس مفروضے کو انتہائی لغو قرار دیا کہ ان کے بھائی اس قدر دل شکستہ ہو چکے تھے اور یہ کہ انہوں نے مسائل سے فرار کے لئے اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ ریحانہ کے والد فصیح الدین ضیا افغانستان کی وزارت خارجہ میں ایک اعلیٰ آفیسر تھے اور ان کی بہن فوزیہ کے بطن سے فاطمہ پیدا ہوئی جو بعدازاں مرتضیٰ کی تحویل میں چلی گئیں۔ مرتضیٰ نے اپنی بیٹی کو بتا دیا تھا کہ ان کی والدہ بھٹو خاندان کے ساتھ مخلص نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاطمہ نے اپنی سوتیلی ماں غنویٰ کے ساتھ رہنا منظور کرلیا اور 20 ستمبر 1996ء کی رات جب میر مرتضیٰ پر فائرنگ ہوئی تو فاطمہ اپنی سوتیلی والدہ غنویٰ کے ہمراہ 70 کلفٹن پر موجود تھیں۔ فائرنگ کی آواز ماں بیٹی نے سنی تو ضرور مگر انہیں یہ اندازہ نہ تھا کہ پولیس نے مرتضیٰ کو ہی نشانہ بنایا ہے۔ تاہم جونہی کسی نے فون کرکے انہیں اطلاع دی کہ مرتضیٰ کو گولی لگ گئی ہے اور وہ شدید زخمی ہیں تو فاطمہ نے فوراً" وزیراعظم ہاؤس' اسلام آباد فون کیا تاکہ وہ اپنی پھوپھی بے نظیر بھٹو کو صورتحال سے آگاہ کرسکیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اس وقت دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں کیونکہ وہ سمجھ گئی تھیں کہ ان کا بھائی اب زندہ نہیں بچے گا کیونکہ نصیراللہ بابر نے انہیں بتایا تھا کہ مرتضیٰ کے بچنے کے امکانات کم ہیں اور وہ شدید زخمی ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے لئے یہ سانحہ ناقابل برداشت تھا کیونکہ ان کے دشمنوں نے بھٹو خاندان کو سیاست سے آؤٹ کرنے کے لئے ایک ایسا گھناؤنا کھیل کھیلا تھا جس کا وہ تصور بھی نہ کرسکتی

تھیں۔ مرتضیٰ بھٹو کے انتقال کی خبر بے نظیر بھٹو کو بعد میں ملی جبکہ بین الاقوامی خبر رساں ادارے یہ خبر پہلے نشر کرچکے تھے۔ بے نظیر بھٹو جانتی تھیں کہ مرتضیٰ کی ہلاکت کو یقینی بنانے والے اس سانحہ کا الزام ان پر لگائیں گے یا ان کے شوہر کو اس کے لئے مورد الزام ٹھہرایا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اپنے بھائی کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں یا رابطے ابھی عوام کے علم میں نہ تھے۔ لوگ تو یہی سمجھتے تھے کہ مرتضیٰ اور بے نظیر کے درمیان تنازعہ موجود ہے۔ بے نظیر بھٹو نے مرتضیٰ کے انتقال کی خبر سن کر سیاہ ماتمی لباس زیب تن کیا اور وہ کراچی کے لئے روانہ ہوگئیں جہاں مڈایسٹ ہسپتال میں ان کے بھائی کی لاش پڑی تھی۔ محترمہ غم سے نڈھال تھیں' ان کی آنکھیں مسلسل رونے سے سرخ ہو رہی تھیں اور ان کی حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ڈرامہ ہے۔ یقیناً" یہ ڈرامہ نہ تھا بلکہ بے نظیر بھٹو اپنے بھائی کے سامنے غم کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں مرتضیٰ آنکھیں کھول دے اور وہ ان کے ساتھ باتیں کریں۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مرتضیٰ اور بے نظیر بھٹو کن حالات میں اکٹھے ہوئے! بالکل یہ وہی صورتحال تھی جب بے نظیر اور ان کی والدہ 18 جولائی 1985ء کی سہ پہر شاہ نواز کے پاس پہنچیں تو وہ پرسکون نیند سو رہا تھا۔ شاہ نواز کے جسم پر وہی لباس تھا جو اس نے 17 جولائی 1985ء کی شام اس وقت زیب تن کر رکھا تھا جب پورا خاندان ساحل سمندر پر پکنک منانے کے لئے اکٹھا ہوا۔ طے شدہ پروگرام کے تحت بے نظیر نے 18 جولائی 1985ء کی شام دوبارہ شاہ نواز سے ملنا تھا لیکن یہ ملاقات اس طرح ہوتی کہ ان کی بہنیں اور والدہ شدت غم سے نڈھال تھیں اور وہ بار بار انہیں پکار رہی تھیں لیکن شاہ نواز بھٹو اس دنیا میں چلا گیا تھا جہاں سے اس کی آواز نہیں آسکتی تھی۔ بے نظیر بھٹو کو' جب ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو' اپنے والد کا آخری دیدار کرنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ تاہم بعدازاں انہیں راولپنڈی سے لاڑکانہ لے جایا گیا جہاں بیگم بھٹو نے اپنی بیٹی کی موجودگی میں بھٹو کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کے لئے فاتحہ پڑھی۔ بے نظیر نے یہی فریضہ اس وقت انجام دیا تھا جب وہ اپنے بھائی کی لاش لے کر اگست 1985ء کو کراچی ائرپورٹ پہنچیں جہاں سے شاہ نواز بھٹو کی میت ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے موہنجو ڈیرو ایئرپورٹ پر لائی

گئی جہاں بیگم اشرف عباسی' ایاز سومرو' منور علی عباسی اور ممتاز بھٹو کے والد الٰہی بخش بھٹو موجود تھے۔ بے نظیر بھٹو نے گڑھی خدا بخش میں شاہ نواز بھٹو کی تدفین کے لئے جگہ کا خود انتخاب کیا تھا اور تدفین کے تمام مراحل ان کی موجودگی میں طے پائے۔ 1985ء میں بے نظیر بھٹو نے شاہ نواز کے رسم قل اور رسم چہلم میں بھی شرکت کی اور وہ پورے ملک سے اظہار تعزیت کے لئے آنے والے افراد کو ڈھارس دیتی رہیں۔ لیکن 20 ستمبر 1996ء کی رات جب وہ اپنے بھائی کی لاش کے قریب بیٹھی زارو قطار رو رہی تھیں تو ایک مخصوص گروہ ایسے نوجوانوں کو اکٹھا کر رہا تھا جو ہسپتال کے باہر آکر "قاتل قاتل زرداری قاتل" "قاتل قاتل زرداری قاتل" "قاتل قاتل بے نظیر قاتل" کے نعرے لگا سکتا اور پھر یہ نعرے لگوائے گئے اور بیگم نصرت بھٹو سے ایسے بیانات منسوب کئے گئے جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ بھٹو خاندان کا داماد آصف علی زرداری 20 ستمبر 1996ء کے سانحہ میں ملوث ہے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے خصوصاً ان لمحات میں غنویٰ بھٹو کو Misguide کیا اور بعدازاں غنویٰ نے آصف علی زرداری پر اپنے شوہر کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کا الزام بھی لگایا۔ اگر یہ بات درست تھی تو سردار فاروق احمد خاں لغاری کے پاس کیا 90 دن کی وہ مدت کم تھی جس مدت کے دوران آصف علی زرداری کو مسلسل تفتیش کا سامنا کرنا پڑا اور ان کو میر مرتضیٰ بھٹو کا قاتل ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کے ذہنی و جسمانی تشدد سے گزارا گیا۔ اگر آصف علی زرداری کا میر مرتضیٰ کے قتل میں کوئی بھی کردار ہوتا تو وہ اب تک عوام کی نظروں کے سامنے آ چکا ہوتا کیونکہ 4 نومبر 1996ء کو سردار فاروق احمد خاں لغاری نے اچانک حکومت ختم نہیں کی تھی بلکہ 20 ستمبر 1996ء کے سانحہ کے بعد وہ مسلسل کوشاں تھے کہ کسی نہ کسی طرح ان کے ہاتھ میں ایسا Clue آجائے جس سے یہ ثابت کرنے میں مدد مل سکے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے قاتلوں کو آصف علی زرداری اور بے نظیر بھٹو کی پشت پناہی حاصل تھی۔ دوسری طرف اقتدار سے محروم ہونے کے بعد بے نظیر بھٹو نے اپنے بھائی کے قتل کی سازش کا الزام سردار فاروق احمد خاں لغاری پر عائد کیا۔ تاہم تحقیقات کے دوران وہ کوئی ایسا مواد فراہم نہ کر سکیں جس سے یہ ثابت کرنے میں مدد ملتی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے قاتل سردار فاروق احمد خاں لغاری ہیں۔ یہ تو

درست ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد سردار فاروق احمد خاں لغاری نے اس ایشو کا سیاسی فائدہ اٹھایا لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کراچی پولیس کو مرتضیٰ کے قتل کی ہدایت سردار فاروق احمد خاں لغاری نے دی تھی۔ میر مرتضیٰ بھٹو جس رات قتل ہوئے اسی صبح سردار فاروق احمد خاں لغاری غیر ملکی دورے سے واپس لوٹے تھے اور ایئرپورٹ پر ان کا استقبال کرنے کے لئے بے نظیر بھٹو موجود نہ تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ بے نظیر بھٹو کو پتہ چل چکا تھا کہ ان کا منتخب کردہ صدر اسمبلیوں کو قتل کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ بے نظیر بھٹو کی کئی ہفتوں بعد پہلی ملاقات سردار فاروق احمد خاں لغاری سے اسلام آباد ایئرپورٹ پر اس وقت ہوئی جب وہ 20 ستمبر 1996ء کی رات کراچی جانے کے لئے روانہ ہوئیں تو سردار فاروق احمد خاں لغاری اظہار تعزیت کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ بعدازاں سردار فاروق احمد خاں لغاری نے سندھ جاکر بے نظیر سے دوبارہ اظہار تعزیت کیا لیکن اس کے فوراً بعد انہوں نے اسلام آباد واپس جاکر میاں نواز شریف کو پیغام بھیجا کہ وہ نئے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے تیار رہیں۔ اس کے بعد پیش آنے والے حالات کا کتاب میں تفصیلاً ذکر موجود ہے۔

زیر نظر کتاب میں بھٹو خاندان کی سیاست میں آمد سے 1998ء تک پیش آنے والے حالات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ صرف اس پہلو کو زیر بحث لایا جا سکے کہ بھٹو خاندان کی سیاست سے درحقیقت خوف زدہ کون تھا' وہ کون سے حالات تھے جب ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر چڑھایا گیا' وہ کون سے حالات تھے جب بے نظیر بھٹو کو دو مرتبہ وزیراعظم بننے کا موقع ملا اور دونوں مرتبہ ان کو معزول کرانے والے کون تھے' وہ کون سے عناصر تھے جنہوں نے مرتضیٰ بھٹو کو قتل کرنے کے بعد اس سازش کے مرکزی کردار انسپکٹر حق نواز کو منظر عام سے ہٹایا اور اس وقت بے نظیر بھٹو کو کن حالات کا سامنا ہے۔

کسی بھی ملک میں اس وقت کی اہم شخصیات کے حوالے سے واقعات کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا' خصوصاً ہمارے ملک میں جہاں خریدنے اور بکنے والے دونوں موجود ہیں یہ کام مزید مشکل اور مشکوک ہو جاتا ہے۔ بھٹو خاندان پر جو کچھ بھی لکھا جائے گا اگر وہ بھٹو خاندان یا پی پی پی کے چاہنے والوں کو پسند نہ آیا تو لکھنے والے

پر یہ الزام لگ کر ہی رہے گا کہ یہ کارنامہ بھٹو کے مخالفین کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح مسلم لیگ کی سیاسی تاریخ قلمبند کرنے والے پر یہ الزام بھی لگ سکتا ہے کہ یہ پی پی پی کی سازش ہے۔ "بھٹو خاندان کا قتل" کے نام سے کتاب لکھتے وقت مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس میں موجود بہت سارے تلخ حقائق شائد پی پی پی کے چاہنے والوں اور مسلم لیگ کے حمایتی حضرات کو پسند نہ آئیں۔ لیکن کیا کریں کہ حالات و واقعات کو زیادہ عرصہ چھپایا نہیں جاسکتا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو 1977ء میں اقتدار سے محروم کر کے ضیاء الحق نے کوئی انوکھی حرکت نہیں کی تھی کیونکہ قیام پاکستان کے بعد سے حکمرانوں کو ذلیل کر کے اقتدار سے الگ کرنا ایک روایت بن چکی تھی اور خود حکمران بھی کافی حد تک اس قسم کے سلوک کے عادی ہو چکے تھے لیکن ضیاء الحق نے ظلم یہ کیا کہ اس نے 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے کر قوم کو ایک ایسے لیڈر سے محروم کر دیا جو پاکستان کو ایک فلاحی مملکت بنانے کا خواب لے کر میدان میں نکلا تھا۔ دراصل ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی ایک عہد کا قتل تھا جس کے لئے تاریخ ضیاء الحق کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اگر پھانسی نہ دی جاتی تو ممکن ہے کہ پانچ دس برس بعد وہ دوبارہ اقتدار میں آجاتے اور آج ہماری سیاسی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔ آنے والے دنوں میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف اقتدار میں آتے جاتے رہیں گے اور اس بات کا علم ان عناصر کو بھی ہے جو بھٹو کو پھانسی دلوانے میں سرگرم رہے' جنہوں نے شاہ نواز اور مرتضیٰ بھٹو کو ان کی افغانستان میں جلاوطنی کے دوران زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی' جنہوں نے مرتضیٰ کو کراچی پولیس کے ذریعے قتل کرایا اور جو اب بے نظیر بھٹو کو قتل کرانا چاہتے ہیں۔ اگر بے نظیر بھٹو سمجھتی ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو' شاہ نواز بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے قاتلوں کی پشت پناہی کرنے والے سازشی عناصر اب بھی ملک میں موجود ہیں تو پھر انہیں اپنے لئے بھی غیر معمولی طور پر حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہوں گی اور بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ کوئی نہ کوئی خفیہ ہاتھ ایسا ضرور ہے جس نے بھٹو خاندان کو سیاست سے ہمیشہ کے لئے آؤٹ کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔

جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے بطور صحافی اور رائٹر مجھے نہ تو پی پی پی

سے محبت ہے اور نہ ہی مسلم لیگ سے نفرت۔ میں نے حالات و واقعات کو من و عن بیان کرنے کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت میں "پاکستان میں انٹیلی جینس ایجنسیوں کا سیاسی کردار" کے عنوان سے ایک کتاب لکھنے کے جرم میں میرے خلاف غداری کا مقدمہ بنایا گیا تھا' اور اس مقدمے کے سلسلے میں مجھے تین برس تک عدالتوں کے دھکے اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کی انتقامی کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود "بھٹو خاندان کا قتل" کے عنوان سے کتاب لکھتے وقت کبھی بھی وہ تکالیف میرے خیالات پر حاوی نہ ہوئیں جن کا میں نے اور میرے خاندان نے سامنا کیا تھا۔ وقت خود سب سے بڑا منصف ہے اور سازش کرنے والا خواہ کوئی کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو وقت کی عدالت میں کبھی نہ کبھی Expose ہو کر ہی رہتا ہے۔ بھٹو خاندان کا مخالف کون تھا' میں نے اس کی ایک جھلک پیش کر دی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو' شاہ نواز بھٹو اور مرتضیٰ کے قاتلوں کے بارے میں خود انگلی اٹھانے کی بجائے میں نے وہ منظر پیش کر دیا ہے جس میں بھٹو خاندان کے قاتلوں کے چہرے آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں اور یہی میرا مقصد تھا۔

منیر احمد

04-04-98

ذوالفقار علی بھٹو کے آباؤ اجداد

1970 کی دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں جنوبی ایشیا کے ممالک کو ایک ایسا لیڈر ملا جو خطے میں نہ صرف ایک نئی طاقت ابھارنے کی صلاحیت رکھتا تھا بلکہ اس کی آنکھ روس اور امریکہ کا زوال بھی دیکھ چکی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ 1980ء کی دہائی ختم ہونے سے قبل جنوبی ایشیا کے ممالک کو مضبوط بندھن میں باندھ کر ایک ایسی طاقت پیدا کر دی جائے جو علاقے سے نہ صرف غربت و افلاس مٹا دے بلکہ اس خطے میں رہنے والوں کو دیرپا امن بھی فراہم کرے اور خوشحالی کا دور رواں ہو۔ یہ وہ خواب تھا جو ذوالفقار علی بھٹو نے دیکھا لیکن ان کے منصوبے ایران کے فرمانروا شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے توسط سے امریکی سی آئی اے تک پہنچ گئے اور پھر ایک ایسی سازش تیار کی گئی اور ایک ایسا جال بچھایا گیا جس میں ذوالفقار علی بھٹو انا کا شکار ہو کر پھنستے ہی چلے گئے۔ حالانکہ یہ وہی بھٹو تھے جنہیں ایوب خاں کے خلاف تحریک چلانے کیلئے امریکہ کی تائید و حمایت حاصل رہی اور اس طرح 1960 کی دہائی میں سیاست کے افق پر نمودار ہونے والا یہ روشن ستارہ دیکھتے ہی دیکھتے فضاؤں میں تحلیل ہو گیا اور جنوبی ایشیا میں ایک نئی دنیا کے قیام کا خواب ادھورا رہ گیا۔

بھٹو خاندان کی تاریخ کوئی زیادہ پرانی نہیں' یہی کوئی سو ایک سال قبل بھٹو خاندان نے سیاست میں قدم رکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ خاندان برصغیر کے بڑے سیاسی خاندانوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے آباؤ اجداد بھارت کے ریگستانی علاقوں میں رہتے تھے اور جب وہاں پانی کی قلت پیدا ہوئی تو وہ لوگ ہجرت کر کے دریائے سندھ کے کنارے پر آباد ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب زیادہ تر آبادیاں

دریاؤں کے کناروں پر قائم ہوتی تھیں اور وادیٔ سندھ میں پانچ ہزار سال قبل کی تہذیب کے آثار کی موجودگی کا سبب یہاں کی زرخیز زمین اور پانی تھا۔ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کی قدیم تہذیبوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جوں جوں دریاؤں کے رخ تبدیل ہوتے رہتے تھے توں توں لوگ بھی وہاں سے ہجرت کرتے رہتے تھے کیونکہ ان ایام میں زیادہ تر لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت اور تجارت تھا۔ بھٹو خاندان کے جد امجد SHETO دراصل ہندو راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور 17 ویں صدی میں مغل حکمرانوں نے جب برصغیر پر چڑھائی کی تو علاقے میں سکونت پذیر زیادہ تر آبادی ان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں آ گئی۔ بھٹو خاندان بھی اسی دور میں مشرف بہ اسلام ہوا اور انہیں اپنے علاقے کی سطح پر عزت و احترام سے دیکھا جانے لگا۔ سندھ میں آباد ہونے کے بعد بھٹو خاندان کو تالپور، کلہوڑا اور کھوڑو خاندان سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ان کی کسی زمانے میں دوستی نے دشمنی کا رخ اختیار کیا اور کبھی مصلحتوں کی بنا پر دشمنی کو ترک کرکے دوستی کی گئی۔ SHETO کو مغل حکمرانوں نے ان کی خدمات کے اعتراف میں خان کا لقب دیا۔ آج کے مہذب اور ترقی یافتہ دور میں بھی اگر کسی علاقے میں دو "معزز" افراد پیدا ہو جائیں تو وہ ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا وہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ خدا کی پناہ! یہی حال 1800ء کے اوائل میں اس وقت ہوا جب بھٹو خاندان کا تالپور اور کلہوڑا خاندان کے ساتھ سیاسی معاملات پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب مغلوں کا امور مملکت پر کنٹرول کمزور ہوتا جا رہا تھا اور ان کے زیر کنٹرول علاقوں میں شورشیں عام تھیں اور جس کا جی چاہتا مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کرکے امور مملکت اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ ان حالات میں انگریزوں نے مغل حکمرانوں کی جڑیں کاٹنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کی کوشش یہ رہی کہ دارالسلطنت سے دور دراز علاقوں میں ساز باز کرکے قبضہ کیا جائے تاکہ مغلوں کو وہاں کمک بھیج کر اپنے علاقے واپس لینے میں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ SHETO KHAN نے مغل حکمرانوں کی کمزوری کو بھانپ کر دریائے سندھ کے ساحلی علاقوں میں اپنے قبیلے کو مضبوط کرنا شروع کر دیا اور ان کے پوتے پیر بخش خاں بھٹو نے انگریزوں کے ساتھ

دوستانہ تعلقات کو پروان چڑھایا جس کے بدلے میں انہیں سیاسی لحاظ سے فوائد حاصل ہوئے۔ سندھ کے سیاسی وڈیرے اگر اپنے اختلافات کو پس پشت ڈال کر انگریزوں کے خلاف ڈٹ جاتے تو کم از کم وادی سندھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس قدر آسانی سے غلبہ حاصل نہ ہوتا جس قدر سرعت کے ساتھ انہوں نے سندھ ختم کیا۔ تالپور خاندان نے خصوصی طور پر سندھ کو انگریزوں کے حوالے کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا کیونکہ تالپوروں نے ایک معاہدے کے تحت انگریزوں کو 1838ء میں اپنی فوج حیدر آباد میں رکھنے کی اجازت دی جس کے 7 سال کے اندر انگریز فوج نے سندھ پر قبضہ کر لیا اور ملکہ برطانیہ کے نامزد کردہ گورنر سر چارلس نے کراچی میں بیٹھ کر سندھ پر حکومت کی۔ انہیں اس زمانے میں سندھ کے تمام وڈیروں کا تعاون میسر رہا اور پیر بخش خاں بھٹو کے صاحبزادے ڈوڈو خاں کو اس دور میں خصوصی عزت عطا کی گئی لیکن ان کے پوتے غلام مرتضیٰ بھٹو اس دور میں ایک انگریز مجسٹریٹ کی بیوی پر عاشق ہو گئے اور وہ خاتون بھی غلام مرتضیٰ بھٹو کو پسند کرنے لگی۔ یہاں سے بھٹو خاندان کی پہلی آزمائش شروع ہوئی کیونکہ غلام مرتضیٰ بھٹو "میم صاحبہ" کے ساتھ عشق لڑاتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیے گئے۔ چونکہ انگریز مجسٹریٹ کے پاس اختیارات کی کمی نہ تھی اس لیے انہوں نے بھٹو خاندان کے چشم و چراغ غلام مرتضیٰ بھٹو کو مقدمات میں الجھا دیا۔ تالپور اور کلہوڑا خاندان سے تعلق رکھنے والے وڈیرے اس صورتحال سے اچھی طرح آگاہ تھے اس لیے انہوں نے بھٹو خاندان کو زیر عتاب دیکھ کر علاقے میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانا شروع کر دیا اور انہی سازشوں کے نتیجے میں غلام مرتضیٰ بھٹو کے والد خدا بخش بھٹو پراسرار انداز میں ہلاک ہو گئے۔ بھٹو خاندان کے افراد نے جب دیکھا کہ انگریز سرکار نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے تو انہوں نے غلام مرتضیٰ بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ فرار ہو جائیں کیونکہ انگریزوں کے ساتھ مقدمے بازی میں خاندان کی سیاسی طاقت ختم ہو کر رہ گئی تھی جبکہ مالی لحاظ سے غلام مرتضیٰ بھٹو اس پوزیشن میں نہ تھے کہ انگریزوں کے قوانین کا عدالت میں سامنا کرتے اس لیے وہ فرار ہو کر افغانستان چلے گئے۔ والیٔ افغانستان امیر عبدالرحمٰن نے مرتضیٰ کی کافی مدد کی اور انہیں سونے کی شکل میں مالی اعانت فراہم کی؛ لیکن جس کشتی میں بیٹھ کر غلام مرتضیٰ بھٹو سندھ جا رہے تھے وہ

راستے میں الٹ گئی اور سونا ضائع ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح کراچی پہنچ گئے جہاں انہوں نے محنت مزدوری کر کے گزر اوقات شروع کر دی۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کو یقین تھا کہ اگر کسی نہ کسی طرح ان کی انگریز کمشنر SIR IVON JAMES تک رسائی ہو جائے تو ان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز مجسٹریٹ نے اپنے اثر و رسوخ سے عدالتی فیصلے کو اپنے حق میں کروا لیا تھا۔ چنانچہ غلام مرتضیٰ بھٹو نے سکھ کا روپ دھار کر انگریز کمشنر کے گھر میں ملازمت اختیار کی اور ایک روز اچانک انہوں نے انگریز کمشنر کے سامنے آکر اپنی کہانی بیان کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ جناب والا میں انصاف چاہتا ہوں ..... میرے ساتھ انصاف کیا جائے کیونکہ ایک انگریز مجسٹریٹ نے مجھے محض اس لیے انتقام کا نشانہ بنایا ہے کہ اس کی بیوی کے ساتھ میری شناسائی تھی۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کی زبانی سچ سن کر انگریز کمشنر نے حکم دیا کہ غلام مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ انصاف کیا جائے لہٰذا FAIR TRIAL کے بعد غلام مرتضیٰ بھٹو مقدمہ جیت گئے۔ ان کے وکیل موتی رام اڈوانی تھے اور اس طرح بھٹو خاندان کو ایک کڑی آزمائش کے بعد سکھ نصیب ہوا۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کی انگریز مجسٹریٹ کے ساتھ صلح ہو گئی تو انہیں 1899ء میں وہ تمام جائیداد واپس مل گئی جو ان کے فرار ہونے کے بعد انگریز بہادر نے بحق سرکار ضبط کر لی تھی۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کو اچھی طرح علم تھا کہ ان کی مفروری کے دوران سندھ کے وڈیروں' مزارعوں اور دوسرے افراد نے ان کے خاندان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا لیکن سیاسی مصلحتوں کے تحت انہوں نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ غلام مرتضیٰ بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کے دادا تھے اور ان میں سیاسی تدبر بے پناہ تھا۔ ان کی اسی خصوصیت کے باعث سندھ کے وڈیرے ان کے جانی دشمن تھے۔ بھٹو خاندان سے باہر سندھ کے وڈیرے اچھی طرح جانتے تھے کہ غلام مرتضیٰ بھٹو میں سندھ کا ایک بڑا سیاستدان بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں اس لیے ایک سازش کے تحت انہیں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور بھٹو خاندان کو کبھی پتہ نہ چل سکا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کس نے مرتضیٰ کو زہر دیا۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کی ناگہانی ہلاکت کے بعد فوری طور پر یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ ان کے بچوں اور دیگر اہل خانہ کی سرپرستی کون کرے گا کیونکہ شاہ نواز اور علی گوہر خاں (سرپرستی کے لیے) ابھی

کمسن تھے۔ سندھ کے انگریز افسران نے صورتحال کو محسوس کرتے ہوئے وہ ہر ممکن اقدام کیا جس سے شاہ نواز اور علی گوہر خاں سازشوں سے محفوظ رہ سکیں۔ خاندان کے بڑوں میں سے الٰہی بخش خاں بھٹو نے دونوں بچوں کی سرپرستی کا بیڑہ اٹھایا لیکن الٰہی بخش خاں بھٹو بھی زیادہ عرصہ حیات نہ رہ سکے اور ایک روز وہ بھی پراسرار طور پر اپنے گھر کے باتھ روم میں فوت ہو گئے۔ شاہ نواز جو قدرے جوان ہو چکے تھے اس طرح نہ صرف اپنے اہل خانہ بلکہ الٰہی بخش خاں بھٹو کے پسماندگان کے بھی سرپرست بن گئے اور یہاں سے صحیح معنوں میں بھٹو خاندان کی برتری کا دور شروع ہوا کیونکہ شاہ نواز نے غیر ضروری طور پر سیاسی دشمنیوں میں الجھنے کی بجائے پیرپگاڑو' تالپور' بگٹی' جتوئی' رئیسانی' بجارانی اور بلیدائی گھرانوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے۔ شاہ نواز نے آہستہ آہستہ نہ صرف لاڑکانہ بلکہ اردگرد کے علاقوں میں بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا شروع کر دیا۔ علاقے کے لوگوں کو درپیش مسائل کو بڑے غور سے سنتے اور جس قدر ممکن ہو پاتا دوسروں کی مدد کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں ان کی شہرت میں اضافہ ہوا اور 1920ء میں صورتحال یہ تھی کہ وہ امپیریل قانون ساز اسمبلی کا الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں آ گئے۔ دراصل 1909ء کی منٹو مارلے اصلاحات کے بعد سندھ کو جب تین مزید نشستیں ملیں تو شاہ نواز نے جی ایم برگھانی کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا جنہیں وزیراعلیٰ شیخ صادق علی نے 1909ء میں انڈین کونسل کا رکن بنوایا تھا۔ شاہ نواز نے 1920ء میں جی ایم برگھانی کو شکست دی اور اس کے 50 برس بعد ان کا صاحبزادہ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کا صدر بنا۔ شاہ نواز بھٹو کی مجموعی طور پر زندگی بہتر گزری۔ ان کا ایک بیٹا سکندر 7 برس کی عمر میں فوت ہو گیا جبکہ ذوالفقار علی بھٹو ایک ہندو خاتون لکھی بائی کے بطن سے پیدا ہوئے جس نے اسلام قبول کر کے شاہ نواز سے 1925ء میں شادی کی تھی۔ لکھی بائی کا اسلامی نام خورشید رکھا گیا۔ شاہ نواز مرحوم کیلئے لکھی بائی کے ساتھ شادی کرنا کوئی آسان فیصلہ نہ تھا کیونکہ وہ ایک ہندو عورت تھیں اور خاندان کے بزرگ ان کے اس اقدام سے قطعاً" خوش نہ تھے اس لیے مجبوراً" شاہ نواز نے شادی کیلئے خان آف قلات کی کوئٹہ میں واقع رہائش کا انتخاب کیا۔ لکھی بائی کے بطن سے منا' بے نظیر اور ذوالفقار علی بھٹو پیدا ہوئے۔ بھٹو کو اپنی بہن بے نظیر

سے بے انتہا محبت تھی لیکن وہ کم سنی کی حدود کو پار نہ کر سکیں اور 14 سال کی عمر میں فوت ہو گئیں۔ اپنی بہن سے محبت کے اظہار کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی ایک بیٹی کا نام بے نظیر رکھا جو دو مرتبہ پاکستان کی وزیراعظم بنیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ لکھی بائی (خورشید) نے متعدد ہندو جوتشیوں سے ان کی قسمت کا حال معلوم کیا اور تقریباً" تمام جوتشیوں نے انہیں خوشخبری سنائی کہ تمہارا بچہ 50 برس کی عمر تک دنیا میں نام پیدا کر چکا ہو گا، لیکن کسی جوتشی نے بھٹو کی زندگی کے آخری ایام کے بارے میں لب نہ کھولا جس سے لگتا ہے کہ اپنے علم کے زور سے انہیں 1928ء میں بھٹو کی پیدائش کے وقت ہی اندازہ تھا کہ یہ بچہ عروج حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خوفناک انجام سے بھی دو چار ہو گا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں دلچسپی

ذوالفقار علی بھٹو کے والد شاہ نواز بھٹو کا بچپن زیادہ خوشگوار نہ تھا کیونکہ کم سنی میں ہی ان کے سر پر ان ذمہ داریوں کا بوجھ پڑ گیا جن فرائض سے انہیں معمول کے حالات میں 25 یا 30 برس کی عمر کے بعد نبرد آزما ہونا تھا۔ شاہ نواز بھٹو کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا لیکن خاندانی مسائل اور زمینداری کے امور میں وہ ایسے الجھے کہ بیرون ملک جاکر تعلیم حاصل کرنے کے متعلق ان کے تمام خواب ادھورے رہ گئے۔ تاہم انہوں نے شادی کے بعد اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کی، خصوصاً" ذوالفقار علی بھٹو کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی حالانکہ ذوالفقار علی بھٹو کی والدہ خورشید اپنے لخت جگر کی جدائی برداشت کرنے کیلئے تیار نہ تھیں۔ شاہ نواز بھٹو کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ذوالفقار علی بھٹو نے بیرون ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انہوں نے بہت کم عمری میں ہی ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں حصہ لیا۔ اس کی ایک مثال ذوالفقار علی بھٹو کا قائداعظم کے نام لکھا جانے والا وہ خط ہے جس پر 26 اپریل 1945ء کی تاریخ درج ہے۔ اس خط میں ذوالفقار بھٹو نے قائداعظم کو لکھا کہ وہ اس وقت کم عمر ہیں اور ایک سکول میں زیر تعلیم ہیں لیکن وقت آنے پر وہ پاکستان کیلئے اپنی جان بھی دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ شاہ نواز بھٹو کے قائداعظم کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے، خصوصاً" 1945ء کے بعد قائداعظم نے تحریک پاکستان کے سلسلے میں شاہ نواز بھٹو سے رابطہ برقرار رکھا جن کا شمار سندھ کے بڑے سیاستدانوں میں ہوتا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی تحریک پاکستان کے دنوں میں شاہ نواز بھٹو سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو خاندان نے کانگریس کی

بجائے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ قیام پاکستان کے وقت ذوالفقار علی بھٹو کی عمر 19 سال تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے بارے میں ان کے ذاتی دوستوں اور عزیز و اقارب کی متفقہ رائے ہے کہ وہ خاندان بھر میں سب سے زیادہ ذہین تھے اور شاہ نواز بھٹو کو پختہ یقین تھا کہ ان کا صاجزادہ کبھی سیاست میں نمایاں مقام حاصل کرے گا۔ شاہ نواز بھٹو کو اپنے ذرائع سے وقتاً" فوقتاً" اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ ذوالفقار علی بھٹو پڑھائی کے ساتھ ساتھ انگریز لڑکیوں میں بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان اطلاعات پر شاہ نواز نے بھٹو کو متعدد مرتبہ خطوط لکھے کہ وہ اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دے۔ جواباً" بھٹو نے اپنے والد کو یقین دلایا کہ ان کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں پرفارمنس سینکڑوں ایشیائی باشندوں سے بہتر ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے نہ صرف اپنے ہم عصر سیاستدانوں کو اپنی خدا داد صلاحیتوں کی وجہ سے مات دی بلکہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ درجنوں غیر ملکی لڑکیوں کے ان کے ساتھ غیر معمولی تعلقات استوار رہے اور ان میں سے کسی ایک کو تو یقین ہو چکا تھا کہ بھٹو ان سے شادی کریں گے لیکن یہ عزت ایک دبلی پتلی' خوبصورت اور اصفہانی گھرانے کی دراز قد لڑکی نصرت کو اس وقت ملی جب ذوالفقار علی بھٹو نے 1950ء میں انہیں شادی کی پیشکش کی۔ شاہ نواز بھٹو اور ان کی اہلیہ ذوالفقار علی بھٹو کے اس فیصلے سے قطعاً" خوش نہ تھے جبکہ خود نصرت کے والد ایک برس تک گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہے کیونکہ نصرت ایرانی تھیں اور بھٹو سندھی تھے۔ بیگم نصرت بھٹو جن کی تاریخ پیدائش 23 مارچ 1929ء تھی شروع میں ذوالفقار علی بھٹو سے شادی کرنے پر تیار نہ تھیں کیونکہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھے اور ان کو خوبصورت لڑکیوں کے حلقے میں دل پھینک تصور کیا جاتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کو جب بھٹو نے شادی کی پیشکش کی تو انہوں نے مسکرا کر ٹال دیا کیونکہ پاکستان سے واپس جاتے ہی انہیں یاد بھی نہ رہے گا کہ انہوں نے کسی لڑکی کو شادی کی پیشکش کی بھی تھی۔ لیکن 1951ء میں بھٹو نے دوبارہ پاکستان آنے کے بعد نصرت سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اس مرتبہ نصرت اصفہانی کو سنجیدہ ہونا پڑا اور انہوں نے شادی پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اب ذوالفقار علی بھٹو کے لئے مرحلہ یہ تھا کہ وہ اپنے والدین کو

شادی پر کس طرح آمادہ کریں۔ ان کی والدہ تو خیر کسی نہ کسی طرح مان ہی جاتیں' لیکن مسئلہ شاہ نواز بھٹو کا تھا جو قطعاً" اس بات کے حق میں نہ تھے کہ ان کا صاجزادہ خاندان سے باہر شادی کرے اور مستقبل میں ان کے آباؤاجداد کی جائیداد غیروں میں چلی جائے۔ شاہ نواز بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو کو نصرت اصفہانی سے شادی کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو ایک روز بھٹو انہیں ایک مسجد میں لے گئے جہاں مولوی صاحب ان کا نکاح پڑھانے کیلئے تیار تھے لیکن نصرت اصفہانی نے اس انداز میں شادی کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کا موقف تھا کہ شادی ایک ایسا فریضہ ہے جسے چھپ چھپا کر انجام نہیں دینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے والدین کے رویے سے بد دل ہو کر بھٹو نے خاندان کے بعض افراد کے ذریعے والدہ کو یہ پیغام دیا کہ وہ اس طرح کی زندگی سے تنگ آگئے ہیں۔ گویا بھٹو کی طرف سے یہ دھمکی تھی کہ اگر انہیں نصرت اصفہانی سے شادی نہ کرنے دی گئی تو وہ کچھ بھی کر لیں گے جس پر ان کی والدہ محترمہ خورشید نے انہیں کہا کہ "بیٹا آج کے بعد وہی ہو گا جو تم چاہو گے" اس طرح ذوالفقار علی بھٹو کو نصرت اصفہانی سے شادی کرنے کی اجازت مل گئی۔ یوں 8 ستمبر 1951ء کو نصرت اصفہانی بھٹو کی شریک حیات بن گئیں۔ شادی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو اپنی دوسری اہلیہ کے ساتھ لندن چلے گئے جہاں انہوں نے زندگی کے بہترین ایام گزارے۔ تاہم کچھ عرصے بعد نصرت بھٹو واپس پاکستان آگئیں کیونکہ ان کی بیرون ملک موجودگی کے باعث بھٹو کی پڑھائی متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔ یہ وہ دور ہے جب پاکستان میں سیاست سخت انتشار کا شکار تھی۔ اقتدار کے ایوانوں میں سازشیں عروج پر تھیں اور غیر ملکی طاقتیں خطے میں اپنے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانے کیلئے نئے مہروں کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی ابتدائی سیاسی زندگی

ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں دلچسپی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد شاہ نواز بھٹو سال میں کم از کم ایک مرتبہ اعلیٰ حکومتی عہدیداروں اور سیاستدانوں کو شکار کی دعوت پر لاڑکانہ ضرور بلایا کرتے تھے۔ اسکندر مرزا بھی کئی مرتبہ لاڑکانہ آتے اور ان کی بھٹو کے ساتھ علیک سلیک بھی ہوتی۔ ذوالفقار علی بھٹو ان دنوں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شاہ نواز بھٹو چونکہ خود اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر پائے تھے اس لیے انہوں نے پوری کوشش کی کہ ان کے صاحبزادے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور اس ضمن میں بھٹو کو ملک سے باہر بھی بھجوایا گیا۔ اسکندر مرزا نے 1950ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں دلچسپی کو دیکھتے ہوئے انہیں کراچی کا میئر بنانے کی پیشکش کی جسے بھٹو نے نہایت خوبصورتی سے ٹھکرا دیا کیونکہ بھٹو کی نظر وفاقی وزارت پر تھی اور وہ میئر بننا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے والد شاہ نواز جانتے تھے کہ آنے والے دنوں میں ایوب خاں اسکندر مرزا کی چھٹی کرا دے گا اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے کئی ایک قریبی دوستوں سے کیا لیکن بھٹو کی رائے یہ تھی کہ اسکندر مرزا نہایت تجربہ کار سیاستدان ہیں اس لیے وہ آسانی سے اقتدار نہیں چھوڑیں گے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اسکندر مرزا نے مارچ 1958 میں ایک وفد کے ہمراہ جنیوا بھجوایا جہاں سے انہوں نے اسکندر مرزا کو خط لکھا کہ آنے والا وقت ثابت کرے گا کہ آپ قائداعظم سے بھی بڑے لیڈر ہیں۔ اسکندر مرزا سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنے تمام اہم کارڈز ایوب خاں کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اگر وہ ایوب خاں کو فری ہینڈ نہ دیتے تو ان کی اتنی جلدی چھٹی نہ کرائی جاتی۔ اسکندر مرزا کی اپنی ہی غلطیوں کے

باعث ایوب خاں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ستمبر 1958ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کے والد کی اسکندر مرزا کی سیاسی ذہانت کے بارے میں رائے راست تھی اس لیے انہوں نے اسکندر مرزا کی بجائے ایوب خاں کے ساتھ رشتہ امید اختیار کر لیا۔ اسکندر مرزا نے سیاسی چالیں چلتے ہوئے 17 اکتوبر 1958ء کو ایوب خاں کی مدد سے سول حکومت کو ختم کرکے مارشل لاء لگایا۔ وہ ایوب خاں کو اپنے انڈر رکھنا چاہتے تھے جبکہ ایوب خاں کو 20 دنوں میں ہی اندازہ ہو گیا کہ سیاستدان کی حیثیت تو محض ایک کٹھ پتلی کی سی ہوتی ہے اور اصل قوت تو فوج کے پاس ہے' چنانچہ 27 اکتوبر 1958ء کو جب اسکندر مرزا نئی وفاقی کابینہ بناکر ایوب خاں کو اپنے ماتحت کرنے کے بعد سکون کا سانس لے رہے تھے' ایوب خاں نے تین جرنیلوں کو ان کے پاس بھیجا جن کے ذمہ اسکندر مرزا سے استعفیٰ حاصل کرنا تھا۔ اسکندر مرزا نے 27 اکتوبر 1958ء کی صبح جو کابینہ بنائی تھی اس میں بھٹو کا نام بطور وزیر تجارت شامل تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ کابینہ امور مملکت سنبھالتی' ایوب خاں نے سیاست کی بساط الٹ دی اور اسکندر مرزا کو بندوق کی نوک پر اقتدار سے الگ کرکے لندن بھیج دیا گیا جبکہ 28 اکتوبر 1958ء کو ایوب خاں ملک کے نئے صدر بن گئے اور فوج کا ڈنڈا بھی ان کے ہاتھ میں رہا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی خدا داد صلاحیتوں کی وجہ سے جلد ہی ایوب خاں کے دل میں جگہ پالی کیونکہ بھٹو مرحوم ایوب خاں کو والد کا درجہ دیتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خاں کے امیج کو عوام میں بہتر بنانے کیلئے دن رات کام کیا۔ انہوں نے جلسوں میں ایوب خاں کے حق میں تقریریں کیں اور انہیں قوم کیلئے نجات دہندہ قرار دیا۔ 1959ء میں جب ایوب خاں نے بنیادی جمہوریت کا تصور پیش کیا تو بھٹو نے اسے زبردست آئیڈیا قرار دیا اور بنیادی جمہوریت کے تصور کے حق میں تقریریں کیں۔ چونکہ ایوب خاں نے اقتدار حاصل کرنے کیلئے اپنے محسن اور دوست اسکندر مرزا کے ساتھ بے وفائی کی تھی اس لیے انہیں ہمیشہ یہ خطرہ لگا رہا کہ کہیں جنرل موسیٰ خاں بھی ان کے ساتھ ہاتھ نہ کر جائیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جنرل موسیٰ خاں بھی فور سٹار جنرل تھے جبکہ ایوب خاں کے کندھے پر بھی اتنے ہی بیج لگے ہوتے تھے۔ مارشل لاء کے نفاذ اور صدر مملکت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ایوب خاں کیلئے ایک برس ایسے

گزرا جیسے ایک صدی گزری ہو۔ جنرل موسیٰ خاں فوج کے اجلاسوں میں جنرل ایوب
خاں کو زیادہ لفٹ نہیں کراتے تھے۔ اس مسئلے کا حل بھی ذوالفقار علی بھٹو نے ہی تجویز
کیا۔ انہوں نے ایوب خاں کو مشورہ دیا کہ وہ فیلڈ مارشل بن جائیں' اس طرح 25
اکتوبر 1959ء کو مارشل لاء کے نفاذ کے ایک سال بعد ایوب خاں نے "فیلڈ مارشل
ایوب خاں" کہلوانا شروع کر دیا اور عہدے کے اعتبار سے انہیں جنرل موسیٰ خاں پر
سبقت حاصل ہو گئی۔

ذوالفقار علی بھٹو کو وزیر خارجہ بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور اپنی اس
خواہش کا براہ راست اظہار کرنے کی بجائے وہ امور خارجہ کے حوالے سے ایوب خاں
کو نئی نئی تجاویز دیا کرتے تھے۔ ایوب خاں کے دور حکومت میں وزارت خارجہ کا
قلمدان منظور قادر کے ہاتھ میں تھا جو بھٹو کی وجہ سے بہت زچ تھے کیونکہ بھٹو نے
وزارت خارجہ سے متعلقہ امور میں مسلسل مداخلت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ 1962ء
میں جب ایوب خاں نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے الیکشن کرائے تو بھٹو بلا مقابلہ ممبر
قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ ایوب خاں نے 1962ء کے انتخابات کے بعد کابینہ بنائی تو
انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی بجائے محمد علی ---- کو وزیر خارجہ بنا دیا کیونکہ بھٹو کی عمر
اس وقت بہت کم تھی۔ تاہم جنوری 1963ء میں جب محمد علی ---- کو دل کا دورہ پڑا
اور وہ وزارت خارجہ جیسے امور سنبھالنے کے قابل نہ رہے تو ایوب خاں نے بھی سب
سے بڑی خواہش پوری کرتے ہوئے انہیں 35 برس کی عمر میں ملک کا وزیر خارجہ بنا
دیا۔ بھٹو نے وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالتے ہی چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے
کی کوشش شروع کر دی اور 2 مارچ 1963ء کو انہوں نے چین کے ساتھ بطور وزیر
خارجہ پہلا معاہدہ کیا۔ اکتوبر 1963ء میں بھٹو نے بطور وزیر خارجہ امریکی صدر جان ایف
کینیڈی سے ملاقات کی۔ 27 مئی 1964ء کو جب پنڈت جواہر لعل نہرو فوت ہوئے تو
ایوب خان نے ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے نمائندے کے طور پر بھارت بھیجا تاکہ وہ ایوب
خاں کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو کی میت پر پھول ڈالیں۔ اندرا گاندھی سے
ذوالفقار علی بھٹو کی بطور وزیر خارجہ پہلی ملاقات نہرو کی وفات کے موقع پر ہوئی۔ بھٹو
نے 1963ء میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ اندرا گاندھی بھارت کی سیاست میں اہم کردار ادا

کریں گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اندرا گاندھی نے 30 مئی 1963ء کو بھٹو کے ساتھ بین
الاقوامی سیاست کے موضوع پر 2 گھنٹے تبادلہ خیال کیا جبکہ امور خارجہ بھٹو کا بھی پسندیدہ
Subject تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے چین کے ساتھ مسلسل بڑھتے ہوئے تعلقات
امریکہ کیلئے تشویش کا باعث تھے۔ امریکہ نے جون 1963ء میں ہی ایوب خاں پر دباؤ
ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ وہ بھٹو کی جگہ کسی اور شخص کو وزارت خارجہ کا قلمدان عطا کر
دیں لیکن مصلحتوں کے باعث ایوب خاں یہ فیصلہ نہ کر پائے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ
تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو نے جو نئی خارجہ پالیسی بنائی تھی اس کو حتمی شکل دینے سے
پہلے انہوں نے ایوب خاں کے ساتھ گھنٹوں بحث کی تھی اور ایوب خاں خود بھی اس
بات سے آگاہ تھے کہ بھٹو ملک کے وسیع تر مفاد میں خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں لا رہے
ہیں۔ محض ذوالفقار علی بھٹو کی چین دوستی کے باعث امریکہ نے پہلے پاکستان کیلئے منظور
کیا جانے والا 400 ملین ڈالر کا قرضہ معطل کیا اور پھر امریکی محکمہ خارجہ نے بھارت کو
دفاعی لحاظ سے مضبوط کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس اقدام کا مقصد سوائے اس
کے کوئی اور نہ تھا کہ امریکہ چاہتا تھا کہ ایوب خاں اپنی خارجہ پالیسی واشنگٹن کی
Dictation کے مطابق ترتیب دیں۔ ایوب خاں کے انکار پر امریکی سی آئی اے حرکت
میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپوزیشن جماعتیں جو ایوب خاں سے خوفزدہ ہو کر دبک
گئی تھیں اچانک متحدہ محاذ کے نام سے ایک نیا سیاسی اتحاد بنا کر میدان میں نکل آئیں۔
اس نئے محاذ میں جماعت اسلامی' مولانا بھاشانی' کونسل مسلم لیگ' نظام اسلام پارٹی اور
عوامی لیگ شامل تھی۔ ان تمام اپوزیشن جماعتوں نے ایوب خاں کو اقتدار سے محروم
کرنے کیلئے فاطمہ جناح سے رابطہ قائم کیا جن کی عمر اس وقت 71 برس تھی اور وہ
سیاست سے الگ ہو کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھیں۔ اپوزیشن جماعتوں کے
اصرار پر مادر ملت نے صدارتی الیکشن میں ایوب خاں کا مقابلہ کیا لیکن دھاندلی جیت گئی
اور جمہوریت ہار گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے صدارتی الیکشن میں فاطمہ جناح کے خلاف
تقریریں کیں۔ اگرچہ ایوب خاں صدارتی الیکشن میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کے
باوجود ان کے خلاف امریکی سازش جاری رہی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1956ء سے
1964ء تک اپنی عملی سیاسی زندگی کے دوران بہت کچھ سیکھا۔ انہیں اس عرصے کے

دوران نہایت اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ کسی بھی حکمران کیلئے امریکی سوچ اور پالیسی کے خلاف کام کرنا آسان نہیں ہو گا اور اس کا انہیں ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا تھا۔ 1969ء کے درمیان جب ایوب خاں کو اندرونی سطح پر اپوزیشن کی شدید مخالفت کا سامنا تھا' ذوالفقار علی بھٹو بھی خاندانی جھگڑوں کا شکار ہو چکے تھے۔ جس کی بنیادی وجہ ان کے حسنہ شیخ کے ساتھ تعلقات تھے جنکا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر کراچی آچکی تھیں اور بھٹو نے ان کیلئے رہائش کا بندوبست کر رکھا تھا۔ حسنہ شیخ بھٹو کی کمزوری جانتی تھیں اس لیے تنہائی کے لمحات میں وہ ان کے ساتھ بین الاقوامی امور پر گھنٹوں بحث کیا کرتی تھیں اور بھٹو ان کے ساتھ گپ شپ کر کے بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو کو جب اس صورتحال کا پتہ چلا تو انہوں نے ایوب خاں کی اہلیہ کے ذریعے ایوب خاں تک شکایت پہنچائی۔ چنانچہ ایوب خاں نے بھٹو اور ان کی اہلیہ کے درمیان صلح کرائی وگرنہ بیگم نصرت بھٹو تو طلاق لینے کیلئے تیار تھیں۔ 1969ء کے آخری مہینوں میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات خراب ہو چکے تھے جبکہ اس کے برعکس امریکہ اور روس نے بھارت کو دفاعی اعتبار سے مضبوط کر دیا تھا۔ پاکستان کو لے دے کر اللہ تعالیٰ کے بعد بس چین کا سہارا تھا اس لیے اس وقت جبکہ بھارت کو روس سے مسلسل نیا اسلحہ مل رہا تھا' ذوالفقار علی بھٹو نے چین کو اپنی دفاعی ضروریات سے آگاہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1965ء کے شروع میں ہی ایوب خاں کو قائل کر لیا تھا کہ کشمیر کو آزاد کرانے کا وقت آگیا ہے۔ اس لیے مئی' جون 1965ء میں دو خفیہ منصوبوں 'اپریشن گلبرالٹر اور اپریشن گرینڈ سیلیم کے تحت کشمیری مجاہدین کو اسلحہ اور تربیت فراہم کی گئی۔ امریکی سی آئی اے کو پاکستان کے دونوں منصوبوں کا کافی تاخیر سے علم ہوا۔ اپریل 1965ء میں ایوب خاں اور امریکی صدر جانسن کی ملاقات طے تھی لیکن بدلتی ہوئی صورت حال کے باعث امریکہ نے یہ ملاقات منسوخ کر دی جس سے صاف واضح ہو گیا کہ امریکہ کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہے اور مشکل لمحات میں امریکہ پاکستان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ ایوب خاں اسی بات سے پریشان تھے لیکن ذوالفقار علی بھٹو اور بعض جرنیلوں کے مشوروں کے باعث وہ اس بات پر تیار ہو گئے کہ کشمیری مجاہدین کو پہلے مرحلے میں محدود امداد دی جائے اور

جب مثبت نتائج نکلنے کا یقین ہو جائے تو پاکستان مقبوضہ کشمیر پر حملہ کر کے اسے آزاد کرا لے۔ 29 اگست 1965ء کو فیلڈ مارشل ایوب خاں نے جنرل موسیٰ خاں کو' جو فوج کے سربراہ تھے' خط لکھا کہ کشمیری مجاہدین کی جس قدر ممکن ہو سکے مدد کی جائے' جس پر یکم ستمبر 1965ء کو پاکستان نے کشمیر کو آزاد کرانے کیلئے بھارت کو محدود سطح کی جنگ میں الجھا دیا۔ اگرچہ پاکستان کو شروع میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن 6 ستمبر 1965ء کو جب بھارت نے امرتسر اور فیروز پور کے راستے پاکستان پر حملہ کیا تو صورتحال تبدیل ہو گئی۔ امریکہ کے وزیر خارجہ چن لی نے حالانکہ 4 ستمبر 1965ء کو ہی اپنے دورہ پاکستان کے موقع پر حکومت کو بعض حساس معلومات فراہم کی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ بھارت نے پاکستان پر بڑے حملے کی تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ ایوب خاں نے 4 ستمبر 1965ء کی رات ہی ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی بریگیڈیئر ریاض کو حکم دیا کہ وہ ان مقامات کا پتہ چلائیں جہاں سے بھارت کی فوجیں حملہ آور ہو سکتی ہیں۔ قبل اس کے کہ آئی ایس آئی بھارت کے فوجی منصوبوں کا سراغ لگا پاتی' اچانک امرتسر اور فیروز پور کے راستے سے بھارت نے پاکستان پر چڑھائی کر دی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل گل حسن نے فوری طور پر ائرمارشل اصغر خاں کے ہمراہ چین سے مذاکرات کیے۔ چین نے محدود سطح پر پاکستان کو جنگی ہتھیار سپلائی تو کر دیئے لیکن یہ مقدار اس قدر نہ تھی جس طرح روس نے بھارت کو اسلحہ فراہم کر دیا تھا۔ لیکن پاکستان کو اس جنگ کے باوجود مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اسی موقع پر سیاسی چال چلتے ہوئے 22 ستمبر 1965ء کی رات اقوام متحدہ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کا نعرہ لگایا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا یہ نعرہ انہیں عوامی سطح پر مقبول کرنے کا باعث بن گیا۔ بھٹو نے اپنے دورہ امریکہ کے دوران اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں دھواں دار تقریریں کر کے نہ صرف پاکستان میں شہرت حاصل کی بلکہ ان کی انٹرنیشنل لیول پر بھی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔ ایوب خاں کے لیے بہرحال یہ لمحہ فکریہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو اب ان کیلئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس قسم کے خدشات نے جب ایوب خاں کے دل میں جگہ پائی تو ان کے اردگرد موجود ان ارکان کابینہ نے جو بھٹو سے حسد کرتے تھے

ان کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔ نتیجتاً" بھٹو کے خلاف کابینہ میں ایک پریشر گروپ بن گیا۔ 8 نومبر 1965ء کو جب بھٹو نے جنگ کے خاتمے کے بعد وطن واپس آنے پر کابینہ کو اپنے دورہ امریکہ کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کیا تو کابینہ کے ماحول کو دیکھ کر انہیں سمجھ آگئی کہ ان کے خلاف لاوا پکنا شروع ہو گیا ہے۔ بھٹو جانتے تھے کہ ایوب خاں کا زوال اب قریب ہے کیونکہ اپوزیشن ان کے خلاف دوبارہ منصوبہ بندی میں مصروف تھی جبکہ امریکہ نے پاکستان میں نئے ممبروں کی تلاش شروع کر دی تھی - ایوب خاں کی 14 دسمبر 1965ء کو امریکہ میں صدر جانسن سے ملاقات ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی اس موقع پر موجود تھے۔ امریکی صدر نے ایوب خاں کو تجویز دی کہ وہ 4 جنوری 1965ء کو تاشقند میں ہونے والی امن کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلئے اپنا کردار ادا کریں۔ اگرچہ ایوب خاں نے بھارتی وزیراعظم شاستری سے تاشقند میں مزاکرات کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے ساتھ رکھا لیکن وہ کئی مواقع پر بھٹو کو کمرہ ملاقات سے باہر نکال دیتے تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ایوب خاں اب بھٹو کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ بھٹو کی خواہش تھی کہ وہ شاستری کے ساتھ ہونے والے مزاکرات میں شرکت کریں لیکن مسلسل نظرانداز کئے جانے کے باعث وہ سمجھ گئے کہ ایوب خاں ان سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے پاس اب بہترین موقع تھا کہ وہ ڈوبتی ہوئی کشتی میں بیٹھ کر ہلاک ہونے کی بجائے چھلانگ لگا دیں۔ اس لیے جب ایوب خاں نے 10 جنوری 1966ء کو معاہدہ تاشقند پر دستخط کئے' بھٹو نے معاہدہ تاشقند کو تنقید کا نشانہ بنایا لیکن ان کی یہ تنقید زیادہ تر کابینہ کے اجلاسوں تک محدود رہی۔ معاہدہ تاشقند کے بعد ایوب خاں نے لاڑکانہ میں بھٹو کے ساتھ شکار کھیلنے کی بجائے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت جتوئی کے ڈیرے پر شکار کھیلا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اس سے سمجھ آگئی کہ ایوب خاں اگلے مرحلے میں انہیں نالائق وزیر خارجہ ثابت کرکے کابینہ سے نکال دیں گے۔ یہ بڑی نازک صورتحال تھی کیونکہ ایوب خاں کے اشارے پر ان کی مسلم لیگ کے ارکان نے بھٹو کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ بھٹو کے پاس دو راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ قومی اسمبلی میں معاہدہ تاشقند کے حق میں تقریر کرتے۔ دوم یہ کہ وہ استعفیٰ دے دیتے۔ بھٹو کو معاہدہ تاشقند

کے حق میں تقریر کرنے کیلئے 6 دن کی مہلت دی گئی اور اس مہلت کے گزرنے کے بعد ایوب خاں نے شریف الدین پیرزادہ کو وزیرخارجہ بنا دیا اور یوں ذوالفقار علی بھٹو نے پہلی مرتبہ عوام کو آگاہ کیا کہ ایوب خاں نے معاہدہ تاشقند پر دستخط کرکے قوم سے غداری کی ہے' نتیجتاً" لوگ ایوب خاں کے خلاف ہونا شروع ہو گئے اور بھٹو نے نوجوانوں ' مزدوروں اور طالب علموں کے علاوہ وکلاء سے رابطے شروع کر دیئے۔ ایوب خاں کو منظرعام سے ہٹانے کیلئے امریکہ بھی میدان میں موجود تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایوب خاں کی مقبولیت میں کمی ہوتی چلی گئی جبکہ بھٹو مقبولیت کی منازل طے کرتے چلے گئے۔

پی پی پی کا قیام' ایوب خاں کی حکومت کا خاتمہ
اور بھٹو کا اندازِ سیاست

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان جس سرد جنگ کا آغاز ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ شخصی تنازعے میں تبدیل ہوگئی۔ بھٹو نے بطور وزیر خارجہ مسئلہ کشمیر اور ایٹمی پروگرام پر جس قسم کا انداز اپنا رکھا تھا وہ بھارت' روس اور امریکہ کے لئے خصوصی طور پر باعث تشویش تھا۔ اس لئے بھٹو جب ایک مرتبہ 23 نومبر 1965ء کو ماسکو کے سرکاری دورے پر گئے تو روس نے نہ صرف پاکستان کو 10 کروڑ روپے امداد دینے کا اعلان کیا بلکہ اس موقع پر روسی حکومت نے بھٹو کے ذریعے فیلڈ مارشل ایوب خاں کو یہ پیشکش بھی کی کہ وہ بھارتی وزیراعظم شاستری کے ساتھ تاشقند میں ان کے مذاکرات کروانے کے لئے تیار ہیں۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں خود بھی 1965ء کی جنگ کے بعد بھارت سے بامقصد مذاکرات کے خواہش مند تھے اس لئے پاکستان نے بھارت کے ساتھ مذاکرات کے لئے روس کی مصالحتی پیشکش منظور کرلی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اس بات کا یقین تھا کہ پاک بھارت تعلقات اور خطے میں قیام امن کو مسئلہ کشمیر کے ساتھ منسلک کرنے کے بعد پاکستان کشمیریوں کو برس ہا برس کے مظالم سے نجات دلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وزارت خارجہ نے بھٹو کی قیادت میں تاشقند میں 4 جنوری 1966ء کو ہونے والے مذاکرات کو کامیاب بنانے کے لئے دن رات مختلف تجاویز پر غور کیا اور آخر کار جب پاکستانی وفد فیلڈ مارشل ایوب خاں کی قیادت میں ماسکو روانہ ہوا تو بھٹو کے بریف کیس میں مسئلہ

کشمیر کے حل کے لئے کئی قابل عمل تجاویز موجود تھیں۔ تاشقند میں بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان 5 جنوری 1966ء کی شام بھارتی وزیر خارجہ سوان سنگھ کی موجودگی میں گرما گرمی ہوئی جسے بمشکل اخبارات سے چھپایا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے دو ٹوک اور غیر لچکدار موقفِ اختیار کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے سے پہلے مسئلہ کشمیر طے کرے کیونکہ "پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعات کا بنیادی سبب مسئلہ کشمیر ہے اور جب تک یہ مسئلہ حل طلب رہے گا خطے میں امن کا قیام ممکن نہیں"۔ روسی حکام کو 5 جنوری 1966ء کی شام ہی پتہ چل گیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے باعث پاک بھارت مذاکرات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہونے والے ہیں تو روس کے وزیر خارجہ نے پہلے فیلڈ مارشل ایوب خاں اور پھر لال بہادر شاستری سے ملاقات کی۔ روسی وزیر خارجہ گورمیکو کی شٹل ڈپلومیسی کے بعد اچانک بھٹو کو مذاکرات سے الگ کر دیا گیا۔ لال بہادر شاستری اور فیلڈ مارشل ایوب خاں کے درمیان مذاکرات کے وقت اس بات کا خصوصی طور پر اہتمام کیا گیا کہ بھٹو کمرہء مذاکرات کے قریب تو موجود رہیں لیکن وہ مذاکرات میں حصہ نہ لے سکیں۔ بھٹو نے اس صورتحال پر ایک دن تو خاموشی اختیار کی لیکن دوسرے دن وہ ایوب خاں کے ساتھ الجھ پڑے اور انہوں نے کہا کہ پاکستان مذاکرات کے دوران بھارت کو اس بات پر راضی کرے کہ کشمیریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے حق خود ارادیت دیا جائے گا' لیکن بھٹو کی ایک نہ چلنے دی گئی۔ 9 جنوری 1966ء کو روسی وزیراعظم کوسیگن نے اپنی موجودگی میں لال بہادر شاستری اور فیلڈ مارشل ایوب خاں کو 9 نکاتی معاہدہ تاشقند پر دستخط کرنے کے لئے راضی کیا جس کے تحت تجویز پایا کہ دونوں ممالک کی فوجیں بین الاقوامی سرحدوں پر واپس چلی جائیں گی' پاکستان اور بھارت کے درمیان سفارتی تعلقات بحال ہو جائیں گے اور دونوں ممالک فروغ تجارت' پروپیگنڈہ کا خاتمہ' ذرائع مواصلات کی توسیع اور بے گھر افراد کی آباد کاری کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ لال بہادر شاستری نے 10 جنوری 1966ء کو ایوب خاں کی موجودگی میں معاہدہ تاشقند پر دستخط کئے اور اسی خوشی میں وہ دل کا دورہ پڑنے کے باعث انتقال کر گئے جبکہ بھٹو نے 15 جنوری 1966ء کو کہا

کہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرلینا چاہئے کہ ہم تاشقند میں مسئلہ کشمیر کا فوری حل تلاش نہیں کرسکے۔ گویا بھٹو کی طرف سے ایوب خاں پر تنقید کا یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد انہوں نے 9 فروری 1966ء کو ذرا کھل کر کہا کہ اعلان تاشقند کو تصفیہ کشمیر کا متبادل حل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ''میں اعلان کرتا ہوں کہ کشمیریوں کو آزادی دلانے کے لئے ان متعلق میرے وعدے پورے ہوں گے''۔ 11 مارچ 1966ء کو بھٹو نے کہا کہ معاہدہ تاشقند کوئی معاہدہ ہے ہی نہیں بلکہ ''میں تو اسے صرف ایک اخلاقی سمجھوتہ سمجھتا ہوں۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے معاہدہ تاشقند کرتے وقت ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو کابینہ سے نکال دیں گے لیکن عوامی ردعمل کے خوف کے باعث وہ ایسا نہ کرسکے۔ تاہم انہوں نے بھٹو کو ایوان صدر بلا کر کہا کہ اگر تم نے کابینہ میں رہنا ہے تو مجھ پر تنقید کا سلسلہ فوراً'' بند کردو۔ بھٹو نے ایوب خاں کی دھمکی کو نظرانداز کرتے ہوئے 30 مئی 1966ء کو کہا کہ ''اب وقت آگیا ہے کہ حکومت قوم کو اصل صورتحال سے آگاہ کرے' میں اب زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتا''۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کا اب پیمانہ صبرلبریز ہوچکا تھا اس لئے انہوں نے 18 جون 1966ء کو اعلان کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو علالت کی وجہ سے طویل رخصت پر بھیج دیا گیا ہے۔ بھٹو نے حکومت کے اس فیصلے کے بعد ایوب خاں کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا کیونکہ جس وقت وہ شکار کھیلنے کے لئے تیاری کررہے تھے' ایوب خاں انہیں علیل ثابت کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ کابینہ سے الگ ہونے کے بعد بھٹو 22 جون 1966ء کو لاہور پہنچے جہاں ریلوے سٹیشن پر ان کا فقید المثال استقبال ہوا۔

عوام نے بھٹو کو جس محبت سے نوازا اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کے لئے حکمت عملی مرتب کرنا شروع کردی جس کے تحت پہلے مرحلے میں انہوں نے 27 فروری 1967ء کو ایوب خاں کی کنونشن لیگ سے خود کو علیحدہ کیا اس کے بعد انہوں نے عوامی اجتماعات سے خطاب کرنا شروع کردیا۔ دراصل ذوالفقار علی بھٹو نئی سیاسی جماعت بنانے سے پہلے پورے ملک میں فضا کو اپنے حق میں سازگار کرنا چاہتے تھے اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب رہے۔ 30 نومبر 1967ء کو لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کی گلبرگ میں واقع رہائش گاہ پر بھٹو کی موجودگی میں اہلیان وطن نے پاکستان پیپلزپارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی۔ بھٹو نے تالیوں کی گونج میں پی پی پی کے تاسیسی اجلاس کی صدارت کی۔ دو دن جاری رہنے والے اس اجلاس میں بھٹو کو پارٹی کا چیئرمین چن لیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ 3 دسمبر 1967ء کو لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد کرکے فیلڈ مارشل ایوب خاں کے خلاف احتجاجی تحریک کا آغاز کیا جائے گا لیکن حکومت نے تاریخی جلسہ گاہ موچی دروازے میں پانی چھوڑ دیا اور وہ ہر ممکن حربہ اختیار کیا گیا جس سے جلسے کو ناکام بنایا جاسکے۔ اس روز بھٹو نے درجنوں کارکنوں کو ہلاک ہونے سے بچانے کے لئے جلسہ منسوخ کردیا۔ 9 دسمبر 1967ء کو بھٹو نے 70 کلفٹن پر پریس کانفرنس کے دوران پارٹی کا 72 صفحات پر مشتمل منشور جاری کیا۔ اگرچہ حکومت نے مسلسل یہ کوشش کی کہ کسی طرح بھٹو اپنی طاقت کا مظاہرہ نہ کرسکیں لیکن اس کے باوجود 25 جنوری 1968ء کو بھٹو نے موچی دروازے میں شدید سردی کے باوجود ایک تاریخی جلسہ عام سے خطاب کیا۔ یہ دراصل رابطہ عوام کا آغاز تھا۔ غلام مصطفیٰ کھر اور ممتاز بھٹو نے کنونشن لیگ میں ہونے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو کے جلسوں میں حصہ لینا شروع کردیا تھا جس پر پارٹی نے انہیں اظہار وجوہ کے نوٹس جاری کئے اور آخر کار ممتاز بھٹو اور غلام مصطفیٰ کھر پی پی میں آگئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو ایوب خاں کے خلاف میدان میں اترا دیکھ کر دیگر اپوزیشن جماعتوں نے ایک نیا سیاسی اتحاد بنا لیا۔ ملک بھر میں مظاہرے روز مرہ کا معمول بن کر رہ گئے' خصوصاً'' طلبا نے بھٹو کا خوب ساتھ دیا۔ مظاہروں میں جب بہت زیادہ شدت آگئی تو 13 نومبر 1968ء کی شب پولیس نے ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر داخل ہوکر ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کرلیا۔ اسی رات غلام مصطفیٰ کھر' ولی خاں اور ممتاز بھٹو کو بھی گرفتار کیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے اپنے شوہر کی گرفتاری کو چیلنج کردیا۔ ہائی کورٹ میں نصرت بھٹو کی رٹ پٹیشن کو تین ماہ تک لٹکائے رکھا گیا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ بیگم صاحبہ کی درخواست پر فیصلے میں زیادہ سے زیادہ تاخیر ہوجائے۔ چونکہ سیاستدانوں کی گرفتاری کے باوجود ایوب خاں حالات کنٹرول کرنے میں ناکام ہوگئے تھے اس لئے مجبوراً'' بھٹو کو 12 فروری 1969ء کو رہا کرکے لاڑکانہ میں ان کی رہائش گاہ پر نظربند کردیا گیا جس پر بھٹو نے 14 فروری 1969ء کو بھوک ہڑتال کردی۔ آخر کار حکومت

نے بھٹو کے مطالبے پر بے گناہ کارکنوں کو رہا کرنے کا اعلان کر دیا اور ڈیفنس آف پاکستان رولز ختم ہونے پر بھٹو نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ 18 فروری 1969ء کو بھٹو نے کراچی میں مزار قائداعظم پر ایک بڑے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے ایوب خاں کو مشورہ دیا کہ وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر سیاست اور حکومت سے الگ ہو جائیں۔ کراچی سے بھٹو ڈھاکہ گئے جہاں وہ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن کو ملے۔ ایوب خاں نے عوامی دباؤ کے باعث آخر کار سیاستدانوں سے مذاکرات کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم 26 فروری 1969ء کو ہونے والی اس گول میز کانفرنس میں بھٹو شریک نہ ہوئے کیونکہ ان کا مطالبہ تھا کہ گول میز کانفرنس سے پہلے اخبارات کے خلاف کالے قوانین ختم کئے جائیں، تمام سیاسی نظربند رہا کئے جائیں، عوام پر تشدد ختم کیا جائے، پریس ٹرسٹ توڑ دیا جائے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات کے ذریعے قومی اسمبلی معرض وجود میں لانے کا اعلان کیا جائے۔ جس وقت اپوزیشن جماعتیں ایوب خاں سے مذاکرات کر رہی تھیں، بھٹو راولپنڈی لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مطالبہ کر رہے تھے کہ "گول میز کانفرنس منعقد کرنے کی بجائے ایوب خاں مستعفی ہو جائیں اور اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کے حوالے کر دیا جائے جو 6 ماہ کے اندر نئے انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنائے"۔

اگرچہ فروری 1969ء میں سیاستدانوں کی اکثریت نے ذوالفقار علی بھٹو کے موقف سے اتفاق نہ کیا اور وہ اپنے مطالبات منوانے کے لئے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے آمادہ ہوگئے۔ تاہم بھٹو کو یقین تھا کہ ایوب خاں عین وقت پر کوئی نہ کوئی چال ضرور چلیں گے جس کے باعث جمہوریت کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 7 مارچ 1969ء کو لاہور میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والے آج خوش ہیں کہ ایوب خاں ان کے مطالبات تسلیم کر کے از سر نو انتخابات کرانے کے لئے تیار ہوگیا ہے لیکن یہ لوگ اس وقت پچھتائیں گے جب یہی ایوب خاں انہیں بے وقوف بنا کر اقتدار کسی اور کے حوالے کر دے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے اندازے درست ثابت ہوئے کیونکہ 10 مارچ 1969ء کو جب گول میز کانفرنس دوبارہ شروع ہوئی تو فوج مارشل لاء لگانے کی تیاریاں

مکمل کر چکی تھی اور 25 مارچ 1969ء کو یحییٰ خاں نے ایوب خاں کے کہنے پر مارشل لاء لگا کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور سیاستدانوں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یحییٰ خاں نے 4 ماہ بعد سیاستدانوں کو محدود سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔ بھٹو نے 13 نومبر 1969ء کو رابطہ عوام مہم شروع کی اور اپنی پارٹی کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں چاہوں گا کہ نئے انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہوں، ملک میں پارلیمانی نظام بحال کیا جائے، ون یونٹ کا خاتمہ ہو اور تمام صوبوں کو آبادی کی بنیاد پر قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں نشستیں دی جائیں۔ 28 نومبر 1969ء کو جب بھٹو پنجاب کے دورے پر بہاولپور سے ملتان آ رہے تھے تو صادق آباد میں ایک ٹرک نے انہیں ٹکر مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر غلام مصطفیٰ کھر کی ہوشیاری کے باعث بھٹو پر ہونے والا یہ قاتلانہ حملہ ناکام ہوگیا اور کھر نے ایسی پھرتی سے کار کو نکالا کہ ٹرک ڈرائیور بھی دیکھتا رہ گیا۔ اسی روز یحییٰ خاں نے انتخابات کے لئے 5 اکتوبر 1970ء کی تاریخ مقرر کر دی جبکہ یکم جنوری 1970ء کو یحییٰ خاں کے حکم پر سیاسی سرگرمیوں پر عائد پابندی ختم کر دی گئی۔

1970ء کے انتخابات، سانحہ مشرقی پاکستان اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کا قیام

ایوب خاں نے جس قسم کے حالات میں اقتدار یحیٰی خاں کے حوالے کیا تھا ان حالات میں اگر یحیٰی خاں چاہتے تو ڈنڈے کے زور پر سیاستدانوں کو جیلوں میں بند کر کے انتخابات کو کئی برس کے لئے ملتوی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے مارشل لاء لگانے کے چند ماہ بعد ہی سیاستدانوں کو محدود پیمانے پر سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی جبکہ انتخابات کے لئے 5 اکتوبر 1970ء کی تاریخ طے کر دی گئی۔ تاہم ستمبر، اکتوبر 1970ء میں مشرقی پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں کے باعث الیکشن 7 دسمبر 1970ء تک ملتوی کر دیئے گئے۔ اس دوران سیاستدانوں نے ایک دوسرے کے اوپر کیچڑ اچھالنے کا سلسلہ شروع کر رکھا۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پاکستان کے خلاف سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ مغربی پاکستان میں بھٹو کی مقبولیت کو دیکھ کر یحیٰی خاں نے کوشش کی کہ کم از کم حکومت کے زیر کنٹرول اخبارات میں بھٹو کی تقریریں شائع نہ ہونے دی جائیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھٹو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب 7 دسمبر 1970ء کو انتخابات ہوئے تو مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو بھاری اکثریت سے جیت گئے اور دونوں کی نظر وزارت اعظمیٰ پر تھی اور یہی وہ مسئلہ تھا جو یحیٰی خاں کے غلط فیصلوں کی وجہ سے ایسا الجھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے وزیراعظم بننے کی بجائے بنگلہ دیش کے قیام کے لئے کھل کر کوششیں شروع کر دیں جس پر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے خصوصی نمائندے غلام مصطفیٰ کھر کے ذریعے شیخ

مجیب الرحمٰن سے رابطہ قائم کیا۔ کھر کی مجیب سے 2 جنوری 1971ء کو ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی جس میں طے پایا کہ انتقال اقتدار کا مسئلہ بھٹو اور مجیب مذاکرات کے ذریعے حل کریں گے۔ بھٹو اور مجیب کے درمیان ڈھاکہ میں 27 جنوری سے 29 جنوری 1971ء تک مذاکرات ہوئے جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مجیب وزارت اعظمیٰ حاصل کرنا چاہتے تھے جبکہ بھٹو بھی اسی عہدے کے حصول کے متمنی تھے۔ بھٹو اور مجیب الرحمٰن میں سے ایک صدر اور ایک وزیراعظم بن سکتا تھا لیکن مسئلہ درپیش یہ تھا کہ جنرل یحیٰی خاں نے ایوان صدر کو خالی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انہوں نے بھٹو اور مجیب دونوں کو کہا کہ وہ انتقال اقتدار کو یقینی بنانے کے لئے انہیں متفقہ صدارتی امیدوار کے طور پر قبول کرلیں۔ یحیٰی خاں نے 15 فروری 1971ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرلیا تھا لیکن بھٹو نے 11 فروری 1971ء کو انہیں کہا کہ کم از کم 6 ہفتوں تک اجلاس ملتوی کر دیں کیونکہ ابھی ان کے مجیب الرحمٰن کے ساتھ مذاکرات مکمل نہیں ہو سکے۔ جس پر یحیٰی خاں نے اجلاس کی نئی تاریخ یکم مارچ مقرر کر دی۔ بھٹو اور مجیب کے درمیان یکم مارچ تک سمجھوتہ نہ ہونے کی وجہ سے یحیٰی خاں نے قومی اسمبلی کا اجلاس دوبارہ ملتوی کر دیا اور گورنر حضرات کی جگہ صوبوں میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیئے گئے۔ گویا اس طرح یحیٰی خاں سیاستدانوں کو بتانا چاہتے تھے کہ انہیں کمزور نہ سمجھا جائے۔ یحیٰی خاں نے 25 مارچ 1971ء کو دوبارہ طلب کئے جانے والے اجلاس کو 22 مارچ 1971ء تک ملتوی کر دیا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی اور شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے پاکستان کا قومی پرچم جلانے کے بعد علیحدگی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ یحیٰی خاں نے ان اقدامات کے بعد مشرقی پاکستان میں محدود پیمانے پر فوجی اپریشن شروع کر دیا۔ اندرا گاندھی جون 1971ء میں ہی مشرقی پاکستان پر حملہ کرنا چاہتی تھیں لیکن موسمی حالات کی وجہ سے ایسا نہ کیا گیا جس کی وجہ سے سیاستدانوں کو اصلاح احوال کے لئے مزید چند ماہ کی مہلت مل گئی جسے یحیٰی خاں اور سیاستدانوں نے گنوا دیا۔ نتیجتاً مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے پر فوجی اپریشن ہوا اور 3 دسمبر 1971ء کو پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی۔ مشرقی پاکستان کے محاذ پر شروع ہونے والی یہ جنگ آہستہ آہستہ مغربی پاکستان کی طرف

بھی بڑھتی چلی گئی اور آخر کار 16 دسمبر 1971ء کو بھارتی افواج ڈھاکہ میں داخل ہوگئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اس وقت سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے امریکہ گئے ہوئے تھے۔ فوج نے جب دیکھا کہ مشرقی پاکستان اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو مغربی پاکستان پر مشتمل ایک نیا پاکستان بنانے کے لئے بھٹو کو امریکہ سے بلایا گیا جو 20 دسمبر 1971ء کی صبح اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترے۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ذوالفقار علی بھٹو کا استقبال کرنے کے لئے فوج کے علاوہ ان کے قریبی ساتھی غلام مصطفیٰ کھر بھی موجود تھے۔ مصطفیٰ کھر کار ڈرائیو کرتے ہوئے بھٹو کو سیدھا ایوان صدر لے کر گئے جہاں انتقال اقتدار کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ یحییٰ خاں نے اقتدار بھٹو کے حوالے کیا اور اس سہ پہر جب بھٹو کی کار ایوان صدر سے نکلی تو اس پر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی جنرل یحییٰ خاں کے علاوہ جنرل عبدالحمید' جنرل مٹھا' جنرل پیرزادہ' جنرل عمر' جنرل خداداد خاں اور جنرل کیانی کو ریٹائر کر دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا انداز حکومت' ضیاء کی سازش اور جمہوریت کا خاتمہ

27 دسمبر 1971ء کو جبکہ ملک ٹوٹ چکا تھا اور مشرقی پاکستان پر بھارتی افواج کی کٹھ پتلی عوامی لیگ اور مکتی باہنی کا قبضہ ہو چکا تھا' ذوالفقار علی بھٹو نے مغربی پاکستان میں نظربند شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کر کے انہیں اس بات کی دعوت دی کہ وہ متحدہ پاکستان کے صدر بن جائیں۔ تاہم شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان ہونے والے ان مذاکرات کا ایک ایک لفظ نوٹ کیا گیا تھا کیونکہ بھٹو نہیں چاہتے تھے کہ آنے والا مورخ سانحہ مشرقی پاکستان کے لئے انہیں مورد الزام ٹھہرائے۔ بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن سے دوران مذاکرات بار بار یہ سوال دہرایا کہ کیا مشرقی پاکستان کو دوبارہ پاکستان کا حصہ بنایا جاسکتا ہے اور مجیب انتہائی محتاط انداز میں مسلسل یہی کہتے رہے کہ "میں ڈھاکہ جاکر حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی کسی قسم کی رائے دینے کے قابل ہوں گا کیونکہ میں تو نظربند ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ میری نظربندی کے دوران وہاں (مشرقی پاکستان میں) کیا کچھ ہوا ہے"۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ بھٹو کے ساتھ ہونے والی ان کی گفتگو کہیں اور بھی سنی جا رہی ہے اس لئے انہوں نے کوئی ایسی بات نہ کہی جس کو بھٹو Exploit کرپاتے۔ تاہم بھٹو اور مجیب کے درمیان ہونے والی اس ملاقات کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ حکومت نے 8 جنوری 1972ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کر دیا۔ بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی شہنشاہ ایران کو دورۂ پاکستان کی دعوت دی جو 7 جنوری

1972ء کو لاڑکانہ پہنچے۔ بھٹو نے ایک نئے اور خوشحال پاکستان کی تعمیر کیلئے شاہ ایران سے مدد کی درخواست کی جس کے بعد بھٹو نے ترکی' مراکش' مصر اور شام کا دورہ کیا۔ 23 جنوری 1972ء سے 28 جنوری 1972ء تک کے اس غیر ملکی دورے کے دوران بھٹو نے دولت مشترکہ سے علیحدگی کے لئے اسلامی ممالک سے مشورے کئے اور 30 جنوری 1972ء کو انہوں نے دولت مشترکہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ امریکہ کے پاس اب سوائے اس بات کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھٹو کے کچھ عرصہ کے لئے ناز نخرے اٹھائے' لہٰذا واشنگٹن نے 19 فروری 1972ء کو پاکستان کی امداد بحال کر دی۔ اگرچہ سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد چاروں صوبوں کی سیاسی جماعتوں کو بچے کھچے پاکستان کو بہتر بنانے کے لئے مل جل کر کام کرنا چاہئے تھا لیکن سرحد اور بلوچستان میں غیر ملکی مداخلت کے باعث ہنگامے اور تخریب کاری شروع ہوگئی۔ بھٹو اس صورتحال کو سختی سے کچلنا چاہتے تھے جبکہ فوج کے سربراہ گل حسن اس پالیسی سے متفق نہ تھے جس پر بھٹو نے 3 مارچ 1972ء کو گل حسن اور ایئرمارشل رحیم خاں سے استعفیٰ لے کر انہیں فارغ کر دیا۔ اسی روز جنرل ٹکا خاں کو فوج کا سربراہ بنا دیا گیا جبکہ ائرمارشل ظفر چوہدری فضائیہ کے سربراہ بنے۔ بدلتی ہوئی بین الاقوامی صورتحال کے باعث بھٹو نے 15 مارچ 1972ء کو روس کا دورہ کیا۔ 19 اپریل 1972ء کو آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس نے بھٹو کے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کی توثیق کی اور 17 اپریل کو مارشل لاء ختم کرنے کے لئے عبوری آئین منظور کرلیا گیا جس کے باعث 21 اپریل 1972ء کو ملک سے مارشل لاء کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 29 مئی سے 10 جون کے درمیان عراق' سعودی عرب' ترکی اور ایران کا دورہ کیا جس کا مقصد بھارت کی قید سے پاکستانی فوجیوں کی رہائی کو یقینی بنانے کے لئے بھارت پر دباؤ ڈالنا تھا۔ بھٹو کی کامیاب خارجہ پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ 21 جون 1972ء کو جب پاکستانی وفد ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں بھارت گیا تو تمام اسلامی ممالک کا بھارت پر دباؤ موجود تھا کہ وہ پاکستانی قیدی رہا کرے۔ یوں 2 جولائی 1972ء کو پاکستان اور بھارت کے درمیان شملہ معاہدے کے نام سے ایک نیا سمجھوتہ طے پایا جس کے تحت جنگی قیدی واپس آنا شروع ہوگئے۔ بھٹو نے اس دوران ملک کو نیا آئین دینے اور جمہوریت بحال کرنے کے لئے اپوزیشن سے

مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھا جس کے نتیجے میں 12 اگست 1973ء کو پاکستان کا تیسرا آئین نافذ ہوا اور بھٹو کو وزیراعظم منتخب کرلیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے صدر کا عہدہ دو روز پہلے فضل الٰہی مرحوم کے حوالے کر دیا تھا' جبکہ اکتوبر 1973ء کو بھٹو امریکہ گئے۔ 15 ستمبر 1973ء میں انہوں نے مشرق وسطیٰ اور دسمبر 1973ء میں خلیجی ملکوں کا دورہ کیا۔ یکم جنوری 1974ء کو 15 نجی بینکوں اور بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا جس کے بعد اسلامی کانفرنس کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ 39 اسلامی ممالک کے سربراہ اور نمائندے 22 سے 24 فروری 1974ء کے درمیان پاکستان آئے اور تین روزہ اسلامی کانفرنس میں بیت المقدس کو آزاد کروانے اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی فضاء کو بہتر بنانے کے لئے اہم فیصلے ہوئے۔ 22 فروری 1974ء کو ہی پاکستان نے بنگلہ دیش کو منظور کیا جبکہ 30 اپریل کو آخری جنگی قیدی امیر عبداللہ خاں نیازی رہا ہو کر پاکستان پہنچے جس کے بعد بھٹو نے 11 مئی 1974ء کو چین کا دورہ کیا۔ بھٹو کے اس دورے کا مقصد بھارتی ایٹمی پروگرام کا مقابلہ کرنے کے لئے چین سے تعاون حاصل کرنا تھا۔ چین کے دورے کے بعد بھٹو کے امریکہ کے ساتھ تعلقات میں سرد مہری آگئی اور امریکی سی آئی اے کو یہ مشن سونپ دیا گیا کہ پاکستان میں بھٹو کی حکومت کو غیر مستحکم کر کے Non-Bhuttoo حکومت کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔ 31 اکتوبر 1974ء کو امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے بھٹو کو نیوکلیئر پروگرام بند کرنے کا مشورہ دیا اور انہیں دھمکی دی کہ اگر پاکستان نے ایٹمی پروگرام ترک نہ کیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ ایک بین الاقوامی سازش کے تحت متحدہ پاکستان کے دونوں مقبول سیاستدانوں (بھٹو اور مجیب) کا قتل ضروری تصور کیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن تو 15 اگست 1975ء کو ایک فوجی بغاوت میں قتل کر دیئے گئے تاہم بھٹو کے خلاف ہونے والی بغاوتوں کو متعدد مرتبہ سر اٹھانے سے پہلے ہی دبا دیا گیا۔ 29 فروری 1976ء کو ٹکا خاں کی ریٹائرمنٹ کے بعد ضیاء الحق کو فوج کا نیا سربراہ بنا دیا گیا جس کے بعد بھٹو نے عام انتخابات کرانے کے لئے اپنے ساتھیوں سے صلح و مشورے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 76-1975ء کے دوران ڈاکٹر عبدالقدیر کی خواہش کے مطابق پاکستانی سفارتخانوں اور بین الاقوامی سمگلروں کے ذریعے ایٹمی پرزوں کی خریداری کا

سلسلہ جاری رکھا جس کی خبر سی آئی اے کو بھی مل گئی جس کے باعث 10 اگست 1976ء کو جب ہنری کسنجر نے دوبارہ بھٹو سے ملاقات کی تو انہوں نے اپنی پرانی دھمکی کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر انہوں نے ایٹمی پروگرام ترک نہ کیا تو ان کے ذریعے ایک بھیانک مثال بنا دی جائے گی۔ 3 نومبر 1976ء کو جمی کارٹر امریکہ کے صدر منتخب ہوگئے۔ بھٹو کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ امریکہ ان پر وار کرے گا اس لئے انہوں نے 1978ء میں انتخابات کرانے کی بجائے مارچ 1977ء میں انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ عوامی اور فوجی حمایت حاصل کرنے کے لئے بھٹو نے انتخابات سے قبل کئی اقدامات کئے۔ 6 جنوری 1977ء کو بھٹو لاڑکانہ سے بلا مقابلہ منتخب ہوگئے جبکہ 31 جنوری 1977ء کو ضیاء الحق نے پہلی مرتبہ مسلح افواج کا جشن منایا۔ 7 مارچ 1977ء کو ہونے والے عام انتخابات میں بھٹو کو واضح کامیابی حاصل ہوگئی لیکن پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات کے نتائج مسترد کر دیئے اور ملک میں احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ امریکی سی آئی اے نے قبل ازیں بنگلہ دیشی عوام میں یہ بات پھیلانے کی کوشش کی کہ شیخ مجیب کے قتل میں بھٹو کا ہاتھ ہے جنہوں نے کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری عبدالحق کی درخواست پر شیخ مجیب الرحمٰن کو قتل کروانے کے لئے بھاری رقوم اور اسلحہ فراہم کیا تھا۔ اس الزام کا مقصد بھٹو کو بین الاقوامی دہشت گرد ثابت کرنا تھا۔ تاہم بھٹو سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے قومی اتحاد کی احتجاجی تحریک کو شروع میں سنجیدگی سے نہ لیا اور جب حالات خراب ہوگئے اور اسلامی ممالک نے اپوزیشن اور حکومت کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی تو بھٹو مذاکرات کے آخری لمحات میں جنرل ضیاء الحق کی سازش کا شکار ہو کر اپوزیشن کے ساتھ معاہدے پر دستخط کرنے میں خاصی تاخیر کر گئے۔ جس کے باعث جنرل ضیاء الحق نے 4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی شب بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا حالانکہ ایسا کرنے سے چند گھنٹے قبل ہی انہوں نے بھٹو کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ سابق وزیراعظم اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود ضیاء الحق کے گیم پلان کو نہ سمجھ سکے۔ 5 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے قومی اسمبلی توڑ کر ملک بھر میں مارشل لاء لگا دیا۔ اسی روز صوبائی اسمبلیاں بھی توڑ دی گئیں اور آئین معطل کر دیا گیا۔ ضیاء الحق نے 15 جولائی 1977ء کو مری میں ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی اور وعدہ کیا کہ وہ

تمام سیاستدانوں کو جلد ہی رہا کر کے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دیں گے۔ 27 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے قوم سے خطاب کے دوران کہا کہ دنیا دیکھ لے گی کہ ضیاء الحق اپنے وعدوں کو پورا کرے گا اور اکتوبر 1977ء میں انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے اگلے روز 28 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے دوبارہ مفتی محمود اور بھٹو سے مذاکرات کئے اور دونوں سیاسی رہنماؤں کو خوشخبری سنائی کہ "میں سیاستدانوں کو رہا کر رہا ہوں"۔ دیگر سیاستدانوں کی طرح بھٹو کو بھی 28 جولائی 1977ء کو رہا کر دیا گیا۔ یکم اگست 1977ء کو ضیاء الحق نے محدود پیمانے پر سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی لیکن 4 اگست 1977ء کو فوج نے پولیس کے ذریعے ایف ایس ایف کے تین اہلکاروں کو نواب محمد احمد خاں کے مقدمہ قتل کی تفتیش کے سلسلے میں گرفتار کر لیا۔ 24 اگست 1977ء کو الیکشن کمیشن نے بھٹو کو تلوار اور قومی اتحاد کو ہل کا انتخابی نشان الاٹ کر دیا۔ بھٹو نے 27 اگست 1977ء کو ضیاء الحق سے ملاقات کی اور کہا کہ اکتوبر 1977ء میں انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لئے ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرنے کے لئے تیار رہیں۔ ضیاء الحق اور بھٹو کے درمیان ہونے والی اس ملاقات کے تین دن بعد تمام اپوزیشن جماعتوں نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ "بھٹو کو گرفتار کر کے ان پر غداری کا مقدمہ چلایا جائے"۔ جولائی 1977ء سے 2 ستمبر 1977ء کے درمیان ضیاء الحق نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر دیا کہ وہ انتخابات کروا کے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرنے کے وعدے پر قائم ہیں۔ حالانکہ ضیاء الحق شروع دن ہی سے الیکشن نہ کرانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ بھٹو کے خلاف اپوزیشن جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ضیاء الحق نے جنرل فیض علی چشتی کے ذریعے تمام بھٹو مخالف سیاستدانوں کو یہ تاثر دیا کہ اگر بھٹو کو گرفتار نہ کیا گیا تو وہ دوبارہ الیکشن جیت جائیں گے۔ ضیاء الحق کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا اور اپوزیشن نے انتخابات کی بجائے بھٹو کو پھانسی دلوانے میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔ نتیجتاً 3 ستمبر 1977ء کو فوج نے بھٹو کو 70 کلفٹن سے گرفتار کر کے لاہور منتقل کر دیا۔ بھٹو کی گرفتاری احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد خاں کے قتل کے سلسلے میں عمل میں آئی۔ بیگم نصرت بھٹو اور صرف چند ایک

دوسرے سیاستدان ہی جانتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ انتخابات کے بعد اگر حکومت انہیں مل گئی تو وہ ضیاء الحق کو آئین منسوخ کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیں گے۔ بھٹو کی گرفتاری کے بعد بیگم بھٹو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور 22 ستمبر 1977ء کو انہوں نے اعلان کر دیا کہ اکتوبر 1977ء میں ہونے والے انتخابات میں کامیابی کے بعد ہم ضیاء الحق کو ریٹائر کر دیں گے۔ جنرل ضیاء الحق نے بیگم صاحبہ کے بیان کے بعد ہنگامی بنیادوں پر جرنیلوں سے مشورے کر کے سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس یعقوب علی خاں کو فارغ کر دیا کیونکہ وہ مارشل لاء کے نفاذ کو غیر آئینی قرار دینے کے لئے ایک اہم رٹ پٹیشن کی سماعت کرنے والے تھے۔ یہ رٹ پٹیشن بیگم بھٹو نے دائر کی تھی۔ 29 ستمبر 1977ء کو بے نظیر بھٹو نے اوکاڑہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر ان کے والد کو پھانسی دی گئی تو پانچوں دریاؤں کا پانی سرخ ہو جائے گا۔ ضیاء الحق نے بے نظیر بھٹو کے اس بیان کے بعد انہیں نظر بند کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ جبکہ یکم اکتوبر 1977ء کو انتخابات ملتوی کر دیئے گئے۔ 9 اکتوبر 1977ء کو نواب محمد احمد خاں کے مقدمہ قتل میں بھٹو کی ضمانت منسوخ کر دی گئی۔ یہ فیصلہ دینے والے جج کا نام مولوی مشتاق حسین تھا۔ (جنہوں نے بعد ازاں انہیں پھانسی کی سزا سنائی)۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف بعدازاں جو جال بنا گیا اس کے تحت 18 اکتوبر 1977ء کو ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر جنرل اور مقدمہ قتل میں وعدہ معاف گواہ مسعود محمود نے ہائی کورٹ کو بتایا کہ نواب محمد احمد خاں کو قتل کرنے کا حکم انہیں بھٹو نے دیا تھا۔ بھٹو نے 21 اکتوبر 1977ء کو سپریم کورٹ میں بیان دیا کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے شخص کو فوج کا سربراہ بنانا ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ بھٹو نے مقدمہ قتل میں 25 جنوری 1978ء کو بند کمرے میں اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ 16 مارچ 1978ء کو بے نظیر بھٹو نے کہا کہ ہائی کورٹ ان کے والد کو پھانسی کی سزا سنانے والی ہے۔ دو روز بعد بھٹو کو سزائے موت سنا دی گئی۔ 25 مارچ 1978ء کو ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ یکم اپریل 1978ء کو سپریم کورٹ نے اپیل کی سماعت شروع کی۔ 18 مئی 1978ء کو بھٹو کو بذریعہ ہیلی کاپٹر کوٹ لکھپت لاہور سے ڈسٹرکٹ

جیل راولپنڈی منتقل کر دیا گیا جس کے بعد قومی اتحاد کے نمائندوں کی ضیاء الحق کے ساتھ ملاقاتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 5 جولائی 1978ء کو ضیاء الحق نے 22 رکنی کابینہ کا اعلان کیا جس میں سیاسی جماعتوں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ 16 ستمبر 1978ء کو فضل الٰہی چوہدری کو صدارت کے عہدہ سے فارغ کر کے ضیاء الحق خود صدر بن گئے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بھٹو کو پھانسی دینے کے خلاف اپیل صدر کے پاس ہی جائے گی۔ 23 دسمبر 1978ء کو اپیل کی سماعت مکمل ہوئی اور سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا۔ 5 فروری 1979ء کو حکومت نے اچانک تعلیمی اداروں کو غیر معینہ عرصہ کے لئے بند کر دیا جس کی محض وجہ یہ تھی کہ ضیاء الحق کو سپریم کورٹ کا وہ فیصلہ مل چکا تھا جس میں ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے بھٹو کو پھانسی کی سزا دینے کا حکم درج تھا۔ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ 6 فروری 1979ء کو سنایا۔ جس کے بعد دنیا بھر سے بھٹو کی جان بخشوانے کے لئے ضیاء الحق کے پاس اپیلیں آنا شروع ہو گئیں۔ 8 مارچ 1979ء کو ضیاء الحق نے بھٹو کی پہلی بیگم امیر بیگم کی ان کے شوہر سے ملاقات کرائی اور 23 مارچ 1979ء کو ضیاء الحق نے انتخابات کے لئے ایک اور تاریخ (17 نومبر) کا اعلان کر دیا۔ 24 مارچ 1979ء کو سپریم کورٹ نے بھٹو کے وکیل کی طرف سے پھانسی کے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست بھی مسترد کر دی۔ 26 مارچ 1979ء کو بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی۔

3 اپریل 1979ء کو بیگم بھٹو اور بے نظیر کی ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات کرائی گئی جو 3 گھنٹے جاری رہی۔ اسی روز ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلے کی توثیق کر دی اور 4 اپریل 1979ء کو سپیدہ سحر نمودار ہونے سے پہلے سابق وزیراعظم کو تختہ دار پر چھڑا دیا گیا۔ اسی روز بھٹو کی میت لاڑکانہ بھیجی گئی جہاں 10 بجے ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور ساڑھے 10 بجے انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو ذوالفقار علی بھٹو کا آخری دیدار کرنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ تاہم 6 اپریل 1979ء کو فوج کے پہرے میں بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو ایک خصوصی طیارے کے ذریعے ان کے آبائی گاؤں رتو ڈیرو جانے کی اجازت ملی۔ بھٹو خاندان کی دونوں خواتین نے بھٹو کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ مگر انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جس سازش کے تحت بھٹو

کو پھانسی دی گئی ہے اس پر عمل درآمد ابھی ختم نہیں ہوا اور اس سازش کے اگلے مرحلے میں شاہ نواز کو 1985ء اور مرتضیٰ کو 1996ء میں قتل کے بعد بھٹو کے پہلو میں سپرد خاک کیا جائے گا اور یہ دونوں خواتین ہی جنازے اٹھانے کے لئے باقی رہ جائیں گی۔

بھٹو کا قتل

4 اپریل 1979ء کی شام قدرے خوشگوار تھی کیونکہ دن میں پڑنے والی گرمی سے گھبرائے ہوئے لوگ خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہوا میں قدرے خنکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے گرمی جاتے جاتے ایک مرتبہ پھر رک جائے گی۔ زندگی کا کارواں حسب معمول رواں دواں تھا' ہر کوئی تلاش معاش کے بعد اپنے گھر جا رہا تھا اور بہت ہی کم افراد کو اس بات کا علم تھا کہ یہ شب بھٹو خاندان کے لئے بہت بھاری ہوگی کیونکہ مارشل لاء حکومت نے نواب محمد احمد خاں کو قتل کروانے کے الزام میں اس رات بھٹو کو تختہ دار پر لٹکانا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو 4 اور 5 جولائی 1979ء کی شب مارشل لاء لگنے کے بعد زیر حراست لیا گیا تھا اور اس کے کچھ عرصہ بعد انہیں نواب محمد احمد خاں کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ مولوی مشتاق حسین ہائی کورٹ کے اس فل بنچ کے سربراہ تھے جس نے بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی۔ یہ وہی مولوی مشتاق حسین ہیں جو چوہدری ظہور الٰہی کی کار پر ہونے والی فائرنگ کے دوران زخمی ہوگئے تھے جبکہ چوہدری ظہور الٰہی اور ان کا ڈرائیور نسیم اس حملے میں ہلاک ہوگئے۔ بیگم نصرت بھٹو کو فروری 1978ء میں ہی انداز ہوگیا تھا کہ ان کے شوہر کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا خصوصاً 3 فروری 1978ء کو پیپلز پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ فوجی حکومت نے ان کے شوہر کو سیاسی منظر سے ہٹانے اور پیپلز پارٹی کو Crush کرنے کے لئے تمام منصوبہ بندی مکمل کرلی ہے اس لئے اگر پی پی پی کے جانثار کارکنوں کو میدان میں نہ لایا گیا تو وقت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بیگم نصرت بھٹو کو 100

فصد یقین تھا کہ اگر ضیاء الحق نے 1978ء میں انتخابات کروا دیئے اور اقتدار کسی سیاسی جماعت (خواہ وہ پی پی مخالف جماعت ہی کیوں نہ ہو) کو منتقل ہوگیا تو نہ صرف بھٹو کی جان بچ جائے گی بلکہ اس سے جمہوری ادارے بھی تباہی سے محفوظ ہو جائیں گے۔
یہ وہی ایام ہیں جب جنرل ضیاء الحق مرحوم نے الیکشن کرانے کا جھانسہ دے کر بھٹو مخالف قوتوں کو اپنا ہمنوا بنا رکھا تھا اور اس بات کی توقع کی جا رہی تھی کہ آنے والے چند ماہ کے اندر ملک بھر میں انتخابی سرگرمیاں شروع ہو جائیں گی۔ بیگم نصرت بھٹو نے 3 فروری 1978ء کو ضیاء الحق سے مطالبہ کیا کہ وہ 2 ماہ کے اندر انتخابات کرائیں۔ ضیاء الحق نے بیگم صاحبہ کے مطالبے کا بنظر غائر جائزہ لیا اور سیاستدانوں کی آمدن کے گوشواروں کی چھان بین کرنے والے سرکاری حکام نے 89 سیاسی رہنماؤں کے معاملات نااہل قرار دینے والے ٹریبونل کے حوالے کر دیئے۔ بیگم نصرت بھٹو کا اس ضمن میں نام سرفہرست تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ جنرل ضیاء الحق کی سربراہی میں 1977ء کو بننے والی فوجی حکومت بھٹو خاندان کو سیاست سے آؤٹ کرنا چاہتی ہے۔ ان حالات میں جب ذوالفقار علی بھٹو پابند سلاسل تھے اور فوجی جنتا یہ طے کر چکی تھی کہ بیگم نصرت بھٹو کو سیاسی عمل سے دور رکھنا ہے تو بھٹو کے لئے سوائے اس بات کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی صاحبزادی بے نظیر بھٹو کو میدان میں لاتے۔ اس سلسلے میں بھٹو مرحوم نے اپنے وکیل یحییٰ بختیار کے ذریعے اپنی اہلیہ کو پیغام دیا کہ وہ "پنکی" (بے نظیر) کو سیاسی دورے کروائیں۔ چنانچہ بھٹو مرحوم کی ہدایات کی روشنی میں بے نظیر بھٹو نے 14 فروری 1978ء کو سندھ کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ چونکہ حکومت کی طرف سے عوامی اجتماعات سے خطاب پر پابندی تھی اس لئے بے نظیر نے اپنے اس دورے کے دوران چار دیواری کے اندر اجتماعات سے خطاب کیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے 14 فروری سے 17 فروری 1978ء تک قدرے صبر سے کام لیا کیونکہ انہیں آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جینس سے بھٹو خاندان کی سیاسی سرگرمیوں کی مسلسل تفصیلات مل رہی تھیں اور ان انٹیلی جینس رپورٹس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگر بے نظیر بھٹو کو فوری طور پر گرفتار نہ کیا گیا تو وہ عوام کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ بے نظیر بھٹو کے دورۂ سندھ سے ذوالفقار علی بھٹو کو بھی باخبر رکھا جا رہا تھا۔ بھٹو کو 18 فروری 1978ء کا

بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ اس روز بے نظیر نے سندھ کے ایک اہم علاقے نواب شاہ میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کا منصوبہ بنا رکھا تھا لیکن ایک روز قبل ہی فوجی حکام نے انہیں سندھ سے کراچی بھیج دیا اور ان کو سختی سے کہا گیا کہ وہ کراچی کی شہری حدود سے باہر نہ نکلیں۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک تو سیاسی سرگرمیوں پر پابندی رہی لیکن سیاستدانوں کی رہائی کے بعد عوام کے دلوں سے مارشل لاء کا خوف نکلنا شروع ہوگیا کیونکہ ضیاء الحق نے سیاستدانوں کو قدرے چھوٹ دے رکھی تھی اور وہ یہ تاثر دیئے ہوئے تھے کہ ان کا اقتدار سے چمٹے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں اور مناسب وقت پر انتخابات کروا دیئے جائیں گے۔ فوج اور سول کی انٹیلی جینس ایجنسیوں کے ذریعے آرمی ہاؤس پہنچنے والی انٹیلی جینس رپورٹس سے فروری 1978ء میں ہی واضح ہوگیا تھا کہ عوام کی بڑی تعداد اب بھی بھٹو خاندان، خصوصاً" ذوالفقار علی بھٹو سے محبت کرتی ہے اور انتخابات کے انعقاد کے بعد اگر پی پی اکثریتی جماعت کے طور پر سامنے نہ بھی آسکی تو بہرحال اسے مرکز اور صوبوں میں اس قدر نشستیں ضرور مل جائیں گی کہ وہ حکمران وقت کو بلیک میل کر سکے۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے ضیاء الحق نے 22 فروری 1978ء کو سبی میں عوامی اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کی حکومت اس وقت انتخابات کروائے گی جب وہ اور ان کے ساتھی مثبت نتائج کے بارے میں پر یقین ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ "مثبت نتائج" سے ضیاء الحق کی مراد ان جماعتوں کی کامیابی تھی جن کی وہ سرپرستی کر رہے تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق 1978ء میں "نان بھٹو" یعنی بھٹو خاندان کے بغیر بننے والی حکومت کے بارے میں اپنے رفقاء سے صلاح و مشورے میں مصروف رہے۔ ان کی کافی حد تک مشکل خود بھٹو نے آسان کر دی تھی کیونکہ اپنے دیرینہ ساتھیوں پر بھروسہ کرنے کی بجائے بھٹو نے اپنی اہلیہ اور صاحبزادی کو پی پی پی کی قیادت سونپ دی جس سے سینئر پارٹی لیڈر ناراض ہوگئے۔ خصوصاً" غلام مصطفیٰ جتوئی اور مولانا کوثر نیازی نے اس پر سخت احتجاج کیا اور انہوں نے کھل کر اعلان کیا کہ وہ بھٹو خاندان کی قدر ضرور کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک خاندان کی اجارہ داری کو تسلیم کرلیا جائے۔ صرف جتوئی اور کوثر

نیازی ہی ان میں شامل نہ تھے جو بھٹو کی جگہ لینے کے لئے بے چین تھے بلکہ اس فہرست میں عبدالحفیظ پیرزادہ' معراج محمد خاں' ملک معراج خالد اور غلام مصطفیٰ کھر بھی شامل تھے۔ مولانا کوثر نیازی نے 24 فروری 1978ء کو بیگم نصرت بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی صاحبزادی بے نظیر کو پارٹی پر مسلط کرنے کی روش ترک کر دیں کیونکہ یہ پارٹی کے لئے تباہ کن ہو گا لیکن اپنے خاوند سے مشورے کے بعد بیگم صاحبہ نے پارٹی کے سینئر رہنماؤں کے احتجاج کو مسترد کر دیا۔

چونکہ فروری 1978ء میں سیاسی حلقوں میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ مولوی مشتاق حسین مارچ 1978ء میں بھٹو کو سزا سنانے والے ہیں' لہٰذا 8 مارچ 1978ء کو پہلے مرحلے میں پی پی پی کی صوبائی لیڈر شپ کو گرفتار کر لیا گیا جبکہ بیگم نصرت بھٹو کو لاہور میں 12 مارچ 1978ء کو حراست میں لیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ 16 مارچ 1978ء کو ہی لکھ لیا تھا اور 17 مارچ 1978ء کو ہائی کورٹ کا یہ لکھا ہوا فیصلہ آرمی ہاؤس میں ضیاء الحق کی ٹیبل پر موجود تھا۔ نواب محمد احمد خاں قتل کیس کی سماعت مکمل ہونے پر بے نظیر بھٹو نے دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ مولوی مشتاق حسین ان کے والد کو سزائے موت دینا چاہتے ہیں اور ان کے یہ خدشات 18 مارچ 1978ء کی صبح 8 بجکر 20 منٹ پر اس وقت درست ثابت ہوئے جب بھٹو کو نواب محمد احمد خاں کے قتل کا مجرم قرار دے کر موت کی سزا سنا دی گئی۔ بیگم نصرت بھٹو 18 مارچ 1978ء کو لاہور کی ایک کوٹھی پر نظربند تھیں اور اپنے شوہر کو سنائی جانے والی سزا ان پر بجلی بن کر گری۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ اگر ہائی کورٹ میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا تو سپریم کورٹ ان کے ساتھ انصاف کرے گی۔ اس کے علاوہ بیگم صاحبہ کو اپنے دونوں صاحبزادوں کی کوششوں سے بھی کافی تسلی تھی جو مسلسل اسلامی ممالک کے دورے پر تھے اور اپنے والد کی جان بچانے کے لئے اسلامی ممالک کے سربراہوں کے ذریعے ضیاء الحق پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائے جانے کے چند گھنٹوں کے اندر ہی ملک بھر سے سینکڑوں کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا جبکہ بھٹو کو 19 مارچ 1978ء کو پھانسی کی کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے خود کو اس وقت بہت تنہا محسوس کیا کیونکہ فوجی حکومت نے ان کی صاحبزادی

کو 70 کلفٹن پر نظربند کر رکھا تھا جبکہ ان کے دونوں صاحبزادے مرتضیٰ اور شاہ نواز دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ "میں اپنے والد سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں' مجھے جلد از جلد لاہور شفٹ کیا جائے" بے نظیر بھٹو نے 70 کلفٹن سے فوجی حکام کو 20 مارچ 1978ء کو ایک درخواست بھجوائی۔ سندھ کے ہوم سیکرٹری نے بے نظیر کی یہ درخواست 21 مارچ 1978ء کو ضیاء الحق کے پاس بھیج دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد بے نظیر بھٹو کی درخواست ان کے سامنے آئی تھی۔ ضیاء الحق دو روز تک فیصلہ نہ کر پائے کہ بے نظیر بھٹو کو کراچی سے لاہور منتقل کیا جائے یا نہیں کیونکہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی۔ کافی سوچ و بچار کے بعد ضیاء الحق نے بے نظیر کو اپنے والد سے ملاقات کی اجازت دے دی جنہیں ایک طیارے کے ذریعے 25 مارچ 1978ء کی صبح کراچی سے لاہور لایا گیا اور اسی روز ان کی بھٹو سے ملاقات ہوئی۔ بھٹو مرحوم نے 25 مارچ 1978ء کو بے نظیر کو اپنا جانشین مقرر کیا اور انہیں سیاسی امور کے بارے میں اپنے تجربے کی روشنی میں گائیڈ کیا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ یحییٰ بختیار اور ان کے رفقاء آج (25 مارچ) سپریم کورٹ میں لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر رہے ہیں۔ بے نظیر کو اسی روز کراچی بھیج دیا گیا۔ سپریم کورٹ نے بھٹو کی درخواست پر یکم اپریل 1978ء کو مقدمے کی سماعت شروع کی۔ یہ وہ ایام ہیں جب بیگم نصرت بھٹو لاہور اور بے نظیر کراچی میں نظربند تھیں اور انہیں ہر وقت یہی خدشہ رہتا تھا کہ کہیں بھٹو کو تختہ دار پر نہ لٹکا دیا جائے۔ فوج کی تمام تر نگرانی کے باوجود شاہ نواز اور مرتضیٰ کا دمشق سے کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی پیغام بیگم نصرت بھٹو یا بے نظیر تک پہنچ ہی جایا کرتا تھا اور ان پیغامات سے ماں بیٹی کو کافی تسلی ہوتی تھی۔ مرتضیٰ بھٹو نے 1977ء کے بعد افغانستان' لیبیا' شام' سعودی عرب' متحدہ عرب امارات اور دیگر اسلامی ممالک کا متعدد مرتبہ دورہ کیا۔ ان کے یہ دورے خاصے کامیاب رہے کیونکہ اسلامی ممالک کی انٹیلی جینس ایجنسیوں اور حکومتوں نے انہیں ہر قسم کی مدد فراہم کی۔ مرتضیٰ کا منصوبہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح کوٹ لکھپت جیل لاہور سے ان کے والد کو جیل توڑ کر آزاد کروا لیا جائے۔ لیکن ان کے یہ منصوبے قبل از وقت ہی فوجی حکام تک پہنچ گئے اور بھٹو کو 18 مئی 1978ء کو کوٹ

لکھپت جیل سے ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دست راست مولانا کوثر نیازی اور کمال اظفر (جنہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں بے نظیر بھٹو نے بعد ازاں 96-1993ء میں سندھ کا گورنر بنایا) ان ایام میں جنرل محمد ضیاء الحق کے زیر اثر تھے اور پاکستان پیپلز پارٹی کو ہائی جیک کرنے کے لئے انہوں نے 19 مئی 1978ء کو پی پی پی کی وہ تنظیم توڑ دی جو بھٹو نے قائم کی تھی اور پارٹی کی تنظیم نو کر کے مولانا کوثر نیازی کو اس کا چیئرمین اور کمال اظفر کو سیکریٹری جنرل چن لیا گیا۔ اسی روز مولانا کوثر نیازی نے جنرل ضیاء الحق سے بھی ملاقات کی گویا حکومتی حلقوں کی طرف سے بھرپور کوشش کی گئی کہ کسی نہ کسی طرح پی پی پی کو بھٹو خاندان کے تسلط سے آزاد کروا لیا جائے۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر ابھی تک نظربند تھیں اور انہیں گھر کی چار دیواری میں قید کرنے کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ "نان بھٹو" قیادت کو سامنے لاکر عوام کو تاثر دیا جائے کہ پیپلز پارٹی پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بیگم نصرت بھٹو اور ان کی صاحبزادی اس ساری صورتحال کو انتہائی بے بسی سے دیکھ رہی تھیں اور انہوں نے جیل حکام کو متعدد مرتبہ درخواست دی کہ وہ بھٹو سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ بے نظیر کو 2 جون 1978ء کی صبح کراچی سے راولپنڈی لایا گیا جہاں بھٹو نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ پارٹی کی تنظیم نو کے لئے منصوبہ بندی کرتی رہیں کیونکہ مولانا کوثر نیازی وغیرہ پارٹی کو کنٹرول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ جیل حکام نے 5 جون 1978ء کو بیگم نصرت بھٹو کی ان کے شوہر سے ملاقات کرائی۔ اس کے لئے وہ راولپنڈی گئیں۔ بیگم نصرت بھٹو کے پاس بعض ایسے پیغامات تھے جو انہیں مرتضیٰ اور شاہ نواز نے اپنے جانثار ساتھیوں کے ذریعے فوجی حکام کی آنکھوں میں دھول ڈال کر ان تک پہنچائے تھے۔ بیگم صاحبہ جیل پہنچیں تو فوجی انتظامیہ نے ان کی تلاشی لینے کی کوشش کی۔ جس پر وہ غصے میں آگئیں کیونکہ تلاشی لئے جانے کی صورت میں بہت سے راز فاش ہو سکتے تھے' لہٰذا انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ شوہر سے ملاقات ہی نہ کی جائے۔ مرتضیٰ بھٹو کا بیرون ملک سے ان ایام میں راؤ رشید سے بھی رابطہ تھا جنہیں 5 جون 1978ء کو ان کی اہلیہ سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ راؤ رشید اس روز ڈسٹرکٹ جیل اٹک بھیج دیے گئے۔

بے نظیر بھٹو نے اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے اپنی نظربندی کو ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ خوش قسمتی سے ان کی درخواست کی سماعت جسٹس فخرالدین جی ابراہیم اور جسٹس جمال میاں پر مشتمل بنچ نے کی۔ جسٹس فخرالدین جی ابراہیم اور ذوالفقار علی بھٹو پرانے دوست تھے اور دونوں کراچی کے ایک ہی علاقے میں وکالت کرتے رہے تھے۔ دو ججوں پر مشتمل اس بنچ نے 14 جون 1978ء کو بے نظیر کی نظربندی کو غیر قانونی قرار دے کر انہیں رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ جس پر ضیاء الحق نے پی پی پی کی قیادت کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ ان ججوں کی فہرست بھی تیار کروائی جو بھٹو یا ان کے خاندان کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ ایسے ججوں کو مختلف طریقوں سے انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ ضیاء الحق نے پاکستان قومی اتحاد کی قیادت کو اقتدار کا جھولا دینے کیلئے شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ انہوں نے پہلے 16 اور پھر 22 جون 1978ء کو قومی اتحاد کی مرکزی قیادت سے مذاکرات کئے اور ان پر واضح کیا کہ وہ سیاست سے مرحلہ وار پابندیاں اٹھانا چاہتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں سیاستدانوں کو محدود سطح پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی جبکہ دوسرے مرحلے میں انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہونے پر تمام سیاستدانوں کو عوامی اجتماعات منعقد کرنے کا حق دے دیا جائے گا۔ پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی قیادت دراصل جولائی 1978ء تک کافی حد تک دلبرداشتہ ہو چکی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ضیاء الحق نے جولائی 1977ء کو مارشل لاء لگاتے وقت وعدہ کیا تھا کہ وہ 90 روز کے اندر انتخابات کروانے کے بعد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیں گے لیکن جب ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود الیکشن نہ ہو سکے تو جماعت اسلامی' جے یو آئی' تحریک استقلال اور مسلم لیگ سمیت تمام اپوزیشن جماعتیں دلبرداشتہ ہوگئیں۔ دوسری جانب بیگم نصرت بھٹو اس بات کے لئے کوشاں تھیں کہ کسی نہ کسی طرح ان کی پاکستان قومی اتحاد سے صلح ہو جائے تاکہ ضیاء الحق پر دباؤ ڈال کر مارشل لاء ختم کروا دیا جائے۔

مارشل لاء کی پہلی سالگرہ پر بننے والی اس کابینہ میں درج ذیل زعماء شامل تھے۔ غلام اسحاق خاں' مصطفیٰ گوکل' محمد علی ہوتی' جنرل فیض علی چشتی' جنرل غلام حسن خاں' جنرل حبیب اللہ خاں' محمود ہارون' فدا محمد خاں' چوہدری ظہور الٰہی' میاں زاہد

سرفراز، خواجہ محمد صفدر، جمل سید میاں، شریف الدین پیرزادہ، شہزادہ محی الدین، گل
محمد جوگیزئی، اے کے بروہی، محمد خان جونیجو، محمد رہی، جاوید ہاشمی، آغا شاہی، بیگم
وقارالنساء نون اور ایم ڈی حبیب، لیکن قومی اتحاد کے چوٹی کے رہنما کابینہ میں شامل نہ
ہوئے۔ 8 جولائی 1978ء کو بیگم نصرت بھٹو نے راولپنڈی میں اپنے شوہر سے جیل کی
کوٹھری میں ملاقات کی۔ بھٹو نے اپنی اہلیہ کو بتایا کہ وہ اپنے وکلاء کی کارکردگی سے
مطمئن نہیں ہیں۔ 24 جولائی 1978ء کو جب سپریم کورٹ میں بھٹو کی اپیل پر مقدمے
کی سماعت جاری تھی، حکومت نے قرطاس ابیض جاری کر دیا جس کا مقصد بھٹو کو
بدعنوان اور ظالم ثابت کرنا تھا۔ پاکستان قومی اتحاد میں شامل جماعتوں میں سے اکثریت
نے 5 جولائی 1978ء کو بننے والی کابینہ میں محض اس لئے شمولیت اختیار نہیں کی تھی کہ
ضیاء الحق جرنیلوں کو بھی کابینہ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس دوران ضیاء الحق کا تختہ
الٹنے کے لئے سازش بھی ہوئی اور انہیں یہ بھی پتہ چلا کہ بعض جرنیل حکومتی عہدوں
کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کے خلاف ایک گروپ قائم کر رہے ہیں۔ چنانچہ ضیاء الحق نے
بھٹو کو پھانسی دینے سے قبل سیاستدانوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے 23 اگست 1978ء کو
مکمل طور پر سول کابینہ کا اعلان کر دیا اور اس موقع پر انہوں نے کہا کہ نئے انتخابات
اکتوبر 1979ء تک کروا دیئے جائیں گے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی دراصل یہ بھی ایک
چال تھی۔ وہ بھٹو کو پھانسی دینے تک سیاستدانوں کی مخالفت مول نہیں لینا چاہتے تھے۔
اس کے ساتھ ساتھ ضیاء الحق نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو پیغامات بھجوانے کا سلسلہ بھی
جاری رکھا۔ جتوئی ان دنوں بھٹو سے سخت نالاں تھے کیونکہ 25 سالہ بے نظیر بھٹو نے
پیپلزپارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاسوں کی صدارت کرنا شروع کر دی تھی اور اس
کے علاوہ پارٹی کی شریک چیئرپرسن بن چکی تھیں۔ مولانا کوثر نیازی نے کئی مرتبہ
کوشش کی کہ جتوئی ان کے ساتھ مل جائیں لیکن سیاسی امور سے قدرے زیادہ آگاہ
ہونے کے باعث جتوئی نے فوری طور پر بھٹو کی مخالفت مول نہ لی مگر ستمبر 1978ء میں
جب بے نظیر نے سیاسی آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرحد کا دورہ کیا تو ضیاء الحق نے
ایک نیا مارشل لاء آرڈر جاری کیا جس کے تحت سیاسی جماعتوں کو تنبیہہ کی گئی کہ وہ
سیاسی سرگرمیوں میں صرف اس وقت حصہ لیں جب ان کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس

ہو رہا ہو اور اس قسم کے اجلاسوں کا بند کمروں میں انعقاد ضروری قرار دے دیا گیا۔
جتوئی نے دو مرتبہ بھٹو کو جیل میں پیغام بھیجا کہ وہ انہیں پارٹی کو آرگنائز کرنے کا موقع
دیں لیکن بھٹو نے ایسا نہ کیا جس پر جتوئی نے 15 ستمبر 1978ء کو پی پی پی سندھ کے
صوبائی صدر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور یہی وہ شام تھی جب ضیاء الحق نے
فضل الٰہی چوہدری کی جگہ 16 ستمبر 1978ء کو پاکستان کا صدر بننے کی تیاریاں مکمل کر
رکھی تھیں۔ ضیاء الحق کو دراصل خدشہ تھا کہ اگر سپریم کورٹ نے بھٹو کو دی جانے
والی پھانسی کی سزا برقرار رکھی اور اس کے بعد بھٹو خاندان نے رحم کی اپیل دائر کی تو
کہیں فضل الٰہی چوہدری بھٹو کو دی جانے والی سزائے موت معاف نہ کر دیں۔ مستقبل
پر نظر رکھنے والے ضیاء الحق نے اس طرح 16 ستمبر 1978ء کو جب صدر مملکت کا عہدہ
سنبھالا تو صورتحال یہ تھی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔
سردار فاروق احمد خاں لغاری ان کے جانثار ساتھیوں میں شامل تھے اور 24 ستمبر 1978ء
کو لغاری ہاؤس میں پارٹی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے بے نظیر بھٹو نے انکشاف کیا
کہ راولپنڈی جیل میں دوران ملاقات ایک مرتبہ ان کے والد نے قرآن پاک پر مجھ سے
حلف لیا تھا کہ میں ملک کے وسیع تر مفاد میں پارٹی کی قیادت سنبھال کر مارشل لاء کے
خلاف جدوجہد جاری رکھوں گی۔ اگرچہ بے نظیر بھٹو نے آنے والے دنوں میں اپنے
دیرینہ ساتھیوں کو نظرانداز کر کے مارشل لاء کے حامی عناصر کو پارٹی میں اہم عہدوں
سے نوازا لیکن 1978ء میں صورتحال یہ تھی کہ پی پی پی کے رہنما اور کارکن حکومت
کی سخت ہدایات کے باوجود ان کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کرتے اور شاید ہی کوئی
ایسا میزبان ہو جس کو حکومت نے جرمانہ یا سزا نہ دی ہو۔ 14 اکتوبر 1978ء کو جب بے
نظیر پنجاب کے دورے پر تھیں، مارشل لاء حکام نے انہیں گرفتار کرلیا جبکہ ساتھ ہی
سردار فاروق لغاری اور ڈاکٹر غلام حسین بھی دھر لئے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بے
نظیر 15 اکتوبر 1978ء کو مارشل لاء کے خلاف عوامی جدوجہد کا آغاز کرنے والی تھیں۔
اگرچہ بے نظیر بھٹو جانتی تھیں کہ جتوئی اور کوثر نیازی وغیرہ ان کے لئے زیادہ مشکلات
پیدا نہیں کر سکیں گے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود تھی کہ بے نظیر
کو پارٹی کے سینئر رہنماؤں کا تعاون حاصل نہ تھا اور مولانا کوثر نیازی نے 3 نومبر 1978ء

کو پی پی پی کے دھڑے کا نام پروگریسو پیپلز پارٹی رکھ لیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ایک
طرف ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل زیر التواء تھی۔ جب ہائی کورٹ کے فیصلے کے
سپریم کورٹ نے بھٹو کیس کی سماعت شروع کی تو فل بنچ میں 9 جج شامل تھے
سے جسٹس قیصر خاں 30 جولائی 1978ء کو ریٹائر ہوگئے جبکہ چیف جسٹس شیخ انوار
نے 4 دسمبر 1978ء کو اعلان کیا کہ بنچ میں شامل ایک معزز رکن جسٹس وحیدالدین بیمار
ہیں اور ان کی آواز اور بات میں خرابی اور چال میں لڑکھڑاہٹ ہے اس لئے مقدمے
کی سماعت اب 7 جج کریں گے۔ جس پر بھٹو نے راولپنڈی میں کہا کہ ملک کے ایک
وزیراعظم (لیاقت علی خاں) کو اسی شہر میں قتل کر دیا گیا لیکن کسی نے ایف آئی آر تک
درج نہ کی جب نواب محمد احمد خاں مقدمہ قتل میں جبکہ کیس داخل دفتر ہو چکا تھا'
انہیں ایک جھوٹے مقدمے میں الجھا دیا گیا ہے۔ "مجھے اب پھانسی بھی دے دی گئی تو
مجھے اس کی کوئی فکر نہیں' میں جانتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا لیکن وقت ثابت
کرے گا کہ میں بے گناہ تھا"۔ سپریم کورٹ نے 23 دسمبر 1978ء کو مقدمے کی سماعت
مکمل کرنے کے بعد فیصلہ محفوظ کرلیا۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی عادت تھی کہ وہ اپنی سالگرہ کے موقع پر لاڑکانہ میں
ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کرتے تھے جس میں ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کو مدعو کیا جاتا۔
بھٹو چونکہ خود بھی شکار کے شوقین تھے اس لئے وہ خصوصی طور پر اس بات کا اہتمام
کرتے کہ ان کے دوست شکار سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن 6 جنوری 1979ء کو ان کی
سالگرہ کے موقع پر صورتحال یکسر طور پر مختلف تھی۔ وہ لاڑکانہ کی شکار گاہوں یا بڑی
حویلی کی بجائے پھانسی کی کوٹھری میں بند تھے اور ان کی اہلیہ اور بیٹی کو جیل حکام نے ان
کی سالگرہ کے موقع پر ملاقات کی اجازت نہ دی۔ جنرل ضیاء الحق اور عدلیہ کے درمیان
ان ایام میں کس قدر خوشگوار تعلقات موجود تھے اس کی ایک مثال مولوی مشتاق حسین
اور دوسری جسٹس انوارالحق تھے۔ مولوی مشتاق نے جب بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی تو
ضیاء الحق اس فیصلے سے پہلے ہی آگاہ تھے جبکہ شیخ انوارالحق نے 6 فروری 1979ء کو
نواب محمد احمد خاں مقدمہ قتل میں لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے کے خلاف بھٹو کی اپیل
مسترد کرنے کے متعلق جو فیصلہ پڑھ کر سنایا اس سے ضیاء الحق 5 فروری 1979ء کو ہی

آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مارشل لاء حکام نے 5 فروری 1979ء کو ہی بیگم نصرت بھٹو
کو نظر بند کر دیا اور ملک بھر کے تمام تعلیمی ادارے تا حکم ثانی بند کر دیئے گئے۔ یہ
اقدامات کسی طوفان کا پیش خیمہ تھے اور بھٹو خاندان کی خواتین اس سے اچھی طرح
آگاہ تھیں۔

بیگم نصرت بھٹو کو جب 6 فروری 1979ء کو اطلاع ملی کہ سپریم کورٹ نے ان
کے شوہر کی اپیل مسترد کر دی ہے تو انہوں نے انتہائی جذباتی انداز میں ضیاء الحق کو برا
بھلا کہا اور وہ بار بار اپنے چہرے پر تھپڑ مارتی رہیں۔ ان کی اس جذباتی کیفیت سے جنرل
ضیاء الحق کو مطلع کیا گیا تو انہوں نے 7 فروری 1979ء کو جیل حکام کو اس بات کی
اجازت دی کہ وہ بیگم صاحبہ کی بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات کروا دیں۔ 8 فروری
1979ء کو نصرت بھٹو نے اپنے شوہر سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر تیار کیا کہ وہ
سپریم کورٹ میں نظرثانی کی درخواست دائر کریں۔ بھٹو اس بات کے حق میں نہ تھے
کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ضیاء الحق نے ججوں کو دباؤ میں ڈال کر فیصلے کروانے کا سلسلہ
شروع کر رکھا ہے اس لئے اپیلوں کے ذریعے انہیں انصاف نہیں ملے گا۔ لیکن یحیٰی
بختیار کے اصرار پر وہ راضی ہوگئے کیونکہ پی پی پی کی حکمت عملی یہ تھی کہ نظرثانی کی
اپیل دائر کر کے کچھ وقت حاصل کرلیا جائے اور پھر ملکی اور بین الاقوامی حمایت سے
ضیاء الحق کو اس بات پر تیار کیا جائے کہ وہ ان کی جان بخشی کر دیں۔ یحیٰی بختیار کو یقین
تھا کہ ضیاء الحق عالمی دباؤ کے باعث بھٹو کی سزا کو عمرقید میں تبدیل کر دیں گے۔ ایک
طرف یہ صورتحال تھی کہ بھٹو خاندان کے افراد سابق وزیراعظم کی جان بچانے کے
لئے سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھے تو دوسری طرف اپوزیشن کا رویہ یہ تھا کہ وہ ضیاء
الحق کو مبارکبادیں دینے اور حلوے تقسیم کرنے میں مصروف تھی۔ پیرپگاڑا نے کہا "
بھیڑیئے سے جس قدر جلدی نجات حاصل کرلی جائے' اسی قدر بہتر ہوگا"۔ بے نظیر بھٹو
ان دنوں 70 کلفٹن پر نظر بند تھیں۔ اس مرتبہ ضیاء الحق نے انہیں اپنے والد سے
ملاقات کرنے کی اجازت نہ دی کیونکہ بھٹو ہر ملاقات میں اپنی صاحبزادی کو سیاسی اسرار و
رموز سے آگاہ کرتے تھے۔ البتہ بھٹو کی پہلی بیگم امیر بیگم کو اپنے شوہر سے ملاقات
کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ امیر بیگم 8 مارچ 1979ء کو پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنے

شوہر کے قریب بیٹھ کر زارو قطار روتی رہیں۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے 23 مارچ 1979ء کو ترپ کارڈ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ عام انتخابات اس سال 17 نومبر 1979ء کو منعقد ہوں گے۔ دراصل اس فیصلے کے ذریعے ضیاء الحق یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو کا منظر عام سے ہٹ جانا اپوزیشن کے اپنے حق میں بہتر ہے۔ 24 مارچ 1979ء کو شیخ انوار الحق نے بطور چیف جسٹس سپریم کورٹ محض 10 سیکنڈ میں بھٹو کی نظرثانی کی اپیل کو مسترد کر دیا۔ ججوں کا رویہ اپنی جگہ پر لیکن بھٹو کے وکلاء نے ان کا مقدمہ کس قدر دلچسپی اور جانفشانی سے لڑا اس کی ایک مثال عبدالحفیظ پیرزادہ ہیں۔ جن کا عشق ان دنوں عروج پر تھا' جن دنوں بھٹو پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنی زندگی کے فیصلے کے منتظر تھے۔ 24 مارچ 1979ء کو جب سپریم کورٹ نے بھٹو کو دی جانے والی سزائے موت کے فیصلے کو برقرار رکھا تو اس روز عبدالحفیظ پیرزادہ نے نئی شادی کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پیرزادہ کی شادی کی خبر بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر سے ملی' جنہوں نے 26 مارچ 1979ء کو ان سے ملاقات کی۔ بھٹو مرحوم کی یہ ملاقات ان تمام ملاقاتوں سے قدرے مختلف تھی جو وہ قبل ازیں اپنے اہل خانہ سے کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ضیاء الحق انہیں زندگی سے محروم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور انہیں اس بات کا بھی دکھ تھا کہ ان کی میت کو کندھا دینے کے لئے خاندان کی روایات کے برعکس ان کے دونوں صاحبزادے ملک میں موجود نہیں ہوں گے۔ "مرتضیٰ اور شاہ نواز سے کہو کو وہ پاکستان نہ آئیں"۔ بھٹو نے اپنی اہلیہ کو مشورہ دیا کیونکہ شاہ نواز نے مارچ 1979ء میں پاکستان لبریشن آرمی کے نام سے ایک گوریلا تنظیم قائم کرلی تھی جس کے روح رواں مرتضیٰ بھٹو تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو جانتے تھے کہ ان کے صاحبزادے جس کام میں ہاتھ ڈال چکے ہیں وہ خطرناک ہے اور مارشل لاء حکام ان کو نہیں چھوڑیں گے۔ مارشل لاء حکام نے 31 مارچ 1979ء کو بھٹو کی ان کے اہل خانہ کے ساتھ آخری ملاقاتیں کروانے کا سلسلہ شروع کیا اور بھٹو کی بہن شیر بانو امتیاز نے اپنے بھائی کی جان بخشی کے لئے ضیاء الحق سے رحم کی اپیل کر دی۔ ضیاء الحق نے کیم اپریل سے 3 اپریل 1979ء تک کا عرصہ انتہائی بے چینی کی کیفیت میں گزارا کیونکہ بھٹو کو پھانسی دینے کے اقدام سے نہ صرف ا سطح پر بلکہ غیر ملکی سطح پر بھی ردعمل ظاہر ہو سکتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر

کی 3 اپریل 1979ء کو بھٹو سے آخری ملاقات کرائی گئی۔ دونوں خواتین جیل میں سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے تین گھنٹے تک زاروقطار روتی رہیں اور بھٹو انہیں بار بار حوصلہ دیتے رہے' حالانکہ مسلسل ذہنی اور جسمانی اذیت کے باعث ان کی اپنی حالت زیادہ بہتر نہ رہی تھی۔ ان کا وزن خاصا کم ہو چکا تھا۔ بھٹو خاندان کے دو افراد (مرتضیٰ اور شاہ نواز) ہزاروں میل دور اس رات جس ذہنی تکلیف اور صدمے سے دوچار تھے اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کیونکہ کرنل قذافی کے توسط سے انہیں پتہ چل چکا تھا کہ آج رات ان کے والد کو پھانسی دے دی جائے گی۔ اسلام آباد کے تمام سفارتخانوں کو 3 اپریل 1979ء کی شام علم تھا کہ ضیاء الحق نے بھٹو کی رحم کی اپیل مسترد کر دی ہے اور ان کا انجام قریب ہے اور اس صورتحال سے اگر کوئی بے خبر تھا تو وہ "عوام" تھے---- وہی عوام جو ذوالفقار علی بھٹو کے تاریخی جلسوں اور ان کے خلاف ہونے والے تاریخی مظاہروں میں شرکت کر چکے تھے۔ ضیاء الحق نے 2 اپریل 1979ء کو انٹیلی جنس رپورٹوں کا مطالعہ کیا جو عوام کے متوقع ردعمل کے حوالے سے تیار کی گئی تھیں۔ 3 اپریل 1979ء کی شام لاہور میں اچانک اس وقت بے چینی پھیل گئی جب شہر میں خصوصی ضمیمے فروخت ہونا شروع ہوگئے کہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ یہ ضمیمے خصوصی طور پر ریلوے اسٹیشن لاہور' لاری اڈے اور دیگر اہم مقامات پر تقسیم کئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے لیکن قدرے سمجھدار افراد نے اخبارات کے خصوصی ضمیمے کو دیکھ کر اس بات پر ضرور حیرت کی کہ پھانسی تو عموماً" صبح سحر سے' پہلے دی جاتی ہے' آخر بھٹو کو عشاء کی نماز سے پہلے کیوں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ اس دوران اخبارات میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں کیونکہ لوگ جاننا چاہتے تھے کہ کیا واقعی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ یہ افواہ پھیلتے پھیلتے سندھ تک بھی چلی گئی جہاں بھٹو کے چچا میر نبی بخش بھٹو کے پاس ایک سرکاری افسر یہ جاننے کے لئے موجود تھا کہ بھٹو کو کس قبرستان میں دفنایا جائے گا۔ ممتاز بھٹو کے والد میر نبی بخش بھٹو نے بھٹو کی قبر بنانے کے لئے گڑھی خدابخش کے اس حصے کا انتخاب کیا جہاں بھٹو کے والد اور بھائی وغیرہ دفن تھے۔ اس رات بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر انتہائی بے بسی اور بے چینی سے

کمرے میں ٹہلتی رہیں۔ جوں جوں کلاک کی سوئی 2 بجے کی طرف بڑھ رہی تھی بھٹو کی اہلیہ اور صاحبزادی کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ یہ جانتی تھیں کہ اگلے چند گھنٹے بھٹو کی زندگی کے لئے بھاری ہیں۔ انہیں اب بھی امید تھی کہ کوئی معجزہ رونما ہوگا اور انہیں بھٹو واپس مل جائے گا۔ واقعی بھٹو انہیں مل گیا لیکن 4 اپریل 1979ء کو اسے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے لاڑکانہ لایا گیا تو وہ جیل کی سلاخوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی آزمائشوں سے بھی آزاد ہو چکا تھا۔ سندھ میں بھٹو کے آبائی گاؤں میں ان کی لاش کے اردگرد خاندان کی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ ہر آنکھ پرنم تھی، ہر دل اشکبار تھا اور ہر روح بے چین تھی لیکن 4 اپریل 1979ء کی صبح آہ و فغاں میں مصروف بھٹو خاندان کی عورتوں کو یہ قطعاً" اندازہ نہ تھا کہ اس قسم کے لمحات ان کی زندگی میں کئی بار آئیں گے اور بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد وہ سازش ختم نہیں ہوگی جس کا شکار ملک کے سابق وزیراعظم ہوتے تھے بلکہ ایک ایک کر کے گڑھی خدا بخش میں مزید لاشیں آئیں گی۔ جن میں مرتضٰی اور شاہ نواز کی لاشیں بھی ہوں گی جو غیر طبعی موت کا شکار ہوئے اور ملک کے سب سے بڑے سیاسی خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔

الذوالفقار کا قیام، پی آئی اے کے طیارے کا اغواء اور ضیاء الحق کے منصوبے

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو 4 اپریل 1979ء کو سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے تختہ دار پر چڑھایا گیا۔ اس افسوسناک خبر کے بارے میں کئی افسانے مشہور ہوئے جن کا لب لباب یہ تھا کہ بھٹو کو پھانسی سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ ان افواہوں اور من گھڑت قصوں کے پیچھے ان افراد کا ہاتھ تھا جو ضیاء الحق کی بعض پالیسیوں کی وجہ سے ترقی سے محروم رہ گئے تھے۔ حالانکہ بھٹو مرحوم نے پھانسی سے پہلے باقاعدہ شیو بنائی تھی اور وہ رات گئے تک اپنی آخری وصیت لکھنے میں مصروف رہے جسے بعض مصلحتوں کے باعث انہوں نے بعدازاں ضائع کر دیا۔ دراصل وہ اپنی آخری وصیت کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے جو جیل میں تعینات تھا۔ اپنے خاندان کے افراد سے متعلق وہ جو کچھ کہنا یا کرنا چاہتے تھے اسے کر چکے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو مرحوم نے اپنے دونوں صاحبزادوں کے بارے میں بعض خصوصی ہدایات جاری کی تھیں۔ بھٹو نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کوئی بھی بیٹا ضیاء الحق کی زندگی میں واپس آئے۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی لاش جب ان کے آبائی گاؤں پہنچی تو ان کی اولاد یا بیگم میں سے کوئی بھی آخری دیدار نہ کر سکیں۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کو نظربند کیا گیا تھا جبکہ مرتضٰی اور شاہ نواز ملک سے باہر جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سابق وزیراعظم کو پھانسی دینے کے بعد ملک بھر میں مظاہرے ہوئے لیکن لیڈر شپ کے فقدان کے باعث ان مظاہروں میں شدت نہ آسکی۔ بھٹو

خاندان کے سربراہ میر نبی بخش بھٹو اس قابل نہ تھے کہ وہ سیاسی ذمہ داریاں نبھا سکتے۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ دنیا بھر سے آنے والے تعزیتی پیغامات وصول کرتے رہے۔ بھٹو کی پھانسی پر رنج و غم کا اظہار کرنے والوں میں نواب زادہ نصراللہ خاں بھی شامل تھے جنہوں نے قومی اتحاد کی تحریک کے دوران مظاہروں کی قیادت کی۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو 6 اپریل 1979ء کی صبح ایک خصوصی طیارے کے ذریعے رتو ڈیرو' لاڑکانہ جانے کی اجازت دی گئی جہاں انہوں نے بھٹو کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور انہیں اسی شام واپس راولپنڈی پہنچا دیا گیا۔ اپریل اور مئی 1979ء کا مہینہ ہنگاموں' توڑ پھوڑ اور مظاہروں کے دوران گزرا۔ پیپلزپارٹی کے کارکنوں کو جہاں موقع ملتا وہ فوجی حکومت کے خلاف مظاہرے کرتے۔ 28 مئی 1979ء کو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو رہا کیا گیا اور وہ راولپنڈی سے کراچی پہنچیں' جہاں 70 کلفٹن پر عوام کی بڑی تعداد نے دھاڑیں مار مار کر ان سے تعزیت کی۔ بیگم نصرت بھٹو نے 8 اگست 1979ء کو اپنی عدت پوری ہونے کے بعد پارٹی کارکنوں کو بتایا کہ ان کے شوہر کو پھانسی سے قبل قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ ان کی گردن نہیں ٹوٹی تھی اور ان کا چہرہ معمول کی طرح تر و تازہ تھا۔ بیگم صاحب کے اس الزام کے باعث ایک دفعہ پھر ملک بھر میں بے چینی پھیل گئی اور جتنے منہ اتنی باتوں کے مصداق قصے کہانیاں گردش کرنے لگیں۔ بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر نے پارٹی کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی اور انہوں نے پارٹی کارکنوں کو تلقین کی کہ وہ نئے انتخابات میں حصہ لینے اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے تیاریاں مکمل رکھیں کیونکہ "ہم انتخابات میں حصہ لیں گے خواہ یہ انتخابات فوجی حکومت ہی کیوں نہ کرائے"۔ پیپلزپارٹی میں ان ایام میں ایک گروپ ایسا بھی ابھرا جس نے بیگم صاحبہ کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ عام انتخابات کا بائیکاٹ کر دیں۔ تاہم بیگم نصرت بھٹو نے اس قسم کی باتوں پر توجہ نہ دی۔ پیپلزپارٹی کو انتخابات کا بائیکاٹ کرانے والوں کی ڈور آرمی ہاؤس کے ساتھ منسلک تھی اس لئے حکومت نے 30 اگست 1979ء کو انتخابات میں حصہ لینے کے لئے رجسٹریشن کی پابندی عائد کر دی جسے پی پی پی نے 13 ستمبر 1979ء کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد 19 ستمبر 1979ء کو ایک صدارتی آرڈی نینس جاری کیا گیا جس کے تحت ایسی جماعت کے ارکان' جس نے

رجسٹریشن نہ کروائی ہو یا جس کی رجسٹریشن منسوخ کر دی گئی ہو' کو پارلیمینٹ یا صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے سے نااہل قرار دے دیا گیا۔ یہ تمام اقدامات دراصل پی پی پی کو انتخابی عمل سے دور رکھنے کے لئے کئے جا رہے تھے کیونکہ انٹیلی جینس ایجنسیاں اپنی جائزہ رپورٹوں میں ضیاء الحق کو مطلع کر چکی تھیں کہ 17 نومبر 1979ء کو انتخابات ہونے کی صورت میں ملک میں ایک مرتبہ پھر پی پی پی کی حکومت بننے کا امکان موجود ہے کیونکہ بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے باعث پی پی پی کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے جبکہ مذہبی جماعتیں انتشار کا شکار ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کو خوب اچھی طرح اندازہ تھا کہ ان کے مہروں کی بدولت پی پی پی رجسٹریشن نہیں کروائے گی اور بھٹو صاحب کی اہلیہ اور بیٹی اس سازش کو نہ سمجھ سکیں گی جو انتخابات کو زیر التوا رکھنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ نتیجتاً" رجسٹریشن نہ کروانے پر پی پی پی کے امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے گئے۔ اس سے بھٹو خاندان کی عورتیں الیکشن میں حصہ لینے سے محروم ہوگئیں کیونکہ ضیاء الحق نے 16 اکتوبر 1979ء کو عام انتخابات غیر معینہ عرصے کے لئے ملتوی کر دیئے اور سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ملک بھر میں فوجی عدالتیں قائم کر دی گئیں اور عوام کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ مارشل لاء کسے کہتے ہیں۔ پی پی پی کے کارکنوں کی پکڑ دھکڑ نے نوجوانوں میں بے چینی پیدا کر دی کیونکہ جس کسی پر پی پی پی کے ساتھ وابستگی کا الزام ہوتا اسے فوجی عدالت میں پیش کر کے قید و بند' جرمانے اور کوڑوں کی سزائیں دلوائی جاتیں۔ یہ سلسلہ جب چل نکلا تو بھٹو خاندان سے پاگل پن کی حد تک محبت کرنے والے نوجوانوں کے پاس سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ رہا کہ وہ ملک چھوڑ کر فرار ہو جائیں کیونکہ 27 مئی 1980ء کو ضیاء الحق نے ہائی کورٹ کے اختیارات محدود کر دیئے کیونکہ بعض کیسوں میں ہائی کورٹ نے فوجی عدالتوں کی طرف سے دی جانے والی سزاؤں کو ختم کر دیا تھا۔ ضیاء الحق کے ان اقدامات کے باعث بھٹو خاندان کے مخالفین بھی چیخ اٹھے اور آہستہ آہستہ قومی اتحاد میں شامل جماعتوں اور پی پی پی کے درمیان صلح کے امکانات بڑھنا شروع ہوگئے۔ 1980ء کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو اور قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کے درمیان بالواسطہ رابطہ برقرار رہا جبکہ مرتضی اور شاہ نواز نے فوجی عدالتوں کے شکنجے سے بچ جانے والے کارکنوں کو افغانستان'

شام اور دیگر ممالک میں گوریلہ تربیت دینے کا سلسلہ تیز کر دیا۔ اس دوران ضیاء الحق کے خلاف 2 مرتبہ ناکام بغاوتیں ہوئیں اور درجنوں جونیئر افسروں کو کورٹ مارشل کر کے سزائیں دی گئیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کے ساتھ روابط کا نتیجہ یہ نکلا کہ 6 فروری 1981ء کو جمہوریت پسند جماعتوں نے ماضی کے اختلافات بھلا کر ایم آر ڈی قائم کرلی جس کا مقصد جمہوریت بحال کروانا تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق کو 1980ء میں ہی مصدقہ اطلاعات ملنا شروع ہوگئی تھیں کہ شاہ نواز بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو نے ان کے قتل کی سازش تیار کی ہے اور ان کا زیادہ تر ان طالب علموں اور دانشوروں کے ساتھ رابطہ ہے جو 1977ء کے بعد لندن یا امریکہ چلے گئے تھے۔ ان میں وہ افراد بھی شامل تھے جو مختلف مقدمات میں مارشل لاء حکام کو مطلوب تھے۔ اس لئے ہنگامی بنیادوں پر آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جینس نے بعض ایسے کارکنوں کی خدمات حاصل کیں جن پر قتل و غارت گری کے الزام میں مقدمات چل رہے تھے۔ اس کے علاوہ انٹیلی جینس ایجنسیوں کے تربیت یافتہ عملے کو لندن، شام، بھارت اور فلسطین بھیجا گیا جہاں انہوں نے کسی نہ کسی طرح مرتضیٰ اور شاہ نواز تک رسائی حاصل کر کے الذوالفقار میں شمولیت اختیار کی۔ اس طرح ضیاء الحق الذوالفقار میں نقب لگانے میں کامیاب ہوگئے اور الذوالفقار آرگنائزیشن کے خفیہ منصوبے ڈبل ایجنٹوں کی موجودگی کے باعث آرمی ہاؤس پہنچنا شروع ہوگئے۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز کو اچھی طرح علم تھا کہ ضیاء الحق نے اپنے بعض ایجنٹ ان کی صف میں شامل کر دیئے ہیں کیونکہ 80-1979ء کے دوران شاہ نواز نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں ادارہ قائم کرلیا تھا جو الذوالفقار میں شامل افراد پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے کئی ایسے جعلی منصوبے بھی تیار کئے جن پر عمل درآمد کرنا مقصود ہی نہ تھا مگر وہ منصوبے ٹاپ سیکرٹ فائلوں کی زینت بن کر ضیاء الحق تک پہنچتے رہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی یہ عادت تھی کہ وہ انٹر سروسز انٹیلی جینس (آئی ایس آئی) اور ملٹری انٹیلی جینس کی مرتضیٰ اور شاہ نواز کی سرگرمیوں کے بارے میں تیار کردہ رپورٹس کو جرنیلوں کے سامنے رکھا کرتے تھے۔ ضیاء الحق کے پاس ایسی درجنوں رپورٹس موجود تھیں جو مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز کی گفتگو پر مبنی تھیں اور

ان رپورٹس میں ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادے یہ عزم کرتے نظر آتے تھے کہ ان کے تربیت یافتہ کمانڈوز جلد پاکستان میں داخل ہو کر فوجی قیادت کو قتل کرنے والے ہیں۔ مارشل لاء کے زمانے میں تین اسلامی ممالک مصر، شام اور لیبیا میں موجود پاکستانی سفارتخانوں میں خصوصی طور پر حساس اداروں کے اہلکار ان عہدوں پر تعینات کئے گئے تھے جو عہدے وزارت خارجہ سے تعلق رکھنے والے افسران کے لئے مخصوص تھے۔ یہ پاکستانی سفارتکار مرتضیٰ اور شاہ نواز کی سرگرمیوں پر خصوصی نظر رکھتے تھے اور کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا جب ضیاء الحق کو بھٹو مرحوم کے صاحبزادوں کی سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹ نہ ملتی۔ انہی ایام میں کراچی یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے درجنوں طالب علموں کو افغانستان میں تربیت دی جا رہی تھی اور مرتضیٰ کا ایسے طالب علموں سے ہروقت رابطہ رہتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کی حکمت عملی یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح تمام سیاسی جماعتوں کو بحالی جمہوریت کے لئے چلائی جانے والی تحریک میں شامل کر لیا جائے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اس چیز کی بھی کوششیں کی گئیں کہ ضیاء الحق امن عامہ کی صورتحال کنٹرول کرنے میں ناکام ہو جائیں۔ بھٹو خاندان کے نزدیک ضیاء الحق ذوالفقار علی بھٹو کے قاتل تھے اور مرتضیٰ نے اس بات کا عزم کر رکھا تھا کہ وہ اپنے والد کے قاتل کو معاف نہیں کرے گا۔ فروری 1981ء میں صورتحال یہ تھی کہ وہ سیاسی جماعتیں اور مذہبی رہنما جو 1977ء میں بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے فوجی قیادت کا ساتھ دے چکے تھے، انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لئے ضیاء الحق کے خلاف صف بندی کرنے پر تیار تھے اور غالب امکان یہی تھا کہ مارچ 1981ء میں ملک بھر میں احتجاجی تحریک شروع کر دی جائے گی لیکن ابھی ایم آر ڈی اپنے منصوبوں کو عملی شکل دے ہی نہیں پائی تھی کہ 2 مارچ 1981ء کو سلام اللہ ٹیپو اور ان کے ساتھیوں نے پی آئی اے کا طیارہ اغوا کر کے کابل پہنچا دیا۔ اس طیارے میں 148 مسافر سوار تھے جبکہ ہائی جیکروں نے ابتدا میں 29 مسافروں کو رہا کر دیا جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے۔ بدقسمتی سے طیارے میں طارق رحیم بھی موجود تھے جو 5 جولائی 1977ء کی شام وزیراعظم ہاؤس میں موجود تھے جب مارشل لاء لگایا گیا۔ مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں نے میجر طارق رحیم کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ پی آئی اے کے طیارے کے اغوا سے متعلقہ

انٹر سروسز انٹیلی جینس کی رپورٹ یہ تھی کہ ہائی جیکروں نے یہ کارنامہ ایک بین الاقوامی دہشت گرد کارلوس کے تعاون سے انجام دیا۔ یہ کارلوس وہی شخص تھا جس نے IOEC کے تیل کے وزراء کو 1976ء میں یرغمال بنایا تھا۔ ہائی جیکروں کی کارلوس سے یہ ملاقات لیبیا میں کروائی گئی اور جس روز پی آئی اے کے طیارے کو اغوا کیا گیا اس دن کارلوس کا مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ رابطہ قائم تھا۔ اس وقت کے سیکریٹری دفاع جنرل رحیم الدین نے 2 مارچ 1981ء کی رات ہی ضیاء الحق کو انتہائی وثوق سے بتا دیا تھا کہ پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرانے والوں میں بین الاقوامی دہشت گرد کارلوس اور الذوالفقار ملوث ہے۔ مرتضیٰ بھٹو کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ان کی تنظیم سے وابستہ چند نوجوان کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے والے ہیں۔ پی آئی اے کے طیارے کی ہائی جیکنگ کا معاملہ ایم آر ڈی کی تحریک کو کچلنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوا کیونکہ سکیورٹی حکام نے ہائی جیکنگ کے واقعے کے بعد ملک بھر میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ضیاء الحق نے 7 مارچ 1981ء کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں کافی غور و خوض کے بعد یہ موقف اختیار کیا کہ حکومت پاکستان ہائی جیکروں کے سامنے قطعاً" نہیں جھکے گی۔ سکیورٹی حکام کی تیار کردہ رپورٹس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ ہائی جیکنگ کے واقعہ میں کابل انتظامیہ براہ راست ملوث ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق اس بات سے چونکہ اچھی طرح آگاہ تھے کہ بعض اسلامی ممالک مرتضیٰ اور شاہ نواز کو ہر قسم کی مدد فراہم کر رہے ہیں اس لئے انہوں نے عراق' انڈونیشیا' لیبیا' فلسطین' شام اور بنگلہ دیش کے حکام سے کہا کہ وہ کابل میں موجود اپنے سفارتی عملے کے ذریعے ہائی جیکروں کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ یرغمال مسافروں کو رہا کر دیں۔ تاہم حکومت پاکستان کو اس وقت انتہائی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب کابل انتظامیہ نے اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کرٹ والڈ ہائم کے توسط سے اسلام آباد انتظامیہ کو پیغام دیا کہ وہ ہائی جیکروں کے مطالبات جس قدر جلدی ممکن ہو سکے تسلیم کرلے وگرنہ افغانستان کی حکومت ان نتائج کی ذمہ دار نہیں ہوگی جو آنے والے دنوں میں رونما ہو سکتے ہیں۔ ضیاء الحق جیسے مضبوط جرنیل کے لئے یہ بات انتہائی شرم کا باعث تھی کہ اس قدر مضبوط فوج اور آئی ایس آئی جیسے ادارے کے ہوتے ہوئے وہ ہائی جیکروں کے سامنے جھک جائیں۔ حکومت نے اس کا حل یہ نکالا کہ

افغانستان میں متعین پاکستانی سفیر کے ذریعے کابل انتظامیہ کو پیغام دیا گیا کہ وہ ہائی جیکروں پر قابو پانے کے لئے پاکستانی کمانڈوز کو اپریشن کرنے کی اجازت دے دیں۔ تاہم افغانستان نے پاکستانی کمانڈوز کو اس قسم کی اجازت دینے سے انکار کر دیا حالانکہ پاک فوج کے کمانڈوز نے طیارے کو ہائی جیکروں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے ہر قسم کی منصوبہ بندی اور ریہرسل مکمل کر رکھی تھی۔ اگر افغان حکومت کا طیارے کے اغوا میں کوئی ہاتھ نہ ہوتا تو پاکستانی کمانڈوز طیارہ ہائی جیک ہونے کے 48 گھنٹے کے اندر ہی مسافروں کو رہا کروا لیتے۔ افغانستان میں اس وقت وزیر خارجہ کے ایک آفیسر فصیح الدین کے ساتھ میر مرتضےٰ بھٹو کے خصوصی مراسم تھے۔ فصیح الدین احمد کی دو لڑکیوں کی بعدازاں شاہ نواز اور مرتضیٰ کے ساتھ شادی ہوئی۔ شاہ نواز کی بیوی کا نام ریحانہ اور مرتضیٰ کی افغان بیوی کا نام فوزیہ تھا۔ ہائی جیکنگ کے ڈرامے کے بعد پاکستانی وزیر خارجہ آغا شاہی اور شاہ محمد دوست کے درمیان ہونے والے مذاکرات کی تفصیلات مرتضیٰ بھٹو تک پہنچتی رہیں۔ ہائی جیکنگ کے اس واقعے کے بعد بے نظیر بھٹو کو اچھی طرح علم تھا کہ فوجی حکام انہیں معاف نہیں کریں گے۔ اس لئے وہ 70 کلفٹن کراچی سے قومی اسمبلی کی ڈپٹی سپیکر بیگم اشرف عباسی کے گھر چلی گئیں جہاں سے انہیں 8 مارچ 1981ء کو گرفتار کیا گیا جبکہ بیگم نصرت بھٹو کو جیل بھجوا دیا گیا۔ ہائی جیکروں نے پاکستان کو 92 سیاسی قیدی رہا کرنے کے لئے ایک فہرست فراہم کی تھی۔ ان 92 افراد میں سے ایسے بھی نوجوان شامل تھے جنہیں پولیس نے بے گناہ پکڑ رکھا تھا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ ہائی جیکروں نے یرغمالی مسافروں کی رہائی کے بدلے ان کو جیلوں سے آزاد کرنے کا مطالبہ کیا ہے تو انہوں نے رہائی حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے بعض سیاسی قیدیوں نے حکومت کو کہا کہ وہ انہیں گولی مار دے' مگر انہیں ہائی جیکروں کے کہنے پر رہا نہ کرے کیونکہ ان کا مرتضیٰ بھٹو کی تنظیم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے' لیکن اس کے باوجود انہیں مرتضیٰ بھٹو کے گروپ کا رکن بنا کر حکومت نے بلیک لسٹ کر دیا اور ان کے اہل خانہ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ہائی جیکروں نے ضیاء الحق کو جن 92 افراد کی فہرست فراہم کی تھی ان میں 15 وہ افراد بھی تھے جو ہائی جیکروں کے رشتے دار تھے' لیکن ہائی جیکروں نے کہا کہ وہ 92 سیاسی قیدیوں کی رہائی تک پی آئی

اے کے مسافر رہا نہیں کریں گے۔ پی آئی اے کے جس طیارے کو اغوا کیا گیا تھا اس میں قبائلی علاقہ جات سے تعلق رکھنے والے بعض مسافر بھی شامل تھے۔ اس وقت جبکہ حکومت ہائی جیکروں کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھی' قبائلی علاقہ جات سے تعلق رکھنے والے زعماء نے پھڈا ڈال دیا کہ ہائی جیکروں کے رشتے داروں کو ان کے حوالے کیا جائے کیونکہ جب تک ہائی جیکر ان کے عزیزوں کو رہا نہیں کریں گے وہ ہائی جیکروں کے رشتے داروں کو یرغمال بنا کر رکھیں گے۔ ضیاء الحق کے لئے یہ مسئلہ ایک نئی مصیبت سے کم نہ تھا کیونکہ پٹھانوں نے دو ٹوک الفاظ میں حکومت کو کہا کہ اگر ان کے عزیزوں کو یرغمال بنانے والے ہائی جیکروں کی شرائط تسلیم کر لی گئیں اور اس کے باوجود ان کے عزیزوں کو نقصان پہنچ گیا تو وہ ضیاء الحق کو نہیں چھوڑیں گے۔ اس وقت جبکہ پی آئی اے کے طیارے میں سوار سو سے زائد مسافروں کی زندگی خطرے میں تھی فوجی حکام نے کراچی جیل میں بیگم نصرت بھٹو سے درخواست کی کہ وہ اپنے صاحبزادے مرتضٰی سے بات کریں تاکہ اغوا شدہ جہاز کے مسافروں کو رہا کروایا جاسکے' لیکن بیگم نصرت بھٹو نے فوجی افسران کو ڈانٹ دیا کیونکہ ان کو یقین تھا کہ ہائی جیکنگ کا ڈرامہ ضیاء الحق کا اپنا تیار کردہ ہے جس کا مقصد ایم آر ڈی کی تحریک کو کچلنا ہے۔ "میرے بیٹے مرتضٰی یا شاہ نواز کا ہائی جیکنگ کے ڈرامے سے کوئی تعلق نہیں۔" بیگم نصرت بھٹو نے 7 مارچ 1981ء کو فوجی حکام پر واضح کیا جس کے بعد ہائی جیکروں نے حکومت پاکستان سے مزید مذاکرات کرنے سے انکار کر دیا اور وہ طیارہ لے کر 8 مارچ 1981ء کو دمشق پہنچ گئے۔ شام کے دارالحکومت دمشق میں ہائی جیکروں اور ضیاء الحق کی نامزد کردہ مذاکراتی ٹیم کے درمیان 9 مارچ 1981ء کو مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ شام کے صدر حافظ الاسد اور ضیاء الحق کے درمیان متعدد مرتبہ ٹیلی فون پر رابطہ قائم ہوا۔ حافظ الاسد کے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھ انتہائی دوستانہ تعلقات تھے اور مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جب مرتضٰی اور شاہ نواز دمشق پہنچے تو حافظ الاسد نے انہیں ہر قسم کی امداد فراہم کی اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ افغان حکومت کے سربراہ ببرک کارمل کا اگرچہ بھٹو کے ساتھ کوئی زیادہ تعلق نہ تھا لیکن مرتضٰی بھٹو کی مدد وہ محض اس لئے کر رہے تھے کہ پاکستانی حکام نے اسلام پسند تنظیموں خصوصاً" گلبدین حکمت یار کو اسلحہ اور

دیگر سازوسامان فراہم کیا تھا جس کے باعث انہوں نے شمالی افغانستان میں افغانستان کی حکومت کو سخت نقصان پہنچایا۔ ہائی جیکر جب پی آئی اے کا طیارہ اغوا کر کے کابل پہنچے تو اس وقت ان کے پاس محدود اسلحہ تھا جبکہ 8 مارچ 1981ء کی شب وہ کابل سے دمشق روانہ ہوئے تو ان کے پاس جدید ترین اسلحہ موجود تھا جس کے بارے میں ضیاء الحق نے حافظ الاسد کو بتایا کہ سلام اللہ ٹیپو اور عبدالناصر خاں ہائی جیکروں کو یہ اسلحہ افغان حکومت نے فراہم کیا۔ مرتضٰی جن کی عمر اس وقت 26 سال تھی 1980ء کے اواخر میں کابل شفٹ ہوگئے تھے جہاں ان کے منتخب کردہ ساتھیوں کو گوریلہ تربیت دی جاتی تھی۔ مرتضٰی بھٹو کے بارے میں آئی ایس آئی کی رپورٹ یہ تھی کہ طیارہ اغوا ہونے سے قبل وہ کابل میں موجود تھے جبکہ مرتضٰی نے ان الزامات کا جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار کی تھی جس سے لگتا تھا کہ وہ افغانستان میں موجود ہیں وگرنہ وہ لندن یا فرانس میں ہوتے تو اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کی تردید کر سکتے تھے۔ بہرحال حافظ الاسد اور ضیاء الحق کے درمیان براہ راست ہونے والے مذاکرات کے نتیجے میں 14 مارچ 1981ء کو ہائی جیکنگ ڈرامہ ختم ہوگیا اور حکومت نے ہائی جیکروں کے کہنے پر 54 سیاسی قیدی رہا کرنے کے بعد مسافروں کو آزاد کروالیا۔

مرتضیٰ کی کابل سے دمشق آمد اور بیگم نصرت بھٹو کی رہائی

میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز بھٹو نے ممکن ہے کہ پی آئی اے کے طیارے کی ہائی جیکنگ کا خود منصوبہ نہ بنایا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جب ہائی جیکر طیارے کو کابل لے گئے تو مرتضیٰ کا افغان حکومت اور ہائی جیکروں کے ساتھ رابطہ بحال رہا۔ اگرچہ ضیاء الحق کی حکومت مرتضیٰ کی کابل میں موجودگی ثابت نہ کر سکی لیکن سرکاری طور پر مسلسل اس چیز کا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا کہ مرتضیٰ کابل میں موجود ہے اور اسے جب طیارے کے اغوا کی اطلاع ملی تو کابل ہوائی اڈے پر موجود افغان حکام اور الذوالفقار کے سینئر ارکان نے مرتضیٰ کو گلے لگایا۔ پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرنے والوں نے ضیاء الحق کو زچ کر کے 54 سے زائد سیاسی قیدیوں کو رہا کروایا اور 2 مارچ سے 14 مارچ تک محض دو ہفتے سے بھی کم عرصے کے دوران پوری دنیا کو پتہ چل گیا کہ پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو' جنہیں ایک مخالف کو قتل کرانے کے الزام میں 1979ء میں پھانسی دی گئی تھی' کے صاحبزادوں نے چھاپہ مار تنظیم قائم کر لی ہے جس کا واحد مقصد ضیاء الحق کو اقتدار سے محروم کرنا ہے کیونکہ بھٹو مرحوم کے اہل خانہ ضیاء الحق کو قاتل سمجھتے تھے۔ اگرچہ الذوالفقار کے کھاتے میں ڈالے جانے والے اس ہائی جیکنگ کے واقعے کے باعث مرتضیٰ دنیا کے سامنے اپنا کیس پیش کرنے میں کامیاب ہوگئے لیکن اس کا ملکی سطح پر فوری اثر یہ ہوا کہ حکومت کو ایم آر ڈی کی تحریک کچلنے کا موقع مل گیا اور ضیاء الحق کے وہ ایجنٹ جو ایم آر ڈی میں شامل [illegible] والوں کی

مخالفت کر رہے تھے کھل کر سامنے آگئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ دہشت گرد تنظیم سے تعلق رکھنے والے افراد (بے نظیر اور بیگم نصرت بھٹو) کے شانہ بشانہ احتجاجی تحریک میں حصہ لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پی آئی اے کے طیارے کی ہائی جیکنگ کے واقعے کے بعد ضیاء الحق نے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سیکرٹ فنڈ میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا کیونکہ الذوالفقار میں نقب لگانا کوئی آسان کام نہ تھا اور اس مقصد کے لئے نوجوانوں کی برین واشنگ کر کے انہیں لندن' پیرس' امریکہ' دمشق' عراق' بھارت اور افغانستان بھجوانے پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوئی تھی۔ ہائی جیکنگ کے واقعے کے بعد ضیاء الحق نے مسلسل یہ کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح افغان حکومت کے سربراہ ببرک کارمل مرتضیٰ اور شاہ نواز کو کابل سے نکال دیں کیونکہ اس وقت تک سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے درمیان روسی افواج کو افغانستان سے نکالنے کے لئے اتفاق رائے ہو چکا تھا۔ ببرک کارمل چونکہ مشکلات سے دوچار تھے اس لئے انہوں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ مرتضیٰ کو کابل سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ 1983ء کے شروع میں ببرک کارمل نے مرتضیٰ کو خود بلا کر کہا کہ وہ افغانستان سے کچھ عرصے کے لئے کہیں اور چلے جائیں کیونکہ ضیاء الحق افغانستان میں موجود ان کے تمام ٹھکانوں سے باخبر ہو چکا ہے اور اس بات کا خدشہ ہے کہ مبادا کوئی افغان مجاہد انہیں ہلاک نہ کر دے۔ مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز نے ببرک کارمل کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے کابل چھوڑ دیا لیکن اس وقت تک ان کے سینکڑوں ساتھیوں کو گوریلا جنگ لڑنے کی تربیت دی جا چکی تھی جبکہ بھارت کی انٹیلی جنس ایجنسی "را" کا بھی الذوالفقار سے بالواسطہ اور بلاواسطہ رابطہ قائم تھا۔ "را" اور مرتضیٰ کا دشمن چونکہ ایک تھا اس لئے الذوالفقار نے محدود پیمانے پر اپنے بعض ساتھیوں کو تربیت کے حصول کے لئے بھارت بھی بھیجا۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب فوجی حکومت نے الذوالفقار کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائیوں کا آغاز کیا کیونکہ الذوالفقار کے تربیت یافتہ افراد کی پاکستان واپسی کے بعد ملک بھر میں دہشت گردی کی وارداتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ فوج اور پولیس کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذمہ 1983ء میں جو ڈیوٹی لگائی گئی تھی اس میں الذوالفقار کے کارکنوں اور ان کے ٹھکانوں کا پتہ چلانا سرفہرست تھا۔ اس کارروائی کے دوران پیپلز پارٹی کے درجنوں رہنما اور سینکڑوں

کارکن زیر عتاب آئے اور انہیں بدنام زمانہ شاہی قلعہ کے عقوبت خانے میں اذیتیں دے دے کر ہلاک اور زخمی کر دیا گیا۔ شاہی قلعہ کے عقوبت خانے میں الذوالفقار اور پی پی پی کے کارکنوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور خواتین قیدیوں کے ساتھ اس طرح کا شرمناک سلوک روا رکھا گیا جسے احاطہ تحریر میں لانا بھی مناسب نہیں۔ شاہی قلعہ کے عقوبت خانے کے علاوہ پشاور اور اٹک کے قلعے میں بھی مبینہ دہشت گردوں کو اذیتیں دے دے کر اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ ان گناہوں کا بھی اعتراف کریں جو ان کی بجائے دوسروں سے سرزد ہوتے تھے۔ ظلم و ستم کا یہ سلسلہ جب طول پکڑ گیا اور عقوبت خانوں میں پی پی پی اور الذوالفقار کے کارکنوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی خبر مرتضیٰ اور شاہ نواز تک پہنچی تو انہوں نے ضیاء الحق کو قتل کرنے کے لئے موت کے دستے روانہ کر دیئے۔ الذوالفقار نے جن افراد کو ٹھکانے لگانے کے لئے فہرست تیار کی تھی اس میں مولوی مشتاق حسین سرفہرست تھے کیونکہ انہوں نے بھٹو کے مقدمہ قتل کے دوران انتہائی جانبداری سے سماعت کی تھی۔ ان پر 25 ستمبر 1983 کو اس وقت حملہ کیا گیا جب وہ ایک کار میں چوہدری ظہور الٰہی کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے۔ مولوی مشتاق حسین تو زخمی ہونے کے بعد بچ گئے لیکن چوہدری ظہور الٰہی اپنے ڈرائیور کے ہمراہ ہلاک ہوگئے۔ اس طرح مجلس شوریٰ کے ایک رکن ظہور الحسن بوپھال کو قتل کیا گیا اور ایاز سومرو نے شاہی قلعہ کے عقوبت خانے میں اعتراف کیا کہ یہ واردات انہوں نے الذوالفقار کی ہدایت پر کی۔ اس کے بعد ملک بھر میں دہشت گردی کی وارداتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا اور کئی مرتبہ مرتضیٰ اور شاہ نواز کو حیران ہونا پڑا کیونکہ پاکستان میں دہشت گردی کی ایسی بھی وارداتیں ہو رہی تھیں جن سے ان کا یا ان کی تنظیم کا بالواسطہ بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ آخر کار وہ کون تھا اس قسم کی دہشت گردی کروا رہا تھا۔ پی پی پی کے حامیوں کی رائے کے مطابق ضیاء الحق خود کروا رہے تھے تاکہ اپوزیشن کو کچلنے کے لئے انہیں جواز میسر آجائے۔ ایام میں جب مرتضیٰ اور شاہ نواز زیادہ سے زیادہ ساتھیوں کو الذوالفقار میں بھرتی رہے تھے انہیں اطلاع ملی کہ ان کی والدہ پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہوگئی ہیں مرتضیٰ اور شاہ نواز اس منحوس خبر کو سن کر بے چین ہوگئے کیونکہ ابھی ان کے والد

پھانسی دیئے گئے چند برس ہی گزرے تھے اور 1977ء کے بعد سے اب تک انہوں نے اپنی والدہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ شاہ نواز نے اس دوران متعدد مرتبہ بھیس بدل کر پاکستان آنے کی کوشش کی لیکن مرتضیٰ نے ہمیشہ انہیں منع کیا کیونکہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کی گرفتاری کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ مرتضیٰ کے لئے بھیس بدل کر پاکستان آنا اس لئے ناممکن تھا کہ وہ اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے سینکڑوں فٹ کے فاصلے سے پہچان لئے جاتے تھے۔ آخرکار بیگم بھٹو کو 13 نومبر 1982ء کو علاج کے لئے بیرون ملک جانے کی اجازت مل گئی۔ فوجی حکام نے بیگم نصرت بھٹو کی بیرون ملک روانگی سے قبل بے نظیر بھٹو کو 70 کلفٹن منتقل کر دیا تاکہ وہ چند روز اپنی والدہ کے ہمراہ گزار سکیں۔ بھٹو خاندان میں صرف صنم بھٹو ہی ایسی لڑکی تھیں جو مارشل لاء حکام کے ظلم و ستم سے محفوظ رہیں' اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاست سے الرجک تھیں اور انہوں نے زمانہ طالب علمی سے لے کر بھٹو کے دور حکومت تک خود کو سیاست سے الگ تھلگ رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 8 ستمبر 1981ء میں شادی کرلی اور بے نظیر کو اپنی بہن کی شادی میں شرکت کے لئے بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ صنم بھٹو کی شادی کے ایک ماہ بعد ہی مرتضیٰ اور شاہ نواز نے افغانستان کے وزیر خارجہ شاہ محمد دوست کی صاحبزادیوں ریحانہ اور فوزیہ کے ساتھ شادی کرلی کیونکہ دونوں بہنوں کے ساتھ ان کے خوشگوار تعلقات تھے اور افغانستان میں قیام کے دوران وہ افغان وزیر خارجہ کے گھر اکثر ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ 1983ء میں مرتضیٰ نے ضیاء الحق کے خلاف دو مرتبہ فوجی بغاوت کرانے کی کوشش کی لیکن دونوں مرتبہ ان کے منصوبے افشا ہوگئے۔ اس کے بعد مرتضیٰ اور شاہ نواز نے لیبیا میں بیٹھ کر بین الاقوامی دہشت گردوں سے رابطے قائم کیے' جن میں انطونی ولیم گل' گارڈ فرلے چارٹز' رومیو نکولس اور ایڈگر بوتک شامل تھے۔ ضیاء الحق کو مرتضیٰ کے بین الاقوامی دہشت گردوں سے روابط کی اطلاع مصر میں موجود پاکستان کے سفارتخانے کے ذریعے ملی جہاں متعین ایک انٹیلی جنیس آفیسر کے ہاتھ ایسے کاغذات لگے تھے جن میں مغربی جرمنی کے چانسلر ہلمٹ کوہل' سعودی عرب کے شاہ فہد' مصر کے حسنی مبارک اور پاکستان کے ضیاء الحق کو قتل کرنے کا ذکر موجود تھا۔ 1983ء کے اواخر میں ہونے والی یہ سازش 3 جنوری 1984ء کو

اس وقت ناکام ہوئی جب سکیورٹی حکام نے لاہور سے بڑی تعداد میں اسلحہ برآمد کر کے الذوالفقار اور پی پی پی کے متعدد رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔ ضیاء الحق کے خلاف ہونے والی ان سازشوں میں کوئی کمی نہ آئی حالانکہ مارشل لا دور حکومت میں درجنوں افراد کو پھانسی یا اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا جن میں رزاق بھی شامل تھے۔ ان پر چوہدری ظہور الٰہی کو قتل کرنے کا الزام تھا۔

شاہنواز بھٹو کی پراسرار موت

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ لوگ اس وقت حکمران وقت کی عزت و احترام کرتے ہیں جب تک وہ اقتدار میں رہتا ہے جبکہ اقتدار سے محروم ہونے کے بعد بڑے بڑے سیاستدان گوشہ تنہائی میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایوب خاں، یحییٰ خاں، اسکندر مرزا، خواجہ ناظم الدین اور غلام محمد اس کی پرانی جبکہ غلام اسحاق خان اور سردار فاروق احمد خاں لغاری اس کی حالیہ مثال ہیں۔ 1979ء میں جب بھٹو کو پھانسی دی گئی تو ضیاء الحق اور پاکستان قومی اتحاد کی قیادت کا خیال تھا کہ دو چار برس بعد بھٹو خاندان سیاست سے آؤٹ ہو جائے گا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ضیاء الحق اور قومی اتحاد کی لیڈر شپ کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور مردہ بھٹو ان کے گلے میں اٹک گیا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ذوالفقار علی بھٹو وہ واحد سیاستدان ہیں جو اپنی موت کے 20 سال بعد بھی عوام کے دلوں میں موجود ہیں۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کا ادراک ضیاء الحق کو اس وقت ہوا جب انہوں نے بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد ان کی صاحبزادی بے نظیر اور اہلیہ بیگم نصرت بھٹو کو تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے رہا کر کے عوامی ردعمل کا جائزہ لیا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے باوجود بھٹو خاندان کی عورتیں عوام کو اکٹھا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ یقیناً فوجی حکمرانوں نے سوچا ہوگا کہ اگر بھٹو صاحب کے گھرانے کی خواتین اس قدر ہجوم اکٹھا کر سکتی ہیں تو مرتضیٰ اور شاہ نواز کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ کہتے ہیں کہ یہی وہ خدشات تھے جن میں مبتلا ہو کر ضیاء الحق نے مرتضیٰ اور شاہ نواز کو ٹھکانے لگانے کی کوششیں شروع کیں۔ ضیاء الحق کو ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادوں کے ساتھ قطعاً" کوئی ہمدردی نہ تھی اور ان کے خلاف

ان کے دل میں موجود نفرت اس وقت دو چند ہو گئی جب 4 جنوری 1984ء کو لاہور میں ایک فوجی سازش کو ناکام بنایا گیا۔ اس واقعہ کے 6 روز بعد ضیاء الحق نے بے نظیر بھٹو کو بیرون ملک علاج کے لئے جانے کی اجازت دے دی۔ بے نظیر بھٹو 10 جنوری کو علاج کے لئے بیرون ملک روانہ ہوئیں۔ صنم بھٹو نے سوئٹزر لینڈ تک بے نظیر کے ساتھ سفر کیا۔ ضیاء الحق نہیں چاہتے تھے کہ بھٹو خاندان کے افراد کو مزید کچھ عرصہ نظر بند رکھ کر امریکہ اور یورپ کے علاوہ انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں کو تنقید کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

اس کے علاوہ بے نظیر بھٹو کی پاکستان میں نظر بندی کی وجہ سے شاہ نواز اور مرتضیٰ سخت بے چین تھے اور بے نظیر بھٹو کی رہائی ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ اس قسم کی سوچ کو مد نظر رکھتے ہوئے ضیاء الحق نے بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو رہا کیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے اپنی والدہ اور بہن سے سوئٹزر لینڈ اور لندن میں متعدد مرتبہ ملاقاتیں کیں اور جب بھی بھٹو خاندان کے افراد مل بیٹھتے ان کے پاس موضوعِ گفتگو "ضیاء الحق اور انقلاب" ہی ہوتا۔ بیگم نصرت بھٹو 1983ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کی ناکامی سے سخت دلبرداشتہ تھیں اور انہیں یقین تھا کہ جب تک افغانستان میں روسی افواج موجود ہیں' ضیاء الحق کو منظر سے ہٹانا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ دوسری طرف ضیاء الحق کا الیکشن کرانے کا ارادہ تبدیل ہو چکا تھا اور وہ اقتدار سے الگ ہو کر خود کو سیاستدانوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی غلطی کرنے پر تیار نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق نے ملک میں مجلس شوریٰ کا نظام متعارف کرایا جو 1981ء سے 1985ء تک چلتا رہا تاوقتیکہ ملک میں عام انتخابات نہ کروا دیئے گئے۔ الیکشن کا ڈول ڈالنے سے قبل ضیاء الحق نے 19 دسمبر 1984ء کو ریفرنڈم کرایا جس میں سوال یہ تھا کہ کیا ملک کے عوام چاہتے ہیں کہ ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ ہو اور اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو ضیاء الحق کو پانچ برس کے لئے ملک کا صدر منتخب کرلیا جائے۔ مرتضیٰ بھٹو کو علم تھا کہ ضیاء الحق ان کی جماعت کو الیکشن میں حصہ نہیں لینے دیں گے خواہ وہ غیر جماعتی بنیادوں پر الیکشن لڑنے کے لئے تیار ہی کیوں نہ ہو جائے۔ شاہ نواز بھٹو 1979ء سے 1984ء تک ضیاء الحق کے خلاف

منصوبے بناتے بناتے تھک گئے تھے کیونکہ 84-1983ء میں ضیاء الحق کے قریبی رفقاء نے شاہ نواز اور مرتضیٰ دونوں کو پیغام دیا تھا کہ وہ پاکستان میں دہشت گردی کا سلسلہ ختم کر دیں اور اگر ایسا نہ کیا گیا اور ضیاء الحق کو قتل کرنے کے لئے منصوبہ بندی کا سلسلہ برقرار رہا تو اسی قسم کی کارروائی بھٹو خاندان کے افراد کے خلاف بھی کی جاسکتی ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز کے درمیان ضیاء الحق کی طرف سے بجھوائی جانے والی اس دھمکی کے حوالے سے متعدد مرتبہ گفتگو ہوئی اور آخرکار دونوں میں یہ طے پایا کہ وہ فی الحال ضیاء الحق کے خلاف موت کا کوئی دستہ پاکستان نہیں بھجوائیں گے۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز کے اس فیصلے سے ضیاء الحق کو جنوری 1985ء میں آگاہ کیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی بھی یہی خواہش تھی کہ فی الحال ضیاء الحق کو قتل کرنے کا منصوبہ ختم کر دیا جائے کیونکہ مارشل لاء حکومت نے ماضی کی طرح ایک مرتبہ پھر انتخابات کرانے کے لئے ایک نئی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو 25 فروری 1985ء کو ہونے والے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لینے کے لئے تیار تھیں لیکن ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کی اکثریت نے غیر جماعتی انتخابات کو خلاف جمہوریت قرار دے کر ضیاء الحق سے مطالبہ کیا کہ وہ جماعتی بنیادوں پر الیکشن کرائیں۔ ایم آر ڈی میں شامل زیادہ تر جماعتوں کو اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد ہونے والے انتخابات میں ان کے امیدوار کامیاب نہیں ہو سکیں گے لہٰذا انہوں نے ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنے کے لئے غیر جماعتی انتخابات کی مخالفت شروع کر دی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ان دنوں لندن میں تھیں' جب 19 جنوری 1985ء کو ایم آر ڈی کے اجلاس کے لئے ایبٹ آباد کا انتخاب کیا گیا۔ ضیاء الحق نے ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کے اندر اپنے ایجنٹ داخل کر رکھے تھے' جنہیں یہ مشن سونپا گیا تھا کہ وہ ہر صورت میں غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ کرائیں۔ نتیجتاً وہی ہوا جس کا خدشہ تھا' یعنی ایم آر ڈی کی مرکزی کمیٹی نے عام انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ کرانے والوں نے دلیل پیش کی کہ ضیاء الحق بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے کبھی بھی یہ نہیں پسند کریں گے کہ ایم آر ڈی میں شامل جماعتیں انتخابی عمل سے باہر رہ جائیں' لیکن اس قسم کی سوچ رکھنے والوں کی خوش فہمی نے پی پی پی کو پارلیمانی

سیاست سے آؤٹ کر دیا۔ انتخابات کے بعد 5 مارچ کو ناصر بلوچ اور 26 مارچ 1985ء کو ایاز سموں کو پھانسی دے دی گئی۔ ان دونوں پر الذوالفقار کی مدد سے ملک میں دہشت گردی کی وارداتیں کرنے کا الزام تھا۔ شاہ نواز بھٹو جو زیر زمین سرگرمیوں اور مافیا کے ساتھ کام کرتے کرتے تھک چکے تھے ناصر بلوچ اور ایاز سموں کو پھانسی دیئے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر Active ہو گئے اور انہوں نے اپنی والدہ کو 28 مارچ 1985ء کو فون کر کے کہا کہ وہ بے گناہوں کے قتل پر مزید خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کریں گے۔ ”میں ضیاء الحق سے بدلہ لوں گا“ شاہ نواز نے اپنی افغان بیوی ریحانہ کو کہا جن کے ساتھ ان کی زندگی اب اس قدر خوشگوار نہ رہی تھی جس قدر لطف کے لمحات وہ 83-1981ء میں گزار چکے تھے۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ تھی کہ شاہ نواز کو ریحانہ کے بارے میں شک ہو گیا تھا کہ وہ پاکستانی انٹیلی جینس ایجنسیوں کے ہاتھوں استعمال ہونا شروع ہو گئی ہے۔ شاہ نواز اور ریحانہ کا 85-1984ء کے دوران متعدد مرتبہ جھگڑا ہوا اور ایک مرتبہ تو شاہ نواز نے ریحانہ کو قتل کرنے کی ٹھان لی لیکن اپنی تین سالہ بچی سسّی کی وجہ سے ان کے ہاتھ رک گئے۔ شاہ نواز بنیادی طور پر جاسوس طبیعت کے حامل نوجوان تھے۔ دہشت گردی کی وارداتیں کرتے اور انہیں ناکام بنانے کے سلسلے میں ان کا ذہن کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا۔ انٹرنیشنل مافیا کے ساتھ روابط ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے پاس ایسا زہر رکھتے تھے جو چند سیکنڈوں کے اندر انسان کو زندگی کے بوجھ سے آزاد کر سکتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کو جب پتہ چلا کہ شاہ نواز ذہنی طور پر بہت الجھا ہوا ہے اور اس کی ازدواجی زندگی تلخ ہو کر رہ گئی ہے تو وہ جولائی 1985ء میں فرانس کے شہر کینز (Canes) گئیں جہاں مرتضیٰ بھی موجود تھے۔ بے نظیر کی چھوٹی بہن صنم بھٹو بھی فرانس پہنچ گئیں اور 17 جولائی 1985ء کو برسوں بعد خاندان کے تمام افراد نے مل کر کھانا کھایا اور خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ 17 جولائی 1985ء کی رات ضیاء الحق کو فرانس سے پاکستانی سفارتخانے میں متعین ایک انٹیلی جینس آفیسر کے ذریعے کینز (Canes) میں بھٹو خاندان کے تمام افراد کے جمع ہونے کی اطلاع ملی۔ اس بات کا تاحال پتہ نہیں چل سکا کہ ضیاء الحق نے شاہ نواز کے بارے میں آنے والی ٹاپ سیکرٹ رپورٹ کے بارے میں کیا فیصلہ کیا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگلے روز شاہ نواز اپنے فلیٹ

میں مردہ پائے گئے۔ پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت کا فوری ردعمل یہ تھا کہ شاہ نواز کو ضیاء الحق نے قتل کرایا ہے۔ لیکن کسی کے پاس اس کا ثبوت موجود نہ تھا اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شاہ نواز مرحوم جس رات فوت ہوئے اس شام ان کی اہلیہ ریحانہ گھر میں موجود تھیں۔ چونکہ شاہ نواز اور ریحانہ کے تعلقات مثالی نہیں رہے تھے' اس لئے جب شاہ نواز کے کمرے سے ان کے کراہنے کی آواز آئی تو ریحانہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ ریحانہ کی اس بے حسی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ شاہ نواز ڈرامہ کر رہے ہیں۔ اس وقت جبکہ شاہ نواز کے جسم سے جان نکل رہی تھی ان کی اہلیہ انتہائی سکون سے دوسرے کمرے میں آرام فرما رہی تھیں۔ فرانس کی پولیس نے اسی لئے ریحانہ کو گرفتار بھی کیا اور ان پر مقدمہ بھی چلا کیونکہ پولیس کے لئے یہ حیرت ناک بات تھی کہ کسی شخص کی جان نکل رہی ہو اور اس کی اہلیہ اس کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کرے۔ شاہ نواز 18 جولائی 1985ء کو پراسرار ماحول میں فوت ہوئے اور فرانس کے جاسوسی ادارے تمام وسائل ہونے کے باوجود اس خفیہ ہاتھ کو بے نقاب نہ کر سکے جو شاہ نواز کی موت کا باعث بنا۔ ریحانہ کا دعویٰ تھا کہ شاہ نواز نے خودکشی کی جبکہ مرتضیٰ اور بے نظیر اس واہیات بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ مرتضیٰ نے 19 جولائی 1985ء کو سخت برا بھلا کہا۔ مرتضیٰ بھٹو' جنہوں نے الذوالفقار میں ایک انٹیلی جینس ونگ بھی قائم کر رکھا تھا' نے کئی سال تک یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ ان کے بھائی کو کس نے قتل کیا لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان تمام کوششوں کے دوران مرتضیٰ کو صرف اتنا ہی پتہ چل سکا کہ شاہ نواز کی وفات سے چند گھنٹے قبل ایک مرسیڈیز گاڑی ان کے فلیٹ کے سامنے آکر رکی تھی' جس میں سوار افراد جتنی تیزی سے شاہ نواز کے کمرے میں گئے وہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ واپس بھی چلے گئے اور جاتی دفعہ انہوں نے کوئی ایسا ثبوت باقی نہ چھوڑا جس سے پتہ چلایا جاسکتا کہ شاہ نواز کی موت کی وجہ کیا تھی۔ ضیاء الحق اور دیگر جرنیلوں کو شاہ نواز کی وفات کی خبر 18 جولائی 1985ء کو پہنچی۔ شاہ نواز نے 17 جولائی 1985ء کو بے نظیر بھٹو سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے روز انہیں اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلائے گا لیکن شاہ نواز اور بے نظیر کی اکٹھے مل بیٹھنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ”مجھے پتہ نہیں کہ ہمارے

خاندان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے"۔ بے نظیر بھٹو نے فرانس سے 19 جولائی 1985ء کو کراچی میں اپنی کزن فخری بیگم سے فون پر بات چیت کرتے ہوئے کہا۔ بے نظیر بھٹو کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ صدمے سے نڈھال ہیں۔ شاہ نواز کے انتقال کی خبر 19 جولائی 1985ء کو پوری دنیا میں پھیل چکی تھی اور لوگ جوق در جوق لاڑکانہ پہنچ رہے تھے جہاں بھٹو خاندان کے سربراہ میر نبی بخش بھٹو تعزیت کے لئے آنے والوں کے ساتھ بیٹھے آنسو بہا رہے تھے جبکہ خواتین کو حوصلہ دینے کے لئے شاہ نواز کی سوتیلی ماں شیریں امیر بیگم نوڈیرو میں موجود تھیں۔ محمد خاں جونیجو نے' جو غیر جماعتی انتخابات کے بعد وزیراعظم بن چکے تھے' فوری طور پر بیگم نصرت بھٹو کے نام ایک تعزیتی پیغام بھجوایا جبکہ ضیاء الحق بھی اس معاملے میں ان سے پیچھے نہ رہے اور انہوں نے بھی بھٹو خاندان سے شاہ نواز کی ناگہانی وفات پر انتہائی دلی افسوس کا اظہار کیا۔ شاہ نواز اپنے بہن بھائیوں میں سب سے کم عمری میں فوت ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم نومبر 1957ء تھی۔

فرانسیسی پولیس 18 جولائی سے 18 اگست تک شاہ نواز کے قتل کا راز تلاش کرنے کے لئے کوشاں رہی لیکن پوسٹ مارٹم اور ابتدائی تفتیش کے دوران نہ پتہ چل سکا کہ شاہ نواز کی موت خود کشی کے باعث واقع ہوئی یا انہیں قتل کیا گیا۔ 20 جولائی 1985ء کو بیگم نصرت بھٹو' مرتضیٰ' صنم اور بے نظیر نے فیصلہ کیا کہ شاہ نواز کو ان کے آبائی قبرستان گڑھی خدابخش میں سپرد خاک کیا جائے گا جبکہ ان کے جسد خاکی کو پاکستان لے کر بے نظیر جائیں گی۔ مرتضیٰ چاہتے تھے کہ وہ اپنے بھائی کی میت کو کندھا دینے کے لئے خود پاکستان جائیں لیکن بیگم نصرت بھٹو نے انہیں اس بات کی اجازت دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ پولیس اور فوج مرتضیٰ کو ایئرپورٹ پر ہی گرفتار کر لے گی اور نتیجتاً مرتضیٰ کو پھانسی کی سزا بھی دی جا سکتی تھی کیونکہ ان کے خلاف دہشت گردی کروانے کے الزام میں درجنوں مقدمات درج کئے جا چکے تھے۔ فرانسیسی حکام نے شاہ نواز کی لاش بھٹو خاندان کے حوالے 6 اگست 1985ء کو ہی کر دی تھی لیکن پاکستانی سفارتخانے نے متعلقہ کاغذات کی تیاری میں کافی وقت ضائع کر دیا۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ ضیاء الحق نہیں چاہتے تھے کہ بھٹو خاندان کے افراد شاہ نواز

کی لاش لے کر پاکستان آئیں کیونکہ پی آئی اے کے طیارے کے اغواء ہونے کے بعد عوام میں الذوالفقار کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی تھی وہ کب کی ختم ہو چکی تھی اور بے نظیر بھٹو کے دوبارہ وطن پہنچنے کے بعد پی پی پی کی مقبولیت کا گراف ایک مرتبہ پھر اوپر جا سکتا تھا۔ مرتضیٰ نے فرانس سے مخدوم خلیق الزماں کو پیغام بھجوایا کہ وہ شاہ نواز کی تدفین کے لئے انتظامات کریں۔ مخدوم خلیق الزماں نے بے نظیر بھٹو کے کزن مشتاق بھٹو کے ساتھ مل کر تجہیز و تدفین کے انتظامات شروع ہی کئے تھے کہ حکومت نے مخدوم خلیق الزماں کو گرفتار کر لیا۔ بے نظیر بھٹو 21 اگست 1985ء کو اپنے بھائی کی لاش لے کر کراچی ایئرپورٹ پر اتریں۔ مولانا احترام الحق تھانوی نے شاہ نواز بھٹو کی نماز جنازہ پڑھائی۔ 23 اگست 1985ء کو شاہ نواز کے سوئم میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ بے نظیر ناصر بلوچ اور ایاز سموں کے گھر بھی جانا چاہتی تھیں لیکن فوجی حکام نے انہیں 27 اگست 1985ء کو 3 ماہ کے لئے 70 کلفٹن پر نظربند کر دیا۔ حالانکہ پاکستان نے امریکہ اور مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ اسلامی ممالک کے سفارتکاروں کو یقین دلایا تھا کہ بے نظیر بھٹو کو شاہ نواز کی لاش لانے پر گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ بے نظیر بھٹو کی گرفتاری پر سب سے پہلے امریکہ نے ردعمل کا مظاہرہ کیا جبکہ یکم ستمبر 1985ء کو امریکی سفیر ڈین ہنٹن نے سندھ کے گورنر جنرل جہانداد خاں سے ملاقات کی اور انہیں امریکی حکومت کے جذبات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ بے نظیر بھٹو کی نظربندی سے امریکہ کو سخت تشویش ہوئی ہے۔ اگر امریکی سفیر نے عام حالات میں اس طرح کے ردعمل کا مظاہرہ کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ ضیاء الحق بے نظیر کی نظربندی فوراً" ہی ختم کر دیتے لیکن انہوں نے افغانستان کے مخصوص حالات کے باعث امریکی سفیر کے موقف کو پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے مترادف قرار دیتے ہوئے ڈین ہنٹن پر واضح کیا کہ وہ واشنگٹن حکام کے کہنے پر نہ تو کسی کو گرفتار کریں گے اور نہ ہی کسی مجرم کی رہائی عمل میں آئے گی۔ لیکن ضیاء الحق اپنے اس موقف پر زیادہ دیر تک نہ ڈٹے رہ سکے اور انہیں بین الاقوامی دباؤ پر بے نظیر کی نظربندی کو ختم کرنا پڑا' جنہیں 3 نومبر 1985ء کو کڑی نگرانی میں فرانس روانہ کر دیا گیا۔ بے نظیر نے 6 نومبر 1985ء کو فرانس کی عدالت میں شاہ نواز کے مقدمہ قتل کے حوالے سے اپنا بیان ریکارڈ کرایا' جس سے

ایک ہفتے بعد ریحانہ کو رہا کر دیا گیا اور ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ وہ 30 دسمبر 1985ء سے قبل مارشل نہ اٹھائیں گے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ نے ضیاء الحق کے اس اعلان کے بعد پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کرلیا جبکہ مرتضیٰ نے کہا کہ میں اپنے والد اور بھائی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد ہی وطن آؤں گا اور ظاہر ہے کہ وہ ضیاء الحق کو اپنے والد اور بھائی کا قاتل سمجھتے تھے جو ایک خوفناک سازش کا شکار ہو کر 17 اگست 1988ء کو ایک طیارے کے حادثے میں ہلاک ہوگئے۔ بھٹو خاندان کے لئے ضیاء الحق کی موت خوشی و مسرت کا باعث اگر نہ بھی تھی تو کم از کم یہ سانحہ ان کے ذہنی سکون کا باعث ضرور بنا لیکن یہ بہت ہی کم افراد کو معلوم تھا کہ ضیاء الحق اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے اور ان کے قتل کی سازش کو بے نقاب کرنے والے خفیہ ہاتھ مسلسل سرگرم رہے اور 20 ستمبر 1996ء کو یعنی شاہ نواز کی وفات کے 11 برس بعد جب مرتضیٰ پولیس مقابلے میں ہلاک کئے گئے تو ملک کے کسی نہ کسی کونے میں وہ لوگ بھی اپنے ذہنوں سے ایک بوجھ اترا ہوا محسوس کر رہے تھے جنہیں شک تھا کہ ضیاء الحق کی ہلاکت میں الذوالفقار کا ہاتھ ہے۔ خود بے نظیر بھٹو کو ان کے اپنے ہی ساتھی سردار فاروق احمد لغاری نے 4 نومبر 1996ء کی رات اقتدار سے محروم کر دیا۔ بے نظیر کا دیگر جرائم کے علاوہ ایک جرم یہ بھی تھا کہ انہوں نے انتہائی خاموشی کے ساتھ ایف آئی اے کی ایک ٹیم فرانس روانہ کی تھی تاکہ شاہ نواز کے اصل قاتلوں کا پتہ چلایا جاسکے۔ قبل اس کے کہ بے نظیر بھٹو اپنے بھائی شاہ نواز کے قاتلوں تک پہنچ پاتیں، خفیہ ہاتھ ایک مرتبہ پھر حرکت میں آیا اور بھٹو خاندان کے سب سے اہم فرد مرتضیٰ کو جعلی پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا گیا۔

میر مرتضیٰ بھٹو

بھٹو خاندان کی سیاسی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس خاندان سے تعلق رکھنے والی خواتین زیادہ تر چار دیواری کے اندر ہی موجود رہیں اور سیاست سمیت دیگر تمام امور بھٹو خاندان کے سربراہ کے ہاتھ میں رہے۔ تاہم خاندان کی روایات کے برعکس ذوالفقار علی بھٹو نے نہ صرف ایک ایرانی خاتون نصرت سے شادی کی بلکہ انہوں نے عملی سیاست میں آنے کے بعد انہیں زیادہ تر اپنے ساتھ رکھا۔ بھٹو خاندان کے بڑے بوڑھوں نے اس پر احتجاج بھی کیا لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے، جو تیسری دنیا کے عوام کو متحد کرنے کا خواب لے کر میدان میں نکلے تھے، اس پر قطعاً کوئی توجہ نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو کی سیاسی زندگی کے آغاز ہی میں ان کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو کی سیاسی تربیت شروع ہوگئی حالانکہ بھٹو مرحوم نے اپنی پہلی بیوی امیر بیگم کو کبھی سیاسی جلسوں میں مدعو نہیں کیا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کے بطن سے بے نظیر، مرتضیٰ، صنم اور شاہ نواز پیدا ہوئے اور بے نظیر نے غیر محسوس انداز میں سیاسی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اگرچہ صنم اور بے نظیر ایک ہی ماں کی بیٹیاں تھیں لیکن صنم کو سیاست سے جس قدر چڑ تھی بے نظیر کو اس سے اسی قدر لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں بے نظیر بھٹو کو سیاست کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ بھٹو جب وزیراعظم بنے تو وہ وزارت خارجہ کی اہم فائلیں بے نظیر کو مطالعہ کے لئے فراہم کیا کرتے تھے۔ اس طرح زمانہ طالب علمی ہی سے بے نظیر کو سیاست اور امور مملکت کے علاوہ بین الاقوامی معاملات سے آگاہی حاصل ہونا شروع ہوگئی۔ 1977ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد

ذوالفقار علی بھٹو نے مرتضیٰ اور شاہ نواز کو زبردستی ملک سے باہر بھیج دیا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ جرنیل کسی بھی رات ان کے گھر پر حملہ کر کے ان کے اہل خانہ، خصوصاً میر مرتضیٰ اور شاہ نواز کو قتل کر دیں گے کیونکہ ان کے دونوں صاحبزادے نہ صرف ان کے سیاسی وارث تھے بلکہ خاندان کی جائیداد کا کنٹرول بھی بہرحال کبھی نہ کبھی انہی کے ہاتھ میں جانا تھا۔ شاہ نواز کی مارشل لاء کے نفاذ کے وقت عمر صرف 21 سال تھی اس لئے انہوں نے اپنی والدہ کے فیصلے کو خاموشی سے تسلیم کیا لیکن مرتضیٰ اڑ گئے کیونکہ وہ اپنے والد کو جیل میں چھوڑ کر بیرون ملک فرار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ آخر کار ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم صاحبہ کے مسلسل اصرار پر مرتضیٰ بھی بیرون ملک جانے پر آمادہ ہوگئے۔ مارشل لاء حکام نے ابھی ان کے خاندان کو تختہ مشق نہیں بنایا تھا اس لئے وہ کسی مشکل کا سامنا کئے بغیر ملک سے چلے گئے۔ تاہم بے نظیر کو ذوالفقار علی بھٹو نے وطن ہی میں روک لیا کیونکہ وہ انہیں سیاسی میدان میں اپنی جانشین کے طور پر اپنے مخالفین کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح بے نظیر بھٹو ایک حادثے کے باعث انتہائی کم عمر میں عملی سیاست میں آگئیں اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعے ضیاء الحق کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ ضیاء الحق کے تصور میں بھی نہ تھا کہ ایک دبلی پتلی نوجوان سی لڑکی اپنے والد کی طرح لاکھوں کے مجمع کو اکٹھا کر سکتی ہے لیکن بے نظیر نے اپنے والد کی زندگی میں اور پھر ان کو پھانسی دیئے جانے کے بعد عوام سے رابطہ برقرار رکھا۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز اگر پاکستان میں موجود ہوتے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی سیاست کی بھٹی میں جاکر کندن بن سکتے تھے لیکن بدقسمتی سے انہوں نے سیاست کی بجائے تشدد کے راستے کو اختیار کرلیا اور اوائل زندگی میں ہی ان پر دہشت گرد کی چھاپ لگ گئی۔ خصوصاً 1981ء میں پی آئی اے کا طیارہ اغوا ہونے کے بعد رائے عامہ ان کے خلاف ہوگئی اور حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ مرتضیٰ اور شاہ نواز سیاست سے دور ہوتے چلے گئے۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز جانتے تھے کہ موت کے سائے ان کا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں اور انہیں کہیں بھی گولی ماری جاسکتی ہے اس لئے ان کے پروگرام کو عین آخری وقت تبدیل کر دیا جایا کرتا تھا۔ مرتضیٰ اور جنرل ضیاء الحق کے درمیان آنکھ مچولی کا سلسلہ 1988ء تک جاری رہا۔ 17 اگست 1988ء

کی سہ پہر جب ضیاء الحق بہاولپور کے نزدیک طیارے کے ایک حادثے میں ہلاک ہوئے تو مرتضیٰ کا کوئی ہاتھ تھا یا نہیں یہ ایک الگ بحث ہے لیکن یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ الذوالفقار نے 88-1977ء کے دوران متعدد مرتبہ ضیاء الحق کی جان لینے کی کوشش کی لیکن ضیاء الحق.ان تمام حملوں سے محفوظ رہے۔ واقفان حال کے مطابق مارشل لاء اٹھائے جانے کے بعد بعض اسلامی ممالک کے سفارتکاروں کی ذاتی کوششوں سے مرتضیٰ اور ضیاء الحق کے درمیان جاری جنگ ختم ہوگئی تھی لیکن اس کا رسماً اعلان اس لئے نہ کیا گیا کہ مرتضیٰ اپنے والد کے قاتل کے ساتھ بیٹھ کر اپنا سیاسی مستقبل داؤ پر نہیں لگانا چاہتے تھے جبکہ اس کے برعکس محترمہ بے نظیر بھٹو ضیاء الحق کی موجودگی میں بننے والی حکومت میں بطور وزیراعظم شامل ہونے کے لئے تیار تھیں حالانکہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے انہیں ضیاء الحق کو صدر مملکت تسلیم کرنا پڑتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرتضیٰ جذباتی فیصلے کرنے کے عادی تھے جبکہ بے نظیر فیصلے کرنے سے پہلے مستقبل پر نظر ڈال لیا کرتی تھیں۔ بے نظیر جانتی تھیں کہ ضیاء الحق کی سیاسی زندگی اب نہایت مختصر ہے کیونکہ وہ اسلام کا نام لے کر میدان میں آئے تھے اور اسلام پسندوں نے ہی انہیں مسترد کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ نے افغان جنگ کے دوران ضیاء الحق کو جس قدر استعمال کرنا تھا اس قدر ضیاء الحق استعمال ہو چکے تھے اور جہاں تک فوج کا تعلق ہے' ضیاء الحق کے بارے میں جرنیلوں کے دل میں بھی کوئی زیادہ اچھے جذبات نہ تھے کیونکہ 1976ء سے 1988ء تک مسلسل فوج کا سربراہ رہنے کی وجہ سے وہ کئی جرنیلوں کا حق چھین چکے تھے۔ بے نظیر بھٹو' جنہوں نے 1986ء میں وطن واپسی کے فوراً بعد فوج کے ساتھ ماضی کی تلخی بھلانے کے لئے عملی اقدامات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا' 1988ء کے انتخابات تک کم از کم اس حد تک فوج کا اعتماد حاصل کر چکی تھیں کہ جی ایچ کیو نے انہیں دفاع اور امور خارجہ کے علاوہ باقی محکموں کا جزوی کنٹرول دے دیا۔ بے نظیر بھٹو اگر اپنی حدود کا خیال رکھتیں اور فوج کے ساتھ کئے گئے معاہدے کے مطابق دفاع اور امور خارجہ سے متعلقہ امور میں فوج کی پالیسی کے برعکس اقدامات نہ کرتیں تو ممکن ہے کہ ان کا پہلا دور حکومت اس قدر مختصر نہ ہوتا جس قدر جلدی میں انہیں وزیراعظم ہاؤس سے رخصت کیا گیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے

1986ء میں خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے جب سرزمین پاکستان پر قدم رکھا تو اس وقت فوج کا کنٹرول ضیاء الحق کے ہاتھ میں تھا لیکن ایک ناگہانی حادثے کے باعث 17 اگست 1988ء کو فوج کی کمان جنرل مرزا اسلم بیگ کے ہاتھ میں چلی گئی جو ممکن ہے یہ حادثہ نہ ہوتا تو فوج کی قیادت حاصل کرنے کی خواہش دل میں ہی لے کر ریٹائر ہو جاتے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے پہلے دور حکومت (90-1988ء) میں اپنی والدہ پر دباؤ ڈال کر مرتضیٰ نے کو پاکستان نہ آنے دیا وگرنہ مرتضیٰ ضیاء الحق کی وفات کے فوراً" بعد وطن واپس آنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ مرتضیٰ بھٹو اور بے نظیر کے درمیان اختلافات کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ بیگم نصرت بھٹو نے ان تمام فنڈز کا کنٹرول مرتضیٰ کے ہاتھ میں دے دیا تھا جو انہیں اسلامی ممالک سے 1977ء میں مارشل لاء کے نفاذ اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد ملے تھے۔ علاوہ ازیں بھٹو کے غیر ملکی اکاؤنٹس کا کنٹرول بھی مرتضیٰ کے ہاتھ میں تھا جبکہ پاکستان میں موجود بھٹو خاندان کے اثاثوں کی نگران بے نظیر بھٹو تھیں۔ آصف زرداری بھی کسی حد تک بھٹو خاندان کے اثاثوں کی بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر نگرانی کر رہے تھے جبکہ بے نظیر بھٹو کی ایوان وزیراعظم میں موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آصف زرداری نے جو مال بنایا اس کی خبر مرتضیٰ کے علاوہ کسی اور کو نہ تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مرتضیٰ کو ہر اس غیر ملکی اکاؤنٹ کا پتہ چل جایا کرتا تھا جو آصف علی زرداری اپنے یا کسی اور کے نام پر بیرون ممالک میں کھلواتے تھے۔ مرتضیٰ نے بے نظیر بھٹو کو ان کے پہلے دور حکومت میں دستاویزی ثبوتوں کی مدد سے آصف علی زرداری کے ان اثاثوں کے بارے میں مطلع کیا جن کی خود بے نظیر یا بیگم نصرت بھٹو کو بھی خبر نہ تھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو مرتضیٰ کو اپنے لئے سیاسی خطرہ تصور کرتی تھیں کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ مرتضیٰ کی وطن واپسی کے فوراً" بعد خاندان کے امور ان کے ہاتھ میں چلے جاتے اور بے نظیر بھٹو کی حیثیت وہی رہ جاتی جو وڈیروں اور جاگیرداروں میں ایک لڑکی کی ہوتی ہے۔ یہ وہ خدشات تھے جو بے نظیر بھٹو نے خود اپنے دل میں پال رکھے تھے وگرنہ مرتضیٰ اپنی والدہ کے ذریعے متعدد مرتبہ بے نظیر بھٹو تک یہ پیغام بھیج چکے تھے کہ وہ ان کی سیاسی زندگی کے لئے کسی قسم کا خطرہ نہیں بنیں گے۔

جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی' فوج نے غلام اسحاق خاں کی مدد سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو ان کے پہلے دور حکومت میں 6 اگست 1990ء کو اقتدار سے محروم کر دیا حالانکہ انہوں نے اپنی پانچ سالہ مدت میں سے بمشکل دو سال ہی پورے کئے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد نواز شریف نے آہستہ آہستہ بے نظیر بھٹو کے خلاف وہ تمام مقدمات خارج کروادیئے جو نگران حکومت (غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام اسحاق خاں) نے فوج اور سول کی انٹیلی جینس ایجنسیوں کی مدد سے ان کے خلاف تیار کئے تھے۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ ان نوازشات کے بدلے میں بے نظیر انہیں پانچ سالہ مدت اقتدار پورا کرنے دیں گی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ محترمہ نے اقتدار سے محروم ہونے کے بعد نواز شریف کو اس طرح کے سگنل بھجوائے تھے کہ گویا وہ بطور اپوزیشن لیڈر اپنا کردار ادا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نواز شریف کو بے نظیر بھٹو کے اصل سیاسی چہرے کا پتہ چلتا گیا جس کے باعث انہوں نے اپنے دست راست اور انٹیلی جینس بیورو کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز احمد کی وساطت سے میر مرتضیٰ بھٹو کو بعض پیغامات بھجوائے جن کا واحد مقصد یہ تھا کہ مرتضیٰ وطن واپس آ کر سندھ کی سیاست میں حصہ لیں۔ تاہم ایک مرتبہ پھر بیگم نصرت بھٹو اپنے بیٹے کے سامنے کھڑی ہوگئیں اور انہوں نے مرتضیٰ کو وطن واپس آنے سے منع کر دیا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے کچھ اس طرح گزرا کہ سیاسی اتار چڑھاؤ نے حالات ایک مرتبہ پھر بے نظیر بھٹو کے حق میں کر دیئے اور سازشوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ وہی بے نظیر بھٹو جو اپنے خلاف مقدمات ختم کروانے کے لئے مسلم لیگی قیادت کی شرائط تسلیم کر کے قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ برائے امور خارجہ کی چیئرپرسن بن گئیں تھیں' اچانک اپریل 1993ء میں غلام اسحاق خاں کے ساتھ مل گئیں اور سازشوں کا یہ سلسلہ میاں نواز شریف کی معزولی پر ختم ہوا۔ نتیجتاً" دو نگران حکومتیں بنیں۔ پہلی نگران حکومت میر بلخ شیر مزاری کی سربراہی میں 18 اپریل 1993ء کو بنی تاہم 26 مئی 1993ء کو نواز شریف کی بطور وزیراعظم بحالی کے باعث نگران حکومت کا وجود خودبخود ختم ہوگیا اور اقتدار ایک مرتبہ پھر نواز شریف کے ہاتھ میں آگیا۔ لیکن ایوان صدر میں ہونے والی سازشوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا اور حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ

فوج کو درمیان میں کود کر غلام اسحاق خاں اور نواز شریف دونوں کو اقتدار سے الگ کرنا پڑا اور ایسا ملک کے "وسیع تر مفاد" میں کیا گیا اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے حمایت یافتہ اور امریکی گرین کارڈ ہولڈر معین قریشی کو نگران وزیراعظم بنا دیا گیا جنہوں نے فوج کی مدد سے از سر نو انتخابات کرائے اور اقتدار کی میوزیکل چیئر پر ایک مرتبہ پھر سے بے نظیر بھٹو کو بٹھانے کے انتظامات مکمل کر دیئے گئے۔ میر مرتضیٰ بھٹو جو 1988ء سے پاکستان میں اسمبلیوں کے بننے اور ٹوٹنے کا تماشا دیکھتے دیکھتے تنگ آگئے تھے آخر کار کشتیاں جلا کر وطن واپس آنے کے لئے تیار ہوگئے۔ مرتضیٰ کے پاس ان دنوں دو راستے تھے۔ پہلا راستہ یہ تھا کہ وہ خاموشی سے واپس آکر خود کو حکام کے حوالے کر دیں۔ جبکہ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عوام کی عدالت میں جائیں۔ چنانچہ مرتضیٰ نے دمشق میں بیٹھ کر 1993ء کے انتخابات میں حصہ لیا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو 1986ء میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد جب واپس آئی تھیں تو عوام کا سمندر ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مارشل لاء کو ختم ہوئے ابھی صرف چند ماہ ہی گزرے تھے اور عوام کو سات آٹھ سال بعد اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا موقع میسر آیا تھا۔ لاہور میں 10 اپریل 1986ء کو فقیدالمثال استقبال کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ایک سابق وزیراعظم کی بیٹی تھیں اور سابق وزیراعظم بھی وہ جسے مارشل لاء دور حکومت میں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا تھا۔ بے نظیر بھٹو کے اوپر اس وقت تک کرپشن کا کوئی الزام نہ تھا جبکہ اس کے برعکس میر مرتضیٰ بھٹو پر ہائی جیکنگ اور دہشت گردی کرانے کے الزامات تھے۔ گو کہ مرتضیٰ نے 1993ء کے انتخابات میں حصہ لینے سے قبل فوج کو بعض یقین دہانیاں کرائی تھیں۔ لیکن بھٹو خاندان کے مخالفین نے اس کے باوجود مرتضیٰ کو تنقید کا نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ بے نظیر بھٹو 1993ء کے انتخابات کے بعد اگرچہ وزیراعظم بن چکی تھیں اور بظاہر وہ فوج اور سول کے انٹیلی جینس اداروں کی Boss بھی تھیں لیکن انہیں اس بات کا اندازہ تک نہ تھا کہ ملٹری انٹیلی جینس کے بعض اہلکاروں کے مرتضیٰ کے ساتھ دوستانہ روابط ہیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی خواہش تھی کہ وہ اپنی سالگرہ (18 ستمبر 1993ء کو)

70 کلفٹن میں منائیں لیکن بے نظیر بھٹو کے ساتھ بعض معاملات طے نہ ہونے کے باعث انہوں نے وطن واپسی چند ہفتوں کے لئے موخر کر دی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے 10 ستمبر 1993ء کو میر مرتضیٰ کی متوقع وطن واپسی کو دیکھتے ہوئے کراچی میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن انہیں اس وقت انتہائی مایوسی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا جب مرتضیٰ کے حامی کارکن نہ صرف جلسہ گاہ میں داخل ہوگئے بلکہ انہوں نے سٹیج پر بھی قبضہ کرلیا اور وہ "زندہ ہے بھٹو زندہ ہے" "زندہ ہے بھٹو زندہ ہے"۔ جیئے مرتضیٰ، جیئے بھٹو" اور "وزیراعظم مرتضیٰ" "وزیراعظم مرتضیٰ" کے نعرے لگاتے ہوئے جلسہ گاہ پر چھا گئے۔ مرتضیٰ کے ان حامیوں نے ایسی شرٹس پہن رکھی تھیں جن پر مرتضیٰ کی تصاویر بنی ہوئی تھیں اور بے نظیر بھٹو اس وقت تک سٹیج پر نہ پہنچ سکیں جب تک ڈپٹی کمشنر اور ایس پی پولیس کراچی نے مرتضیٰ کے حامیوں کو منت سماجت کر کے سٹیج سے نیچے نہ اتارا۔

گویا میر مرتضیٰ بھٹو کی طرف سے بے نظیر کو یہ ایک اشارہ تھا کہ اگر انہوں نے "جیو اور جینے دو" کی پالیسی نہ اپنائی تو وہ ان کے لئے مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے 1993ء کے شروع میں ہی اپنی والدہ محترمہ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اب مزید کچھ عرصہ جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ "میں وطن واپس جاکر اپنے والد کا مشن پورا کروں گا"۔ مرتضیٰ نے پاکستان جانے کے متعلق اپنے فیصلے سے حافظ الاسد کو آگاہ کرتے ہوئے کہا" جو ذوالفقار علی بھٹو کے ذاتی دوستوں میں سے تھے اور یہ وہی حافظ الاسد ہیں، جنہوں نے بھٹو کے دونوں صاحبزادوں (مرتضیٰ اور شاہ نواز) کو ہر قسم کی اعانت فراہم کی اور ایسا کرتے وقت انہوں نے ضیاء الحق کی کسی قسم کی تجویز سے اتفاق رائے نہ کیا۔ مرتضیٰ بھٹو کی اہلیہ غنویٰ اپنے شوہر کی وطن واپسی کا پروگرام طے ہونے پر 1993ء کے وسط میں ہی پاکستان آچکی تھیں۔ غنویٰ بھٹو گو کہ ذوالفقار علی بھٹو کی بہو تھیں لیکن انہیں سیاست سے کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ غنویٰ کا پاکستان کی سیاست میں کسی قسم کا کوئی کردار ادا کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس لبنان کی شہریت تھی۔ 18 ستمبر 1993ء کو مرتضیٰ کی سالگرہ کے موقع پر غنویٰ نے 70 کلفٹن میں کیک کاٹا اور اس موقع پر مرتضیٰ نے دمشق سے اعلان کیا کہ

وہ قومی اور سندھ اسمبلی کی 17 نشستوں پر الیکشن لڑیں گے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو وطن واپسی کے موقع پر اچھی طرح علم تھا کہ ان کے مخالفین کسی نہ کسی وقت ان کو سیاسی منظر سے ہٹانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ انہوں نے 29 اکتوبر 1993ء کو اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو اور غنویٰ بھٹو کو دمشق سے ٹیلی فون پر ایک ایسی سازش سے آگاہ کیا جو ان کو قتل کرنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ مرتضیٰ نے سازشی عناصر کے بارے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی اشارہ نہ دیا۔ تاہم انہوں نے بیگم نصرت بھٹو کے ذریعے اپنی بہن کو یہ پیغام بھیجا کہ "بے نظیر! میرے دشمن دراصل تمہارے دشمن ہیں اور میرے قتل کے بعد تمہارے لئے آسانیاں نہیں بلکہ مشکلات پیدا ہوں گی"۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو جب مرتضیٰ کا یہ پیغام ملا تو وہ لرز گئیں کیونکہ وہ مرتضیٰ سے اختلاف رائے ضرور رکھتی تھیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ ان کی موت چاہتی تھیں۔

میر مرتضیٰ بھٹو چونکہ وطن واپسی کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے اس لئے شام کی انٹیلی جینس ایجنسی نے 30 اکتوبر 1993ء کو انہیں پاکستان کے سیاسی حالات کے بارے میں بریفنگ دی۔ مرتضیٰ کو بتایا گیا کہ پاکستان میں اگرچہ وزارت اعظمیٰ کا عہدہ ان کے خاندان کے پاس ہے لیکن اس کے باوجود انہیں قومی سطح کی سیاست میں حصہ لینے کے لئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے دمشق سے کراچی روانہ ہونے سے پہلے الطاف حسین سے بھی روابط قائم کئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایم کیو ایم اور الذوالفقار (جسے بعد ازاں شہید بھٹو گروپ کا نام دے کر ایک سیاسی جماعت میں تبدیل کیا گیا) نے ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کر لیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے جیسے کام میں پڑ کر اپنی توانائیاں ضائع نہیں کریں گی۔ مرتضیٰ نے وطن روانگی سے قبل شام کے صدر حافظ الاسد سے الوداعی ملاقات کی تو ان کی آنکھیں تشکر کے جذبات سے بھیگی ہوئی تھیں کیونکہ حافظ الاسد نے صحیح معنوں میں بھٹو کے ساتھ حق دوستی ادا کیا تھا اور انہوں نے 1977ء سے 1993ء کے دوران مرتضیٰ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دی۔ حافظ الاسد نے مرتضیٰ اور شاہ نواز کو خصوصی سیکورٹی فراہم کر رکھی تھی جبکہ مرتضیٰ کے ذاتی باڈی گارڈ بھی شام کی انٹیلی جینس ایجنسی کے تربیت یافتہ تھے۔ حافظ الاسد نے مرتضیٰ کو پاکستان آنے کے لئے ایک خصوصی

طیارہ فراہم کیا اور اس سلسلے میں حکومت پاکستان سے درخواست کی گئی کہ مرتضیٰ کو لانے والے طیارے کو کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت دے دی جائے لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو نے جو اس وقت وزیراعظم کے عہدے پر فائز تھیں، مرتضیٰ کے طیارے کو کراچی ایئرپورٹ پر نہ اترنے دیا جس پر مرتضیٰ کا طیارہ دوبئی چلا گیا جہاں بھٹو کے ایک اور دوست شیخ زید بن سلطان النہیان نے ان کو ہر ممکن مدد فراہم کی اور وہ اس طرح شیخ زید کی مدد سے ایک اور طیارے کے ذریعے نومبر 1993ء کی رات ایک بجکر 55 منٹ پر کراچی ایئرپورٹ پر پہنچے جہاں ملٹری انٹیلی جینس کے بعض اہلکار ان کا استقبال کرنے کے لئے موجود تھے اور فوج کی انٹیلی جینس ایجنسی نے اس قسم کے خصوصی انتظامات کر رکھے تھے کہ مرتضیٰ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ 16 سالہ جلا وطنی ختم کر کے وطن آنے پر مرتضیٰ نے اپنی بہن بے نظیر کی طرح کسی بڑے جلوس کی قیادت نہ کی کیونکہ وہ بے نظیر بھٹو کی طرح غیر ملکی سفارتکاروں کے ذریعے پاکستان پر دباؤ ڈال کر وطن واپس نہیں آئے تھے بلکہ ان کا کیس کافی حد تک مختلف تھا۔ بیگم نصرت بھٹو نے مرتضیٰ کو کراچی ایئرپورٹ پر طیارے سے باہر نکلتے ہی گلے لگایا، ان کے کندے پر امام ضامن باندھا اور گلے میں تعویز ڈالا تاکہ ان کا صاحبزادہ ممکنہ سازشوں سے محفوظ رہ سکے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی والدہ کی وساطت سے مرتضیٰ کو مبارکباد کا پیغام بھیجا لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ اگرچہ پاکستان میں بھٹو خاندان کی حکومت ہے لیکن اس کے باوجود مرتضیٰ کو تمام قانونی مراحل سے گزر کر سندھ اسمبلی پہنچنا پڑے گا جس کے وہ رکن تھے۔ بیگم نصرت بھٹو نے نومبر 1993ء کو کراچی جیل میں اپنے صاحبزادے کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا جبکہ آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جینس کے علاوہ ایف آئی اے اور پولیس نے متعدد مقدمات کے حوالے سے مرتضیٰ سے تفتیش کا سلسلہ جاری رکھا۔ مرتضیٰ کو 72 گھنٹے کی مسلسل نظر بندی اور تفتیش کے بعد 6 نومبر 1993ء کو کراچی کی ایک خصوصی عدالت میں لایا گیا جس نے مرتضیٰ کا 18 نومبر 1993ء تک جسمانی ریمانڈ دے دیا۔ مرتضیٰ کو جس خصوصی عدالت میں لایا گیا، ان کی والدہ اس وقت کمرۂ عدالت میں موجود تھیں اور وہ مسلسل قرآنی آیات کی تلاوت کر رہی تھیں۔ کمرہ عدالت کے اندر اور باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ مرتضیٰ سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں

اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے 6 نومبر 1993ء کو حلف لینے کی اجازت دے دی جائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا اور انہیں سندھ اسمبلی بھجوانے کی بجائے دوبارہ سیکورٹی ایجنسیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ مرتضیٰ نے سندھ اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے 8 نومبر 1993ء کو حلف اٹھایا۔ اسی روز مرتضیٰ نے کراچی کے اخبار نویسوں کو بتایا کہ انہیں فوج کی طرف سے پیغام بھیجا گیا تھا کہ وہ وطن واپسی کا ارادہ کم از کم 6 ماہ کے لئے موخر کر دیں۔ یہ پیغام کس نے بھجوایا تھا اور پیغام بر کون تھا اس کے بارے میں مرتضیٰ نے کوئی بات نہ کی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ ابھی وقت ایسا نہیں ہے کہ وہ حساس موضوعات پر گفتگو کریں۔

بیگم نصرت بھٹو کی خواہش پر سندھ حکومت نے انہیں مرتضیٰ کے ساتھ ملاقاتوں کے تمام تر مواقع فراہم کئے۔ بیگم نصرت بھٹو ہفتے میں ایک دو مرتبہ ضرور اپنے صاحبزادے کے ساتھ جیل میں کھانا کھاتی تھیں۔ مرتضیٰ شاہ بندر کیس کے سلسلے میں 25 نومبر 1993ء کو کراچی کی خصوصی عدالت میں پیش ہوئے اور عدالت نے سماعت مکمل کر کے فیصلہ محفوظ کر لیا۔ مرتضیٰ کو چونکہ مقدمات کا سامنا تھا اس لئے انہیں ضمانت پر رہا نہ کیا جا سکا۔ جوں جوں مرتضیٰ کی جیل میں زندگی طول پکڑتی جا رہی تھی توں توں بیگم نصرت بھٹو کا غصہ بڑھتا چلا جا رہا تھا کیونکہ وہ حیران تھیں کہ ان کی اپنی بیٹی وزیراعظم ہیں اور مرتضیٰ جیل میں بند ہے۔ 4 دسمبر 1993ء کو ایک مقدمے کی سماعت کے لئے مرتضیٰ کو جب کراچی کی خصوصی عدالت میں لایا گیا تو اس روز ایک طے شدہ منصوبے کے تحت مرتضیٰ کے ساتھیوں نے زبردست ہنگامہ کیا اور کمرۂ عدالت ”زندہ ہے بھٹو زندہ ہے“ ”زندہ ہے بھٹو زندہ ہے“ کے نعروں سے گونجتا رہا۔ ان حالات میں مرتضیٰ کو ضمانت پر کیسے رہا کیا جا سکتا تھا؟ اس لئے عدالت کے حکم پر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو کو ان کی صاحبزادی نے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ مرتضیٰ کی ضمانت رکوانے میں کوشاں نہیں ہے۔ ”ممکن ہے مرتضیٰ 4 دسمبر 1993ء کو رہا ہو جائے“۔ بیگم نصرت بھٹو نے غنویٰ کو بتایا لیکن غنویٰ کا خیال تھا کہ بے نظیر اتنی جلدی مرتضیٰ کو رہا نہیں کریں گی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ 4 دسمبر 1993ء کو ہی مرتضیٰ نے جیل سے اپنی والدہ کو پیغام بھجوایا تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو 5 دسمبر 1993ء کو پارٹی

کے مستقبل کے حوالے سے اہم فیصلے کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ 4 دسمبر 1993ء کو اگر مرتضیٰ کو ضمانت پر رہا کر دیا جاتا (جس کے تمام انتظامات مکمل تھے، لیکن عین وقت پر حکومت نے مرتضیٰ کو ضمانت پر رہا کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا) تو بیگم نصرت بھٹو اسی شام 70 کلفٹن پر ہنگامی پریس کانفرنس طلب کر کے اپنے بیٹے کو پاکستان پیپلز پارٹی کا سربراہ نامزد کر دیتیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو نے پھانسی کی کوٹھڑی میں بے نظیر بھٹو کی موجودگی میں اپنی اہلیہ کو پی پی پی کا تاحیات چیئرپرسن نامزد کیا تھا۔ بھٹو نے پہلے یہ عہدہ یحییٰ بختیار کو دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن یحییٰ بختیار کے انکار پر انہوں نے اس عہدے کے لئے اپنی اہلیہ کا انتخاب کیا کیونکہ جتوئی اور مولانا کوثر نیازی ایسے سیاستدانوں میں شامل تھے جو بھٹو کی زندگی کے بعد پارٹی کا سربراہ بننا چاہتے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنی والدہ پر اس وقت بہت غصہ آیا جب انہیں انٹیلی جینس بیورو کے ذریعے مرتضیٰ اور بیگم نصرت بھٹو کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کی ریکارڈنگ ملی جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے مرتضیٰ کو اپنے شوہر کا جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے پارٹی کے متعدد سینئر رہنماؤں سے مشاورت کی تھی۔ ان حالات میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا 5 دسمبر 1993ء کو لاہور میں اجلاس طلب کیا جس میں بیگم نصرت بھٹو نے شرکت نہ کی۔ پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کی کل تعداد 55 تھی جبکہ 5 دسمبر 1993ء کے اجلاس میں 25 ارکان شریک ہوئے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آٹھ دس ارکان بیگم صاحبہ کے ساتھ بھی تھے۔ اس اجلاس میں آفتاب شیرپاؤ، شیخ رفیق، این ڈی خاں، فتح محمد حسنی، جہانگیر بدر اور غیاث الدین جانباز نے ایک قرارداد پیش کی جس کے ذریعے محترمہ بے نظیر بھٹو کو کہا گیا کہ وہ پارٹی کی قیادت باضابطہ طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اس طرح پی پی پی کے یوم تاسیس کے موقع پر الحمرا ہال لاہور میں منعقدہ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں پی پی پی کی سربراہ بن گئیں۔ بیگم نصرت بھٹو نے جیسا کہ متوقع تھا اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انہوں نے اس روز بے نظیر بھٹو کا فون سننے سے بھی انکار کر دیا جو چاہتی تھیں کہ ان کی والدہ پارٹی کی سرپرست بن جائیں۔ بیگم نصرت بھٹو نے 6 دسمبر 1993ء کو کراچی میں اپنی رہائش گاہ پر

پریس کانفرنس طلب کر کے 5 دسمبر 1993ء کے فیصلے کو باضابطہ طور پر مسترد کر دیا اور وہ اس روز زار و قطار روئیں کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں تاحیات چیئرپرسن نامزد کیا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کا اخبار نویسوں سے جھگڑا ہونا کبھی بھی باعث حیرت نہیں رہا۔ وہ عموماً" اخبار نویسوں کے تلخ اور تند و تیز سوالوں کے باعث غصے میں آجایا کرتی تھیں اور اخبار نویس ان کی ڈانٹ ڈپٹ کا بہت کم برا مناتے تھے۔ 6 دسمبر 1993ء کو بیگم نصرت بھٹو نے جب اپنی باغی بیٹی کے خلاف پریس کانفرنس کی تو پہلے تو انہوں نے ایسے احباب کو خوب کوسا جو مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ضیاء الحق کے ساتھ مل گئے تھے اور بعدازاں انہوں نے رپورٹر حضرات کی بھی خوب خبر لی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مرتضیٰ کو پارٹی کا سربراہ بنانے کے متعلق ان کے عزائم کے بارے میں خبروں کی اشاعت کے بعد بے نظیر نے پارٹی پر قبضہ کیا حالانکہ بات دراصل یہ تھی کہ بے نظیر بھٹو نے ان کی مرتضیٰ کے ساتھ تنہائی میں ملاقاتیں محض اس لئے کروائی تھیں کہ وہ اپنی والدہ اور بھائی کے پوشیدہ منصوبوں سے باخبر ہو سکیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے پارٹی کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تو خوشامدی وزراء اور پارٹی لیڈروں نے اس فیصلے کو خوب سراہا اور انہوں نے اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعے یہ تاثر دیا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ ہی وہ واحد لیڈر ہیں جو پارٹی کو متحد رکھ سکتی ہیں۔ بہرحال محترمہ بے نظیر بھٹو پارٹی کی چیئرپرسن بن گئیں تو الذوالفقار کے کارکنوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے اپنے قائد کی رہائی کو یقینی بنانے کے لئے ملک بھر میں خصوصاً" کراچی میں مظاہروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نتیجتاً" بے نظیر بھٹو نے کراچی پولیس کو حکم دیا کہ امن عامہ کی صورتحال خراب کرنے کی کوشش کرنے والے تمام افراد کو زیر حراست لے لیا جائے۔ 10 دسمبر 1993ء کو مرتضیٰ کی رہائی کے لئے ہونے والے مظاہروں میں شدت آگئی۔ 11 دسمبر 1993ء کو جب مرتضیٰ کراچی کی عدالت میں پیش ہوئے تو مظاہرین میں خواتین بھی شامل تھیں، لیکن مرتضیٰ کی رہائی عمل میں نہ آسکی۔ 17 دسمبر کو مرتضیٰ کے بچے فاطمہ اور ذوالفقار جونیئر بھی پاکستان پہنچ گئے۔ صنم بھٹو جو مرتضیٰ کی وطن واپسی سے پہلے ہی مرتضیٰ اور بے نظیر بھٹو کے درمیان صلح کرانے کے لئے کوششوں میں مصروف ہوگئی تھیں ایک مرتبہ پھر سرگرم ہوگئیں۔ انہوں نے بے نظیر بھٹو کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ کم از کم مرتضیٰ کے بچوں اور بیوی سے ہی ملنے کے بہانے 70 کلفٹن چلی جائیں۔ اس خوشگوار تعلق کا آغاز کرانے کے لئے 17 دسمبر 1993ء کو مدینتہ الحکمت کراچی میں حکیم سعید کی نگرانی میں ہونے والی ایک تقریب کا انتخاب کیا گیا۔ صنم بھٹو نے اپنی والدہ اور بے نظیر بھٹو دونوں کو اس تقریب میں ملوایا اور اس موقع پر بے نظیر بھٹو نے بڑے پرجوش انداز میں اپنی والدہ کو گلے لگایا اور جواباً" بیگم صاحبہ نے بھی اپنی صاحبزادی کا اسی گرم جوشی سے بوسہ لیا اور انہیں دعائیں دیں۔ دیکھنے والے حیران تھے کہ ماں بیٹی میں یہ کس قسم کی لڑائی ہو رہی ہے کیونکہ ابھی دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی والدہ کو پارٹی کی قیادت سے اس طرح محروم کر دیا تھا جس طرح مکھن سے بال نکالا جاتا ہے۔ صنم بھٹو نے 19 دسمبر 1993ء کو بے نظیر بھٹو کی غنویٰ اور اس کے بچوں سے ملاقات طے کی اور بے نظیر اس روز کافی دیر تک اپنے بھائی کے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ گپ شپ لگاتی رہیں اسی روز آصف علی زرداری کو غلام حسین انہڑ کیس سے بری کر دیا گیا۔ یہ مقدمہ کئی سال سے چل رہا تھا اور آصف علی زرداری پر الزام تھا کہ انہوں نے غلام حسین انہڑ کی ٹانگ کے ساتھ بم باندھ کر ان سے بھاری رقم وصول کی جبکہ زرداری کا موقف تھا کہ وہ اغواء برائے تاوان کی اس واردات سے قطعاً" بے خبر ہیں۔ 19 دسمبر 1993ء کو بے نظیر بھٹو نے غنویٰ اور ان کے بچوں کو یقین دلایا کہ مرتضیٰ بہت جلد رہا ہو جائیں گے۔ بے نظیر بھٹو کی اس یقین دہانی کے بعد بیگم نصرت بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر منعقدہ تقریب میں مرتضیٰ کی شرکت کو یقینی بنانے کے لئے سندھ کے سیکرٹری داخلہ کو ایک درخواست ارسال کی جس میں مرتضیٰ کو پیرول پر رہا کرنے کے لئے استدعا کی گئی تھی۔ بے نظیر بھٹو اگر چاہتیں تو مرتضیٰ کو پیرول پر رہا کیا جاسکتا تھا، لیکن انہوں نے سندھ کے وزیراعلیٰ عبداللہ شاہ اور گورنر کمال اظفر کو ہدایت کی کہ ان کے والد کی 66 ویں سالگرہ کے موقع پر نوڈیرو میں منعقدہ تقریب میں کسی قسم کی بدمزگی نہ ہونے پائے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ مارشل لاء لگنے کے بعد بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر مرتضیٰ سندھ میں موجود رہے گو کہ مرتضیٰ جیل توڑ کر فرار نہ ہو سکتے تھے کیونکہ اگر انہوں نے جیل سے فرار ہی ہونا ہوتا تو وہ جلاوطنی کی زندگی ختم کر

کے پاکستان واپس کیوں آتے۔ لیکن اس کے باوجود یکم جنوری 1994ء کو کراچی جیل میں سیکورٹی کے غیر معمولی انتظامات کیے گئے۔ بیگم نصرت بھٹو نے جب دیکھا کہ بے نظیر بھٹو ان کے صاحبزادے کی رہائی میں دلچسپی نہیں رکھتی تو انہوں نے المرتضیٰ میں اپنے شوہر کی سالگرہ کی تقریب منعقد کرنے کا اعلان کر دیا اور مرتضیٰ کے ساتھیوں کو کہا گیا کہ وہ جوق در جوق 5 جنوری 1994ء کو المرتضیٰ پہنچیں کیونکہ مرتضیٰ کو اب دباؤ کے ذریعے رہا کروایا جائے گا۔ انٹیلی جینس بیورو نے بھٹو کی سالگرہ کے حوالے سے بے نظیر بھٹو کو جو رپورٹس ارسال کیں ان میں سفارش کی گئی تھی کہ مرتضیٰ کو پیرول پر رہا نہ کیا جائے کیونکہ مرتضیٰ اور بے نظیر کی سندھ میں موجودگی کے باعث امن عامہ کی صورتحال خراب ہونے کا خدشہ پیدا ہو جائے گا۔ "مرتضیٰ کے ساتھیوں نے اندرون سندھ اسلحہ منتقل کرنا شروع کر دیا"۔ بے نظیر بھٹو کو بھجوائی جانے والی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا۔ اس طرح کی رپورٹس اگرچہ معمول کا حصہ بن کر رہ گئیں تھیں لیکن اس کے باوجود بے نظیر بھٹو کی ہدایت پر نوڈیرو میں بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر منعقدہ تقریب میں شرکت کے لئے اس "پاس" کی موجودگی لازمی قرار دے دی گئی جو حکومت نے خصوصی طور پر جاری کیے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بیگم نصرت بھٹو تک کو یہ پاس جاری نہ ہوا جس پر بیگم صاحبہ نے کافی شور مچایا۔ 5 جنوری 1994ء کو بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر اندرون سندھ، خصوصاً" نوڈیرو اور المرتضیٰ میں بکتر بند گاڑیوں کا گشت جاری تھا جبکہ نوڈیرو کو جانے والی سڑک پر فوج اور رینجرز کے علاوہ پولیس کی بھاری نفری موجود تھی لیکن اس کے باوجود مرتضیٰ کے ساتھی نوڈیرو اور المرتضیٰ پہنچ گئے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کی سالگرہ کے موقع پر رنگا رنگ تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا جبکہ المرتضیٰ میں ان کی والدہ بھی اپنے شوہر کی سالگرہ کا کیک لے کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے دونوں بچے تک ان کے پاس موجود نہ تھے جس کی وجہ محض اور محض سیاست تھی۔ حالانکہ یہ وہی ماں بیٹی تھیں جو مارشل لاء کے زمانہ میں بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر جیل حکام کو درخواستیں بھیجا کرتی تھیں کہ انہیں بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر اپنے اہل خانہ کے ساتھ مل بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ مارشل لاء کے اس دور میں جب بھٹو خاندان زیر عتاب تھا' اس خاندان کے افراد ایک دوسرے کے دیکھنے کو

ترستے تھے لیکن مارشل لاء اٹھائے جانے کے بعد اور مرتضیٰ کی جلاوطنی ختم ہونے پر 1993ء میں صورتحال اس سے یکسر مختلف تھی۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کی سالگرہ کا کیک نوڈیرو میں کاٹا جبکہ مرتضیٰ کراچی جیل میں اس بات کے منتظر رہے کہ انہیں رہائی کا اجازت نامہ اب ملتا ہے کہ اب ملتا ہے۔ اس طرح خوشی کا یہ موقع بھی مرتضیٰ اور بے نظیر کے درمیان اختلافات کی خلیج کو مزید بڑھانے کا موجب بن گیا۔ اس پر ظلم یہ ہوا کہ سیکورٹی حکام نے لاڑکانہ میں مرتضیٰ کے ساتھیوں پر فائرنگ کرائی جس سے ایک کارکن ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے۔ بیگم نصرت بھٹو کو جب مرتضیٰ کے ساتھیوں کے ہلاک اور زخمی ہونے کی اطلاع ملی تو وہ اپنے بیٹے کی طرف سے فراہم کردہ باڈی گارڈ کے ہمراہ ہسپتال اور تھانوں میں پہنچ گئیں کیونکہ حکومت نے سینکڑوں نوجوانوں کو محض اس لئے تھانوں میں بند کر دیا تھا کہ وہ حکومتی تقریب میں شرکت کرنے کی بجائے بیگم نصرت بھٹو کی رہائش گاہ کے باہر جمع ہوگئے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو کو جب اس صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے کراچی جیل میں بھوک ہڑتال کر دی کیونکہ ان کے پاس اب احتجاج کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔

مرتضیٰ کی ضمانت پر رہائی اور
سیاسی اتار چڑھاؤ

بھٹو کی 66 ویں سالگرہ کے موقع پر 5 جنوری 1994ء کو سندھ میں جو ہنگامے ہوئے اس کا پس منظر یہ تھا کہ مرتضیٰ کی وطن واپسی کے فوراً بعد ہی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف سے بے نظیر کو اس طرح کی رپورٹس بھجوانے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جن سے پتہ چلتا تھا کہ الذوالفقار کا مرکزی دفتر شام سے 70 کلفٹن منتقل ہوگیا ہے اور مرتضیٰ کے دہشت گرد ساتھی 70 کلفٹن میں مقیم ہیں۔ مرتضیٰ کے بعض جانثار کارکنوں نے کراچی جیل کے گردونواح میں رہائش اختیار کر رکھی تھی تاکہ بوقت ضرورت وہ ہنگامی بنیادوں پر اپنے لیڈر کے پاس پہنچ سکیں جبکہ الذوالفقار کے ہی متعدد کارکن ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح حکومت کے قابو میں آگئے۔ ان میں سے ایک کارکن خالد خاں بھی تھا جس نے اس وقت کے وزیر داخلہ میجر جنرل (ریٹائرڈ) نصیراللہ بابر کا کام آسان کرتے ہوئے تحقیقاتی ٹیم کے سامنے انکشاف کیا کہ وہ بھارت سے تربیت حاصل کر چکے ہیں اور الذوالفقار کے کارکنوں کو اب بھی بھارت کے یوپی میں واقع فوجی کیمپ میں دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے۔ خالد خاں کے اس بیان کے علاوہ ایک لمبی چوڑی رپورٹ اور تصاویر پر مشتمل ایک سیل بند پیکٹ لے کر نصیراللہ بابر خود بے نظیر بھٹو کے پاس پہنچے اور انہوں نے وزیراعظم صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ اگر الذوالفقار کی سرگرمیوں کو سختی سے نہ کچلا گیا تو سندھ میں ایم کیو ایم کے عسکری ونگ کی طرح مرتضیٰ کا بھی عسکری ونگ مضبوط ہو جائے گا۔

مرتضیٰ کے بارے میں نصیراللہ بابر کی رپورٹ یہ تھی کہ وہ پاکستان پیپلزپارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے کے خود سربراہ بن جائیں گے اور جب بھی ان کی رہائی عمل میں آئی اس کے چند ہفتوں کے اندر پارٹی کو ہائی جیک کرنے کی کوشش ہوگی۔ بے نظیر بھٹو نے اس صورتحال میں بہتری اسی میں سمجھی کہ کسی نہ کسی طرح کم از کم 6 ماہ تک مرتضیٰ کو جیل میں ہی رکھا جائے کیونکہ ان کے اقتدار میں آنے کے ایک ماہ کے اندر ہی مرتضیٰ وطن واپس آگئے تھے اور وہ اس پوزیشن میں نہ تھیں کہ اپنے بھائی کی کسی قسم کی کوئی مدد کرسکیں۔ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں اس وقت کے وزیر داخلہ میجر جنرل (ریٹائرڈ) نصیراللہ بابر نے مرتضیٰ کی وطن واپسی کے فوراً بعد ہی 70 کلفٹن پر چھاپہ مارنے کے لئے تیاریاں شروع کر دی تھیں کیونکہ ان کی اطلاع کے مطابق بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی "را" کے تربیت یافتہ نوجوانوں نے مرتضیٰ کے سیکورٹی گارڈ کی حیثیت سے 70 کلفٹن میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ کراچی پولیس نے 16 جنوری 1994ء کو پہلی مرتبہ 70 کلفٹن پر چھاپہ مارا اور مرتضیٰ کے دو کارکنوں کو گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ مرتضیٰ کو جیل میں جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنی والدہ کو کہا کہ وہ بے نظیر بھٹو کو سمجھائیں کہ اگر پولیس کو کنٹرول نہ کیا گیا تو کسی روز انہیں بھی (مرتضیٰ کو) جعلی پولیس مقابلے میں قتل کر دیا جائے گا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے ان خدشات کا اظہار اس لئے کیا تھا کہ کراچی میں ان دنوں ملزموں، مجرموں اور سیاسی کارکنوں کو پولیس کی حراست میں ہلاک کر دینا معمول بن کر رہ گیا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو نے 16 جنوری 1994ء کو ہی بے نظیر بھٹو سے ملاقات کی اور انہیں سمجھایا کہ سازشی عناصر انہیں Misguide کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے دو ٹوک الفاظ میں اپنی والدہ پر واضح کیا کہ وہ مرتضیٰ کی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کی وزیراعظم بھی ہیں اور بطور سربراہ مملکت ان پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کو وہ ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے اس جواب سے بیگم صاحبہ سخت دل برداشتہ ہوئیں اور انہوں نے اپنی صاحبزادی کے ٹیلی فون Receive کرنا بند کر دیئے جس پر صنم بھٹو نے ایک مرتبہ پھر اپنی والدہ اور بہن کے درمیان غلط فہمی ختم کرانے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ صنم بھٹو کی کوشش تھی کہ بیگم صاحبہ اور بے

نظیر بھٹو کی غنویٰ اور ان کے بچوں سے 22 جنوری 1994ء کو ملاقات کروا دی جائے لیکن 21 جنوری 1994ء کو شام کے صدر حافظ الاسد کے صاحبزادے فوت ہوگئے جس کی وجہ سے بیگم نصرت بھٹو اپنی بہو غنویٰ بھٹو کے ہمراہ 22 جنوری کو دمشق چلی گئیں۔ مرتضیٰ بھٹو اگر جیل میں نہ ہوتے تو وہ بھی اپنی والدہ کے ہمراہ دمشق جاتے کیونکہ حافظ الاسد کے ان پر بڑے احسانات تھے۔ مرتضیٰ بھٹو نے پروگرام کے مطابق 3 نومبر 1993ء کو پاکستان آمد کے فوراً بعد مزار قائد پر حاضری دینے کے بعد کراچی کی تاریخی جلسہ گاہ ککری گراؤنڈ میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا اور اس سلسلے میں ککری گراؤنڈ میں ایک بڑا سٹیج تیار کیا گیا تھا' لیکن حکومت پاکستان نے مرتضیٰ کے اس طیارے کو کراچی ایئرپورٹ پر نہ اترنے دیا جس میں بیٹھ کر وہ پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہوئے تھے۔ سول ایوی ایشن اتھارٹی کے حکام نے حافظ الاسد کے فراہم کردہ طیارے کو مجبور کیا کہ وہ واپس چلا جائے۔ مرتضیٰ کے پاس اس روز دو راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ طیارے کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے قریبی ترین ملک میں اتر جائے اور ظاہر ہے کہ قریبی ترین ملک بھارت ہی تھا۔ مرتضیٰ نے صورتحال کو دیکھتے ہوئے طیارے کے پائلٹ کو کہا کہ وہ بھارت جانے کی بجائے دوبئی چلا جائے کیونکہ متحدہ عرب امارات کے فرمانروا کے ساتھ ان کے خصوصی مراسم تھے۔ مرتضیٰ بھٹو جانتے تھے کہ اگر وطن واپسی کے موقع پر ان کا طیارہ بھارت کی فضائی حدود میں داخل ہوگیا تو پاکستان میں بھونچال آجائے گا اور ان کا سیاسی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ اگرچہ مرتضیٰ کو پاکستان آمد سے قبل ہی علم تھا کہ انہیں اپنے وطن میں انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن انہیں اس بات کا شاید اندازہ نہ تھا کہ بے نظیر بھٹو انہیں جیل میں ڈال کر ان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو جائیں گی۔ بیگم نصرت بھٹو بھی اپنے صاحبزادے کی مسلسل نظربندی کی وجہ سے پریشان تھیں اس لئے 29 جنوری 1994ء کو جب خصوصی عدالت کے جج علی احمد جونیجو نے مقدمہ کی سماعت شروع کی تو بیگم صاحبہ غصے میں کھڑی ہوگئیں اور انہوں نے جج صاحب کو ڈانٹنا شروع کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ خصوصی عدالت مقدمے کی راست طریقے سے سماعت نہیں کر رہی۔ جسٹس علی احمد جونیجو اور بیگم نصرت بھٹو کے درمیان اس روز سخت الفاظ کا تبادلہ ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا

کہ جج صاحب نے مرتضیٰ کی درخواست ضمانت مسترد کر دی۔ بے نظیر بھٹو کو جب پتہ چلا کہ ان کی والدہ کا خصوصی عدالت کے جج کے ساتھ جھگڑا ہوگیا ہے تو انہوں نے کہا کہ "ماما! آپ نے مرتضیٰ کا کیس خود خراب کر دیا ہے"۔ اس واقعے کے بعد بیگم صاحبہ اور بے نظیر کے درمیان مجموعی طور پر تعلقات کشیدہ ہی رہے۔ اس وقت کے اپوزیشن لیڈر میاں نواز شریف نے ماں بیٹی کے جھگڑے کے حوالے سے پوچھے جانے والے سوالات کے جواب میں صحافیوں کو کہا کہ میں اس خاتون کو کیسے قابل اعتبار سمجھ سکتا ہوں جس نے اپنی والدہ کو بھی معاف نہیں کیا۔ مرتضیٰ بھٹو کو پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں خصوصی دلچسپی تھی اور انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کیلئے جو مقالا تیار کیا تھا وہ ایٹمی ٹیکنالوجی کے استعمال سے متعلق تھا۔ لیکن مرتضیٰ کو اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری نہ مل سکی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت کے ابتدائی مہینوں میں ہی پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کے حوالے سے اخبارات میں متنازعہ خبریں شائع ہونا شروع ہوگئیں۔ ہوا یوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اخبار نویسوں کے ساتھ دوران گفتگو ایک مرتبہ اقرار کیا کہ ایٹمی پروگرام جولائی 1990ء میں رول بیک ہوا تھا اور یہ وہ مہینہ تھا جب وہ خود برسراقتدار تھیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو یہ اقرار کرنے کے بعد پھنس گئیں اور ان کا میڈیا ٹرائل شروع ہوگیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے ملنے پر کھل کر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد کو پاکستان کا ایٹمی پروگرام شروع کرنے کی پاداش ہی میں پھانسی کی سزا دلوائی گئی تھی لیکن بے نظیر بھٹو نے ایٹمی پروگرام پر ڈپلومیٹک انداز میں گفتگو کرنے کا سلسلہ برقرار رکھا جس کے باعث متعدد ارکان کابینہ نے بھی احتجاج کیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کرے۔ فروری اور مارچ 1994ء کے دونوں مہینوں میں بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے درمیان تعلقات بدستور خراب رہے جس کی ایک جھلک اس وقت دیکھنے کو ملی جب بھٹو کی برسی کے موقع پر بھی ماں بیٹی ایک چھت تلے نہ بیٹھ سکیں۔ 4 اپریل 1994ء کو بھٹو کی برسی کے موقع پر بے نظیر بھٹو نے سرکاری وسائل خرچ کرکے گڑھی خدا بخش میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا جبکہ بیگم نصرت بھٹو نے اس روز 70 کلفٹن پر قرآن خوانی کی۔ بیگم

نصرت بھٹو کے مرتضیٰ کی واپسی کے بعد اگرچہ اپنی صاحبزادی بے نظیر بھٹو کے ساتھ تعلقات کوئی زیادہ اچھے نہ رہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی صاحبزادی پر تنقید سے احتراز کرتی رہیں۔ تاہم بھٹو کی برسی کے موقع پر 4 اپریل 1994ء کو حکومت نے مرتضیٰ کے کارکنوں کو جس طرح گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا اس کے بعد بیگم نصرت بھٹو نے حکومت پر زبردست تنقید کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سارے کھیل میں صنم بھٹو نے انتہائی مثبت کردار ادا کیا اور ان کی شٹل ڈپلومیسی کی وجہ سے غنویٰ اور نصرت بھٹو 15 اپریل 1994ء کو بلاول ہاؤس گئیں جہاں آصف زرداری کی موجودگی میں بے نظیر کی غنویٰ اور ان کی والدہ سے ملاقات کرائی گئی۔ اس دوران بھٹو خاندان کے افراد کے درمیان خوب گلے شکوے ہوئے اور آخرکار بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری نے غنویٰ بھٹو کو یہ یقین دلا کر رخصت کیا کہ ان کے دل میں مرتضیٰ کے خلاف کوئی بغض نہیں ہے اور مرتضیٰ کی سیاست میں آمد سے انہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ "میر مرتضیٰ بھٹو رہا بھی ہو جائے گا آپ لوگ فکر نہ کریں" آصف زرداری نے غنویٰ کے بچوں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ اس طرح بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر بھٹو کی اہلیہ اور بیٹی کے درمیان پیدا ہونے والی رنجشیں بظاہر ختم ہوگئیں۔ اس کے بعد غنویٰ 23 اپریل 1994ء کو لاہور آئیں کیونکہ 25 اپریل 1994ء کو چوہدری ظہور الٰہی قتل کیس میں فیصلہ متوقع تھا۔ پنجاب میں اس وقت وزارت اعلیٰ کا قلمدان میاں منظور وٹو کے ہاتھ میں تھا۔ وٹو نے چوہدری ظہور الٰہی کیس میں حکومتی وکیل کو جو ہدایت دے رکھی تھی اس کی روشنی میں حکومت نے مقدمے کی سماعت کے دوران ایسا تاثر دیا کہ گویا حکومت کو مرتضیٰ کی رہائی پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس لئے انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالت نے 25 اپریل 1994ء کو مرتضیٰ کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ غنویٰ بھٹو کے لئے یہ فیصلہ خلاف توقع نہ تھا اور لگتا تھا کہ انہیں کراچی سے لاہور آنے سے پہلے ہی اس بات کا یقین تھا کہ ان کے شوہر کی چوہدری ظہور الٰہی کیس میں ضمانت پر رہائی کے باوجود مرتضیٰ کو کراچی جیل سے نہ نکالا گیا کیونکہ ابھی شاہ بندر کیس کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ بے نظیر بھٹو اپنے بھائی کے خلاف ایک مقدمہ ختم ہونے پر خوشی کے اظہار کے لئے 29 اپریل 1994ء کو 70 کلفٹن گئیں جہاں انہوں نے والدہ اور بھابی کو مبارکباد دی

اور اس توقع کا اظہار کیا کہ مرتضیٰ کے خلاف باقی مقدمات مئی 1994ء کے آخر تک ختم ہو جائیں گے۔

کراچی کی خصوصی عدالت نے میر مرتضیٰ بھٹو کو شاہ بندر کیس میں 6 جون 1994ء کو ضمانت پر رہا کر دیا جس پر نواز شریف نے انہیں مبارکباد دی حالانکہ مرتضیٰ پر مسلم لیگ کے مرکزی رہنما چوہدری ظہور الٰہی کے قتل کا الزام تھا جبکہ ضیاء الحق کے طیارے کی تباہی کے سلسلے میں بھی ان پر ماضی میں الزامات عائد کئے جا چکے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو کو مبارکباد دینا دراصل نواز شریف کی چال تھی۔ مرتضیٰ نے رہائی کے بعد 4 دن 70 کلفٹن پر قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے ذاتی دوستوں سے آزادانہ ماحول میں ملاقاتیں کیں اور 10 جون 1994ء کو وہ کراچی سے لاڑکانہ روانہ ہوگئے جہاں ان کی دستار بندی کی گئی۔ اس موقع پر مرتضیٰ نے کہا کہ "بے نظیر! تمہارا ہر دکھ میرا دکھ ہے اور تمہارا ہر خواب میرا خواب ہے مگر یاد رکھنا ہمارے خلاف سازشوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا"۔ مرتضیٰ نے 10 جون 1994ء کو اپنے اور بے نظیر بھٹو کے خلاف سازشیں کرنے والوں کا ذکر تو کیا لیکن اس موضوع پر انہوں نے کھل کر گفتگو نہ کی۔ تاہم آٹھ دن بعد انہوں نے سندھ میں اپنے ذاتی دوستوں کو بتایا کہ ایک ڈی ایس پی کو میرے قتل کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ مرتضیٰ کے دوستوں نے بارہا پوچھا کہ وہ ڈی ایس پی پولیس کون ہے اور اسے کس نے ان کے قتل کا مشن سونپا ہے لیکن مرتضیٰ خاموش رہے۔ البتہ انہوں نے اپنے ذاتی محافظوں کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا۔

میر مرتضیٰ بھٹو کا انداز سیاست

میر مرتضیٰ بھٹو نے 16 سالہ جلا وطنی کے بعد سرزمین پاکستان پر قدم رکھا تو انہیں اندازہ ہوا کہ اگرچہ 1977ء سے 1993ء کے دوران بہت ساری اقدار اور بہت ساری چیزیں تبدیل ہو چکی ہیں لیکن اگر نہیں بدلے تو سیاست کے اصول ہی نہیں بدلے۔ 1947ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد سیاستدانوں نے ایک دوسرے کی لاشوں پر چڑھ کر سیاست کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ 1993ء میں بھی قائم و دائم تھا اور مخالفین کو برداشت کرنے کا جذبہ کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ان حالات میں مرتضیٰ کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا کیونکہ ملک میں ان کے مخالفین زیادہ اور چاہنے والے کم تھے۔ خود مرتضیٰ کو اپنے خاندان کے بعض افراد کی مخالفت کا سامنا تھا۔ 30 اکتوبر 1993ء کو جب مرتضیٰ دمشق میں اپنا سامان پیک کر کے وطن واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے اس وقت پاکستان میں 10 سیاستدان صدارتی الیکشن لڑنے کے لئے جوڑ توڑ میں مصروف تھے جن میں غلام اسحاق خاں' اصغر خاں' افتخار گیلانی' یحییٰ بختیار' نواب اکبر بگٹی' نواب زادہ نصراللہ خاں' آفتاب شعبان میرانی' فاروق لغاری' وسیم سجاد' سرتاج عزیز' گوہر ایوب خاں' بلخ شیر مزاری اور جنرل (ریٹائرڈ) مجید ملک شامل تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کیم نومبر 1993ء تک صدارتی امیدوار کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور قرین قیاس یہی تھا کہ بیوروکریٹس کے امام غلام اسحاق خاں کو ایک مرتبہ پھر ملک کا صدر منتخب کرلیا جائے گا کیونکہ غلام اسحاق خاں نے بے نظیر بھٹو کو اقتدار دلوانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اگر غلام اسحاق خاں 8 اپریل 1993ء کو نواز شریف کی حکومت ختم نہ کرتے تو ممکن ہے کہ بے نظیر بھٹو اس قدر جلدی وزیراعظم ہاؤس میں نہ

پہنچ پاتیں۔ میر مرتضیٰ کو پاکستان میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں گہری دلچسپی تھی کیونکہ آنے والے دنوں میں نیوٹرل صدر ان کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن جب نومبر 1993ء کو وہ دمشق میں اپنے دوستوں سے الوداعی ملاقاتیں کر رہے تھے تو انہیں اطلاع ملی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے غلام اسحاق خاں کو صدارتی امیدوار نامزد کرنے سے معذوری ظاہر کر دی ہے۔ مرتضیٰ بھٹو نے اس اطلاع پر قہقہہ لگایا کیونکہ وہ خود بھی یہی سوچ رہے تھے کہ بے نظیر بھٹو اس شخص کو کبھی دوبارہ اپنے اوپر مسلط نہیں کریں گی جس نے انہیں ان کے پہلے دور حکومت میں معزول کر کے مقدمات میں الجھا دیا تھا۔ مرتضیٰ نے ملک مجید کو بتایا کہ بے نظیر بھٹو صدارتی الیکشن میں آفتاب شیر پاؤ یا سردار فاروق لغاری کو اپنی پارٹی کا امیدوار نامزد کریں گی۔ میر مرتضیٰ بھٹو پاکستان کے سیاسی امور سے اس لئے بھی آگاہ رہتے تھے کہ ان کے ساتھی انہیں ملک کے سیاسی حالات کے متعلق روزانہ جائزہ رپورٹیں ارسال کرتے تھے۔ 2 نومبر 1993ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے صدارتی انتخابات کے حوالے سے جنرل عبدالوحید سے صلاح و مشورہ کیا جو اس وقت فوج کے سربراہ تھے۔ جنرل عبدالوحید کو علم تھا کہ مرتضیٰ اگلے 24 گھنٹوں میں پاکستان پہنچنے والے ہیں لیکن دونوں کے درمیان مرتضیٰ بھٹو کے حوالے سے کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ بے نظیر بھٹو نے 2 نومبر 1993ء کو جی ایچ کیو سے نکلتے نکلتے جنرل عبدالوحید کو کہا کہ وہ غلام اسحاق خاں کی حمایت نہیں کریں گی۔ فوج کو صدارتی الیکشن میں حصہ لینے والے بعض امیدواروں پر اعتراض تھا جبکہ سردار فاروق احمد خاں لغاری اور اصغر خاں کے نام اس فہرست میں شامل تھے جس پر فوج یا آئی ایس آئی کو قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا۔ بے نظیر بھٹو کی جنرل عبدالوحید کے ساتھ ملاقات اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ جنرل عبدالوحید نے کافی حد تک بے نظیر کو فری ہینڈ دیتے ہوئے کہا کہ وہ فلاں فلاں افراد میں سے جس کو چاہیں صدارتی امیدوار نامزد کرلیں۔ تاہم اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی جنرل جاوید اشرف قاضی نے بے نظیر بھٹو کو مشورہ دیا کہ چونکہ ان کا تعلق سندھ سے ہے اس لئے اگر پنجاب سے تعلق رکھنے والے کسی مضبوط اور ایماندار شخص کو صدارتی امیدوار نامزد کر دیا جائے تو یہ ان کے اور ملک کے مفاد میں بہتر ہوگا۔ اس طرح قرعہ فال سردار فاروق احمد خاں لغاری کے نام نکلا۔ بے

نظیر بھٹو نے 2 نومبر 1993ء کو غلام اسحاق خاں سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی جماعت میں شامل ارکان کی اکثریت انہیں صدارتی امیدوار کے طور پر آگے بڑھانے کے حق میں نہیں ہے۔ ”آپ اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لیں“۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے غلام اسحاق خاں کو مشورہ دیا جس پر وہ بولے کہ انہیں صدارتی الیکشن لڑنے کے لئے جونیجو لیگ نے آمادہ کیا تھا اور میں جو بھی فیصلہ کروں گا اسے آپ کی حلیف جماعت (جونیجو لیگ) کی تائید و حمایت حاصل ہوگی۔ گویا غلام اسحاق خاں اس طرح بلیک میلنگ پر اتر آئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو غلام اسحاق خاں کے اس انداز سے قطعاً مرعوب نہ ہوئیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ غلام اسحاق خاں اتنی آسانی سے سیاست سے ریٹائرمنٹ لینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

3 نومبر 1993ء کا دن بے نظیر بھٹو کے لئے آزمائش کا دن تھا کیونکہ اس روز صدارتی الیکشن میں حصہ لینے والے امیدواروں نے اپنے کاغذات نامزدگی واپس لینا تھے اور ان کی اطلاع کے مطابق کاغذات نامزدگی واپس لینے والوں میں غلام اسحاق خاں کا نام شامل نہ تھا۔ حالانکہ کاغذات نامزدگی واپس لینے کا وقت گزر چکا تھا۔ دوسری طرف سے انہیں شام سے اطلاع ملی کہ میر مرتضٰی بھٹو حافظ الاسد کے خصوصی طیارے کے ذریعے پاکستان روانہ ہونے والے ہیں۔ بیگم نصرت بھٹو کا اس روز اصرار تھا کہ مرتضٰی بھٹو کو کراچی کی ککری گراؤنڈ میں جلسہ کرنے کی اجازت دی جائے جبکہ حکومت کو سیکورٹی حکام کی طرف سے بھجوائی جانے والی رپورٹس میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ اگر مرتضٰی کو گرفتار نہ کیا گیا تو کراچی میں امن عامہ کی صورتحال خراب ہو جائے گی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے آخر کار 3 نومبر 1993ء کی شام مرتضٰی بھٹو کو گرفتار کرنے کی اجازت دے دی جس پر ان کی والدہ سخت ناراض ہوئیں اور انہوں نے 70 کلفٹن پر مرتضٰی کے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے لئے تو آج بھی مارشل لا حکومت ہی برقرار ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نہیں چاہتی تھیں کہ مرتضٰی جن پر ہائی جیکنگ جیسے الزامات تھے وطن واپس آنے کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو جائیں کیونکہ انہیں ابھی صدارتی الیکشن میں اپنے امیدوار کو کامیاب کرانا تھا اور مرتضٰی کی کسی غلط حرکت کی وجہ سے پی پی پی کا ووٹ بنک متاثر ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

حکومت نے مرتضٰی کو گرفتار کرنے کے بعد جیل بھجوا دیا اور خود بے نظیر صدارتی الیکشن میں کامیابی کے لئے مخالفین اور حلیفوں سے ساز باز میں مصروف ہوگئیں۔ بیگم نصرت بھٹو نے مرتضٰی کی وطن واپسی کے بعد جب کراچی جیل میں ان سے ملاقات کی تو اس وقت سردار فاروق احمد خاں لغاری پی پی کے صدارتی امیدوار کے طور پر سامنے آچکے تھے جبکہ مسلم لیگ نے وسیم سجاد کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا تھا۔ 13 نومبر 1993ء کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں سردار فاروق احمد خاں لغاری 274 ووٹ لے کر کامیاب ہوئے جبکہ ان کے مخالف وسیم سجاد کو 168 ووٹ ملے۔ میر مرتضٰی بھٹو نے جیل سے ہی اپنی والدہ کے ذریعے بے نظیر بھٹو کو متعدد مرتبہ پیغام بھیجا کہ وہ ان کے خیر خواہ ہیں۔ ”مجھ سے مت ڈرو، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں بلکہ تمہارے دشمن تمہاری اپنی صفوں میں موجود ہیں“۔ مرتضٰی نے بے نظیر کو پیغام بھیجا لیکن اس کے باوجود وزیراعظم ہاؤس سے کوئی ایسا حکم جاری نہ ہوا جس سے مرتضٰی کی رہائی میں آسانی پیدا ہوتی۔ مرتضٰی بھٹو نے ہی بے نظیر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی پہلی ترجیح کے طور پر 8 ویں ترمیم کی متنازعہ دفعات ختم کر دیں کیونکہ سردار فاروق احمد خاں لغاری کسی بھی مرحلے پر ان کے ساتھ دھوکہ کر سکتے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو خود بھی 8 ویں ترمیم ختم کرنا چاہتی تھیں اور وہ صدارتی الیکشن سے قبل ہی سردار فاروق احمد خاں لغاری سے وعدہ لے چکی تھیں کہ وہ 8 ویں ترمیم ختم کرنے کے سلسلے میں ان کی مدد کریں گے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری کو جب پتہ چلا کہ مرتضٰی نے 8 ویں ترمیم ختم کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے تو انہوں نے بھی 8 ویں ترمیم کے خلاف بیان بازی شروع کر دی۔ جس پر بے نظیر نے 8 ویں ترمیم، خصوصاً 58 (2 بی) جس کے تحت صدر کو اسمبلی توڑنے کے صوابدیدی اختیارات حاصل تھے، ختم کرنے کا معاملہ موخر کر دیا کیونکہ ان کے ذہن میں ایک بات بیٹھ چکی تھی کہ مرتضٰی انہیں سیاسی میدان میں شکست دینے کے لیے سیاست کر رہا ہے۔ مرتضٰی بھٹو نے ہی بے نظیر بھٹو کو جیل سے مشورہ دیا تھا کہ وہ میاں نواز شریف کے ساتھ تعلقات بہتر بنائیں کیونکہ نواز شریف کو انتقامی سیاست کا نشانہ بنانے سے پی پی پی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مرتضٰی بھٹو کے اس مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے نواز شریف کے خاندان کی فیکٹریوں کو نیلام

کرنے کے لئے منصوبہ بندی شروع کر دی جبکہ سرحد میں مسلم لیگ کی مخلوط حکومت، جس کے سربراہ وزیراعلیٰ صابر شاہ تھے، کے خلاف بھی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آفتاب شیرپاؤ نے سرحد کے ارکان اسمبلی کو پشاور سے کراچی پہنچا دیا۔ 16 فروری 1994ء کو پی پی پی نے صابر شاہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کر دی جبکہ رائے شماری کے لئے 23 فروری کی تاریخ مقرر ہوئی مگر اس روز سپیکر ہدایت اللہ چمکنی نے دو ارکان کو نااہل قرار دے کر اجلاس 31 مارچ تک ملتوی کر دیا۔ ہدایت اللہ چمکنی کے اس فیصلے کو بے نظیر نے جمہوریت کے خلاف سازش قرار دیتے ہوئے سردار فاروق احمد خاں لغاری کو کہا کہ وہ سرحد میں گورنر راج نافذ کردیں۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری کی کیا مجال تھی کہ وہ بے نظیر بھٹو کی بات پر عمل نہ کرتے۔ چنانچہ 25 فروری 1994ء کو سرحد اسمبلی معطل کر کے گورنر راج نافذ کر دیا گیا اور 23 اپریل 1994ء کو آفتاب شیرپاؤ سرحد کے وزیراعلیٰ چن لئے گئے تھے۔ نومبر 1993ء سے اپریل 1994ء کے دوران محترمہ بے نظیر نے ہر سطح پر محاذ کھول دیئے۔ انہوں نے سب سے پہلے 5 دسمبر 1993ء کو پی پی پی کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی جبکہ بعدازاں 5 جنوری 1994ء کو بھٹو کی سالگرہ اور 4 اپریل 1994ء کو بھٹو کی برسی کے موقع پر مرتضیٰ کے حامیوں کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرتضیٰ اور بے نظیر بھٹو کے درمیان خاندان کے اثاثوں کی تقسیم سے شروع ہونے والی سیاسی لڑائی دشمنی کی شکل اختیار کر گئی۔ بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر آصف علی زرداری بعض خدشات کے باعث مرتضیٰ سے خوف زدہ رہنے لگے۔ اس کی کسی حد تک ذمہ داری میجر جنرل (ریٹائرڈ) نصیراللہ بابر پر بھی عائد ہوتی تھی جو مسلسل بے نظیر اور آصف علی زرداری پر ممکنہ قاتلانہ حملے کے حوالے سے وزیراعظم ہاؤس کو رپورٹس ارسال کر رہے تھے۔ اس طرح کی متعدد رپورٹس بے نظیر بھٹو کی پولیٹیکل سیکرٹری ناہید خاں کی بھی نظر سے گزریں۔ ناہید خاں کے بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ناہید کے ان سیاستدانوں کے ساتھ خصوصی مراسم تھے جو مرتضیٰ کے خلاف تھے اور جنہوں نے سندھ میں 1993ء کے انتخابات میں مرتضیٰ سے شکست کھائی تھی۔ محض مرتضیٰ بھٹو کے بے نظیر بھٹو کے ساتھ اختلافات اپنی جگہ پر سہی لیکن انہوں نے اپنی ہمشیرہ اور ان کے بچوں کے خلاف کبھی کوئی ایسی سازش تیار نہ کی جس سے انہیں جسمانی طور پر کوئی نقصان پہنچانا مقصود ہو۔ البتہ آصف علی زرداری اور مرتضیٰ بھٹو دونوں ایک دوسرے کی حرکات جاننے کے لئے ایک دوسرے کی جاسوسی کرواتے رہتے تھے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے 5 جون 1994ء کو ضمانت پر رہا ہونے کے بعد اپنی آنٹی بیگم منور الاسلام سے بھی ملاقاتیں کیں کیونکہ منورالاسلام چاہتی تھیں کہ بھٹو خاندان کے تمام افراد اپنے اپنے اختلافات بھلا کر متحد ہو جائیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے 18 جولائی 1994ء کو کہا کہ اگر بے نظیر اپنی والدہ کو پارٹی کی دوبارہ چیئرپرسن بنا دیں تو میرے ان کے ساتھ تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے اور ہم نواز شریف کا مل کر مقابلہ کریں گے۔ انہوں نے یہ یقین دہانی اس وقت کرائی جب وہ اپنے چھوٹے بھائی شاہ نواز کی 9 ویں برسی کے موقع پر لاڑکانہ گئے۔ بیگم نصرت بھٹو اور خاندان کے تقریباً تمام افراد شاہ نواز کی برسی کے موقع پر موجود تھے، لیکن اگر کوئی نہ تھا تو وہ محترمہ بے نظیر بھٹو تھیں جو 21 اگست 1985ء کو اپنے بھائی کی لاش لے کر فرانس سے پاکستان آئی تھیں۔ لیکن ان 9 برسوں کے دوران خاندان کا اتفاق اور محبت بکھر گیا تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے شاہ نواز کی برسی کے فوراً بعد عوامی رابطہ مہم شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے لاہور کو منتخب کیا۔ وہ 20 جولائی 1994ء کو لاہور آئے اور ہزاروں افراد نے ان کا استقبال کیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے لاہور میں تین دن گزارے۔ 22 جولائی 1994ء کو انہوں نے بادشاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی بادشاہی مسجد کے خطیب مولانا آزاد مرتضیٰ کو اپنے سامنے دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے کیونکہ ان کے والد بھی اس مسجد میں کئی مرتبہ نماز ادا کر چکے تھے۔ مولانا آزاد نے مرتضیٰ کو پیشکش کی کہ وہ ان کی محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ صلح کرانے کے لئے تیار ہیں۔ مرتضیٰ نے یہ پیشکش قبول کرلی۔ اس سے پہلے کہ مولانا آزاد اس روز محترمہ بے نظیر بھٹو سے رابطہ قائم کرتے، مرتضیٰ کو کراچی سے اطلاع ملی کہ ان کی پھوپھو بیگم منور الاسلام انتقال کر گئی ہیں۔ مرتضیٰ بھٹو اپنی تمام سیاسی مصروفیات منسوخ کر کے کراچی چلے گئے جہاں بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر بھی موجود تھے۔ مرتضیٰ اور آصف علی زرداری نے بیگم منور الاسلام کے جنازے میں شرکت کی لیکن دونوں کے درمیان کوئی علیک سلیک نہ ہوئی۔

بیگم منورالاسلام کے جنازے پر مرتضیٰ اور زرداری کے سیکورٹی گارڈز ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ اس طرح بیگم منورالاسلام مرتضیٰ اور بے نظیر کے درمیان صلح کرانے کی حسرت دل ہی میں لئے دنیا سے چلی گئیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے 15 اگست 1994ء کو سرحد کا دورہ کیا۔ چونکہ کالا باغ ڈیم کے ایشو پر پنجاب اور سرحد کے درمیان سخت تنازعات پیدا ہو چکے تھے اور اہل سرحد کالا باغ ڈیم کے حق میں ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہ تھے اس لئے مرتضیٰ نے بھی سیاسی چال کے طور پر کالا باغ ڈیم کی مخالفت کی جس کے باعث انہیں سرحد میں زبردست پذیرائی ملی۔ مرتضیٰ نے جب دیکھا کہ اہل پشاور ان کی بات کو سننے کے لئے تیار ہیں تو انہوں نے اگلا انکشاف یہ کیا کہ ضیاء الحق نے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کا غیر سرکاری طور پر معائنہ کروا کر امریکی امداد حاصل کی تھی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے اس الزام کو ملکی اور غیر ملکی اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیا جس کے بعد نواز شریف نے کشمیر میں 27 اگست 1994ء کو خطاب کرتے ہوئے تاریخی اعلان کیا گیا --- میں تصدیق کرتا ہوں کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے"۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے نواز شریف کے اس بیان پر اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بنیاد شہید بابا (ذوالفقار علی بھٹو) نے رکھی تھی اور انہیں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو آگے بڑھانے کے جرم میں ہی پہلے اقتدار اور پھر زندگی سے محروم کیا گیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے 1994ء کے دوران پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی حمایت میں متعدد مرتبہ بیانات دیے کیونکہ ان دنوں امریکہ کی طرف سے پاکستان پر دباؤ بڑھ رہا تھا کہ وہ اپنے نیوکلیئر پروگرام کو رول بیک کرے جبکہ امریکی حکام کی تو یہاں تک خواہش تھی کہ ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر کو مدت ملازمت مکمل ہونے پر ریٹائر کر دیا جائے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے ڈاکٹر عبدالقدیر کو ریٹائر کرنے کے فیصلے کی کھل کر مخالفت کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا کہوٹہ پراجیکٹ کے ساتھ منسلک رہنا کس قدر ضروری ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے بارے میں یہ بات بہت ہی کم افراد کو معلوم تھی کہ انہوں نے جلاوطنی کی زندگی کے دوران متعدد مرتبہ ان پاکستانی سائنسدانوں کی رہنمائی کی تھی جو ایٹمی پرزوں کی خریداری کے لئے عموماً" یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا کرتے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو نواز شریف کے دور حکومت میں

ہمیشہ یہ شک رہا کہ ان کے بھائی کے انٹیلی جینس بیورو کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز احمد کے ساتھ خصوصی مراسم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 1994ء کے وسط میں بریگیڈیئر امتیاز احمد کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ظاہر ہے کہ ایف آئی اے کو بریگیڈیئر امتیاز احمد کی گرفتاری کے لئے کوئی نہ کوئی مواد درکار تھا اس لئے بریگیڈیئر امتیاز کی فوری طور پر گرفتاری عمل میں نہ آسکی۔ نجانے بے نظیر بھٹو کا وہ دشمن کون تھا جس نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بریگیڈیئر امتیاز احمد کے ساتھ ساتھ میاں نواز شریف کو بھی گرفتار کرلیں۔ اس قسم کے مشورے دینے والوں کا خیال تھا کہ میاں نواز شریف گرفتاری کے 30 منٹ کے اندر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن اس معاملے میں بے نظیر بھٹو کے تمام تر اندازے غلط ثابت ہوئے اور ان کی انتقامی کارروائیاں میاں نواز شریف کو سیاست سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کرنے پر مجبور نہ کرسکیں بلکہ اس سے نواز شریف کے قد کاٹھ میں اضافہ ہی ہوا۔ نواز شریف نے 18 جولائی 1994ء کو کہا کہ اگر مجھے گرفتار کیا گیا تو عوام کا سمندر بے نظیر بھٹو کی حکومت کو غرق کر دے گا۔

اس کے بعد مسلم لیگی ارکان نے 14 اگست 1994ء کو قومی اسمبلی کی تمام کمیٹیوں سے استعفے دے دیئے اور نواز شریف نے 11 ستمبر 1994ء سے حکومت کے خلاف ٹرین مارچ شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ان تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے مذاکرات کئے جنہوں نے 1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف چلائی جانے والی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان حالات میں سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لینے کی بجائے جارحانہ پالیسی اپنائی۔ ان کے حکم پر 29 اگست 1994ء کو اتفاق گروپ آف انڈسٹریز کے دو افسران کو گرفتار کرلیا گیا۔ حکومت اس طرح نواز شریف کے خاندان کو بلیک میل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نواز شریف نے ٹرین مارچ کا آغاز کیا اور 12 ستمبر کو وہ لاہور پہنچے جہاں ہزاروں افراد ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ٹرین مارچ کا یہ مرحلہ 13 ستمبر 1994ء کو پشاور جاکر مکمل ہوا۔ جس کے بعد نواز شریف نے 29 ستمبر 1994ء کو ملک بھر میں یوم احتجاج منانے کا اعلان کیا۔ سندھ حکومت نے ان کے کراچی آنے پر پابندی لگادی جس پر میر مرتضیٰ بھٹو نے نواز شریف کو پیغام بھیجا کہ وہ بے فکر ہو کر کراچی آئیں ان کے ساتھی ان کی حفاظت کریں گے۔

مرتضیٰ اور نواز شریف کے درمیان اس طرح بالواسطہ تعلقات کا سلسلہ بحال ہوگیا۔ نواز شریف نے حکومت پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے' 11 اکتوبر 1994ء کو ہڑتال کی اپیل کر دی۔ حکومت کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہڑتال کامیاب رہی اور حکومت نے نواز شریف کے خلاف آخری کارڈ استعمال کرتے ہوئے 13 نومبر 1994ء کو میاں شریف کو گرفتار کرلیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے نواز شریف کے والد کی گرفتاری کی شدید مذمت کی۔ اگرچہ میاں شریف کو 17 نومبر 1994ء کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا لیکن اس کے بعد اپوزیشن اور حکومت میں ناختم ہونے والی لڑائی شروع ہو گئی۔ میاں نواز شریف نے بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے وسیع تر اتحاد (Grand Alliance) بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں چوہدری شجاعت کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ اپوزیشن جماعتوں سے رابطہ قائم کریں۔ مسلم لیگ نے مرتضیٰ بھٹو کو اس Grand Alliance میں شامل کرنے کی تجویز پر بھی غور کیا لیکن اس سے پہلے کہ اس سلسلے میں پیش رفت ہوتی' چوہدری شجاعت حسین کو 22 نومبر 1994ء کو بدعنوانی کے الزامات میں گرفتار کرلیا گیا۔ جس پر سینٹ کے چیئرمین وسیم سجاد نے حکومت کو حکم دیا کہ وہ سینیٹر چوہدری شجاعت حسین کو ایوان میں پیش کرے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے بھی اپوزیشن کے خلاف ہونے والی انتقامی کارروائیوں کی مذمت کی۔ بلکہ انہوں نے حکومت پر وار کرتے ہوئے کہا کہ بے نظیر بھٹو نے محض اقتدار بچانے کے لئے امریکہ کے ساتھ خفیہ معاہدہ کرلیا ہے۔ "قومی حکومت کا قیام ہی مسائل کا واحد حل ہے"۔ مرتضیٰ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ظاہر ہے کہ قومی حکومت کے قیام کا یہ مطلب تھا کہ بے نظیر بھٹو کی چھٹی کروا دی جائے۔ میر مرتضیٰ بھٹو اگرچہ نواز شریف کے دوست نہ تھے لیکن انہوں نے حکومت کی طرف سے اپوزیشن کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کی کبھی بھی حمایت نہ کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسی حرکتوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

میر مرتضیٰ بھٹو سولہ سالہ جلاوطنی کے بعد کیوں وطن واپس آئے؟

میر مرتضیٰ بھٹو گو کہ قدکاٹھ کے اعتبار سے خاندان بھر میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے لیکن جہاں تک سیاسی بصیرت کا تعلق ہے اس معاملے میں وہ اپنی بہن بے نظیر بھٹو کے مقابلے میں جو کہ عمر میں ان سے صرف ایک برس بڑی تھیں بہت زیادہ پیچھے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز دونوں بھائیوں کو سیاست سے کوئی زیادہ لگاؤ نہ تھا اور خود ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اپنے بیٹوں کی سیاسی تربیت پر زیادہ توجہ نہ دی تھی۔ مولانا کوثر نیازی مرحوم کے بقول میر مرتضیٰ بھٹو بچپن ہی سے سیاست سے الرجک تھے اور خصوصی طور پر انہیں سیاست سے اس دن نفرت ہوئی جب ان کے والد نے کراچی کے ایک جلسہ عام میں انہیں ہزاروں افراد کے سامنے ڈانٹ دیا۔ ہوا یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک مرتبہ کراچی میں ایک عظیم الشان جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر اپنے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو پر پڑی جو ان کی تقریر شروع ہونے کے چند منٹ بعد ہی سٹیج پر آکر بیٹھے تھے۔ بھٹو نے جونہی مرتضیٰ کو سٹیج پر بیٹھا دیکھا انہوں نے اپنی تقریر روک کر ہزاروں افراد کے سامنے انہیں باآواز بلند مخاطب کر کے کہا کہ "مرتضیٰ تم ادھر سٹیج پر بیٹھے کیا کر رہے ہو' چلو فورا" ایک منٹ سے پہلے سامنے زمین پر جاکر وہاں بیٹھو جہاں اس ملک کا مزدور بیٹھا ہے' جہاں اس ملک کا کسان بیٹھا ہے' جہاں اس ملک کا طالب علم بیٹھا ہے------ جاؤ' فورا" وہاں جاکر بیٹھو' تمہیں اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم صرف اس لئے سٹیج پر

آکر بیٹھ جاؤ کہ تم وزیراعظم کے بیٹے ہو——— نہیں میری نگاہ میں ایک عام نوجوان اور تم میں کوئی فرق نہیں----- تم وہاں بیٹھو جہاں اس ملک کے عام افراد بیٹھے ہیں"۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے انتہائی حیرت سے اپنے والد کی طرف دیکھا جن کے جوش خطابت کے باعث پورے مجمع میں جوش و جذبے کی ایک نئی لہر پیدا ہو چکی تھی اور جلسہ گاہ بھٹو کے حق میں فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ مرتضیٰ خاموشی سے سٹیج سے نیچے اترے اور جلسہ گاہ میں سٹیج کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ اس طرح بھٹو نے عوام کو جذباتی کرتے ہوئے محفل لوٹ لی۔ اسی رات مولانا کوثر نیازی 70 کلفٹن گئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ مرتضیٰ اداس اور پریشان پھر رہا ہے۔ مولانا کوثر نیازی نے مرتضیٰ کو بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا اور ان سے پریشانی کا سبب پوچھا تو مرتضیٰ بولے "انکل! بابا نے مجھے خود ہی تاکید کی تھی کہ جب میں تقریر شروع کروں تو تم سٹیج پر آکر بیٹھ جانا اور پھر آج خود ہی انہوں نے بھرے مجمع میں میری بے عزتی کر دی"۔ مولانا کوثر نیازی اس پر مسکرا کر رہ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مرتضیٰ صحیح کہہ رہا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اگرچہ اس روز جلسہ گاہ میں اپنے صاحبزادے کو ہزاروں افراد کے سامنے سیاسی ڈانٹ پلا کر جلسہ کو لوٹ لیا لیکن مرتضیٰ نے اس دن کے بعد سیاسی سرگرمیوں سے دور رہنا شروع کر دیا۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے 1971ء کی جنگ کے بعد دھواں دار تقریروں کا سلسلہ شروع کیا تو ایک دن انہوں نے پی ایس ایف کے رہنماؤں کو کہا کہ "جب میں جلسہ گاہ میں تقریر کرنے کے لئے اٹھوں تو تم میرے گلے میں گلاب کے ہار ڈال دینا"۔ ان دنوں حالات یہ تھے کہ سانحہ مشرقی پاکستان رونما ہو چکا تھا جبکہ مغربی پاکستان پر جنگ کے سائے ابھی تک منڈلا رہے تھے۔ پی ایس ایف کے ایک کارکن طے شدہ پلان کے تحت راولپنڈی میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران جونہی ہار لے کر بھٹو کی طرف ہاتھ بڑھائے' مرحوم وزیراعظم نے ہار گلے میں پہننے کی بجائے ان کے ہاتھ سے انتہائی جوش میں چھینے اور انہیں انتہائی غصے میں توڑ کر سٹیج پر پھینک دیا اور جذباتی لہجے میں بولے کہ "خبردار! یہ پھولوں کے ہار میرے گلے میں نہ ڈالنا" میں یہ ہار اس روز پہنوں گا جب میرے ملک کا ایک ایک فرد اور سپاہی بھارت کی قید سے رہا ہو کر پاکستان واپس نہیں پہنچ جائے گا"۔ محترمہ بے نظیر

بھٹو کو اپنے والد محترم کے انداز سیاست سے اتفاق تھا اور وہ ان سے بہت کچھ سیکھتی رہتی تھیں جبکہ مرتضیٰ اور شاہ نواز نے شکار کھیلنے اور تعلیم پر توجہ مرکوز رکھی۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز کوئی پیدائشی دہشت گرد نہ تھے۔ انہوں نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وقت کا ظالم دھارا انہیں سرزمین وطن سے انتہائی دور لے جائے گا اور ان کے والد کو وہی شخص تختہ دار پر چڑھا دے گا جسے انہوں نے کئی جرنیلوں کو نظرانداز کر کے چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ 1977ء میں جب مارشل لاء لگا تو ذوالفقار علی بھٹو نے مرتضیٰ اور شاہ نواز دونوں کو پاکستان سے باہر بھجوا دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی ممکنہ سازش کے دوران ان کے اہل خانہ کو بھی شیخ مجیب الرحمٰن کی طرح قتل کر دیا جائے۔ مارشل لاء کے نفاذ کے وقت بے نظیر بھٹو کی عمر 24 سال تھی جبکہ مرتضیٰ 23 سال' صنم بھٹو 21 سال اور شاہ نواز 20 سال کے تھے۔ صنم بھٹو کو چونکہ سیاست سے کوئی لگاؤ نہ تھا اس لئے مارشل لاء حکام نے انہیں زیادہ تنگ نہ کیا جبکہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس کے برعکس مرتضیٰ اور شاہ نواز آزاد فضاؤں میں زندہ رہے۔ اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی طرف سے ملنے والی ہدایات کے مطابق اسلامی ممالک کے سربراہان اور ان کے نمائندوں کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز نے انہیں ایام میں فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز کی توقعات کے برعکس ضیاء الحق نے ان کے والد محترم کو 4 اپریل 1979ء کو تختہ دار پر چڑھا دیا۔ مارشل لاء حکومت کے اس اقدام نے مرتضیٰ اور شاہ نواز کے دل میں بدلے کی آگ بھڑکا دی اور اس ٹارگٹ کے حصول کے لئے کہیں وہ دوسروں کے ہاتھوں استعمال ہوتے اور کہیں انہوں نے دوسروں کو استعمال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مرتضیٰ اور شاہ نواز پاکستان میں دہشت کی علامت بن گئے۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز کو شاید افرادی قوت حاصل کرنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا مگر یہ مسئلہ ضیاء الحق نے خود اس وقت حل کر دیا جب مارشل لاء حکام نے پی پی پی کی احتجاجی تحریک کو کچلنے کے لئے اس کے کارکنوں کو کوڑوں کی سزائیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ شاہی قلعہ کے بدنام زمانہ عقوبت خانے میں دی جانے والی اذیتوں کا شکار ہونے والے نوجوان رہائی کے

بعد بدلہ لینے کی ٹھان کر جب باہر نکلتے تو انہیں کسی نہ کسی طرح مرتضیٰ کا پیغام مل جاتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ملک سے فرار ہو جاتے اور یوں مرتضیٰ کی الذوالفقار پروان چڑھتی چلی گئی۔ خصوصی طور پر اندرون سندھ سے بڑی تعداد میں نوجوانوں نے مرتضیٰ کی قیادت میں الذوالفقار میں شمولیت اختیار کی اور پھر ان کے لئے آزمائش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مرتضیٰ نے 1977ء سے 1985ء تک جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا لیکن 1985ء میں جب وہ ضیاء الحق کے خلاف ایک خفیہ منصوبے پر کام کر رہے تھے، اچانک 18 جولائی 1985ء کو ان کے چھوٹے بھائی شاہ نواز فرانس میں اپنے فلیٹ میں انتقال کر گئے۔ اور تاحال یہ پتہ نہیں چل سکا کہ شاہ نواز طبعی موت مرے یا انہیں قتل کیا گیا۔

میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو نے شاہ نواز کی ناگہانی موت کے لئے ضیاء الحق کو ذمہ دار قرار دیا۔ لیکن ان کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہ تھا جس سے پتہ چل جاتا کہ شاہ نواز کو منظر عام سے ہٹانے کے پیچھے ضیاء الحق کا ہاتھ تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو 20 اگست 1985ء کی شام اپنے بھائی کی لاش سے لپٹ لپٹ کر روئے کیونکہ بیگم بھٹو نے انہیں شاہ نواز کے جسد خاکی کے ساتھ فرانس سے پاکستان جانے سے منع کر دیا تھا اور وہ کسی حد تک حق بجانب بھی تھیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے 1985ء سے 1988ء کا عرصہ اپنے کاروباری امور کی نگرانی کرتے ہوئے گزارا اور اس دوران الذوالفقار کا وجود محض کاغذات کی حد تک رہ گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بعض فوجی حکام نے فرانس میں بیگم بھٹو کو دو ٹوک الفاظ میں پیغام دیا تھا کہ اگر الذوالفقار نے پاکستان میں مزید دہشت گردی کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ بیگم بھٹو گو کہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ مزید لاشیں دیکھنے کی پوزیشن میں نہ تھیں۔ اس لئے مرتضیٰ کے انتہائی قریبی ساتھیوں کے مطابق الذوالفقار کی سرگرمیاں 1986ء سے 1988ء کے دوران خصوصی طور پر محدود کر دی گئی تھیں اور 17 اگست 1988ء کی سہ پہر ضیاء الحق کے طیارے کی تباہی کی خبر جب مرتضیٰ تک پہنچی تو کئی لمحوں تک تو انہیں یقین ہی نہ آیا لیکن جلد ہی انہیں اپنے کانوں پر یقین کرنا پڑا کیونکہ بین الاقوامی نشریاتی اداروں نے تمام پروگرام روک کر ضیاء الحق کے طیارے کی تباہی

کے بارے میں خبریں دینا شروع کر دی تھیں۔ ضیاء الحق کی موت بھی اگرچہ پردۂ راز میں ہے لیکن واقعات و حالات ظاہر کرتے ہیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو اس سازش میں شامل نہ تھے جس سازش کے تحت ضیاء الحق کو قتل کیا گیا۔ ضیاء الحق کے جہاز کی تباہی کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ یہ ایک سازش تھی اور اس سازش پر عمل درآمد کوئی دہشت گرد تنظیم نہیں بلکہ کسی بڑے ملک کی انٹیلی جینس ایجنسی ہی کر سکتی تھی اور اس سلسلہ میں انگلی امریکی سی آئی اے کی طرف اٹھائی جاتی رہی ہے۔ ضیاء الحق کی وفات کے بعد میر مرتضیٰ بھٹو وطن واپس آنے کے لئے تیاریوں میں مصروف ہوئے تو محترمہ بے نظیر بھٹو نے انہیں جلاوطنی کی زندگی ختم کرنے سے منع کر دیا۔ اس کی وجہ مرتضیٰ کو یہ بتائی گئی کہ فوج میں جرنیلوں کی ایک بڑی تعداد ان کے خلاف ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے 1988ء کے انتخابات تک اپنی بہن بے نظیر بھٹو کے ساتھ اختلافات کوئی زیادہ نہ تھے۔ بیگم بھٹو نے مرتضیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کے پانچ سالہ دور حکومت میں ہی انہیں وطن واپس بلا لیا جائے گا۔ بے نظیر بھٹو نے مرتضیٰ کو کہا تھا کہ وہ کم از کم ایک برس کے لئے وطن نہ آئیں۔ مرتضیٰ کو اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ بے نظیر اس ایک برس کے دوران ان تمام مقدمات کا جائزہ لیں گی جو بھٹو خاندان کے افراد خصوصاً مرتضیٰ کے خلاف بنائے گئے تھے اور فضا سازگار ہونے پر انہیں وطن واپس بلا لیا جائے گا لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو کا پہلا دور حکومت بڑا ہی مختصر ثابت ہوا اور ان کے اقتدار میں آنے کے چھ ماہ کے اندر ہی مرکز پنجاب اختلافات اس مقام پر پہنچ گئے کہ ملک میں حکومت ختم ہونے کی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ ان حالات میں میر مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی بے نظیر بھٹو کے لئے سیاسی مسائل کا موجب بن سکتی تھی بے نظیر کو مزید مشکلات سے بچانے کے لئے مرتضیٰ کو وطن آنے سے روکنا بہت ضروری تھا اس لئے بیگم بھٹو جو اس وقت سینئر وزیر تھیں کی پرزور سفارش پر مرتضیٰ نے جلا وطنی کی زندگی ختم کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے بے نظیر بھٹو کو بعض شرائط کے تحت اقتدار منتقل کیا تھا اور بے نظیر کی بطور وزیر اعظم نامزدگی میں تاخیر بھی اس لئے کی گئی کہ کسی نہ کسی طرح پی پی پی کا کوئی لیڈر بے نظیر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اقتدار میں آتے ہی جیلوں کے دروازے

کھول دیئے جس کے باعث پی پی پی کے سینکڑوں کارکن رہا ہوگئے۔ بے نظیر بھٹو کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں تو مرتضیٰ نے اپنی والدہ کو کہا کہ وہ وطن واپس آکر سازشیوں کا مقابلہ کریں گے لیکن 70 کلفٹن پر منعقد ہونے والے اجلاسوں میں' جن میں بیگم بھٹو' آصف علی زرداری اور صنم بھٹو نے بھی اکثر شرکت کی' آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ مرتضیٰ کو فی الحال دمشق میں ہی قیام کرنے کا مشورہ دیا جائے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی توقع کے بالکل برعکس ان کی بہن سیاسی میدان میں سازشوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہوگئیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بے نظیر بھٹو نے پی پی پی کی مخلص قیادت پر اعتماد کرنے کی بجائے اسی خوشامدی ٹولے کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا جس نے ضیاء الحق کے دور حکومت میں اقتدار کے مزے اڑائے تھے۔ اس طرح بے نظیر بھٹو موقع پرستوں کے نرغے میں گھر کر رہ گئیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں دو برس سے بھی کم مدت بعد اقتدار سے محروم کر دیا گیا اور ظاہر ہے کہ بے نظیر بھٹو کی معزولی سے میر مرتضیٰ بھٹو کی جلاوطنی مزید لمبی ہوگئی اور اس وقت جب غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیراعظم کی حیثیت سے بھٹو خاندان کے خلاف مقدمات قائم کرنے میں مصروف تھے' یہ بالکل مناسب نہ تھا کہ مرتضیٰ واپس لوٹ آتے۔ لیکن اس کے باوجود مرتضیٰ نے خود کو پاکستانی حکام کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا اور وہ 1990ء کے انتخابات میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ تاہم اس مرتبہ بھی انہیں یہی کہا گیا کہ اپوزیشن اپنی انتہائی مہم میں الذوالفقار کے جرائم کو بے نظیر بھٹو کے کھاتے میں ڈال کر پیپلز پارٹی کے لئے مشکلات پیدا کرے گی۔ مرتضیٰ کو ایک مرتبہ پھر کہا گیا کہ وہ خاندان کے وسیع تر مفاد میں سیاست میں حصہ نہ لیں۔ اس مرتبہ مرتضیٰ کو قائل کرنے والوں کے پاس ٹھوس دلیل تھی۔ انہیں اس سازش کے ثبوت فراہم کئے گئے جو سازش فوج اور آئی ایس آئی نے اپوزیشن رہنماؤں کے ساتھ مل کر تیار کی تھی اور جس کا مقصد بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور کروانا تھا۔ چنانچہ 1990ء کے انتخابات ہوئے اور بے نظیر بھٹو بری طرح شکست کھا گئیں۔ 1990ء سے 1993ء کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو کو سخت آزمائش سے گزرنا پڑا' آصف علی زرداری کو جیل میں ڈالا گیا اور ان کے والد حاکم علی زرداری ملک سے فرار ہو کر لندن پہنچ گئے۔ گویا پورا بھٹو خاندان

1990-93ء کے دوران سخت آزمائش سے دوچار رہا۔ مرتضیٰ تنبیہہ کر چکے تھے کہ اب جب کبھی بھی انتخابات ہوئے وہ ان میں حصہ لیں گے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ مرتضیٰ نے بے نظیر بھٹو کی پہلے دور حکومت میں معزولی کے بعد فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ساتھ براہ راست روابط کر کے تعلقات بہتر بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ مرتضیٰ نے فوج کو یقین دلایا کہ ان کی دشمنی ضیاء الحق کے ساتھ تو تھی مگر وہ بحیثیت ادارہ فوج کے خلاف کبھی بھی نہ تھے۔ فوج نے میر مرتضیٰ بھٹو کی اس یقین دہانی کے بعد ان کی نگرانی مزید سخت کر دی اور شواہد سے یہ ثابت ہوا کہ الذوالفقار تنظیم ختم کر دی گئی ہے اور مرتضیٰ کسی ایسی سرگرمی میں ملوث نہیں جس کا مقصد پاکستان میں انتشار بپا کرنا ہو۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے فوج اور ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ ان روابط کے بارے میں بے نظیر بھٹو کو لاعلم رکھا گیا کیونکہ میر مرتضیٰ اب اس وقت کے منتظر تھے جب نواز شریف کو وزیراعظم ہاؤس سے رخصت کیا جائے اور وہ وطن آکر سیاست میں حصہ لیں۔ پاکستان میں بے اصولی کی بنیاد پر ہونے والی سیاست کے باعث میاں نواز شریف سازشیوں کے نرغے میں آگئے اور وہ غلطیوں پہ غلطی کرتے ہوئے 1993ء میں اقتدار سے محروم ہوگئے۔ یہ وہ موقع تھا جب میر مرتضیٰ بھٹو نے دو ٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ سیاست میں حصہ لیں گے اور اس دفعہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے پاس انہیں وطن واپسی سے روکنے کے لئے کوئی دلیل نہ تھی کیونکہ دونوں ایک ہی خاندان کے فرد ہونے کے باوجود سیاسی طور پر ایک دوسرے کے حریف بن چکے تھے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے سیاست میں حصہ لینے کا 28 فروری 1993ء کو اس وقت ہی فیصلہ کرلیا تھا جب انہیں اطلاع ملی کہ نواز شریف آئین کے آرٹیکل 58 (2 بی) کے تحت صدر کو اسمبلی توڑنے کے متعلق حاصل صوابدیدی اختیارات کو پارلیمنٹ میں آئینی ترمیمی بل پیش کر کے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے اس اطلاع پر بے ساختہ کہا کہ اب نواز شریف کی حکومت نہیں بچتی کیونکہ وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ بین الاقوامی قوتیں مسلم لیگ کی حکومت کی حمایت سے ہاتھ کھینچ چکی ہیں جبکہ ملک کی اقتصادی حالت سخت خراب ہے۔ محمد خاں جونیجو ان دنوں امریکہ کے ایک ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ نواز شریف نے یکم مارچ 1993ء کو

محمد خاں جونیجو کو فون پر مطلع کیا کہ وہ 8 ویں ترمیم ختم کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم جونیجو نے نواز شریف کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ مرتضیٰ کو امریکہ کے کراموبل ہسپتال سے 3 مارچ 1993ء کو اطلاع ملی کہ غلام اسحاق خاں نے میر بلخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو 10 مارچ 1993ء کو ہی پتہ چل گیا تھا کہ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین' جو فوجی اپریشن کے دوران سیاست سے ریٹائر ہو گئے تھے' دوبارہ سیاست میں واپس آنا چاہتے ہیں۔ مرتضیٰ کو کراچی میں سب سے زیادہ الطاف حسین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا' اس لئے انہوں نے وطن واپسی سے پہلے الطاف حسین سے بھی رابطہ قائم کیا جنہوں نے 12 مارچ 1993ء کو سیاست سے ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ واپس لے لیا۔ الطاف حسین پر بھی ملک میں دہشت گردی کرانے کے الزامات تھے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو یقین تھا کہ الطاف حسین 1993ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے پاکستان نہیں جائیں گے کیونکہ ابھی فوجی اپریشن ختم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ جون 1992ء کے فوجی اپریشن کے دوران فوج کو پتہ چلا تھا کہ الطاف حسین سندھ کے شہری علاقوں پر مشتمل ایک نیا صوبہ بنانا چاہتے ہیں اور اس منصوبے کے اگلے مرحلے میں ایک خودمختار ریاست قائم کی جائے گی۔ اگرچہ الطاف حسین نے ان الزامات کی تردید کی لیکن مرتضیٰ جانتے تھے کہ ایم کیو ایم کی قیادت کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو کے کیسیں ملٹری انٹیلی جینس کے پاس پہنچ چکی ہیں۔ فوج اور ملٹری انٹیلی جینس نے کراچی میں ایم کیو ایم کے عسکری ونگ کو ختم کرنے کے لئے دن رات کوششیں کیں۔ سندھ کے شہری علاقوں میں کوئی ایسا بڑا گروپ یا سیاسی جماعت موجود نہ تھی جو الطاف حسین کا مقابلہ کرپاتی اور اس خلا کو پر کرنے کے لئے جب مختلف تجاویز پر غور شروع ہوا تو ایک مرحلے پر یہ فیصلہ ہوا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو وطن واپس آنے دیا جائے کیونکہ وہ بھی کسی دور میں ایک مضبوط عسکری ونگ کی قیادت کر چکے تھے اور الذوالفقار کے کارکنوں کی بڑی تعداد اب بھی ان کے ساتھ تھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ان دنوں لندن میں موجود تھیں جہاں ان کے پہلے بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ بے نظیر بھٹو کو نواز شریف نے سرکاری طور پر علاج کے لئے لندن بھیجا تھا۔ بجائے اس کے کہ بے نظیر بھٹو نواز شریف کی ممنون ہوتیں' انہوں نے مسلم لیگ

کی حکومت پر فیصلہ کن وار کرنے کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنا شروع کر دیا۔ غلام اسحاق خاں نے سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ مرحوم میر افضل کے ذریعے محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ مذاکرات کا ڈول ڈالا۔ میر افضل مرحوم کو غلام اسحاق خاں نے یہ مینڈیٹ دے کر لندن بھیجا تھا کہ وہ بے نظیر بھٹو کو نواز شریف کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کرنے پر آمادہ کریں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے شروع میں تو میر افضل خاں کو زیادہ لفٹ نہ کرائی لیکن جب انہیں سفارتی حلقوں کے ذریعے اس قسم کی اطلاعات ملنا شروع ہوئیں کہ نواز شریف اور امریکہ کے درمیان تعلقات خراب ہو چکے ہیں اور نواز شریف اپنی حکومت بچانے کے لئے چوہدری نثار کے ذریعے امریکی حکام کے ساتھ واشنگٹن میں مذاکرات میں مصروف ہیں تو انہوں نے غلام اسحاق خاں کو پیغام بھیجا کہ نواز شریف کے خلاف استعفے دینے کا سلسلہ پہلے جونیجو لیگ شروع کرے کیونکہ بے نظیر نہیں چاہتی تھیں کہ وہ استعفے دے کر پارلیمانی سیاست سے آؤٹ ہو جائیں۔ اسی دوران 18 مارچ 1993ء کو محمد خاں جونیجو کا امریکہ میں انتقال ہوگیا جس کے فوراً بعد حامد ناصر چٹھہ مسلم لیگ کی قیادت اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے سرگرم عمل ہوگئے۔ نواز شریف اور مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کے درمیان مسلم لیگ کی صدارتی ایشو پر ہونے والی کشمکش جلد ہی کھلی جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ 27 مارچ 1993ء کو فدا محمد خاں نے مسلم لیگ کے ایک انتہائی اہم اجلاس میں نواز شریف کو مسلم لیگ کا صدر نامزد کرنے کے لئے ایک قرارداد پیش کی جسے منظور کرلیا گیا۔ تاہم حامد ناصر چٹھہ اور ان کے ہم خیال سیاستدانوں نے نواز شریف کو مسلم لیگ کا صدر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ غلام اسحاق خاں نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ایک قریبی عزیز انور سیف اللہ کو کہا کہ وہ فوری طور پر حامد ناصر چٹھہ اور اسد جونیجو کے ساتھ مذاکرات کر کے وفاقی کابینہ سے نکل جائیں۔ چٹھہ اور اسد جونیجو کو غلام اسحاق خاں کا یہ پیغام 27 مارچ 1993ء کو ملا جبکہ اسی شام محترمہ بے نظیر بھٹو کو لندن میں پیغام بھیجا گیا کہ نواز شریف کی کابینہ کے 10 ارکان بہت جلد حکومت کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ پہلے مرحلے میں حامد ناصر چٹھہ' انور سیف اللہ اور اسد جونیجو نے 28 مارچ 1993ء کو کابینہ سے استعفیٰ دیا۔ نواز شریف اس روز لندن میں موجود تھے اور ان کا بے نظیر بھٹو کے ساتھ

رابطہ برقرار تھا۔ نواز شریف کو 28 مارچ 1993ء تک یقین نہیں تھا کہ بے نظیر بھٹو ان کے خلاف غلام اسحاق خاں کے ساتھ مل جائیں گی۔ لیکن جب لندن میں بیٹھ کر انہیں بے نظیر بھٹو کی ان کے مخالفین کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کی تفصیل ملی تو ان کے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ باقی نہ رہا کہ وہ پہلی فرصت میں غلام اسحاق خاں کو صدارتی الیکشن کے لئے مسلم لیگ کا امیدوار نامزد کر دیں کیونکہ یہی ایک پیشکش ایسی تھی جو اپوزیشن انہیں کر سکتی تھی۔

میر مرتضیٰ بھٹو کو 3 اپریل 1993ء کی شام دمشق میں اطلاع ملی کہ راولپنڈی میں ہونے والی کور کمانڈروں کی کانفرنس میں ملک کو درپیش بحران کے حل کے لئے کئی تجاویز پر غور کرنے کے بعد یہ طے ہوا ہے کہ اگر نواز شریف اور غلام اسحاق خاں اپنے معاملات دو ہفتوں میں درست نہ کر سکے تو فوج نئے انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لئے اپنا کردار ادا کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ نواز شریف نے 4 اپریل 1993ء کو جنرل عبدالوحید سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ وہ بحران کے خاتمے کے لئے غلام اسحاق خاں کو صدارتی امیدوار نامزد کرنا چاہتے ہیں۔ جنرل عبدالوحید نے نواز شریف کی بات کو غور سے سنا مگر انہوں نے اپنی کسی رائے کا اظہار نہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ فوج کو ان کے اس فیصلے پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ نواز شریف نے اسی روز غلام اسحاق خاں کو صدارتی امیدوار نامزد کر دیا لیکن جب وہ یہ خوشخبری سنانے کے لئے ایوان صدر گئے تو غلام اسحاق خاں نے "شکریہ" کہہ کر ان کی خوشی کو غارت کر دیا۔ غلام اسحاق خاں نے نواز شریف کو جذبات سے عاری آواز میں بتایا کہ ابھی انہوں نے صدارتی الیکشن میں حصہ لینے کے حوالے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے ارکان کابینہ مستعفی ہوتے چلے گئے۔ غلام اسحاق خاں نے ترپ کا کارڈ اس وقت استعمال کیا جب 11 اپریل 1993ء کو فوج کے سابق سربراہ جنرل آصف نواز کی اہلیہ نے پریس کانفرنس میں یہ الزام عائد کیا کہ ان کے شوہر کو قتل کیا گیا تھا۔ میاں نواز شریف اس روز سارک کانفرنس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ گئے ہوئے تھے۔ جنرل آصف نواز مرحوم کی بیوہ کی پریس کانفرنس نے پورے ملک میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی کیونکہ مرحومہ نزہت آصف نواز نے نواز شریف کے تین قریبی ساتھیوں چوہدری

نثار، بریگیڈیئر امتیاز احمد اور میاں شہباز شریف کو اپنے شوہر کی موت کے لئے مورد الزام ٹھہرایا۔ نواز شریف نے وطن واپس آتے ہی 12 اپریل 1993ء کو جنرل عبدالوحید سے ملاقات کی اور بیوہ آصف نواز کے الزامات کی چھان بین کے لئے جسٹس شفیع الرحمٰن کی سربراہی میں ایک کمیشن تشکیل دے دیا گیا جس میں جسٹس عبدالقدیر چوہدری اور جسٹس رفیق تارڑ شامل تھے۔ اس عدالتی کمیشن نے بعدازاں جنرل آصف نواز مرحوم کی موت کو طبعی قرار دے دیا لیکن یہ فیصلہ اس وقت منظر عام پر آیا جب میاں نواز شریف اقتدار سے محروم کئے جا چکے تھے اور وزیراعظم ہاؤس میں ان کی جگہ بے نظیر بھٹو مسند اقتدار پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ جنرل عبدالوحید نے 15 اپریل 1993ء کو امریکہ جانا تھا لیکن انہوں نے ملکی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا ارادہ منسوخ کر دیا جبکہ میاں نواز شریف کے خصوصی ایلچی چوہدری نثار 16 اپریل 1993ء کو امریکہ سے واپس آئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کوئی اچھی خبر موجود نہ تھی۔ اس کے بعد نواز شریف نے قوم سے خطاب کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تاہم فوج کے سربراہ نے مداخلت کر کے انہیں قوم سے خطاب کرنے سے روک دیا کیونکہ جنرل عبدالوحید ابھی تک سیاسی بحران کے حل کے لئے کوششوں میں مصروف تھے۔ نواز شریف نے جب دیکھا کہ جنرل عبدالوحید کی کوششوں کے باوجود ایوان صدر میں سازشی ٹولے کی آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے تو انہوں نے 17 اپریل 1993ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں نہ تو ڈکٹیشن لوں گا اور نہ ہی اسمبلیاں توڑوں گا۔ اس روز محترمہ بے نظیر بھٹو لندن سے کراچی پہنچ گئیں کیونکہ تمام کرداروں نے اپنے اپنے رول کو انتہائی خوبصورتی سے ادا کر لیا تھا۔ نواز شریف نے 22 اپریل 1993ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کے لئے غلام اسحاق خاں کو ایک سمری بھجوائی جسے ایوان صدر کا عملہ دبا کر بیٹھ گیا جس سے واضح ہو گیا کہ غلام اسحاق خاں کے ارادے ٹھیک نہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے 16 اپریل 1993ء کو لندن سے کراچی روانہ ہونے سے پہلے لندن میں بیٹھ کر جن سیاستدانوں سے ملاقاتیں کیں اور جن جن سیاستدانوں کو انہوں نے ٹیلی فون کئے اس بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ 17 اپریل 1993ء کی صبح ہی بریگیڈیئر امتیاز احمد کو مل چکی تھی جنہوں نے نواز شریف کو بتایا کہ تمام اپوزیشن جماعتیں چند ایک روز

میں منتقل ہو جائیں گی۔ اس سے پہلے کہ نواز شریف کی حکومت ختم کی جاتی' انہوں نے آگے بڑھ کر غلام اسحاق خاں پر وار کر دیا جس کے بعد وہ اپنی حکومت کی رخصتی کا انتظار کرنے لگے۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور بے نظیر بھٹو دونوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اب نواز شریف چاہے کچھ بھی کر لیں' انہیں حکومت نہیں کرنے دی جائے گی۔ ان کے خیالات اگلے ہی روز درست ثابت ہوگئے اور غلام اسحاق خاں نے مولانا کوثر نیازی کی لکھی ہوئی تقریر پڑھتے ہوئے 18 اپریل 1993ء کو اسمبلی توڑ دی۔ نواز شریف نے اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جس نے 26 مئی 1993ء کو نواز شریف کی حکومت بحال کر دی لیکن سازشیوں کا سرغنہ (غلام اسحاق خاں) ایوان صدر میں موجود رہا اور بے نظیر بھٹو کی فوج کے ساتھ انڈر سٹینڈنگ کے بعد 18 جولائی 1993ء کو نواز شریف اور غلام اسحاق خاں دونوں کی چھٹی کرا دی گئی اور معین قریشی نئے انتخابات کرانے کے لیے نگران وزیراعظم بنا دیئے گئے۔ اسی روز میر مرتضیٰ بھٹو نے دمشق سے ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے واضح طور پر اقرار کیا کہ ان کے بے نظیر بھٹو کے ساتھ اختلافات موجود ہیں۔ تاہم وہ پی پی پی کو ہائی جیک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بے نظیر بھٹو 19 اکتوبر 1993ء کو 121 ووٹ لے کر وزیراعظم بن گئیں جبکہ نواز شریف کو لیڈر آف دی ہاؤس کے انتخاب کے لئے ہونے والی ووٹنگ میں 72 ووٹ ملے۔ بیگم نصرت بھٹو کی خواہش تھی کہ بے نظیر بھٹو پہلی فرصت میں جنرل عبدالوحید سے مرتضیٰ بھٹو کو وطن واپس لانے کی اجازت دینے کے حوالے سے بات چیت کریں۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے شوہر کے والد حاکم علی زرداری کے خلاف نواز شریف کے دور حکومت میں درج ہونے والے مقدمات کو ختم کرانے کے لئے ایف آئی اے وغیرہ سے ریکارڈ تو طلب کر لیا لیکن میر مرتضیٰ بھٹو کے بارے میں انہوں نے اپنی والدہ کو کہا کہ فوج' آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جنس مرتضیٰ سے اس لئے ناراض ہے کہ وہ ماضی میں بھارت کی انٹیلی جنس ایجنسی RAW کے ساتھ مل کر بعض ایسی کارروائیاں کر چکے تھے جو ہمارے قومی مفاد میں نہ تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو کا جوں جوں مرتضیٰ کو وطن واپس لانے کے لئے اصرار بڑھتا چلا گیا توں توں ماں بیٹی کے درمیان موجود تعلقات میں سرد مہری آتی چلی گئی۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک موقع پر بیگم نصرت بھٹو نے آصف

علی زرداری اور حاکم علی زرداری کے بارے میں چند قابل اعتراض فقرے چست کئے تو بے نظیر اور ان کے شوہر کے درمیان سخت ناراضگی پیدا ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے جب دیکھا کہ انہیں اپنی بیٹی سے کوئی مدد نہیں مل رہی تو انہوں نے فوج کی ہائی کمان سے براہ راست رابطہ قائم کر کے پوچھا کہ کیا آپ کو مرتضیٰ کی واپسی پر کوئی اعتراض ہے۔ ظاہر ہے کہ فوج کب یہ کہہ سکتی تھی کہ اسے مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی پر اعتراض ہے۔ جنرل عبدالوحید اور بیگم نصرت بھٹو کے درمیان مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کے حوالے سے دو مرتبہ بالواسطہ رابطہ ہوا اور بیگم صاحبہ نے فوج اور فوج کے اداروں سے روابط کے بعد یہ تاثر دیا کہ فوج کو ان کے صاحبزادے کی وطن واپسی پر کوئی اعتراض نہیں۔ تاہم فوج یہ ضرور چاہتی تھی کہ مرتضیٰ کے ساتھ قوانین کے مطابق سلوک کیا جائے اور عوام کو کوئی ایسا تاثر نہ ملے کہ وزیراعظم کے بھائی کے خلاف حکومتی دباؤ پر مقدمات ختم کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح میر مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کے لئے فضا ہموار کی گئی۔ اس کے علاوہ مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ممتاز بھٹو نے انہیں دمشق فون کر کے خود کہا تھا کہ وہ اب وطن لوٹ آئیں کیونکہ بھٹو خاندان کی زمینوں اور دوسری جائیداد کی نگرانی آصف علی زرداری کے سپرد کرنے کے انتظامات مکمل کئے جا رہے ہیں۔ بنیادی طور پر مرتضیٰ کی وطن واپسی میں ان کی والدہ نے اہم کردار ادا کیا ورنہ بے نظیر بھٹو کی خواہش تھی کہ وہ کم از کم 6 ماہ وطن واپس نہ آئیں۔ تاہم وطن آنے کے بعد مرتضیٰ کو 4 نومبر 1993ء سے جون 1994ء تک جیل میں رکھا گیا حالانکہ انہیں جن مقدمات کا سامنا تھا وہ قابل ضمانت تھے اور اس طرح کے مقدمات میں کوئی بھی وکیل اپنے موکل کو ایک ماہ کے اندر ہی ضمانت پر رہا کروا لیا کرتا ہے۔

میر مرتضیٰ بھٹو کی فوج سے صلح کیسے ہوئی؟

وطن واپسی کے فوراً" بعد میر مرتضیٰ بھٹو کو گرفتار کرلیا گیا اور وہ نومبر 1993ء سے جون 1994ء تک کراچی جیل میں مقدمات کا سامنا کرتے رہے۔ بعد 1995ء میں انہیں شاہ بندر کیس اور چوہدری ظہور الٰہی کیس سے بری کیا گیا۔ چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی کی میر مرتضیٰ بھٹو کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہ تھی کیونکہ وہ انہیں چوہدری ظہور الٰہی کا قاتل سمجھتے تھے۔ تاہم جب عدالت نے مرتضیٰ کو بری کر دیا تو انہوں نے مقدمے کی مزید پیروی نہ کی۔ وگرنہ وہ مرتضیٰ بھٹو کی رہائی کے خلاف ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کر سکتے تھے۔ چوہدری فیملی کے اس فیصلے سے فوری طور پر ایک تاثر یہ ملا کہ چوہدری شجاعت حسین اور ان کے اہل خاندان ماضی کی تلخیوں کو بھلانا چاہتے ہیں۔ جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو نے بھی ان تمام افراد میں سے کسی کے خلاف بھی کوئی قدم نہ اٹھایا جنہوں نے ماضی میں مارشل لاء حکام کے سامنے پیش ہو کر ان کے خلاف گواہی دی تھی۔ "میں اپنے دل سے ہر قسم کی تلخی نکال کر واپس آیا ہوں اور اب میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوگا"۔ مرتضیٰ بھٹو نے 7 جون 1994ء کو اپنی رہائی کے بعد کراچی میں اپنی جماعت کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے اس طرح اپنے ساتھیوں اور مخالفوں کو پیغام دیا کہ وہ سیز فائر کر چکے ہیں۔ اور پھر مرتضیٰ نے اپنے اس فیصلے پر پوری طرح عمل کیا۔ آصف علی زرداری کو مرتضیٰ کی آمد کے فوراً" بعد کہا گیا تھا کہ اب ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے لیکن مرتضیٰ نے ہمیشہ اس تاثر کو غلط قرار دیا اور ان کا ہمیشہ یہ موقف رہا کہ وہ بے نظیر بھٹو کے دشمن نہیں بلکہ خیر خواہ ہیں۔ 20 نومبر 1993ء کو جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو

کو وطن لوٹے ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ آصف علی زرداری نے میاں نواز شریف سے ملاقات کی اور انہیں مختلف طریقوں سے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان کی اہلیہ کی حکومت کے خلاف احتجاج نہ کریں، حکومت ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ میاں نواز شریف جانتے تھے کہ آصف علی زرداری انہیں بلیک میل کرنے آتے ہیں کیونکہ ایک روز قبل ہی حکومت نے سیکرٹری خزانہ قاضی علیم اللہ کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے ذمہ یہ لگایا گیا تھا کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں کہ ان بڑی بڑی فیکٹریوں کو جو بینکوں کے قرضوں سے قائم ہوئی تھیں، کس طرح واجب الادا قرضے واپس کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ نواز شریف کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قاضی علیم اللہ کو کس مقصد کے لئے اس کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت ملک کے سب سے بڑے صنعتی یونٹ (اتفاق گروپ آف انڈسٹریز) پر سرکاری ایڈمنسٹریٹر متعین کرنا چاہتی تھی۔ نواز شریف نے آصف علی زرداری کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کی جس سے انہیں یہ تاثر ملتا کہ وہ حکومت کے ہاتھوں بلیک میل ہو جائیں گے۔ بے نظیر بھٹو کے پاس ایک ہی کارڈ تھا یعنی نواز شریف کو بلیک میل کرنے کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ آصف نواز کیس کو استعمال کریں گی لیکن نواز شریف کو دسمبر 1993ء کے شروع میں ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ جسٹس شفیع الرحمٰن کی سربراہی میں بننے والے عدالتی کمیشن نے مکمل چھان بین کے بعد جنرل آصف نواز مرحوم کی موت کو طبعی قرار دے دیا تھا۔ حکومت نے اس کمیشن کی رپورٹ 13 دسمبر 1993ء کو جاری کی۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے جیل میں بیٹھ کر بھی اپنی جماعت کے کارکنوں کے ساتھ رابطہ برقرار رکھا اور بیگم نصرت بھٹو چپکے چپکے سے مرتضیٰ کے ان ساتھیوں کی مدد کرتی رہیں جو مسائل سے دوچار تھے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو بے نظیر بھٹو نے نومبر 1993ء کو جیل بھجوا کر پوری کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح مرتضیٰ پی پی پی کی قیادت حاصل کرنے کی کوششیں ترک کر دیں لیکن مرتضیٰ اپنے اصولی موقف پر ڈٹے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ پی پی پی کی قیادت بیگم نصرت بھٹو کے پاس رہنا چاہئے اور بیگم بھٹو کہتی تھیں کہ میرا جانشین مرتضیٰ ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور میاں نواز شریف دونوں ان دنوں زیر عتاب تھے اور دونوں کے بارے میں عوامی سطح پر یہ مشہور کیا جا رہا تھا کہ وہ فوج کے لئے قابل

قبول نہیں ہیں۔ میاں نواز شریف نے 12 فروری 1994ء کو فوج پر اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے اپنے چھوٹے بھائی میاں شہباز شریف کو جنرل عبدالوحید کے پاس بھیجا جو جی ایچ کیو میں 35 منٹ تک فوج کے سربراہ کو اس بات پر قائل کرتے رہے کہ میاں نواز شریف کے دل میں ان کے بارے میں کوئی بغض نہیں ہے۔

میر مرتضیٰ بھٹو کی پوزیشن Clear کرنے کے لئے بیگم نصرت بھٹو نے فوج کے سربراہ اور کور کمانڈر کراچی کے علاوہ انٹیلی جینس کے بعض حکام سے خود مذاکرات کئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرتضیٰ کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو دونوں کبھی اپنے والد محترم کی پھانسی کی ذمہ داری امریکہ پر ڈالا کرتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے نظیر بھٹو امریکہ کے لئے قابل قبول بنتی چلی گئیں جبکہ مرتضیٰ کے بارے میں امریکی موقف اور امریکہ کے بارے میں مرتضیٰ کی سوچ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ امریکی محکمہ خارجہ اور امریکی سی آئی اے کے پاس بین الاقوامی دہشت گرد تنظیموں کی جو فہرست موجود تھی اس میں الذوالفقار آرگنائزیشن کا نام بھی شامل تھا۔ امریکی حکام کسی ایسے پاکستانی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے جو ایٹمی پروگرام کو دفاعی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میر مرتضیٰ بھٹو اپنے والد کی طرح ایٹمی ٹیکنالوجی کو دفاعی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے ان بین الاقوامی سمگلروں سے تعلقات قائم کئے تھے جو ایٹمی پرزوں کی سمگلنگ جیسے کام سے منسلک تھے۔ مرتضیٰ بھٹو کو ایٹمی ٹیکنالوجی کے بارے میں گہری دلچسپی تھی اور انہیں دنیا کے ان تمام ممالک کے بارے میں ٹاپ سیکرٹ معلومات حاصل تھیں جو ایٹمی قوت بن چکے تھے یا جنہوں نے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے کوششوں کا آغاز کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ میر مرتضیٰ بھٹو نے سپر کمپیوٹر بھی حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ سپر کمپیوٹر کے حصول کے لئے پاکستانی سائنسدانوں نے ضیاء الحق کی زندگی میں سخت کوشش کی لیکن امریکہ نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ نتیجتاً پاکستانی سائنسدانوں اور کمپیوٹر انجینئرز کو اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت متبادل انتظامات کرنا پڑے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے پاس سپر کمپیوٹر کے بارے میں ہر قسم کی معلومات موجود تھیں اور انہوں نے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد کوشش کی کہ

ان کی کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر عبدالقدیر سے ملاقات کروا دی جائے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا کیونکہ حساس ادارے ایٹمی پروگرام کے مسئلہ پر کسی بھی شخص پر اعتبار نہ کرتے تھے اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے راز چوری کرنے کے لئے سرگرم عمل تھے اور اس ضمن میں امریکی سی آئی اے متعدد مرتبہ بین الاقوامی دہشت گرد تنظیموں سے بھی مدد لے چکی تھی۔ ان چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو پاکستان میں صرف حکومت سے ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی قوتوں کی مخالفت کا بھی سامنا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو سیاسی میدان میں مرتضیٰ کو اپنے لئے خطرہ تصور کرتی تھیں لیکن مرتضیٰ اور بے نظیر کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے والوں کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ دونوں بہن بھائی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فوج اور سول کی انٹیلی جینس ایجنسیوں اور کراچی پولیس نے مرتضیٰ بھٹو کے بارے میں کافی محتاط رویہ اپنائے رکھا اور بے نظیر بھٹو کو محض اتنی ہی معلومات فراہم کی جاتی تھیں جس قدر ضرورت ہوتی تھی۔ البتہ حساس اداروں کی طرف سے صدر مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری کو بعض ایسی معلومات (خفیہ رپورٹس) ضرور فراہم کی جاتی تھیں جن کا تعلق مرتضیٰ بھٹو اور الطاف حسین کی سرگرمیوں کے بارے میں ہوتا تھا۔ جبکہ بعض انٹیلی جینس ایجنسیوں کے اہلکار سردار فاروق احمد خاں لغاری کو بے نظیر بھٹو کے بارے میں بھی بعض اہم معلومات فراہم کیا کرتے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے بے نظیر بھٹو کے اقتدار حاصل کرنے کے 6 ماہ بعد ہی جاسوسی کرانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو جب صورتحال کا پتہ چلا تو انہوں نے سردار فاروق احمد خاں لغاری سے قومی اسمبلی توڑنے کے متعلق اختیارات واپس لینے کے لئے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپوزیشن اور صدر مملکت کو آپس میں لڑانے کے لئے مہران بینک سکینڈل کا سہارا لیا لہٰذا نواز شریف کو سردار فاروق احمد خاں لغاری کے خلاف کرپشن کے ثبوت ایک منصوبے کے تحت فراہم کئے گئے تھے کیونکہ مئی 1994ء میں اگر اپوزیشن اور سردار فاروق احمد خاں لغاری کو لڑایا نہ جاتا تو ممکن ہے کہ بے نظیر بھٹو کے خلاف سازشوں کا سلسلہ بہت پہلے شروع ہو جاتا۔ نواز شریف نے 31

مئی 1994ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران سردار فاروق احمد خاں لغاری کے خلاف کرپشن کے ثبوت پیش کیے۔ جیسا کہ متوقع تھا' لغاری نے یکم جون 1994ء کو ان الزامات کی تردید کر دی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری چیف جسٹس آف پاکستان کی تعیناتی کے مسئلہ پر اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کر سکتے تھے لیکن مہران بنک سیکنڈل کے منظرعام پر آجانے سے وہ سیاسی طور پر بے نظیر بھٹو کے ہاتھوں بلیک میل ہوگئے اور انہوں نے حکومت کی طرف سے بھجوائی جانے والی سمری کو منظور کرتے ہوئے سینئر ترین جج جسٹس سعد سعود جان کو نظرانداز کرتے ہوئے قدرے جونیئر جج سید سجاد علی شاہ کو 5 جون 1994ء کو چیف جسٹس آف پاکستان مقرر کر دیا حالانکہ اس سے قبل سردار فاروق احمد خاں لغاری جسٹس سعد سعود جان کو چیف جسٹس آف پاکستان مقرر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور جسٹس سعد سعود جان کو اس ضمن میں غیر سرکاری طور پر مطلع بھی کر دیا گیا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس فیصلے کو تبدیل کر دیا گیا۔ سید سجاد علی شاہ نے 5 جون 1994ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھایا اور اسی روز میر مرتضیٰ بھٹو کو کراچی کی ایک خصوصی عدالت نے شاہ بندر کیس میں ضمانت پر رہا کر دیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری کو جب کبھی بھی پتہ چلا کہ مہران بنک سیکنڈل کے پیچھے اصل ہاتھ کس کا تھا تو وہ بے نظیر کو معاف نہیں کریں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو خود بھی ایک بڑے جاگیردار کے بیٹے تھے جبکہ سردار فاروق احمد خاں لغاری کا شمار بھی ڈیرہ غازی خان کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا اور ظاہر ہے کہ جاگیرداری کلچر میں معاف کرنے کی رسم موجود نہیں ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی ضمانت پر رہائی کے بعد یکدم ملک میں تخریب کاری کی وارداتوں میں اضافہ ہوگیا۔ مساجد پر فائرنگ اور بم دھماکوں کے علاوہ دہشت گردی کی وارداتیں معمول بن کر رہ گئیں۔ کراچی اور پنجاب میں امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صورتحال کے باعث سردار فاروق احمد خاں لغاری کو محترمہ بے نظیر بھٹو پر برتری حاصل ہوگئی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کراچی کے ایشو پر سردار فاروق احمد خاں لغاری کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کی بجائے وزیر داخلہ نصیراللہ بابر کو دہشت گردی کے خلاف بے رحم اپریشن شروع کرنے کا اختیار دے دیا۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) نصیراللہ بابر

نے کراچی میں ایم کیو ایم کے خلاف اپریشن کے دوران پی پی پی کے ان کارکنوں کو بھی ہٹ (Hit) کرنا شروع کر دیا جو حکومت کی پالیسیوں پر عدم اعتماد کرتے ہوئے میر مرتضیٰ بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کی قیادت میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ چونکہ میر مرتضیٰ بھٹو نے الذوالفقار کا باب وطن آتے ہی بند کر دیا تھا اس لئے حکومت کو ان کے خلاف کوئی نیا مقدمہ بنانے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی ہاں البتہ حساس اداروں نے مرتضیٰ کے باڈی گارڈز کی نگرانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی اصل قوت اُن کے ساتھی تھے جبکہ ان کے قریبی ساتھیوں میں ملک مجید اور صنم بھٹو کے شوہر ناصر شامل تھے۔ ملک مجید کو امریکہ میں منشیات کی سمگلنگ کے الزام میں سزا بھی ہو چکی تھی جبکہ مرتضیٰ کے باڈی گارڈز میں ایسے افراد بھی شامل تھے جن پر حساس اداروں کو شبہ تھا کہ ان کا بالواسطہ یا بلاواسطہ RAW کے ساتھ تعلق موجود ہے۔

میر مرتضیٰ بھٹو نے رہا ہونے کے 6 ماہ بعد ہی غلطی یہ کی کہ انہوں نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلامی ممالک کو اکٹھا کر کے جنوبی ایشیا میں ایک نیا بلاک بنانے کے لئے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو اکثر سیاستدان دراصل سمجھ ہی نہیں پائے تھے۔ 16 سالہ جلاوطنی کے دوران میر مرتضیٰ بھٹو نے بہت کچھ سیکھا تھا اور بین الاقوامی حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس پی پی پی کی قیادت موجود نہ تھی۔ وہ اگر پارٹی کے سربراہ بن جاتے تو دیکھتے ہی دیکھتے پارٹی کے اندر ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہو جاتا کیونکہ ان کے پاس پارٹی کے لئے وافر وقت موجود تھا۔ تاہم بیگم بھٹو کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی انہیں پارٹی کی قیادت نہ مل سکی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر مرتضیٰ بھٹو سندھ کی حیثیت تک محدود ہو کر رہ گئے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو سیاست میں کھل کر آنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ وہ پی پی پی کے جس لیڈر سے رابطہ قائم کرتے تھے وہ زیر عتاب آجاتا تھا۔ بے نظیر بھٹو کو یہ قطعاً" پسند نہ تھا کہ ان کی پارٹی کے رہنما اور کارکن مرتضیٰ کے ساتھ رابطہ قائم کریں۔ حالانکہ اگر وہ مرتضیٰ کو سندھ پی پی پی کا صدر بنا دیتیں تو بھی بہن بھائی کے درمیان اختلاف کی خلیج کم ہو سکتی تھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو جب اپنے خاندان کی حمایت حاصل نہ ہو سکی تو ان کے مخالفین نے صورتحال کو Exploit کرنا شروع کر دیا۔ کراچی

میں خصوصاً بے نظیر بھٹو کی حکومت کاغذات کی حد تک رہ گئی کیونکہ مٹھی بھر دہشت گرد جب چاہتے تھے امن عامہ کی صورتحال کو تباہ کر کے رکھ دیتے تھے۔ بجائے اس کے کہ محترمہ صورتحال کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرتیں انہوں نے ایم کیو ایم کو بزدل اور چوہا کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی میں درجنوں افراد کا قتل معمول بن کر رہ گیا۔ 2 جون 1995ء کو پنجاب اسمبلی نے قرارداد منظور کر کے بے نظیر بھٹو کو کہا کہ وہ کراچی میں امن عامہ کی صورتحال بہتر بنائیں۔ اس قرارداد کے منظور ہونے کے بعد میر مرتضٰی بھٹو نے مخدوم خلیق الزماں سے کہا کہ اب بے نظیر بھٹو میاں منظور وٹو کو معاف نہیں کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ بے نظیر بھٹو نے جون 1995ء میں وٹو کے خلاف منصوبہ بندی شروع کی اور 5 ستمبر 1995ء کو پنجاب میں گورنر راج نافذ کر کے وٹو کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ جبکہ احتجاجی تحریک شروع کرنے پر میاں نواز شریف کے خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ کراچی اور پنجاب میں امن عامہ کی صورتحال پر قابو پانے کے لئے حکومت نے انتہائی بھونڈے طریقے سے اپریشن کیا۔

ایم کیو ایم کے کارکنوں کو کراچی پولیس نے چن چن کر قتل کیا اور الطاف حسین کی جگہ ڈاکٹر عمران فاروق کو ایم کیو ایم کا سربراہ بنوانے کی کوششیں ہوئیں۔ غیر یقینی کی اس صورتحال میں میر مرتضٰی بھٹو کو یقین ہو گیا تھا کہ بے نظیر 1995ء کا سال بمشکل ہی گزار پائیں گی' یعنی ان کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ انہی دنوں میں فوج کے بعض سینئر جرنیلوں نے ملک میں انقلاب لانے کی کوشش بھی کی لیکن بروقت کارروائی کے باعث یہ سازش ناکام ہو گئی' ورنہ ممکن ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور مرتضٰی کو ستمبر 1995ء میں ہی انقلاب کے بعد سیاسی منظر سے ہٹا دیا جاتا۔

میر مرتضٰی بھٹو کی بے نظیر بھٹو سے صلح کرانے کی کوششیں اور سانحہ کلفٹن

محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنے دوسرے دور حکومت میں جہاں اپنی غلطیوں کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا وہیں پر بیوروکریسی اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کے وہ سینئر حکام بھی ان کی رسوائی کا باعث بنے جن کی دوستیاں آصف علی زرداری کے ساتھ تھیں۔ بعض بیوروکریٹس کھلم کھلا کرپشن کر رہے تھے اور ان کا موقف یہ تھا کہ وہ یہ سب کچھ آصف علی زرداری کو ان کے ساتھ طے پانے والے معاہدے کے تحت رقم فراہم کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ ملک کی اقتصادی صورتحال اگست 1995ء میں یہ تھی کہ حکومت کے پاس ملازمین کو تنخواہیں ادا کرنے کے لئے پیسے نہ تھے اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی منت سماجت کر کے زر مبادلہ کے ذخائر کو مصنوعی طور پر بڑھایا گیا۔ ملک میں امن عامہ کی صورتحال دگرگوں تھی جبکہ عام اشیاء کی قیمتوں (پانی' بجلی اور گیس) میں ہر تیسرے ماہ اضافہ معمول بن کر رہ گیا تھا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا اور لگتا تھا کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت اب گئی کہ اب گئی۔ ان حالات میں بے نظیر بھٹو نے مرتضٰی کے ساتھ صلح کی کوششیں شروع کیں اور ان کی مرتضٰی سے ایک ملاقات کافی حد تک کامیاب رہی۔ بے نظیر بھٹو کو ستمبر 1995ء میں نہایت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ فوج اور سردار فاروق احمد خاں لغاری (جو اس وقت صدر مملکت کے عہدے پر فائز تھے) کے میاں نواز شریف کے ساتھ تعلقات بہتر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ انٹیلی جینس بیورو کے سربراہ میجر مسعود شریف کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو

کو ملک کی سیاسی صورتحال کے حوالے سے بھجوائی جانے والی رپورٹس میں صاف اشارہ موجود تھا کہ آنے والے دن حکومت کے لئے بھاری ہوں گے کیونکہ مسلم لیگ نے صدر مملکت پر تنقید کا سلسلہ ختم کر کے صرف بے نظیر بھٹو کو ٹارگٹ بنانے کے لئے حکمت عملی تیار کرلی ہے۔ ستمبر 1995ء میں امن عامہ کی صورتحال اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ فوج کی انٹیلی جنیس ایجنسیوں کو پتہ نہیں چل پا رہا تھا کہ سندھ اور پنجاب کے شہری علاقوں میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے والے کون ہیں۔ ان حالات میں جنرل عبدالوحید نے نواز شریف کو لندن بھجوایا تاکہ وہ الطاف حسین کے ساتھ مذاکرات کر کے کراچی کے مسئلے کا کوئی حل تلاش کر سکیں۔ 30 ستمبر 1995ء کو راولپنڈی میں جنرل بدالوحید کی سربراہی میں کور کمانڈروں کا اجلاس منعقد ہونا تھا اور مبینہ طور پر فوج کے بعض سینئر افسروں نے سازش کی کہ کسی نہ کسی طرح کور کمانڈروں کے اجلاس کے دوران جی ایچ کیو میں داخل ہو کر اعلیٰ فوجی قیادت کو ختم کر دیا جائے۔ اگلے مرحلے میں وزیراعظم اور ان کی کابینہ کے چیدہ چیدہ ارکان کو ختم کیا جاتا۔ اس انقلاب کو لانے میں میجر جنرل ظہیرالاسلام عباسی نے مرکزی کردار ادا کرنا تھا اور بریگیڈیئر مستنصر باللہ اس کار خیر میں ان کے ساتھ تھے۔ 30 ستمبر 1995ء کو کور کمانڈروں کی کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ہی یہ سازش بے نقاب ہوگئی اور سازشی فوجی افسروں کو گرفتار کر کے خفیہ مقامات پر منتقل کر دیا گیا۔ جنرل عبدالوحید نے ناکام فوجی سازش کے بارے میں بے نظیر بھٹو کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ میڈم پرائم منسٹر! خدا کا شکر ہے کہ سازش ناکام ہوگئی ہے اور اس سازش میں شامل تمام کرداروں کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ حکومت نے ناکام فوجی بغاوت کے بارے میں خبر کو اخبارات سے دو ہفتوں تک چھپائے رکھا اور اگرچہ اخبارات میں ناکام فوجی سازش کے بارے میں کوئی خبر تو شائع نہ ہو سکی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صحافیوں کو اس سازش کے بے نقاب ہونے کا علم نہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ غیر صحافی اس بارے میں باخبر تھے اور یہ اطلاع سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی ملک میں 15 اکتوبر 1995ء تک پھیل چکی تھی۔ جس پر محترمہ بے نظیر بھٹو نے پہلی مرتبہ 15 اکتوبر 1995ء کو لب کشائی کرتے ہوئے کہا کہ فوج کے سینئر افسران کو حراست میں لیا گیا ہے۔ یہ سارا آپریشن فوج کی

انٹیلی جنیس ایجنسی ملٹری انٹیلی جنیس نے مکمل کیا جس کے سربراہ علی قلی خاں تھے۔ بے نظیر بھٹو نے علی قلی خاں کو 13 اکتوبر 1995ء کو راولپنڈی کا کور کمانڈر بنا دیا۔ جس کے بعد بے نظیر 20 اکتوبر 1995ء کو امریکہ گئیں جہاں انہوں نے پاکستان کے لئے فوجی و اقتصادی امداد بحال کرانے کے لئے امریکی حکام سے مذاکرات کئے۔ 29 اکتوبر 1995ء کو سردار فاروق احمد خاں لغاری نے پارلیمینٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کے دوران حکومت پر پہلی مرتبہ تنقید کی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری کا انداز خطاب بے نظیر بھٹو کے لئے یہ سمجھ لینے کے لئے کافی تھا کہ اب صورتحال کافی حد تک بدل گئی ہے اس لئے انہوں نے بھی جارحانہ پالیسی اپناتے ہوئے 15 نومبر کو کہا کہ میں نواز شریف کی طرح بلی بن کر استعفیٰ نہیں دوں گی اور نہ ہی ملک میں مڈٹرم الیکشن ہوں گے۔

1995ء کے آخر میں بے نظیر بھٹو جس قسم کی سازشوں میں پھنس گئی تھیں' ان سازشوں سے نکلنے کے لئے انہوں نے جہاں پارٹی کے ناراض کارکنوں کو منانے کا سلسلہ شروع کیا وہیں پر انہوں نے اپنے خاندان کے افراد سے بھی صلح کی کوششیں شروع کیں۔ انہوں نے پہلے مرحلے میں اپنے چچا ممتاز بھٹو سے صلح کی جنہوں نے بے نظیر کو مشورہ دیا کہ مرتضیٰ کے ساتھ تمام سیاسی اختلاف ختم کر کے کسی دن 70 کلفٹن میں غنویٰ اور اپنی والدہ کی موجودگی میں پریس کانفرنس سے خطاب کریں۔ بے نظیر بھٹو اس حد تک جانے کے لئے تیار تھیں لیکن وہ چاہتی تھیں کہ پہلے مرتضیٰ سے تمام اختلافی امور طے کر لئے جائیں۔ مرتضیٰ بھٹو کی 1993ء میں وطن واپسی کے بعد سے نومبر 1995ء تک بیگم بھٹو، صنم بھٹو اور خاندان کے دیگر افراد نے بے نظیر بھٹو پر دباؤ ڈالے رکھا کہ وہ مرتضیٰ کے ساتھ صلح کر لیں۔ نومبر 1995ء کے بعد بے نظیر بھٹو نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے مرتضیٰ کے ساتھ بلاواسطہ اور بالواسطہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بے نظیر بھٹو کبھی کبھار مرتضیٰ کو فون کر کے ان سے چپکے سے بات چیت کرلیا کرتی تھیں۔ بے نظیر بھٹو کی خواہش تھی کہ مرتضیٰ آصف علی زرداری سے بھی اپنے تعلقات درست کرے کیونکہ 95-1993ء کے دوران انٹیلی جنیس ایجنسیوں نے جھوٹی سچی رپورٹیں تیار کر کے آصف علی زرداری اور مرتضیٰ بھٹو کے درمیان

اختلافات کو کافی بڑھا دیا تھا۔ ایک بے نظیر بھٹو خاندان کے مسائل حل کرنے میں مصروف تھیں تو دوسری طرف انہوں نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح جنرل عبدالوحید اپنی ملازمت میں توسیع لینے پر آمادہ ہو جائیں۔ تاہم جنرل عبدالوحید نے جو 13 جنوری 1996ء کو ریٹائر ہو رہے تھے' اپنی ملازمت میں توسیع کرانے سے انکار کر دیا۔ بے نظیر بھٹو نے 17 دسمبر 1995ء تک کوشش کی کہ جنرل عبدالوحید ملازمت میں توسیع حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دیں لیکن ان کے مسلسل انکار کے بعد حکومت نے جنرل جہانگیر کرامت کو فوج کا نیا سربراہ مقرر کر دیا۔

یکم جنوری 1996ء کو میاں نواز شریف اور اجمل دہلوی لندن گئے جہاں مسلم لیگ اور ایم کیو ایم کی قیادت کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ الطاف حسین اور نواز شریف نے 5 جنوری 1996ء کو مشترکہ اعلامیہ جاری کرتے ہوئے کہا کہ "وہ مل کر ملک میں جلد ہی تبدیلیاں لائیں گے"۔ اور ظاہر ہے کہ ان تبدیلیوں سے مراد موسم کی تبدیلی نہیں بلکہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کا خاتمہ تھا۔ الطاف حسین اور نواز شریف کے درمیان ہونے والی اس ملاقات کے بعد پاکستان میں تخریب کاری میں اضافہ ہو گیا۔ 6 جنوری 1996ء کو امریکہ نے تھامس سائمنز کو پاکستان میں سفیر مقرر کیا جس کے اگلے روز کراچی میں بموں کے دھماکے ہوئے جبکہ 8 جنوری 1996ء کو برطانیہ نے پاکستان کی درخواست مسترد کرتے ہوئے الطاف حسین کو اسلام آباد کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

میر مرتضیٰ بھٹو بھی بدلتی ہوئی سیاسی صورتحال کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے کیونکہ بے نظیر بھٹو کے خلاف نہ صرف ملکی سطح پر اپوزیشن جماعتیں متحد ہو رہی تھیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بڑی قوتیں ان کی بہن کی حکومت کا خاتمہ چاہتی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنے کی خواہش رکھنے والوں نے کوئی نہ کوئی تو منصوبہ بنا ہی رکھا ہوگا۔ مرتضیٰ بھٹو ان منصوبہ سازوں کی تلاش میں تھے کیونکہ ایک بات وہ نہایت اچھی طرح جانتے تھے کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے کے بعد بھٹو خاندان کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی ہوگی اور اس کی لپیٹ میں مرتضیٰ بھی آسکتے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو نے 5 جنوری 1996ء کو ایم کیو ایم اور مسلم لیگ کی طرف

سے لندن سے جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیہ کی خبر پر سرخ دائرہ بنایا اور اس اخبار کو لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اسی روز پاکستان نے ایران پر اقتصادی پابندیاں لگانے کے متعلق امریکی کارروائی کو بزدلانہ حرکت قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ایران پر عائد اقتصادی پابندی فوراً" ختم کی جائے۔ اس واقعہ کے بعد نواز شریف 13 فروری 1996ء کو امریکہ گئے اور ان کے دورے کا بظاہر مقصد نیوکلیئر پروگرام کے موضوع پر ہونے والے ایک سیمینار سے خطاب کرنا تھا۔ لیکن اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے امریکی وزارت خارجہ کی ایک اہم خاتون آفیسر رابن رافیل سے بھی ملاقات کی جن کے امریکی سی آئی اے کے ساتھ تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ رابن رافیل سے ملاقات کے بعد نواز شریف جب وطن واپس لوٹے تو ان کا چہرہ خوشی اور جوش کے ملے جلے جذبات سے تمتما رہا تھا اس کی شاید وجہ یہ تھی کہ انہیں امریکہ میں اعلیٰ حکام سے ملاقاتوں کے بعد بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے کے متعلق کوئی اشارہ مل گیا تھا۔ نواز شریف نے یکم مارچ 1996ء کو الطاف حسین کے ساتھ لندن میں دوبارہ مذاکرات کئے جس کے اگلے روز محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ "آمریت والے تیسری قوت کو لانا چاہتے ہیں"۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی اس بامعنی گفتگو کا سردار فاروق احمد خاں لغاری نے اگلے ہی روز اس وقت جواب دے دیا جب انہوں نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "عوامی نمائندے مفت خوری چھوڑیں اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں"۔ امریکہ نے 6 مارچ 1996ء کو پاکستان پر الزام لگایا کہ اسلام آباد ایٹمی دھماکے کی تیاری کر رہا ہے۔ امریکی ترجمان کے اس بیان کے بعد نواز شریف نے ذرا کھل کر کہا کہ "ہم اپنے ایجنڈے پر دوبارہ وہیں سے عمل شروع کریں گے جہاں پر ہماری حکومت ختم ہونے سے (1993ء میں) ہمارے تیار کردہ منصوبوں پر کام روک دیا گیا تھا" سردار فاروق احمد خاں لغاری نے بے نظیر بھٹو کے خلاف تیار کئے جانے والے جال کو مضبوط کرتے ہوئے حکومتی مخالفین کی حوصلہ افزائی کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ 10 مارچ 1996ء کو صدر مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری نے حکومت پر کھلم کھلا تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "حکومت کنٹرول اور نظم و ضبط سے محروم ہے"۔ بے نظیر بھٹو اس وقت تک اس سازش کو سمجھ چکی تھیں جو انہیں اقتدار سے محروم کرنے کے

لئے تیار کی گئی تھی کیونکہ ہر سطح پر ان کے خلاف محاذ کھول دیئے گئے تھے۔ قاضی حسین احمد جو عرصہ دراز سے سردار فاروق احمد خاں لغاری سے ناراض تھے' اچانک 13 مارچ 1996ء کو ایوان صدر پہنچ گئے جہاں انہوں نے صدر محترم کو مشورہ دیا کہ وہ بے نظیر بھٹو کی چھٹی کرائیں۔ مرتضیٰ بھٹو نے 14 مارچ 1996ء کو اپنی پارٹی کے چیدہ چیدہ رہنماؤں کو بتایا کہ اب سردار فاروق احمد خاں لغاری کی اگلی کوشش یہ ہوگی کہ کسی نہ کسی طرح ان کی میاں نواز شریف سے ملاقات ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے عابدہ حسین کے ذریعے نواز شریف کو پیغامات بھجوانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ میاں نواز شریف نے صورتحال کو اپنے حق میں دیکھتے ہوئے پہلے مرحلے میں سردار فاروق احمد خاں لغاری سے خود ملاقات کرنے کی بجائے راجہ ظفرالحق' جنرل مجید ملک اور چوہدری نثار پر مشتمل تین رکنی مذاکراتی ٹیم کو 26 مارچ 1996ء کو ایوان صدر بھیجا۔ مسلم لیگ کی اس مذاکراتی ٹیم نے 23 مارچ 1996ء کے سپریم کورٹ کے تاریخ ساز فیصلے پر عمل درآمد کروانے کے حوالے سے ایوان صدر کی کوششوں کی تعریف کی اور انہیں نواز شریف کی طرف سے مبارکباد کا پیغام دیا۔ سیاست میں مبارکباد کے پیغامات کی اگرچہ کوئی حیثیت نہیں ہوتی کیونکہ یہ طریقہ واردات ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری بھی اس سے اچھی طرح باخبر تھے لیکن محض بے نظیر بھٹو کو بلیک میل کرنے کی خاطر انہوں نے اپوزیشن کے ساتھ نئی چالیں چلنا شروع کر دیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے سردار فاروق احمد خاں لغاری کی جاسوسی کا سلسلہ جنوری 1996ء میں ہی شروع کر دیا تھا اور انٹیلی جینس بیورو کی طرف سے سردار فاروق احمد خاں لغاری کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں انہیں باقاعدگی سے رپورٹس ارسال کی جاتی تھیں۔ 26 مارچ 1996ء کو جب سردار فاروق احمد خاں لغاری نے مسلم لیگ کے تین رکنی وفد سے ملاقات کی تو بے نظیر بھٹو بھی اسی روز ایوان صدر پہنچ گئیں تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری ان کے سامنے سچ بولتے ہیں یا جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری اور اپوزیشن کے درمیان ہونے والے مذاکرات کی تفصیل سے وہ اچھی طرح باخبر تھیں اور جب محترمہ بے نظیر بھٹو ایوان صدر سے باہر

نکلیں تو ان کا سر چکرا رہا تھا کیونکہ صدر مملکت محترم ان کے سامنے بے نقاب ہو چکے تھے۔ بے نظیر بھٹو اور سردار فاروق احمد خاں لغاری دونوں کے پاس وقت کم تھا اور جو پہلے وار کر جاتا وہی کامیاب ہو جاتا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے سردار فاروق احمد خاں لغاری پر فیصلہ کن وار کرنے کے لئے 8 ویں ترمیم کی متنازعہ دفعات ختم کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ بے نظیر بھٹو نے یکم اپریل 1996ء کو نواز شریف کو خط لکھ کر مذاکرات کی دعوت دی۔ 2 اپریل 1996ء کو سردار فاروق احمد خاں لغاری نے فوج کے فارمیشن کمانڈروں کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں اپوزیشن نے بھی شرکت کی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ نواز شریف اور سردار فاروق احمد خاں لغاری کے درمیان صلح ہو چکی ہے اور اس سلسلے یں اب محض رسمی کارروائی باقی ہے۔ سردار فاروق لغاری 1993ء سے 1995ء کے دوران آنکھیں بند کر کے بے نظیر بھٹو کی ہدایات پر عمل کرتے رہے لیکن 1995ء کے آخر میں سردار فاروق احمد خاں لغاری نے بالکل غلام اسحاق خاں کی طرح چالیں چلنا شروع کر دیں۔ بے نظیر بھٹو نے کئی معاملات میں انہیں شک کا فائدہ دیا لیکن جب وہ ان کے سامنے بے نقاب ہوگئے تو ان کی وفاداری کا امتحان لینے کے لئے بے نظیر بھٹو نے انہیں کہا کہ وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ کو فارغ کر دیں۔ ظاہر ہے کہ سردار فاروق احمد خاں اپنی جیب میں موجود ایک اہم کارڈ کیسے ضائع کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے سید سجاد علی شاہ کو فارغ کرنے کی بجائے 16 اپریل 1996ء کو چیف جسٹس صاحب کو حکومتی اداروں اور اپنی سوچ سے آگاہ کر دیا۔ چیف جسٹس اور لغاری کے درمیان ایوان صدر میں ہونے والی اس ملاقات کے بعد حکومت اور عدلیہ کے درمیان فیصلہ کن جنگ شروع ہوگئی اور عمران خاں جیسے شخص کو بھی یقین ہوگیا کہ اب نئے الیکشن دور کی بات نہیں۔ عمران نے 23 اپریل 1996ء کو تحریک انصاف کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کر دی جس پر مرتضیٰ بھٹو نے کہا کہ اگر عمران مرد کا بچہ ہے تو کھل کر اعلان کرے کہ وہ وزیراعظم بننا چاہتا ہے۔

28 اپریل 1996ء کو پھول نگر میں چلتی بس میں دھماکہ ہوا جس سے 70 افراد ہلاک ہوگئے۔ اس پر بے نظیر بھٹو نے کہا کہ "خوف زدہ لوگ مجھے گھر بھیجنا چاہتے ہیں

لیکن آپ لوگ (ارکان پارلیمنٹ) یہ ڈر دل سے نکال دیں کہ اسمبلی ٹوٹ جائے گی"۔ بے نظیر بھٹو کے اس بیان کے بعد شیخوپورہ میں بم کا دھماکہ ہوا جس میں 10 افراد ہلاک ہوئے۔ بھٹو خاندان کے خلاف جو کچھ ہو رہا تھا وہ دراصل ایک طے شدہ منصوبے کا حصہ تھا اور قومی اسمبلی تڑوانے کے لئے یہ بہت ضروری تھا کہ ملک میں اس قدر خونریزی ہو کہ عوام دہشت زدہ ہو کر حکومت جانے کی دعائیں کرنا شروع کر دیں۔ 23 جون 1996ء کو تاجروں نے وفاقی بجٹ میں لگائے گئے بھاری ٹیکسوں کے خلاف ہڑتال کی جبکہ 24 جون 1996ء کو جب جماعت اسلامی نے اسلام آباد میں دھرنا دینے کے لئے راولپنڈی سے اسلام آباد کی طرف مارچ شروع کیا تو پولیس نے فائرنگ شروع کر دی۔ جماعت اسلامی نے حکومت کو گرانے کے لئے دھرنا دینے کا پروگرام سردار فاروق احمد خاں لغاری کو اعتماد میں لے کر ترتیب دیا تھا۔ اس روز قاضی حسین احمد کو گرفتار کیا گیا جبکہ ایک مرتبہ پھر بزرگ سیاستدان نواب زادہ نصراللہ خاں کی سربراہی میں اس وقت حکومت کے خلاف متحد ہوگئے جب انہوں نے 25 جون 1996ء کو آزاد گروپ کے نام سے ایک نیا اتحاد تشکیل دے دیا۔ اس کے بعد سیاسی رابطوں میں تیزی آگئی۔ نواز شریف نے منصورہ (جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر) جاکر قاضی حسین احمد سے ملاقات کی۔ اس موقع پر جماعت اسلامی اور مسلم لیگ میں اتحاد تو نہ ہو سکا لیکن یہ ضرور طے ہوگیا کہ دونوں جماعتیں بے نظیر بھٹو کے خلاف احتجاجی تحریک جاری رکھیں گی۔ جماعت اسلامی نے حکومت گرانے کے لئے 20 جولائی 1996ء کو ٹرین مارچ شروع کیا جس کے دو روز بعد لاہور ایئرپورٹ پر بموں کے دھماکے ہوئے۔ 5 اگست 1996ء کو کمشنر سرگودھا دہشت گردی کا نشانہ بنے جس کے بعد 6 اگست 1996ء کو جماعت اسلامی نے حکومت کے خلاف آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جس میں نواز شریف بھی شریک ہوئے۔ ان دنوں اپوزیشن حکومت پر کس طرح تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا جب مسلم لیگ کا ہم خیال سیاستدانوں کے ساتھ رابطہ نہ ہوتا ہو اور جس روز اپوزیشن کی کارکردگی مایوس کن رہی' اس دن دہشت گرد بم دھماکوں اور شیعہ سنی رہنماؤں کو قتل کر کے یہ کمی پوری کر دیتے۔ یکم ستمبر 1996ء کو بے نظیر بھٹو نے پی پی پی کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس

کی صدارت کرتے ہوئے اپنی پارٹی کے مرکزی رہنماؤں کو اس سازش سے آگاہ کیا جو ان کی حکومت ختم کرنے کے لئے تیار ہو چکی تھی اور سردار فاروق احمد خاں لغاری اس سازش کے مرکزی کرداروں میں شامل تھے۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے اس روز مڈٹرم الیکشن کرانے پر رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ "آپ لوگ نئے الیکشن کے لئے تیار رہیں"۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے پی پی پی کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد کراچی پولیس کو خصوصی طور پر ہدایت جاری کی کہ "مرتضیٰ کی تلاشی کے لئے 70 کلفٹن اور 71 کلفٹن پر چھاپہ نہ مارا جائے"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ حکومت نے مرتضیٰ کے بعض ساتھیوں کی گرفتاری کے لئے بے نظیر بھٹو سے 70 اور 71 کلفٹن پر چھاپہ مارنے کی اجازت طلب کر رکھی تھی۔ بے نظیر بھٹو نے اگرچہ مرتضیٰ کے ساتھ صلح صفائی کے لئے 1995ء میں ہی عملی کوششیں شروع کر دی تھیں لیکن ستمبر 1996ء کے آغاز میں ہی انہوں نے اپنی بھٹو خاندان کے اثاثوں کو مرتضیٰ بھٹو کی خواہش کے مطابق تقسیم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی جبکہ بے نظیر بھٹو اس بات پر بھی آمادہ ہوگئیں کہ پارٹی کی قیادت بیگم نصرت کے سپرد کر دی جائے گی اور اس سلسلے میں تمام فیصلے 70 کلفٹن میں ہوں گے۔ بیگم بھٹو ان دنوں ذہنی طور پر بہت پریشان تھیں اور مرتضیٰ کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کی والدہ اب پارٹی کے امور نہیں سنبھال سکتیں۔ مرتضیٰ اور بے نظیر بھٹو پی پی پی کی قیادت کا مسئلہ' پارٹی کی ازسرنو تنظیم سازی اور خاندانی اثاثہ جات کی منصفانہ طور پر تقسیم کے لئے 25 سے 30 ستمبر 1996ء کے درمیان دوبارہ ملنے والے تھے اور حتمی تاریخ کا تعین کسی بھی دن کیا جاسکتا تھا۔ ابھی بے نظیر بھٹو اپنے خاندانی مسائل حل کرنے کے لئے مختلف تجاویز پر غور کرنے میں مصروف ہی تھیں کہ انہیں 18 ستمبر 1996ء کو کراچی میں سول سیکرٹریٹ اور کمشنر آفس میں بم دھماکوں کی اطلاع ملی۔ کراچی پولیس اور انٹیلی جنس بیورو نے 18 ستمبر 1996ء کی شام محترمہ بے نظیر بھٹو کو ان دھماکوں کے بارے میں جو رپورٹ ارسال کی اس میں واضح طور پر یہ اشارہ موجود تھا کہ دہشت گردی کی اس واردات میں بھارتی انٹیلی جنس RAW کے دہشت گردوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے جو مرتضیٰ کے ایک قریبی ساتھی علی سنارا کو رہا کروانے کے لئے حکومت کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ کراچی پولیس

19 ستمبر 1996ء کو مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز کو گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو نے اچانک نصیراللہ بابر کو ہدایت کی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ مرتضیٰ بھٹو یا کوئی اور رکن اسمبلی کراچی پولیس کی زیادتیوں کا نشانہ نہ بنے۔ نصیراللہ بابر نے جو اس وقت وزیر داخلہ کے عہدے پر فائز تھے' محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہدایت پر کس قدر عمل کیا اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کراچی پولیس نے 19 ستمبر 1996ء کو مرتضیٰ بھٹو کے خلاف تیار کئے جانے والے منصوبے پر عمل درآمد ترک کرنے کی بجائے بعض ایسے بھی انتظامات کر لئے جن کا مقصد مرتضیٰ بھٹو کو زندہ نہیں بلکہ مردہ حالت میں گرفتار کرنا تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو 20 ستمبر 1996ء کی صبح معمول کی کارروائی کے بعد شام کو جب کراچی میں ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لئے 70 کلفٹن سے روانہ ہوئے تو ان کے وہ تمام باڈی گارڈز ان کے ساتھ موجود تھے جن کے بارے میں حکومت کو شک تھا کہ وہ RAW کے ایجنٹ ہیں یا ان کے پاس غیرلائسنس یافتہ اسلحہ موجود ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے کراچی میں 20 ستمبر 1996ء کی سہ پہر پریس کانفرنس میں کراچی پولیس کو وارننگ دی کہ اگر وہ انہیں گرفتار کرنا چاہتی ہے تو پہلے وارنٹ حاصل کرے۔ میر مرتضیٰ بھٹو دراصل اپنے ساتھی علی سنارا کو پولیس کے تشدد سے بچانے کے لئے کراچی سی آئی اے سینٹر کا دورہ کر چکے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو کے اس اقدام کو پولیس نے یہ رنگ دیا کہ مرتضیٰ نے سی آئی اے سینٹر پر حملہ کیا حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ مرتضیٰ بھٹو صدیق گوٹھ سے جلسہ کر کے گاڑیوں کے ایک جلوس کی شکل میں 70 کلفٹن روانہ ہوئے تو 20 ستمبر 1996ء کی اس رات ان کے گرد پریشانی کے سائے منڈلا رہے تھے کیونکہ ان کی اپنی اطلاع کے مطابق کراچی پولیس نے ان کے ساتھیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی کا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ مرتضیٰ کی گاڑی جونہی آٹھ بجکر چالیس منٹ پر 70 کلفٹن کے قریب پہنچی ان کی نظر آڑھی ترچھی کھڑی پولیس کی گاڑیوں پر پڑی۔ مرتضیٰ الذوالفقار کے سربراہ تھے اور الذوالفقار کے سربراہ کے طور پر ان کا کئی مرتبہ اس قسم کی صورتحال سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ لیکن وہ خوف زدہ ہونے کی بجائے انتہائی اعتماد سے اپنی نشست پر بیٹھے رہے۔ اسی اثناء میں پولیس نے انہیں گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ پولیس کے کمانڈوز نے جس انداز میں پوزیشن سنبھال رکھی تھی اس

کو دیکھتے ہوئے مرتضیٰ نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ اس کے بعد انہوں نے ہاتھ سے پولیس آفیسرز کی طرف اشارہ کیا۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ کوئی سینئر افسران سے بات کرے۔ اے ایس پی شاہد حیات نے مرتضیٰ کے ہاتھ کے اشارے پر اس گاڑی کی طرف قدم اٹھانے شروع کئے جس میں مرتضیٰ اور ان کے ساتھی موجود تھے۔ ایک سینئر پولیس آفیسر کو آتا دیکھ کر مرتضیٰ کے چہرے پر موجود تفکرات میں کمی آگئی کیونکہ اگر پولیس انہیں مارنا چاہتی تو کوئی سینئر پولیس آفیسران کی طرف نہ آتا۔ شاہد حیات نے مرتضیٰ سے کہا "سر! ہم آپ کے باڈی گارڈز کی تلاشی لینا چاہتے ہیں کیونکہ ہماری اطلاع کے مطابق ان کے پاس غیر قانونی اسلحہ موجود ہے"۔ مرتضیٰ نے اس پر انتہائی اعتماد سے شاہد حیات کو کہا کہ وہ چند ایک پولیس آفیسرز اور ملازمین کے ساتھ ان کے پیچھے 70 کلفٹن آجائیں کیونکہ اس طرح سڑک پر کھڑے ہو کر وہ تلاشی نہیں دیں گے۔ مرتضیٰ کے قریبی ساتھی اور پولیس والوں کا 20 ستمبر 1996ء کی رات شاہد حیات اور مرتضیٰ کے درمیان ہونے والے ڈائیلاگ کے بارے میں موقف بہت مختلف ہے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ مرتضیٰ کے کمانڈوز نے اے ایس پی کو اغواء کرنے کی کوشش کی تھی جس پر پولیس کو فائرنگ کرنا پڑی جبکہ مرتضیٰ کے قریبی ساتھیوں کے مطابق اس وقت جبکہ پولیس اور مرتضیٰ کے درمیان مذاکرات جاری تھے' اچانک فائرنگ شروع ہوگئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مرتضیٰ اور ان کے ساتھی زخمی ہوگئے۔ یہ کارروائی وزیراعظم کے ان احکامات کو نظرانداز کرتے ہوئے کی گئی جن کے ذریعے ملک بھر کی پولیس اور سیکورٹی حکام کو حکم دیا گیا تھا کہ مرتضیٰ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ آخر کار وہ کون تھا جس کے حکم پر مرتضیٰ کو قتل کرتے کے لئے وزیراعظم کے احکامات کو نظرانداز کر دیا گیا؟

انکوائری ٹریبونل کی رپورٹ

20 ستمبر 1996ء کو رات 8 بج کر 40 منٹ سے 8 بج کر 55 منٹ کے درمیان 70 کلفٹن شاہراہ ایران کے قریب ڈی آئی جی ہاؤس کے سامنے فائرنگ کا ایک واقعہ رونما ہوا۔ پولیس کے مطابق اس بات کے مناسب اقدامات کئے گئے تھے کہ سرجانی ٹاؤن سے مرحوم میر مرتضٰی بھٹو، ایم پی اے سندھ، سربراہ پاکستان پیپلزپارٹی (شہید بھٹو گروپ) اور اس وقت کی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے بھائی اور ان کی پارٹی کے دیگر ممبران بشمول ان کے باڈی گارڈز کو لانے والی گاڑیوں کے قافلے کو جائے حادثہ کے قریب روکا جاسکے جس کا مقصد جنگجو باڈی گارڈز کی تلاشی لینا (جن کے بارے میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ان کے پاس غیر لائسنس شدہ ہتھیار ہیں) اور انہیں 17-9-96 کو سی آئی اے سینٹرز پر چڑھائی کرنے کے شبہے اور 18-9-96 کو ہونے والے بم دھماکے میں گرفتار کرنا تھا۔ تاہم پولیس کے مطابق قافلہ روکے جانے کے بعد میر مرتضٰی سے پوچھ گچھ کے وقت مرحوم میر مرتضٰی کے ساتھی افراد کی جانب سے فائرنگ شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں دو پولیس کے عہدیدار زخمی ہوئے اور اپنے بچاؤ کے لئے پولیس نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس کی فائرنگ کے نتیجے میں 7 افراد ہلاک ہوئے جن میں میر مرتضٰی اور عاشق حسین جتوئی اور کئی دیگر افراد شامل تھے۔ زخمیوں میں سے ایک فرد ٹیکسی میں ہلاک ہوا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پولیس نے پوزیشنیں سنبھالی ہوئی تھیں اور وہ جلوس کی آمد کی منتظر تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مرحوم میر مرتضٰی اس صورتحال سے بے خبر تھے کہ انہیں روکا جائے گا اور پولیس ان کے انتظار میں کھڑی ہے۔ حادثے کے بعد ایک ایف آئی آر پولیس اسٹیشن کلفٹن ساؤتھ کراچی میں درج

کرائی گئی۔ اسی رات حکومت کی جانب سے بذریعہ انسپکٹر حق نواز سیال، ایس ایچ او پی ایس کلفٹن، زیر دفعہ 147'148'149'186'353'427/ جسے دفعہ 324 بابت قصاص و دیت آرڈی نینس (سیکشن 302 جس کا بعد میں اضافہ کیا گیا) کے ساتھ پڑھیں میر مرتضٰی اور ان کے ساتھیوں بشمول زخمیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ایک علیحدہ ایف آئی آر زیر دفعہ 13 ڈی بابت آرمز آرڈی نینس بھی میر مرتضٰی کے ساتھیوں کے خلاف درج کرائی گئی جس میں سے کچھ افراد ایف آئی آرز سے پہلے ہی ہلاک ہو چکے تھے۔ پولیس کے موقف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میر مرتضٰی کی پارٹی میں سے جو سات افراد ہلاک اور زخمی ہوئے انہیں پولیس کے آتشیں اسلحہ سے زخم آئے۔ سات افراد کی ہلاکت اور دیگر زخمی افراد کے ضمن میں متعلقہ پولیس حکام کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی۔

2- حادثے میں پولیس کی جانب سے ادا کردہ کردار کے خلاف اخبارات میں اسکے برعکس رپورٹس شائع ہوئیں۔ اس کے پس منظر میں حکومت سندھ نے حادثے میں پولیس کے کردار کی چھان بین کیلئے یہ انکوائری ٹریبونل تشکیل دیا۔

3- جیساکہ بیان کیا گیا ہے کہ فائرنگ 8 بج کر 40 منٹ تا 8-55 کے درمیان 20 ستمبر 1996 کو شروع ہوئی۔ مملکت کی جانب سے پولیس کے ذریعے ایک ایف آئی آر اسی رات 10 بجے پولیس سٹیشن کلفٹن میں اس وقت کے زخمی انسپکٹر حق نواز سیال، ایس ایچ او پی ایس کلفٹن کی شکایت پر درج ہوئی۔ اس ایف آئی آر میں انسپکٹر حق نواز سیال اور اے ایس پی شاہد حیات، اور دو پولیس اہلکار جنہیں زخم آئے تھے، کا حوالہ دیا گیا تھا۔ ایف آئی آر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پولیس پارٹی نے اپنے بچاؤ میں جوابی فائرنگ کی جس میں دوسری جانب کے کچھ افراد زخمی ہوئے۔ ایف آئی آر میں کسی کی ہلاکت کے ضمن میں کچھ تحریر نہیں کیا گیا۔ یہ بھی تحریر نہیں کیا گیا کہ میر مرتضٰی اور عاشق جتوئی زخمیوں میں شامل تھے۔

نوٹیفکیشن نمبر پی ایس / ایچ ایس ، ایچ ڈی/01/29 مورخہ 25-9-96 کے

ذریعہ حکومت سندھ نے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ذریعے سندھ ٹریبونلز آف انکوائری آرڈی نینس 1969ء کی زیر دفعہ 3 کے تحت ایک انکوائری ٹریبونل تشکیل دیا۔

Anex A: اسی نمبر کے نوٹیفکیشن مورخہ 7-10-96 پر مشتمل موجودہ چیئرمین اور ممبران ٹریبونل کے ٹرمز آف ریفرنس یہ ہیں۔

اے۔ انکوائری کی جائے اور ان حالات کا پتہ لگایا جائے جس کے نتیجے میں یہ فائرنگ کا واقعہ پیش آیا جس میں میر مرتضیٰ بھٹو ایم پی اے سندھ اور دیگر سات افراد ہلاک اور چھ افراد زخمی ہوئے۔

بی۔ 70 کلفٹن کراچی کے قریب جو کہ میر مرتضیٰ بھٹو ایم پی اے سندھ کی رہائش گاہ ہے' اس مخصوص وقت اور دن بھاری پولیس کی تعیناتی کے بارے میں انکوائری کی جائے۔

سی۔ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ آیا میر مرتضیٰ بھٹو ایم پی اے سندھ اور ان کی پارٹی پر فائرنگ قانون اور انصاف پر مبنی تھی۔

ڈی۔ اس بات کا پتہ لگایا جائے آیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو اور دیگر افراد پر فائرنگ کے واقعہ پر باقاعدہ دیکھ بھال اور احتیاط کو بروئے کار لاتے ہوئے اجتناب برتا گیا تھا۔

ای۔ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ آیا میر مرتضیٰ بھٹو اور دیگر افراد کو طبی امداد دینے میں تاخیر تو نہیں کی گئی اور آیا ہسپتال کی جانب سے انہیں باقاعدہ فوری طبی امداد دی گئی تھی اور اگر انہیں ہنگامی طبی امداد درکار تھی تو کچھ دیگر ہسپتالوں میں انہیں یہ فراہم کرنے کیلئے کوئی قدم اٹھایا گیا تھا؟ اگر نہیں اٹھایا گیا تو اس کوتاہی کے ذمہ دار شخص / اشخاص یا انتظامیہ کا تعین کرنا۔

ایف۔ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ آیا وقوع پذیر ہونے والا واقعہ میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی جانب سے بلا کسی اشتعال کے پیش آیا اور اگر وہاں کوئی اشتعال تھا تو آیا پولیس پارٹی نے شدید طاقت کا استعمال کیا۔

جی۔ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ یہ واقعہ پہلے سے منصوبے کا حصہ تھا اور آیا

اس تمام آپریشن میں میر مرتضیٰ بھٹو اور دیگر افراد کو ارادتاً" قتل کیا جانا مقصود تھا۔ اگر ایسا تھا تو منصوبہ بنانے اور آپریشن کی انجام دہی کیلئے ذمہ دار اشخاص کو شناخت کرنا۔

ایچ۔ واقعہ میں مبینہ طور پر ملوث انفرادی / انفرادی گروہ کی شناخت کی ذمہ داری کا تعین اور اس معاملے میں مزید قانونی چارہ جوئی کی سفارش کرنا۔

نوٹیفکیشن کے ذریعے قرار دیا گیا کہ مذکورہ آرڈی نینس کی دفعہ 5 کے سب سیکشن (2)'(3)'(4)'(5) اور (6) کا ٹریبونل پر اطلاق ہو گا۔

5- معزز چیف جسٹس آف پاکستان کی رضامندی سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے ریسٹ ہاؤس واقع بمقام ایچ ایم 4 باتھ آئی لینڈ کراچی کو ٹریبونل کی نشست کے مقصد کے لئے بطور مقام منتخب کیا گیا تھا جہاں سماعت منعقد ہوئی۔ 22 فروری 1997ء سے ٹریبونل کی نشست کا مقام نیو سپریم کورٹ رجسٹری بلڈنگ کراچی (اولڈ اسٹیٹ بینک بلڈنگ) میں منتقل کر دیا گیا۔ اس سے قبل ٹریبونل نے ایک نوٹس اخبارات میں شائع کرایا کہ کوئی بھی شخص جو اس واقعہ کے بارے میں کسی بھی قسم کی معلومات رکھتا ہو وہ اپنا نام اور پتہ اور ایک حلف نامہ ٹریبونل آف رجسٹرار کو ارسال کر دے تاکہ اگر ضروری سمجھا گیا تو اسے ٹریبونل کے سامنے بیان دینے کے لئے طلب کیا جا سکے۔

6- 22-10-96 کو گواہوں کے بیانات قلمبند ہونا شروع ہوئے۔ گواہ نمبر 1 ڈی ایس پی محمد اسلام خان ایس ڈی پی او کلفٹن کا بیان ٹریبونل کے سامنے قلمبند ہوا۔ مجموعی طور پر 129 گواہوں کے بیانات ٹریبونل کے سامنے قلمبند ہوئے۔ ان گواہوں کے علاوہ دو ایس ایچ اوز شبیر احمد قائم خانی' سابق ایس ایچ او پی ایس گارڈن (ایکس ڈبلیو 128) اور آغا محمد جمیل' سابق ایس ایچ او پی ایس نیپئر (ایکس ڈبلیو - 129)' جو کہ ٹرائل میں ملزم ہیں وہ بھی اپنی درخواست پر ٹریبونل کے روبرو گواہوں کے کٹہرے میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنے تحریری بیانات پڑھے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اے ایس پی رائے محمد

طاہر (ایکس 134) اور اے ایس پی شاہد حیات (ایکس 135) کے تحریری بیانات بھی ان کے وکیل جناب کے کے آغا کی جانب سے 27-2-97 کو جمع کرائے گئے۔

بیانات کی قلمبندی 17-3-97 کو جبکہ اے آئی جی مٹھیانی (ایکس 108) کا اضافی بیان بھی قلمبند ہوا' ختم ہوئی۔ پارٹیوں کے لئے حاضر ہونے والے فاضل وکیل کی درخواست پر 19-3-97- 29-4-97 اور 5-4-97 کو بحث کی ساعت ہوئی۔ مسٹر اختر علی جی قاضی' ایڈووکیٹ برائے حکومت سندھ' مسٹر کریم خان آغا ایڈووکیٹ برائے حکومت سندھ' مسٹر کریم خان آغا ایڈووکیٹ برائے ڈی آئی جی شعیب سڈل اور اے ایس پی شاہد حیات اور رائے محمد طاہر' مسٹر نہال ہاشمی' ایڈووکیٹ برائے اے ایس آئی عبدالباسط اور دیگران مسٹر منظور بھٹہ ایڈووکیٹ برائے ڈاکٹر مظہر میمن اور دیگران کی جانب سے تحریری بیانات بھی داخل کئے گئے۔

7- چیئرمین اور ٹریبونل کے ممبران کی کورٹ کے عمومی کام میں مصروفیت کی بنا پر اور چیئرمین کے اسلام آباد میں کورٹ کے کام کو نمٹانے کی بنا پر بھی ٹریبونل کی رپورٹ تحریر کرنے اور اسے حتمی شکل دینے کے لئے اس سے قبل ٹریبونل کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ اس مقصد کے لئے ٹریبونل کا اجلاس کراچی میں 5-5-97 سے شروع ہوا۔

8- اس وقت کے ایس ایس پی ساؤتھ کراچی واجد علی درانی پولیس آپریشن کے انچارج تھے۔ وہ گواہ نمبر 9 کی حیثیت سے (والیم II صفحات 6-96) ٹریبونل کے روبرو پیش ہوئے۔ انہوں نے بیان دیا کہ 17-9-96 کو انہیں مطلع کیا گیا کہ اس دن صبح کے وقت میر مرتضیٰ نے گارڈن سی آئی اے سینٹر اور سی آئی اے سینٹر ریاض نزد نیپئر پولیس اسٹیشن پر بھی چڑھائی کی۔ پھر دوپہر کے وقت انہیں ڈی آئی جی شعیب سڈل کی جانب سے ایک فون موصول ہوا کہ وہ غیر قانونی اسلحہ کے لیے میر مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز کی چیکنگ کے لئے انتظامات کریں۔ درانی کو یہ بھی بتایا گیا کہ انسپکٹر ذیشان کاظمی

(ایس ایچ او کھوکھرا پار) نے تقریباً" دو بجے علی محمد سنارا (میر مرتضیٰ بھٹو کا قریبی ساتھی اور ان کی پارٹی کا دفتری عہدیدار) کو گرفتار کر لیا ہے۔ درانی کی جانب سے یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ عاشق جتوئی نے دوپہر کے وقت ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے علی سنارا کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اسے جعلی پولیس مقابلے میں ہلاک نہ کر دیا جائے۔ 18-9-96 کو صبح کے وقت کراچی میں دو بم دھماکے ہوئے۔ درانی کے مطابق 18-9-96 کی سہ پہر کو انہیں ڈی آئی جی سڈل کی جانب سے سی آئی اے سینٹرز پر ریڈز کے ضمن میں دو کیسوں کی رجسٹریشن اور ایس پی انویسٹی گیشن (شکیب قریشی) کی سربراہی میں خصوصی ٹیم کے ذریعے تفتیش کرنے کی ہدایات موصول ہوئیں۔ اسی دوپہر درانی کو ڈی آئی جی سڈل نے ٹیلیفون پر مطلع کیا کہ تفتیش کے دوران علی سنارا نے انکشاف کیا ہے کہ اس کے ساتھی یار محمد بشیر بلوچ' جہانگیر بلوچ' وسیم بلوچ' رمضانی اور سجاد گھاکھرو علی سنارا کی گرفتاری کے خلاف رد عمل کا اظہار اور بم دھماکے کر سکتے تھے اور یہ کہ علی سنارا نے یہ بھی کہا کہ اس کے مذکورہ قریبی ساتھی بم دھماکے کرنے کے ماہر تھے۔ درانی کے مطابق یہ بات بھی سامنے آئی کہ گزشتہ بم دھماکوں میں سجاد گھاکھرو' رحیم بروہی اور علی سنارا ملوث تھے اور یہ کہ یہ افراد ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ سڈل نے درانی کو ان افراد کو گرفتار کرنے کی خصوصی ہدایات بھی دیں جن کے نام علی سنارا نے بتائے تھے اور جو بم دھماکے میں ملوث ہونے کے سلسلے میں مشکوک تھے۔ 18 اور 19 ستمبر کو میر مرتضیٰ کے مذکورہ ساتھیوں کی تلاش میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

میر مرتضیٰ کے باڈی گارڈز/ گن مین کے نام بم دھماکوں اور دیگر ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث مشکوک افراد میں شامل تھے۔ یہ شبہ بھی تھا کہ ان کے پاس غیر لائسنس یافتہ اسلحہ تھا۔ سڈل نے درانی کو عاشق حسین جتوئی کو گرفتار کرنے کی بھی ہدایت کی۔ عاشق جتوئی نے 17-9-96 کی صبح کو جب

دو ی آئی اے سینٹرز پر چڑھائی کی تو وہ میر مرتضیٰ کے ساتھ موجود تھے۔ میر مرتضیٰ کے باڈی گارڈز / گن مین 18-9-96 اور 19-9-96 کو 70 کلفٹن کے باہر نہیں دیکھے گئے۔ یہ شبہ تھا کہ وہ 70 کلفٹن کے اندر ہونگے۔ لیکن اس وقت کی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ کی واضح ہدایات تھیں کہ پولیس 70 کلفٹن کے اندر داخل نہ ہو اور حسب الحکم 70 کلفٹن ایس ایس پی درانی زیر نگرانی تھا۔ درانی کے مطابق 18-9-96 سے 20-9-96 کی شام تک کوئی شخص 70 کلفٹن کے اندر یا اس کے باہر اسلحہ لے جاتا ہوا نظر نہیں آیا۔ تاہم 20-9-96 کو شام سوا پانچ بجے ایس ایچ او کلفٹن نے درانی کو مطلع کیا کہ 70 کلفٹن میں کچھ گاڑیاں داخل ہوئی ہیں لیکن گاڑیوں میں موجود کوئی بھی شخص اسلحہ نہیں لایا ہے۔ اس کے بعد انہیں مطلع کیا گیا کہ آنے والے میر مرتضیٰ کو سرجانی ٹاؤن میں ایک تقریب میں شرکت کے لئے لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ خیال کیا گیا کہ اگر میر مرتضیٰ سرجانی ٹاؤن جانے کے لئے 70 کلفٹن سے باہر آئے تو ان کے باڈی گارڈ / گن مین بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ درانی نے ایس ایچ او کلفٹن نیز اے ایس پی درخشاں رائے طاہر کو مطلع کیا کہ جب میر مرتضیٰ 70 کلفٹن سے باہر آئیں تو وہ ان کے اسلحہ برداروں کو چیک کریں لیکن چھ بجکر 10 منٹ پر اے ایس پی رائے طاہر نے درانی کو بتایا کہ وہ اسلحہ برداروں کو چیک نہیں کر سکے ہیں کیونکہ جس وقت وہ 70 کلفٹن پہنچے اس وقت میر مرتضیٰ کی پارٹی پہلے سے باہر نکل چکی تھی۔ اس موقع پر درانی کے مطابق انہوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ جس وقت میر مرتضیٰ کی پارٹی واپس آئے گی ان کے اسلحہ برداروں کو چیک کیا جائے لہٰذا انہوں نے رائے طاہر سے کہا کہ اسلحہ برداروں کی واپسی پر چیکنگ کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں۔ درانی کے مطابق انہوں نے ٹیلی فون پر ڈی آئی جی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ڈی آئی جی سے کوئی رابطہ نہیں کر سکے پھر جب وہ واک کے لئے باہر نکلے اور بالآخر 8 بجکر 20 منٹ پر یا 8 بجکر 25 منٹ پر ڈی

آئی جی سڈل کے پاس گئے اور انہیں پورے منصوبے' پولیس اور افسران اور جہاں وہ موجود ہونگے اس سے مطلع کیا اور درانی کے مطابق سڈل نے اس منصوبے پر رضامندی ظاہر کی "جس سے میں مطمئن ہوگیا۔" درانی کے مطابق اس تمام وقت میں وہ اپنے دوست کے گھر اس کے سسر کی برسی میں شرکت کرنے کے لئے عسکری اپارٹمنٹ نمبر3 میں موجود تھے۔ وہ 8 بجکر 20 منٹ پر عسکری اپارٹمنٹ سے نکلے اور 70 کلفٹن کے قریب پہنچے جہاں انہوں نے دیکھا کہ پولیس پکٹس 70 کلفٹن سے تقریباً 100 گز کے فاصلے پر موجود ہیں۔ درانی کے مطابق وہ میر مرتضیٰ کی پارٹی کے وہاں پہنچنے سے نصف گھنٹہ قبل وہاں آئے۔ اسی دوران میں انہیں 70 کلفٹن کی جانب پارٹی کی پیش رفت کے بارے میں اطلاع ملی۔ درانی نے رائے طاہر کو ہدایت دی کہ 70 کلفٹن کی جانب جانے والے تمام تینوں روٹس پیٹرولنگ کے لئے بند کر دیئے جائیں۔ انہوں نے ہدایات دیں کہ 2 بکتر بند گاڑیاں وہاں ہونی چاہئیں۔ درانی نے بیان دیا کہ رائے طاہر کے مطابق ان کی کمانڈ میں پولیس' جس نے کارروائی میں حصہ لیا' 7-30 تا 8-00 بجے وہاں پہنچی۔ ایس ایچ اوز نیپیئر اور گارڈن بھی اپنی اپنی پارٹیوں کے ہمراہ وہاں پہنچے اور انہوں نے رائے طاہر کو رپورٹ کیا۔ درانی نے اپنے بیان میں یہ واضح کیا کہ جب وہ جائے حادثہ پہنچے تو تمام پولیس نیز گاڑیاں اپنے اپنے متعین کردہ مقامات پر موجود تھیں ماسوائے اے ایس پی صدر شاہد حیات کے' جو اس وقت تک وہاں نہیں تھے۔ درانی نے انتظامات کا معائنہ کیا اور انہیں اطمینان بخش پایا ماسوائے یہ کہ ڈی آئی جی کے گھر کے عین سامنے مین چیک پوسٹ پر مزید نفری درکار تھی' لہٰذا انہوں نے اپنے گن مین اور 4 کانسٹیبلز کو جو ان کے ساتھ رہا کرتے تھے آرڈرز کے لئے اے ایس پی درخشاں کو رپورٹ کرنے کے لئے ہدایات دیں۔ اس کے بعد درانی دو تلوار کی چورنگی پر بنے ٹریفک پولیس چوکی میں چلے گئے جو جائے واقعہ سے قریباً 300 گز دور تھی۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ تمام پولیس اہلکار خود کار اور نیم خود کار ہتھیاروں

سے مسلح تھے۔ ان کی سابقہ اطلاع کے مطابق میر مرتضیٰ کی پارٹی 10 تا 12
نیم خود کار اور خود کار ہتھیار اپنے پاس رکھتی تھی۔ درانی کے مطابق 4/5
پولیس اہلکار بلٹ پروف جیکٹس پہنے ہوئے تھے۔

-9 درانی کی جانب سے دیئے گئے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فائرنگ 8 بجکر
35 منٹ پر یا اس کے لگ بھگ شروع ہوئی اور 8-55 پر بند ہوئی۔ پہلی
ایف آئی آر حال نمبر 386 بابت 1996ء رات 10 بجے پولیس اسٹیشن کلفٹن
میں درج ہوئی اور وہ یہاں دوبارہ پیش کی جا رہی ہے۔ نمبر 386/96 تھانہ
کلفٹن ضلع کراچی ساؤتھ تاریخ و وقت وقوعہ 20-9-96 ' 21-00 بجے تاریخ
وقت رپورٹ 20-9-96 ' 22 بجے رپٹ 61 تھانہ سے روانگی کی تاریخ وقت
بروقت نام و سکونت اطلاع دہندہ و مستغیث سرکار ذریعہ انسپکٹر حق نواز سیال
ایس ایچ او کلفٹن کراچی مختصر کیفیت جرم (معہ دفعہ) و مال اگر کچھ کھویا گیا
ہے بجرم دفعہ 147'148'149'186'353/427 ت پ 324 قصاص و دیت
آرڈی نینس ' 302 قصاص میں ترمیم ہوا۔ جائے وقوعہ و فاصلہ تھانہ سے اور
سمت شاہراہ ایران بالمقابل نیو کلفٹن گارڈن جانب شمال مشرق اندازاً" 1/2
کلو میٹر از تھانہ کلفٹن کارروائی متعلقہ تفتیش اگر اطلاع درج کرنے میں کچھ
توقف ہوا ہو تو اس کی وجہ بیان کی جائے۔ موصولہ بیان زیر دفعہ 154 ض
ف پر مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا' میں ایس آئی خرم وارث تفتیش کروں گا۔
دستخط ایس آئی۔ اس وقت ایک قطعہ تحریری بیان زیر دفعہ 154 ض ف
ازاں مدعی مندرجہ خانہ نمبر 2 بدست اے ایس آئی عبدالباسط متعلقہ تھانہ ہذا
موصول ہوا۔ جس کی نقل مندرجہ ذیل ہے۔ از جناح ہسپتال کراچی
20-9-96 بوقت 21-15 بجے بیان زیر دفعہ 154 ض ف امروہی انسپکٹر حق نواز
سیال ایس ایچ او کلفٹن زیر نگرانی و قیادت جناب محمد طاہر ملک اے ایس پی
درخشاں و قائم مقام ایس ڈی پی او کلفٹن و جناب شاہد حیات خان صاحب
اے ایس پی صاحب صدر آمدہ ایس ایچ او صاحبان تھانہ گارڈن ایس آئی شبیر
احمد قائم خانی ایس ایچ او تھانہ نیپیئر انسپکٹر آغا محمد جمیل صاحب کی اطلاع پر

کہ مطلوبہ مقدمات الزام 270/96 بجرم دفعہ نمبر 106/96 بجرم 225 B/
452'149'148'147 تھانہ نیپیئر کراچی جو کہ شہید بھٹو گروپ کے سربراہ میر
مرتضیٰ بھٹو کے مسلح محافظ ہیں' کی مختلف گاڑیوں میں 70 کلفٹن آمد متوقع
ہے مع افسران و ملازمان بغرض روکنے و کرنے شامل تفتیش بغرض بعد حصول
اجازت افسران بالا شاہراہ ایران بالمقابل نیو کلفٹن گارڈن موجود تھا کہ بوقت
قریب 21-00 بجے چار گاڑیوں میں سوار جائے مذکورہ پہنچے جنہیں من ایس
ایچ او نے ہمراہی پولیس پارٹی کی مدد سے رکنے کا اشارہ کیا۔ ملزمان نے اپنی
گرفتاری کو یقینی سمجھتے ہوئے اور اپنے زیر استعمال گاڑیوں ڈبل کیبن پجارو
کی فرنٹ سیٹ پر موجود میر مرتضیٰ بھٹو صاحب نے اپنے مسلح محافظوں کو با
آواز حکم دیا کہ ان پولیس کے کتوں کو مار دو جس پر جملہ گاڑیوں میں موجود
اسلحہ برداروں نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس پر جناب اے ایس
پی صاحب صدر گولی لگنے سے زخمی ہو گئے۔ پولیس کی گاڑیوں کو نقصان
پہنچا۔ حفاظت خود اختیاری اور ملزمان کی گرفتاری کے پیش نظر پولیس پارٹی
نے جوابی فائرنگ کی جس سے مذکورہ گاڑی کے اندر اور باہر موجود ملزمان
زخمی ہوئے۔ مجھے موبائل فوری طور پر ہسپتال لے آئی۔ دیگر افسران اس
موقع پر مصروف کارروائی رہے۔ رپورٹ کرتا ہوں کہ کارروائی کی جائے میرا
دعویٰ ملزمان متذکرہ پر میر مرتضیٰ بھٹو صاحب کے حکم سے کار سرکار میں
مزاحم ہو کر بغرض مشترکہ سے پولیس پارٹی قتل عمد کی غرض سے فائرنگ
کر کے مجھے اور اے ایس پی صاحب صدر کو زخمی کر کے اور سرکاری گاڑیوں
کو نقصان پہنچانے کا ہے۔ بیان سنا درست ہے۔ انسپکٹر حق نواز سیال۔

کارروائی پولیس: میں اے ایس آئی عبدالباسط تصدیق کرتا ہوں کہ
بیان بالا حسب گفتہ انسپکٹر موصوف لفظ بہ لفظ تحریر کیا گیا جس کو درست
تسلیم کرتے ہوئے زیر بیان کو دستخط کیے مضمون رپورٹ سے نوعیت جرم
353/186'149'148'147'324 قصاص و دیت کا ہونا پایا گیا لہذا بیان ہذا بغرض
قائمی مقدمہ و تفتیش پیش خدمت ہے۔ دستخط اے ایس آئی باسط۔ نوٹ۔

تھانہ پر اے ایس آئی خرم وارث تصدیق کرتا ہوں کہ موصولہ بیان کی حروف بحروف کی گئی' نوعیت زیر دفعہ 353/324‘149‘148‘147 کا ہونا پایا گیا میں مقدمہ ہذا قائم کیا جائے۔ من اے ایس آئی مصروف تفتیش ہوں۔ مذکورہ مین ایف آئی آر نمبر 386/96 کے علاوہ گیارہ دیگر علیحدہ ایف آئی آر نمبر 387 تا 397 بابت 1996ء بھی آرمز آرڈی نینس کے سیکشن 13 - ڈی کے تحت درج کرائی گئیں جن میں ایف آئی آر میں مذکورہ ہر ایک ملزم سے بلا لائسنس اسلحہ کی برآمدگی کا الزام لگایا گیا اور وہ میر مرتضیٰ پارٹی کے ممبران تھے۔ ایف آئی آر نمبر 386/96 میں جس میں اصل کیس کی تفصیلات درج ہیں اور اس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ مندرجہ ذیل 18 افراد جن میں سے کچھ زخمی ہو گئے تھے گرفتار کر لئے گئے تھے۔ (1) مصطفیٰ ولد محمد شاہ نمبر (2) محمود ولد اللہ دتہ -3- قیصر حسین ولد رسول بخش -4- اسماعیل ولد فقیر محمد -5- بچل ولد محمد حاکم -6- مظہر میمن -7- علی اصغر ولد کریم بخش -8- ایاز ولد علی مدد -9- عاشق علی ولد جمال دین 10- وقار حسین ولد کرار حسین -11- اصغر علی ولد محمد علی -12- میر مرتضیٰ بھٹو ولد ذوالفقار علی بھٹو -13- عاشق جتوئی ولد نامعلوم -14- رحمٰن بروہی ولد نامعلوم -15- سجاد ولد نامعلوم -16- عبدالستار راجپو ولد نامعلوم -17- یار محمد بلوچ -18- وجاہت جوکھیو۔ مذکورہ بالا افراد میں سے زیادہ تر پر بلا لائسنس اسلحہ اٹھانے کا الزام تھا۔ اس کا تذکرہ ایف آئی آر نمبر 387/96 جو کہ کلفٹن پولیس اسٹیشن میں رات دس بجکر بیس منٹ پر ایس آئی شاہنواز ایس ایچ او پی ایس درخشاں کے ذریعہ مملکت کی جانب سے درج کرائی گئی تھی موجود ہے۔

گواہ نمبر 116) درج ذیل ملزمان کو جو مذکورہ بالا ان 18 افراد میں شامل ہیں جنہیں زخمی حالت میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس افسران کی نگرانی میں فوری طور پر ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔

1- مظہر میمن' 2- اسماعیل' 3- بچل' 4- میر مرتضیٰ بھٹو' 5- رحمٰن بروہی' 6- علی اصغر' 7- ایاز' 8- عاشق جتوئی' 9- سجاد حیدر' 10- عبدالستار راجپر' 11 - یار محمد بلوچ' 12-

وجاہت جوکھیو۔

یہ ایف آئی آر نمبر 387/96 جو غلام مصطفیٰ ولد محمد شاہ کے خلاف آرمز آرڈی نینس کی سیکشن 13 ڈی کے تحت درج کی گئی ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ نمبر 387/96 تھانہ کلفٹن ضلع کراچی ساؤتھ تاریخ وقت وقوعہ 20-9-96 ‘21-5 تاریخ وقت رپورٹ 20-9-96‘22 تھانہ سے روانگی کی تاریخ و وقت 20-9-96 نام و سکونت اطلاع دہندہ و مستغیث سرکار ذریعہ ایس آئی شاہنواز ایس ایچ او تھانہ درخشاں کراچی مختصر کیفیت جرم (معہ دفعہ) و مال بجرم دفعہ 13- ڈی اسلحہ آرڈی نینس اگر کچھ کھویا گیا ہے۔

جائے وقوعہ سے فاصلہ تھانہ سے اور سمت شاہراہ ایران بالمقابل نیو کلفٹن گارڈن انداز" آدھا کلو میٹر شمال مشرق۔

کارروائی۔ متعلقہ تفتیش اگر اطلاع درج کرنے میں کچھ توقف ہو تو اسکی وجہ بیان کی جائے'ایس آئی خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔ امروز ایک قطعہ تحریری زیر دفعہ 154 ض ف ہذا مدعی خانہ نمبر2 بدست اے ایس آئی غلام علی موصول ہوا جس کی نقل درج ذیل ہے۔ از جائے وقوعہ 20-9-96 بوقت 22-00 بیان زیر دفعہ 154 ض ف ڈیوٹی آفیسر تھانہ کلفٹن کراچی امروز مورخہ 20-9-96 کو من ایس ایچ او درخشاں ایس آئی شاہنواز علاقہ میں موجود تھا کہ بوقت 21-05 بجے ذریعہ وائرلیس 70 کلفٹن P-I حق نواز سیال مع ایس ایچ او گارڈن و نیپیئر زیر قیادت اے ایس پی صاحب صدر و درخشاں مطلوبہ مقدمہ الزام نمبر 106/96276/96 تھانہ نیپیئر و گارڈن گرفتاری کے لئے جائے وقوعہ پر موجود تھے کہ پولیس پارٹی کے رکنے کے اشارے پر ملزمان نے میر مرتضیٰ بھٹو کے حکم سے پولیس پارٹی پر فائرنگ کی۔ ایس ایچ او صاحب کلفٹن اے ایس پی صاحب صدر زخمی ہوئے جن کو ہسپتال لے جایا گیا اور ملزمان جن میں کوئی زخمی تھے اسلحہ کے ساتھ اپنی پوزیشن میں تھے کہ بامداد موجود ایس ایچ او صاحبان اور دیگر افسران و ملازمان گھیر دیا گیا۔ اس پر گرفتاری پیش کرنے کا حکم دیا گیا جس پر ذیل ملزمان کی گرفتاری عمل میں آئی جن سے درج ذیل اسلحہ برآمد ہوا۔ -1- مصطفیٰ ولد محمد شاہ ایک ضرب ٹی ٹی بلا نمبر دو عدد گولیاں (2) محمود ولد اللہ دتہ ایک ٹی ٹی نمبر MB 1279 مع میگزین خالی (3) قیصر حسین ولد رسول بخش ایک ٹی ٹی (4) اسماعیل ولد فقیر محمد (5) بچل ولد محمد حاکم (6)

مظہر (7) علی اصغر ولد کریم بخش ایک ضرب ایس ایم جی نمبر 39530 مع میگزین چار گولیاں (8) ایاز ولد علی مدد ایک ضرب جی -3 نمبر 508' دو عدد میگزین گیارہ گولیاں (9) عاشق علی ولد جمال دین (10) وقار حسین ولد قرار حسین ایک ضرب اوزی دو میگزین (11) اصغر علی ولد محمد علی (12) میر مرتضیٰ بھٹو ولد ذوالفقار علی بھٹو (13) عاشق جتوئی ولد نامعلوم (14) رحمان بروہی ولد نامعلوم ایک ضرب بلا نمبری لوڈ میگزین (15) سجاد حیدر ولد نامعلوم ایک ضرب ٹی ٹی و خالی میگزین بلا نمبری (16) عبدالستار راجپر ولد نامعلوم ایک ضرب ٹی ٹی ایک خالی میگزین (17) یار محمد بلوچ ولد نامعلوم ایک ضرب جی -3 نمبر 708 مع دو میگزین' دس کارتوس (18) وجاہت جوکھیو ایک ضرب اوزی F-2135 ایک خالی میگزین۔ ملزمان متذکرہ بوقت کوئی لائسنس پیش نہ کر سکے۔ گرفتاری عمل میں آئی۔ اسلحہ قبضہ پولیس میں لیا گیا۔ مزید جامہ تلاشی مطابق عمل میں آئی کہ ملزمان مظہر میمن' اسماعیل' بچل' میر مرتضیٰ بھٹو' رحمان بروہی' علی اصغر' ایاز' عاشق جتوئی' سجاد حیدر' عبدالستار راجپر' یار محمد بلوچ' وجاہت جوکھیو' جو کہ زخمی حالت میں گرفتار ہوئے ہیں کو زیر نگرانی افسران و ملازمان فوری طور پر بغرض طبی امداد ہسپتال روانہ کیا گیا۔ ملزمان کے نام بعد میں ابراہیم بلوچ' ڈوکلی مزید آٹھ دس مسلح و غیر مسلح موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔

پولیس کارروائی - زخمی گرفتار شدہ و برآمد شدہ اسلحہ کو تحویل میں لیا اور بیان بدست اے ایس آئی غلام علی تھانہ کلفٹن بغرض' قائمی مقدمہ ارسال کیا گیا۔ اے ایس آئی راسب خان تصدیق کرتا ہوں کہ بیان موصولہ کی نقل حروف بحروف تحریر کی گئی۔ ملزمان کے خلاف 13- ڈی اسلحہ آرڈی نینس جرم ہونا پایا جاتا ہے۔ ملزمان غلام مصطفیٰ ولد محمد شاہ کے خلاف اندراج کیا جائے۔ ایس آئی خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

مندرجہ بالا ایف آئی آر کے مندرجات کے حوالے سے یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ 12 ملزمان جنہیں زخمی حالت میں گرفتار کرکے پولیس کی نگرانی میں فوری طور پر ہسپتال بھیج دیا گیا میں سے ایک میر مرتضیٰ بھٹو کو تقریباً" رات 9 بجکر 20 منٹ پر مڈایسٹ ہسپتال پہنچایا گیا۔ 6 دیگر عاشق حسین جتوئی' عبدالستار راجپر' سجاد حیدر گاکھرو'

یار محمد بلوچ' رحمٰن بروہی اور وجاہت جوکھیو آتشیں اسلحے کے زخم لگنے سے فوری طور پر یا تھوڑی دیر بعد موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ انہیں تحویل میں لے کر کسی ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران ریکارڈ پر آنے والی شہادت کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی کے یہ چھ ارکان جو ان کے ذاتی محافظ تھے موقع پر جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس لئے انہیں گرفتار کرنے یا علاج کے لئے ہسپتال لے جانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کی لاشیں تھوڑی دیر تک موقع پر ہی پڑی رہیں بعدازاں انہیں ایدھی کی ایمبولینسوں میں ڈال کر کلفٹن پولیس اسٹیشن اور پھر جناح ہسپتال کے مردہ خانے لے جایا گیا۔ یہ لاشیں وقوع کے تقریباً" 6 گھنٹے بعد صبح تین بجے مردہ خانے پہنچیں اور اس تاخیر کی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ ایک زخمی بچل' جو غالباً" ٹیکسی ڈرائیور تھا اور جسے فائرنگ کے دوران حادثاتی طور پر سر میں گولی لگی تھی' بے ہوشی کی حالت میں پہلے مڈایسٹ ہسپتال لے جایا گیا لیکن میڈیکو لیگل کیس ہونے کی بنا پر اسے داخل نہیں کیا گیا۔ جس کے بعد اسے جناح ہسپتال لے جایا گیا جہاں اسے داخل کر لیا گیا لیکن وہ ایک دن بعد بے ہوشی کی حالت ہی میں انتقال کر گیا۔ بچل کے بارے میں ایک اور نقطہ نظر پر رپورٹ میں بعد میں بحث کی جائے گی۔

ایف آئی آر نمبر 387/96 کے علاوہ آرمز آرڈی نینس کے سیکشن 13- ڈی کے تحت دس دیگر ملزمان کے خلاف ایف آئی آر نمبر 388 تا 397/96 دس دیگر ایف آئی آرز بھی درج کی گئیں۔ یہ تمام مقدمات ایس ایچ او کلفٹن تھانہ ایس آئی شاہنواز کی شکایت پر درج کئے گئے۔ ان مقدمات میں کلفٹن تھانے کے سب انسپکٹر خرم وارث کو تفتیشی افسر مقرر کیا گیا یہ تمام ایف آئی آرز رات ساڑھے دس بجے سے سوا گیارہ بجے کے درمیان درج کی گئیں اور ان کے مندرجات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

F.I.R No 388 96, registered at 2230 hours. مطابق مقدمہ الزام 96/ 387 بجرم دفعہ 13/ ڈی اسلحہ آرڈی نینس -

تھانہ ہذا ملزم محمود اللہ دتہ کے قبضہ سے ایک ضرب ٹی ٹی پستول 30 بور نمبر ایم بی - 1279 مع خالی میگزین بلا لائسنس برآمد ہوا ہے۔ ملزم کا یہ فعل بجرم دفعہ 13- ڈی اسلحہ آرڈی نینس قابل مواخذہ ہے۔ لہٰذا مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا۔ ایس آئی خرم

وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

F.I.R No 390 96, registered at 2240 hours. مطابق مقدمہ الزام 387-96 بجرم دفعہ 13/ ڈی اسلحہ آرڈی نینس قابل مواخذہ ہے۔ لہٰذا مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا۔ ایس آئی خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

F.I.R No 387/ 96, registered at 2245 hours. ڈی اسلحہ آرڈی نینس۔

تھانہ ہذا ملزم ایاز ولد علی مراد کے قبضہ سے ایک ضرب جی -3 نمبر 508 مع دو میگزین گیارہ گولیاں بلا لائسنس برآمد ہوئی ہیں چونکہ ملزم کا یہ فعل بجرم دفعہ 13/ ڈی اسلحہ آرڈی نینس قابل مواخذہ ہے لہٰذا مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا۔ ایس آئی خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

F.I.R No 392/ 96, registered at 2250 hours. مطابق مقدمہ الزام 96 /387 بجرم دفعہ 13 ڈی اسلحہ آرڈی نینس

تھانہ ہذا ملزم وقار حسین ولد قرار حسین کے قبضہ سے ایک ضرب اوزی بلا نمبر دو میگزین 5 گولیاں بلا لائسنس برآمد ہوا ہے جو کہ ملزم کا یہ فعل بجرم دفعہ 13/ ڈی اسلحہ آرڈی نینس قابل مواخذہ ہے لہٰذا مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا۔ ایس آئی خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

F.I.R No 393 96, registered at 2255 hours. مطابق مقدمہ الزام نمبر 387/96 بجرم دفعہ 13/ ڈی اسلحہ آرڈی نینس۔

تھانہ ہذا ملزم رحمٰن بروہی ولد نہ معلوم کے قبضہ سے ایک ضرب ٹی ٹی پستول بلا نمبری ایک میگزین دو گولیاں بلا لائسنس برآمد ہوئی ہیں جو کہ ملزم کا یہ فعل بجرم دفعہ 13 / ڈی اسلحہ آرڈی نینس قابل مواخذہ ہے لہٰذا مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا۔ ایس آئی خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

موبائل برٹش قونصلیٹ کے پاس سے گزری، پولیس وہاں پر تھی لیکن اس نے بھی نہیں روکا۔ ہم اس لائق تھے کہ موبائل کو بالکل ڈی آئی جی ہاؤس تک لے جا سکیں اور ڈی آئی جی ہاؤس کے سامنے ٹھہر گئے۔ سب نے دیکھا کہ سارے علاقے کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی پولیس گاڑیوں کی کثیر تعداد علاقے میں موجود تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے کوئی لاش یا کسی زخمی کو نہیں دیکھا۔ اور میں نے کسی بھی شخص کو زیر حراست نہیں دیکھا۔ دیگر جانب یعنی کلفٹن گارڈن کی جانب میں نے چار پرائیویٹ گاڑیاں پارک کی ہوئی دیکھیں۔ سامنے ایک سرخ ڈبل کیبن ٹویوٹا ہائی لکس تھی۔ اس کے بعد ایک بلیو پجارو تھی پھر اس کے بعد ایک سوزوکی آلٹو تھی لیکن وہ کسی قدر کلفٹن گارڈن کی جانب تھی۔ وہ ٹھیک بلیو پجارو کے عقب میں نہیں تھی اور آخری گاڑی ایک سفید پجارو تھی۔ میں نے سائٹ پر کوئی اسلحہ نہیں دیکھا لیکن میں نے خالی کارتوس اکٹھے کئے۔

سوال - وہاں پر روشنی موجود تھی کیونکہ پولیس گاڑیوں کی لائٹیں آن تھیں اور ایک سرخ لائٹ بھی موجود تھی۔ جیساکہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں اس علاقے کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ ایس پی شکیب قریشی پہلے سے وہاں موجود تھے وہاں پر دیگر افسران اور پولیس والے بھی موجود تھے۔ اگر میری یاد داشت درست ہے ایس پی شکیب قریشی سویلین لباس میں ملبوس تھے۔ وہاں پر موجود تمام اشخاص پولیس والے تھے۔ وہ یونیفارم میں ملبوس تھے اور دیگر سویلین لباس میں بھی ملبوس تھے۔ ایس پی شکیب قریشی کی زیر نگرانی اس وقت خالی کارتوس اکٹھے کئے جا رہے تھے جب میں وہاں پہنچا میں نے بھی خالی کارتوس کی تلاش شروع کر دی ممکن ہے کہ میں نے 25 تا 30 خالی کارتوس اکٹھے کئے ہوں گے۔

سوال - کیا پولیس کی گاڑیاں جو کہ پولیس کے مطابق واقعہ میں ملوث تھیں سائٹ پر اس وقت پارک کی گئی تھیں جب آپ پہنچے تھے۔

ایف آئی آر نمبر 395/96 جو کہ بوقت 23:05 گھنٹے (یعنی رات کے 11 بجکر 05 منٹ پر) درج رجسٹر کرائی گئی۔

مطابق مقدمہ الزام 387/96 بجرم دفعہ 13/D اسلحہ آرڈی نینس تھانہ ہذا ملزم عبدالستار راجپر کے قبضے سے ایک ضرب ٹی ٹی پستول بلا نمبر کی مع ایک میگزین خالی بلا لائسنس برآمد ہوا ہے جو کہ ملزم کا یہ فعل بجرم دفعہ 13/D اسلحہ آرڈی نینس قابل مواخذہ ہے لہٰذا مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا۔ S.1 خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

ایف آئی آر نمبر 396/96 جو کہ رات کے 11 بجکر دس منٹ پر درج رجسٹر کرائی

گئی۔

مطابق مقدمہ الزام 387/96 بجرم دفعہ 13/D، اسلحہ آرڈی نینس تھانہ ہذا ملزم یار محمد بلوچ ولد نامعلوم کے قبضے سے ایک ضرب G-3 نمبر 708 مع دو میگزین دس گولیاں بلا لائسنس برآمد ہوئی ہیں جو کہ ملزم کا یہ فعل بجرم دفعہ 13/D اسلحہ آرڈی نینس قابل مواخذہ ہے لہٰذا مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا۔ S.I خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

ایف آئی آر نمبر 97/96 جیسا کہ بوقت رات کے 11 بجکر 15 منٹ پر درج رجسٹر کیا گیا۔

مطابق مقدمہ الزام 387/96 بجرم دفعہ 13/D اسلحہ آرڈی نینس تھانہ ہذا ملزم وجاہت جوکھیو ولد نامعلوم کے قبضے سے ایک ضرب اوزلی نمبر F-2135 مع ایک خالی میگزین بلا لائسنس برآمد ہوئی ہے جو کہ ملزم کا یہ فعل بجرم دفعہ 13/D اسلحہ آرڈی نینس قابل مواخذہ ہے' لہٰذا مقدمہ درج رجسٹر کیا گیا۔ S.I خرم وارث صاحب تفتیش کریں گے۔

-12 مذکورہ بالا تمام ایف آئی آرز یعنی مین ایف آئی آر نمبر 386/96 اور 11 دیگر ایف آئی آرز نمبرز 387/96 تا 397/96 مملکت کی جانب سے درج رجسٹر کرائی گئیں۔ ایف آئی آر نمبر 386/96 بذریعہ حق نواز سیال' ایس ایچ او۔ پی ایس کلفٹن اور دیگر 11 ایف آئی آرز بذریعہ ایس آئی شاہنواز' ایس ایچ او' پی ایس درخشاں اس امر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ابتداء میں وہ سارا علاقہ جو کہ اب پی۔ ایس کلفٹن اور پی ایس درخشاں کے تحت ہے۔ پولیس اسٹیشن کلفٹن کے دائرہ اختیار کے تحت تھا۔ بعد میں اس علاقے کو تقسیم کر دیا گیا اور ایک اور پولیس اسٹیشن یعنی درخشاں قائم کیا گیا۔ دونوں پولیس اسٹیشن اگرچہ علیحدہ بلڈنگز میں ہیں' (تاہم) وہ اسی کمپاؤنڈ میں واقع ہیں۔

24-9-1996 کو ایک دوسری ایف آئی آر پی ایس۔ کلفٹن میں اس واقعہ سے متعلق درج رجسٹر کرائی گئی جو کہ ایف آئی آر نمبر 399/96 ج رات کے 12 بج کر 59 منٹ پر درج رجسٹر کرائی گئی اور اس ایف آئی آر

میں مستغیث اصغر علی ولد کریم بخش برڑو ہیں جو کہ میر مرتضٰی بھٹو کے ایک ملازم تھے۔ اس ایف آئی آر کو ذیل میں نقل کیا گیا ہے۔

بعدالت علاقہ مجسٹریٹ صاحب تھانہ کلفٹن کراچی' نمبر 399/76 ' کلفٹن ضلع ساؤتھ کراچی۔ تاریخ وقت وقوعہ 29-9-96 بوقت قریب 2100 بجے تاریخ و وقت رپورٹ نمبر 00.59 / 24.9.96 تھانہ سے روانگی کی تاریخ و وقت ذریعہ' نیشنل رپورٹ نام و سکونت اطلاع دہندہ و مستغیث :اصغر علی ولد کریم بخش برڑو سکنہ معرفت 70 کلفٹن کراچی مختصر کیفیت جرم (مع دفعہ) ' مال' بجرم دفعہ 324'7/3'D'8' مورخہ 24-9-96 کو زیر دفعہ اگر کچھ کھو گیا ہے 148/49 ' ت پ اور 302 قصاص و دیت کا اضافہ ہوا' جائے وقوعہ و فاصلہ تھانہ سے سمت : شاہراہ ایران بالمقابل نیو کلفٹن گارڈن جانب شمال مشرق اندازا" 1/2 کلو میٹر تھانہ کارروائی متعلقہ تفتیش اگر اطلاع درج کرنے میں تفتیش مقدمہ S.I خرم وارث کریں گے کچھ توقف ہوا ہو تو اس کی وجہ بیان کی جائے دستخط ASI-

میں اصغر علی ولد کریم بخش برڑو رہائش نیو بس اسٹینڈ لاڑکانہ کا ہوں' اور میر مرتضٰی بھٹو کا ذاتی ملازم ہوں۔ ان کی دوائیاں' پانی کا تھرموس وغیرہ دوران سفر اپنے پاس رکھتا ہوں۔ مورخہ 20-9-96 بروز جمعہ 6 بجے شام میں میر صاحب کے ہمراہ ان کی پجارو میں 70 کلفٹن سے مسیحی برادری والوں کے پاس سرجانی ٹاؤن گیا اور میر صاحب نے ان کے دفتر کا افتتاح کیا۔ تقریر کی اور اس کے بعد ہم مسیحی برادری کے جلوس کے ہمراہ سندھیوں کے گاؤں گئے جہاں میر صاحب نے سیاسی جلسہ کیا۔ ہم وہاں ایک گھنٹہ ٹھہرے۔ ریفرشمنٹ کے بعد میر صاحب نے عاشق جتوئی ' ڈاکٹر مظہر میمن' اسماعیل' ایاز' آصف' اختر علی محمود' غلام مصطفٰی ' قیصر وقار حسین' رحمان بروہی' عبدالستار راجپر' یار محمد بلوچ' سجاد حیدر' وجاہت جوکھیو' امیر بخش ڈوکی اور ابراہیم گبول کے ہمراہ اور گاڑیوں میں 70 کلفٹن کیلئے روانہ ہوئے جس پجارو میں میر صاحب کے ساتھ سفر کر رہا تھا اس میں میرے اور میر صاحب

کے علاوہ جناب عاشق جتوئی' جو ڈرائیونگ کر رہے تھے' میر صاحب کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یارو بلوچ ان کے پیچھے والی سیٹ پر اور میں اور آصف سامان والی جگہ پر بیٹھے تھے ہمارے ساتھ ساتھ ایک پولیس موبائل کافی دیر تک چلتی رہی اور پھر چلی گئی۔ جب ہم دو تلوار والے چوک سے آگے کلفٹن گارڈن کراس کر رہے تھے تو پولیس ہمارے سامنے آگئی اور ہم کو روک لیا اتنے میں آواز آئی کوئی فائر نہیں کرے گا۔ اس کے دو منٹ کے بعد فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں اپنی جان بچانے کیلئے سیٹ کے نیچے لیٹ گیا دس منٹ کے بعد میں نے میر صاحب کو آواز دی بابا آپ خیریت سے ہیں۔ میر صاحب نے اوں کرکے جواب دیا۔ اوں کا جواب سن کر میں گھبرا گیا اور میں نے ان کی طرف دیکھا تو میر صاحب کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور عاشق جتوئی گاڑی کے اسٹیرنگ پر گرا ہوا تھا اور آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا کہ ایمبولینس منگواؤ۔ میں نے گاڑی کی کھڑکی سے منہ باہر کرکے ہاتھ باندھ کر روتے ہوئے کہا کہ خدا کے واسطے فائر بند کرو کیونکہ میر صاحب کو گولی لگ چکی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے دوبارہ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر کہا خدا کے واسطے فائر بند کردیں۔ اس دوران مجھے بھی گولی لگی اور میں زخمی ہو گیا۔ 10 یا 15 منٹ کے بعد میں نے بکتر بند گاڑی کی آواز سنی جو ہماری گاڑی کے گرد چکر لگا رہی تھی اور ایک آواز سنی اودھر آؤ مجھے میر صاحب کو نکالنا ہے۔

پولیس میر صاحب کو گاڑی سے نکال رہی تھی۔ میں بھی گاڑی سے نکل آیا۔ میں نے کہا میں زخمی ہوں مجھے ہسپتال پہنچاؤ لیکن انہوں نے مجھے ساتھ نہیں لیا میری تلاشی لینی شروع کردی جس پر سب نے کہا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پر پولیس والوں نے کہا کہ تم نیچے لیٹ جاؤ اور پھر مجھے ایک طرف لے جاکر فٹ پاتھ پر دوسروں کے ساتھ لٹا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہماری آنکھوں پر کپڑا رکھ کر ہمیں تھانہ کلفٹن لے جایا گیا اور تھانہ لاک اپ میں بند کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے جناح ہسپتال لے جایا گیا۔

علاج معالجہ کے بعد وارڈ میں ہتھکڑی لگا دی۔ وہاں پتہ چلا کہ میر صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ عاشق جتوئی' وجاہت جوکھیو' یار محمد بلوچ' سجاد حیدر گاگرو' عبدالستار راجپر' رحمان بروہی بھی مارے گئے ہیں۔ ڈاکٹر مظہر میمن اور اسماعیل بھی گولیوں سے زخمی ہیں۔ میں دو راتوں کے بعد پولیس کی حراست میں کلفٹن تھانہ آیا۔ یہاں پر غلام مصطفیٰ' محمود آصف' وقار' قیصر اور اختر علی بھی بند ہیں۔ آج میں نے سنتری کے ذریعہ تھانیدار سے بات کی کہ میری طرف سے رپورٹ درج کی جائے۔ میرا دعویٰ ہے کہ پولیس نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرکے فائرنگ کی۔ میر صاحب اور باقی ساتھیوں کو ہلاک کیا۔ مجھے اور دوسروں کو زخمی کیا۔ انصاف کیا جائے۔ دستخط : اصغر علی

کارروائی پولیس : میں ASI محمد حمید تصدیق کرتا ہوں کہ رپورٹ حسب گفتہ مدعی لفظ بہ لفظ تحریر کی گئی ہے۔ رپورٹ مضمون سے جرم زیر دفعہ 324 قصاص و دیت 3R کا ہونا پایا جاتا ہے۔ لہٰذا مقدمہ بر خلاف پولیس ملازمان موجود از موقع درج رجسٹر کی جاکر نقل F.I.R برائے تفتیش سپرد ایڈیشنل ایس ایچ او تھانہ کلفٹن انچارج انویسٹی گیشن S.I خرم وارث صاحب کی گئی جو مقدمہ ہذا کی تفتیش کریں گے۔ نقول FIR حسب ضابطہ تقسیم کی گئی ہیں دستخط۔ A.S.I

13- 20-9-1996 کے اہم واقعہ کے ضمن میں ایک اور ایف آئی آر نمبر 96/443 ہے جو کہ 9-11-1996 کو 12-45 بجے دوپہر پی ایس کلفٹن میں درج رجسٹر کی گئی۔ اس ایف آئی آر میں مستغیث نور محمد ولد ابراہیم ہیں جو کہ 70- کلفٹن میں میر مرتضیٰ کے ساتھ رہائش پذیر تھے اور ان کی پارٹی کے ایک ممبر تھے یہ تیسری ایف آئی آر سندھ ہائی کورٹ کی اس ہدایت کے مطابق درج رجسٹر کی گئی جو کہ اس آئینی درخواست نمبر 1720 بابت 1996ء میں جو کہ غنویٰ بھٹو بیوہ میر مرتضیٰ بھٹو اور محترمہ بدر النساء بیوہ عاشق حسین جتوئی بخلاف حکومت سندھ اور ایس ایچ او پی ایس کلفٹن دائر کی گئی تھی' میں (معزز عدالت نے) اپنے فیصلہ میں دی تھیں (دستاویز نمبر 5) یہ تیسری ایف آئی آر بھی ذیل میں نقل کی گئی ہے جو کہ دیگر فریق یعنی ان افراد کا موقف ظاہر کرتی ہے جو کہ پہلی ایف آئی آر نمبر 96/386 میں ملزم

تھے۔

پولیس فارم نمبر 24-5 (1) بک نمبر 5

ابتدائی اطلاعی رپورٹ بابت جرم قابل دست اندازی پولیس رپورٹ شدہ زیر دفعہ 154 مجموعہ ضابطہ فوجداری ایف آئی آر نمبر 443/296 تھانہ کلفٹن ضلع کراچی ساؤتھ

تاریخ و وقت وقوعہ 96-9-20 بوقت رات کے 8 بجکر 35 منٹ۔

1- تاریخ وقت رپورٹ 96-11-09 تھانہ سے روانگی کی تاریخ 6' ایس ڈی ای نمبر 28 بوقت 35-12

2- نام و سکونت اطلاع دہندہ و مستغیث' نور محمد ولد محمد ابراہیم سکنہ 70 کلفٹن کراچی

3- مختصر کیفیت مع جرم زیر دفعہ 148/149/302/12 دفعہ و مال اگر کچھ کھو گیا ہے اے اینڈ بی جسے 324 کیو اینڈ ڈی کیساتھ ملا کر پڑھا جائے۔

4- جائے وقوعہ فاصلہ شاہراہ ایران کلفٹن کراچی بجانب شمال تھا سے اور سمت مشرق تقریباً" 1/2 کلو میٹرز پولیس تھانہ -

5- کارروائی متعلقہ تفتیش تحریری استغاثہ کی بنیاد پر مقدمہ درج اگر اطلاع درج کرنے میں رجسٹر کیا جا رہا ہے ایس ایس پی ساؤتھ کچھ توقف ہوا ہو تو اس کی مد میں مقدمے کی تحقیقات کریں گے وجہ بیان کی جائے۔

دستخط : انسپکٹر (ایس ایچ او)

ابتدائی اطلاع نیچے درج کریں۔

نوٹ : اطلاع کی نیچے اطلاع دہندہ کا دستخط یا مہر یا نشان انگوٹھا ہونا چاہیے۔ اور افسر تحریر کنندہ ابتدائی اطلاع) دستخط بطور تصدیق کنندہ ہونا چاہیے۔

مذکورہ مستغیث کا تحریری استغاثہ موصول ہوا جو کہ درج ذیل ہیں۔ مستغیث کا بیان درج ذیل ہے۔

(I) یہ کہ 96-09-20 جو کہ جلسہ عام جس سے پاکستان پیپلز پارٹی (ش ب) کے چیئرمین میر مرتضیٰ بھٹو خطاب کرنے والے تھے تقریباً" 6 بجے شام

یوسف گوٹھ' سرجانی ٹاؤن کراچی (ویسٹ) میں منعقد کیا جانے والا تھا۔ یہ کہ میر مرتضیٰ بھٹو مذکورہ جلسے سے خطاب کرنے کے لئے اپنے گھر واقع 70- کلفٹن پارٹی کے لیڈرز' ورکرز اور پرنسپل گارڈز بشمول مسٹر عاشق حسین جتوئی پریذیڈنٹ پی پی پی (ش ب) سندھ مسٹر سجاد حیدر گاکھرو' فنانس سیکرٹری پی پی پی (ش ب)' سندھ مسٹر یار محمد بلوچ ممبر سندھ کونسل ڈاکٹر مظہر میمن وائس پریذیڈنٹ (پی پی) (ش ب) حیدر آباد ڈویژن مسٹر وجاہت حسین جوکھیو انفارمیشن سیکرٹری حیدر آباد ڈویژن نور محمد اور گوگو سیکرٹری (پی آر) دو آفیشل گارڈز مسٹر ایاز دایو اور غلام محمد بٹ' ذاتی ملازم اصغر' پارٹی ورکرز اسماعیل بچل اور وقار' پرائیویٹ گارڈز اختر میرانی' قیصر بلوچ' محمد رحیم بروہی اور عبدالستار راجپر' ڈرائیور محمود بھلائی اور آصف اور دیگر ان کے ہمراہ تھے۔ (III) یہ کہ تقریباً" 35-8 بجے رات مذکورہ جلسہ عام سے واپسی پر جب میر مرتضیٰ بھٹو مسٹر عاشق حسین جتوئی کی جیپ میں بذات خود اور مذکورہ بالا ان کے ساتھی اور دیگر (افراد) تقریباً" 100 میٹر کے فاصلے پر پہنچے تو 80/100 پولیس اہلکار جو کہ خود کار اسلحہ سے باقاعدہ لیس تھے جائے وقوعہ پر پہلے ہی پوزیشن سنبھال چکے تھے۔ پولیس افسران یعنی واجد درانی ایس ایس پی ساؤتھ کراچی' شاہد حیات اے ایس پی صدر' اے ایس پی درخشاں (نام نامعلوم) حق نواز سیال ایس ایچ او کلفٹن ' ذیشان کاظمی ایس ایچ او کھوکھرا پار' ایس ایچ او گارڈن (نام نامعلوم) آغا جمیل ایس ایچ او نیپیئر نے گاڑیوں کے قافلے کو رک جانے کا سگنل دیا' جوں ہی قافلہ رک گیا اور میر مرتضیٰ بھٹو نے جیپ کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا تو مذکورہ پولیس افسروں نے چلا کر کہا "فائر کر دو" جس پر یار محمد بلوچ' وجاہت جوکھیو اور سجاد حیدر میر مرتضیٰ بھٹو کی سمت تیزی سے دوڑے تاکہ ان کے اطراف کور فراہم کر دیں لیکن اس اثناء میں پولیس نے ٹارگٹ شوٹنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں یار محمد بلوچ' سجاد حیدر گاکھرو' وجاہت جوکھیو اور عاشق حسین جتوئی' محمد رحیم بروہی اور عبدالستار راجپر موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اور میر مرتضیٰ بھٹو ایاز

دایو' اسماعیل ، بجل' اصغر اور ڈاکٹر مظہر میمن شدید زخمی ہو گئے (IV) یہ کہ ملزم پولیس اہلکاروں نے میر مرتضیٰ بھٹو اور مذکورہ بالا زخمیوں کو جائے وقوعہ پر تقریباً" 50 منٹ تک اس حالت میں چھوڑے رکھا کہ ان کے زخموں سے کثیر مقدار میں خون بہہ رہا تھا اور پھر میر مرتضیٰ بھٹو کو قریب ہی واقع مڈایسٹ اسپتال لے جایا گیا اور دیگر کو جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر کراچی لے جایا گیا۔ میر مرتضیٰ رات کے تقریباً" 11 بجکر 55 منٹ پر جاں بحق ہو گئے اور بجل اگلے دن جے پی ایم سی میں اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔

(V) یہ کہ اسی دن تقریباً" 4 بجے سہ پہر شہید میر مرتضیٰ بھٹو 70 کلفٹن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کے دوران یہ انکشاف کر چکے تھے کہ حکومت مسٹر شعیب سڈل ڈی آئی جی کراچی' واجد درانی' ایس ایس پی (ساؤتھ) کراچی اور محمد رمضان چنا ایس ایس پی سی آئی اے کراچی کے ذریعے انہیں اور ان کے کارکنوں کو بڑے پیمانے پر جھوٹے اور من گھڑت الزامات کے تحت گرفتار کرنے کی سازش تیار کر رہی ہے لیکن انہوں نے کہا تھا کہ وہ ان مظالم کا سیاسی طور پر سامنا کریں گے۔ (VI) یہ کہ وفاقی حکومت اور سندھ کی صوبائی حکومت میں میر مرتضیٰ بھٹو کے سیاسی مخالفین نے' جو ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے ان سے حسد کرتے تھے' یہ سازش کی تھی کہ انہیں ختم کر دیا جائے اور انہوں نے مذکورہ بالا ملزم پولیس افسران اور انٹیلی جنس بیورو کے ایک سینئر افسر میجر (ریٹائرڈ) مسعود شریف سے ساز باز کر کے سنگدلی سے میر مرتضیٰ بھٹو' عاشق جتوئی' سجاد حیدر گاکھرو' وجاہت جوکھیو' یار محمد بلوچ' محمد رحیم بروہی' عبدالستار راجپر اور محمد بجل کو قتل کر دیا اور آتشیں اسلحہ سے ایاز دایو' اسماعیل ، ڈاکٹر مظہر اور اصغر کو انہیں قتل کر دینے کے ارادے سے زخمی کر دیا۔ (VII) یہ کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے سنگدلانہ قتل کے خلاف جھوٹے دفاع کی پیش بندی کرنے کے لیے پولیس کی جانب سے پولیس تھانہ کلفٹن میں ایک بوگس ایف آئی آر درج کرائی گئی جس میں

ایک جھوٹا پولیس مقابلہ دکھایا گیا تھا جبکہ در حقیقت ملزمان پیشگی منصوبہ بندی اور پہلے سے غور و خوض کے بعد قتل کے مرتکب ہوئے ہیں مستغیث تلافی کی درخواست کرتا ہے۔

دستخط---- مستغیث نور محمد ولد محمد ابراہیم۔

70 کلفٹن کراچی 9-11-96 میں ایس ایچ او/انسپکٹر محمد فاروق بذریعہ ہذا تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا استغاثہ کی لفظ بالفظ نقل کی گئی ہے ایک جرم زیر دفعہ 148/149/120/ اے اینڈ بی مجموعہ تعزیرات پاکستان جسے 302 /324' قصاص اور دیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ کے ارتکاب کا ذکر کیا گیا ہے لہٰذا مقدمہ کو درج رجسٹر کرنے کے بعد ڈی آئی جی پی/کراچی کی ہدایت کے تحت ایس ایس پی/ ساؤتھ اس مقدمہ کی تحقیقات کریں گے۔

دستخط---- 9-11-96

(14) واقعہ 20-9-96 کی شام کو پیش آیا زیر بحث جرم کے پہلے تحقیقاتی افسر' ایف آئی آرز نمبر 386/96, 397/96 میں ایف آئی آر نمبر 399/96 میں پی ایس کلفٹن کے ایس آئی خرم وارث کو دکھایا گیا ہے تاہم ٹریبونل کے سامنے خود انہی کے دیئے گئے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ صرف کاغذی حد تک تحقیقاتی آفسر تھے اور حقیقی تحقیقات کو کنٹرول/ان کے نگران سینئر افسران کر رہے تھے ان کی حلفی شہادت کے حسب ذیل حصہ سے جو جلد (XI) کے صفحات 102 تا 110 پر درج شدہ ہے مذکورہ بالا پوزیشن کی توثیق ہو جاتی ہے۔

سوال---- ایف آئی آر میں درج شدہ وقت اور آپ کی ریکارڈنگ سے کہ آپ تحقیقات میں مصروف تھے یہ ظاہر ہوا کہ آپ کو رات کے سوا دس بجے یا اس کے لگ بھگ وقت پر جائے وقوعہ پر لازماً" پہنچ جانا چاہئے تھا۔

جواب---- یہ درست ہوگا۔

جائے وقوعہ پر تحقیقات کے لئے پولیس اسٹیشن سے میری روانگی روزنامچہ میں درج شدہ ہے میری روانگی کا وقت بھی وہاں مذکور ہو گا میں

پولیس اسٹیشن کی موبائل میں افسران کے ہمراہ بشمول اے ایس آئی بدر اے ایس آئی فدا اور پولیس جوانوں کے روانہ ہوا۔ پولیس آفیسرز کے علاوہ میری موبائل میں لگ بھگ 7 تا 8 پولیس والے ہوں گے 2 تا 3 منٹ کے اندر ہم سائٹ پر پہنچ گئے۔ اسٹریٹ لائٹس بند تھیں۔

(اے) جو پولیس گاڑیاں ملوث تھیں وہ واقعہ والے وقت اصل پوزیشن میں کھڑی نہیں کی گئی تھیں انہیں وہاں سے منتقل کیا گیا' جب میں وہاں پہنچا' ایس پی شکیب قریشی اور اے ایس پی رائے طاہر نے ان گاڑیوں کی نشاندہی کی جو ملوث تھیں۔ انہوں نے چار گاڑیوں کی نشاندہی کی' تین پولیس گاڑیاں جن پر گولیاں لگی تھیں اور ایک گاڑی ایس پی صدر کی تھی جس پر کوئی گولی نہیں لگی تھی۔ ایس پی شکیب قریشی اور اے ایس پی رائے طاہر نے ان جگہوں کی نشاندہی کی جہاں چاروں گاڑیاں وقوع والے دن کھڑی کی گئی تھیں۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جب میں سائٹ پر پہنچا تو اس سے قبل چاروں گاڑیاں کہاں تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس وقت استعمال میں تھیں۔ ایس پی یا اے ایس پی کے حکم پر چاروں گاڑیاں جگہ پر لائی گئیں اور اس کے بعد ان کی نشاندہی کی گئی کہ یہ وہ چاروں گاڑیاں ہیں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وقوع والے وقت کی چاروں گاڑیوں کی اصل پوزیشن بتائی گئی میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کس گاڑی سے خالی خول لے جائے گئے' تاہم ان اطلاعات پر جو مجھے فراہم کی گئیں میں نے مشیر نامہ تیار کیا جس میں بتایا گیا ہے کہ کتنے اور کس قسم کے خالی خول ہر گاڑی سے برآمد کئے گئے۔

سوال---- کیا آپ نے وقوع والی جگہ پر ایس پی شکیب قریشی یا اے ایس پی طاہر یا دوسرے کسی سینئر افسر سے یہ پوچھا کہ جو پولیس گاڑیاں مقابلے میں شریک تھیں' انہیں ان کے اصل مقام سے کیوں منتقل کیا گیا جبکہ اس طرح میر مرتضیٰ بھٹو کے قافلے کی گاڑیاں ان کی اصل پوزیشن سے منتقل نہیں کی گئیں؟

جواب---- میں نے نہ تو ایس پی شکیب قریشی یا اے ایس پی رائے طاہر یا کسی دوسرے سینئر افسر سے اس بارے میں سوال نہیں کیا۔

سوال---- بطور سینئر افسر کیا یہ درست نہیں کہ کسی جرم میں ملوث تمام اشیاء کو اس وقت تک وہیں رکھا جاتا ہے جب تک تحقیقاتی افسر وہاں نہ پہنچ جائے اور ضروری تحقیقات مکمل نہ کر لے اور مطلوبہ مشیر نامہ تیار نہ کر لے؟

جواب---- یہ درست ہے۔

سوال---- جب آپ بطور تحقیقاتی افسر واقعہ کے مقام پر پہنچے اور دوسرے جوانوں یا شاید افسروں کو دیکھا جو گاڑیوں اور اس جگہ سے خالی خول جمع کر رہے تھے اور جب آپ کو یہ علم ہوا کہ مقابلے میں شریک پولیس کی گاڑیوں کو ان کے اصل مقام سے منتقل کیا جا رہا ہے تو کیا بطور ایک سینئر پولیس افسر کے آپ کو یہ بات غیر معمولی عمل کے طور پر محسوس نہیں ہوئی؟

جواب---- ایس ایس پی واجد علی درانی' ایس پی شکیب قریشی اور دوسرے سینئر افسروں کی موجودگی میں' میں نے جو دیکھا (سوال میں جس کی نشاندہی کی گئی) وہ مجھے غیر معمولی طور پر محسوس نہیں ہوا' اگر ایس ایس پی اور ایس پی وہاں موجود نہ ہوتے اور وہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ ان کی نگرانی میں نہ ہو رہا ہوتا تو بطور تحقیقاتی افسر میں یقینی طور پر ان تمام چیزوں کو غیر معمولی محسوس کرتا۔ میں اپنے تیار کردہ مشیر نامہ بتاریخ 20-9-96 کی کاپی پیش کر رہا ہوں اس مشیر نامے پر بطور گواہ اے ایس آئی عبدالباسط اور اے ایس آئی حضور بخش ابڑو کے دستخط ہیں دونوں کا تعلق کلفٹن تھانے سے ہے۔

سوال---- آپ نے اپنے مشیر نامے میں یہ حقیقت واضح نہیں کی کہ جب آپ جائے وقوع پر پہنچے تو وہاں پہلے سے تحقیقات جاری تھیں اور دوسرے پولیس اہلکار اور افسران ایس پی شکیب قریشی اور اے ایس پی طاہر کی نگرانی

میں خالی خول جمع کر رہے تھے آپ نے اس بات کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

جواب--- میں نے ایس پی شکیب قریشی، اے ایس پی طاہر اور دوسرے پولیس حکام کے اس کردار کا ذکر نہیں کیا جو وہ ادا کر رہے تھے میں نے ٹریبونل کو بتایا ہے کہ ایس پی شکیب قریشی پورے ضلع کی حفاظت سے متعلق انچارج تھے اور وہ وہاں موجود تھے اور تحقیقات کی نگرانی کر رہے تھے تو یہ بات واضح تھی کہ وہ تحقیقات کے نگران بلکہ اس کے انچارج ہیں، میں نے ایس پی شکیب قریشی اور اے ایس پی طاہر اور دوسرے اہلکاروں کے کردار کی نشاندہی اپنے مشیر نامے میں نہیں کی۔ جب میں نے واردات کا مشیر نامہ تیار کرلیا تو میں نے اسے ایس پی شکیب قریشی اور اے ایس پی طاہر کو پڑھ کر سنایا اور انہوں نے اسے "اوکے" کیا اور پھر مشیر نامہ پر دستخط ہوئے۔

سوال--- جب ایس پی اور اے ایس پی نے مشیر نامے کو "اوکے" کیا تو آپ نے اس پر ان دونوں کے دستخط کیوں نہیں لئے۔؟

جواب--- میں ان سے اس بارے میں کہنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

سوال--- آپ کو تحقیقات کا بڑا تجربہ ہے، کیا یہ درست نہیں کہ اگر مشیرنامہ اعلیٰ افسران کی نگرانی میں تیار کیا گیا ہو تو کیا اس پر بطور گواہ اس کے دستخط نہیں ہونے چاہیں تھے؟

جواب--- یہ درست ہے لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ وہاں متعدد دوسرے افسران بھی پہلے سے موجود تھے۔

سوال--- یہ تعجب کی بات ہے کہ مشیر نامے کے جو مندرجات ہیں ان کی بنیاد دوسرے افسران اور پولیس اہلکاروں کی دی گئی معلومات ہیں اور ان معلومات کے بغیر یہ مشیر نامہ تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ نے مشیر نامے میں یہ بھی واضح نہیں کیا کہ مشیر نامہ کا کونسا حصہ کون سے پولیس افسر کی دی گئی معلومات پر مبنی ہے۔ یہ تمام حقیقت مشیرنامے میں موجود نہیں ہے کیا یہ درست ہے؟

جواب--- یہ درست ہے۔

سوال--- آپ نے اپنے مشیر نامے میں ایک یا دیگر گاڑیوں سے برآمد کئے گئے خالی خول اور ان کی قسم یعنی کہ وہ کلاشنکوف یا اوزی یا جی تھری یا ایس ایم جی وغیرہ وغیرہ کے ہیں کے متعلق لکھا ہے، آپ کو صرف یہ بیان کر دینا تھا کہ یہ خالی خول مختلف اقسام کے متعدد گاڑیوں سے ملے۔ مشیر نامے اور آپ کی شہادت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے جو کچھ بیان کیا وہ ان تمام تفصیلات پر مبنی ہیں جو آپ کو بتائی گئیں کیا یہ درست ہے؟

جواب--- جی ہاں۔

تحقیقاتی افسر ایس آئی خرم کے مطابق وہ 22-9-96 تک تحقیقات پر فائز رہے یعنی دو دنوں کے لئے۔ انہوں نے بتایا کہ جب انہوں نے ملزمان کا بارہ بجے ریمانڈ لیا تو انہیں بطور تحقیقاتی افسر کام کرنے سے روک دیا گیا۔ اس وقت انہیں ہدایات ملیں کہ یہ تحقیقات کرائمز برانچ کو منتقل کر دی گئی ہیں تاہم تحقیقات سے متعلق کاغذات ان سے اگلے دن یعنی 23-09-96 کی صبح لئے گئے۔

(صفحہ 119-120 باب گیارہ)

ایس آئی خرم وارث کے بعد جب تحقیقات کرائمز برانچ کے سپرد کی گئیں تو اس وقت کے حیدر آباد کے ایس پی کرائمز نور محمد پیچو کو تحقیقاتی ٹیم کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ وہ بطور گواہ نمبر 110 ٹریبونل کے سامنے پیش ہوئے۔ ان کے بیان کا حصہ صفحہ 175-176 باب 12 میں موجود ہے۔

مورخہ اکتوبر 1996ء کو آئی جی پولیس سندھ کے جاری کردہ نوٹیفیکیشن کے مطابق ایس ایس پی اللہ ڈنو خواجہ، جرم کی تحقیقات میں شامل ہوگئے وہ ٹریبونل کے سامنے بطور گواہ نمبر 109 پیش ہوئے ان کے بیان کا حصہ صفحہ 170 جلد 12 حسب ذیل ہے۔

20 ستمبر 1996ء کو میں نے بطور ایس ایس پی ساؤتھ کراچی کے چارج سنبھالا آئی جی پولیس سندھ کے 15 اکتوبر 1996ء کے جاری کردہ

نوٹیفکیشن کے مطابق مجھے 20 ستمبر1996ء کو کلفٹن پولیس اسٹیشن کے واقعہ سے متعلق کرائم نمبر386, 387, 399 کی تحقیقات میں تحقیقاتی ٹیم کی مدد کرنا تھی تحقیقاتی ٹیم کے سربراہ اے آئی جی نور محمد پیچو تھے' کلفٹن پولیس اسٹیشن میں 9 نومبر1996ء کو ایک دوسری ایف آئی آر کرائم نمبر443/90 رجسٹر ہوئی جس میں مدعی نور محمد تھے جو مذکورہ واقعہ سے متعلق تھے میں کرائم نمبر443/96 کے بارے میں تین روز تک تحقیقاتی افسر رہا 20 ستمبر 1996ء کو ایس ایس پی ساؤتھ کے عہدے سے میرا تبادلہ کر دیا گیا اور سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں رپورٹ کرنا پڑا۔ بعد ازاں مجھے کہیں اور تعینات کیا گیا۔

اس کیس کے آخری تفتیشی افسر آئی جی علی گوہر تھے انہوں نے 19 دسمبر1996ء کو تحقیقاتی افسر کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت ان کے پاس ایس ایس پی سی آئی اے کراچی کا عہدہ تھا جس دن وہ تفتیشی افسر مقرر ہوئے حکومت سندھ نے ایک نوٹیفکیشن جاری کیا جس کے تحت انہیں ایس ایس پی سی آئی اے کی اپنی ذمہ داری کے علاوہ اے آئی جی پولیس کرائمز کا چارج بھی دیا گیا تھا۔

15- فائرنگ کے واقعہ نے 8 افراد کی جانیں لے لیں۔ یہ سب کے سب میر مرتضٰی بھٹو کی پارٹی سے وابستہ تھے۔ جاں بحق ہونے والوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

1- میر مرتضٰی بھٹو ایم پی اے' چیئرمین پی پی پی (ش ب)
2- عاشق حسین جتوئی' صدر پی پی پی (ش ب) سندھ
3- سجاد حیدر گھاکھرو' فنانس سیکریٹری پی پی پی (ش ب)
4- یار محمد بلوچ' ممبر سندھ کونسل پی پی پی (ش ب)
5- وجاہت حسین جوکھیو' انفارمیشن سیکریٹری پی پی پی (ش ب)
6- محمد رحیم بروہی' پارٹی کا کارکن۔
7- عبدالستار راجپر' پارٹی کا کارکن۔

8- محمد بچل' پارٹی کا کارکن۔

(ایف آئی آر نمبر443/96 سے عہدہ حذف کر دیا گیا) یہ بات محسوس کی گئی کہ زخمی ہونے والا بچل ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ جو دو تلوار کی ٹریفک پولیس چوکی کے نزدیک تھا اور شہادتوں کے مطابق وہ ریکارڈ پر آیا ہے پولیس نے اسے ٹیکسی میں تنہا بے ہوشی کی حالت میں پایا۔ اس کے سر پر آتشیں ہتھیار کا زخم تھا۔ ٹیکسی میں کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ یہ قیاس کیا گیا تھا کہ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا اور جب فائرنگ شروع ہوئی تو وہ روڈ سے گزر رہا تھا کہ اتفاقیہ طور پر نشانہ بن گیا۔ اس زخمی بچل کو جناح اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں وہ اگلے دن بغیر ہوش میں آئے دم توڑ گیا۔ مدعی نور محمد جس کی بنیاد پر ایف آئی آر نمبر443/96 کلفٹن پولیس اسٹیشن میں 9 نومبر1996ء سندھ ہائی کورٹ کے احکامات کی پیروی میں درج ہوئی۔ محمد بچل کو بطور پارٹی ورکر کے دکھایا گیا اور وہ بعدازاں اگلے روز جے پی ایم سی میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ بچل واحد شخص تھا جسے جے پی ایم سی میں داخل کیا گیا تھا اور وہ مبینہ طور پر ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ شواہد سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ زخمی بے ہوشی کی حالت میں ٹیکسی میں کیسے آیا جبکہ ٹیکسی دو تلوار پر ٹریفک پولیس چوکی کے نزدیک رک گئی تھی۔

بچل کے علاوہ جو کہ ابتداء میں زخمی تھا اور اگلے روز چل بسا حسب ذیل افراد واقعہ میں زخمی ہوئے:

1- ڈاکٹر مظہر میمن' نائب صدر پی پی پی (ش ب) حیدر آباد ڈویژن۔
2- اسمٰعیل' پارٹی کا ایک کارکن۔
3- ایاز دائیو' ایم پی اے میر مرتضٰی بھ[illegible]ہ پولیس کا فراہم کردہ گارڈ۔
4- اصغر' میر مرتضٰی بھٹو کا ملازم۔

میر مرتضٰی بھٹو کی پارٹی سے وابستہ 8 ہلاک شدگان اور چار زخمیوں کے علاوہ دو پولیس افسران بھی زخمی ہوئے جو اس پولیس ٹیم کا حصہ تھے جنھوں نے آپریشن کیا تھا ان میں اے ایس پی صدر شاہد حیات' جن کے بائیں ران میں آتشیں اسلحہ کا زخم آیا اور ایس ایچ او کلفٹن انسپکٹر حق نواز سیال جو معمولی طور پر زخمی ہوئے' ان کے با[illegible] پیر پر زخم آئے۔ واضح رہے کہ 29 ستمبر1996ء کو انسپکٹر سیال کی موت کے بارے میں

ان کے قتل کئے جانے کا ایک کیس رجسٹر کیا گیا۔

(16) جب ٹریبونل نے اپنی کارروائی شروع کی تو اس وقت کے ایڈووکیٹ جنرل سندھ مسٹر عبدالغفور منگی نے 22 اکتوبر 1996ء کا ایک مکتوب فائل کیا جس میں حکومت سندھ کی جانب سے ایڈووکیٹ جنرل سندھ کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں ٹریبونل کی کارروائی میں معاونت کی ہدایت کی گئی تھی ان کی معاونت ــــــــ

جناب عبداللطیف انصاری نے ابتدائی ایام میں سندھ اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کے فرائض ادا کئے اس سے قبل چند سماعتوں کے دوران ٹریبونل کی کارروائی میں آئی جی پولیس نے شرکت کی۔ جناب عبداللطیف انصاری حکومت سندھ کے علیحدہ اتھارٹی لیٹر کے ساتھ حاضر ہوئے۔ 22 فروری 1997ء کو الگ الگ اتھارٹی لیٹرز پیش کئے گئے جس میں ایک کے تحت جناب اختر علی جی قاضی کو اور دوسرے خط میں جناب عبداللطیف خان کھوسہ کو اختیارات دیئے گئے تھے جو حکومت سندھ کی طرف سے ٹریبونل کی معاونت کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ مسٹر اختر علی جی قاضی کی معاونت مسٹر عبداللطیف انصاری نے کی۔ ایڈووکیٹ جنرل سندھ نے 21 اکتوبر 1996ء کو 81 گواہان کی فہرست پیش کی جو ان کے مطابق اہم گواہ تھے۔ استدعا کی گئی ان گواہوں کو ٹریبونل کے سامنے پیش ہونے کے لئے نوٹس جاری کئے جائیں۔ (دستاویز نمبر 4) فہرست میں مذکور گواہوں میں سے اکثر کو ٹریبونل میں پیش ہونے کے لئے کہا گیا اور سماعت کے دوران وہاں محسوس کیا گیا کہ ایک گواہ یا گواہان کو طلب کیا جائے' ان کو طلب کیا گیا۔ کچھ گواہان نے خود درخواست دائر کی کہ وہ گواہ کے طور پر پیش ہونا چاہتے ہیں جن میں محترمہ بے نظیر بھٹو اور رحیم بخش جمالی شامل ہیں۔ جب بھی ضروری سمجھا گیا ان گواہوں کو شہادت کے لئے طلب کیا گیا اور ان کے بیانات ٹریبونل میں قلمبند کئے گئے۔

17 ٹریبونل یہاں اپنی ایک مد کو ریکارڈ کرنا چاہے گا جس کا سامنا اس کو کارروائی اور رپورٹ کی تیاری کے دوران ہوتا رہا۔ ٹریبونل ایک انکوائری ٹریبونل ہے جو سندھ ٹریبونل آف انکوائری آرڈی نینس 1969ء کے تحت تشکیل دیا گیا اور اس کو یہ تحقیق کرنے کے لئے تشکیل دیا گیا کہ ان وجوہ اور واقعات اور حالات کا سراغ لگایا جائے جن کی وجہ سے یہ سانحہ پیش آیا اور دوسری چیزوں کے علاوہ یہ تعین کیا جائے کہ کیا سانحے

سے پہلے اس کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ جس کا مقصد میر مرتضیٰ بھٹو اور دوسروں کو جان بوجھ کر جان سے مارنا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ٹریبونل کے قیام سے قبل اخباری ذرائع ابلاغ میں پولیس کے اس واقعہ میں کردار کے بارے میں ناراضی کا اظہار کیا گیا۔

ایف آئی آر نمبر 96/386 میں اس واقعے کو معمول کا تصادم قرار دیا گیا جس میں پولیس پر فائرنگ کی گئی اور اس کے دو افسران زخمی ہوگئے۔ اس کے بعد پولیس نے اپنے دفاع میں ایکشن لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک دوسری ایف آئی آر 399/96 بھی تھی جس کو میر مرتضیٰ بھٹو کے گھریلو ملازم اصغر نے درج کرایا تھا لیکن فریق مخالف کے مطابق یہ ایف آئی آر اس طرح درج کی گئی تھی کہ اس سے اصل حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا تھا اور یہ کہ اس سانحے سے متعلق حقائق کو مبہم رکھا گیا تھا۔ ایف آئی آر نمبر 96/399 کے جائزے سے یہ ظاہر ہوگیا کہ اصغر خود کلفٹن تھانے گیا تھا اور یہ ایف آئی آر اسی طرح درج ہوئی جس طرح وہ زبانی بتاتا رہا لیکن ریکارڈ پر یہ شہادت آئی کہ اصغر علی جو جرم نمبر 96/386 میں ملزم تھا اور پولیس کے زیر حراست تھا حراست ہی کے دوران اس کو وزیر اعلیٰ ہاؤس لے جایا گیا جہاں اس سانحے کی شکایت تیار کی گئی اور اس شکایت کی بنیاد پر ایف آئی آر نمبر 96/399 درج کی گئی اس لئے بنیادی طور پر اس سانحے کے بارے میں پولیس کا وہ مخصوص کردار تھا جو تحقیق کا موضوع تھا اور اس کے بعد یہ تعین کرنا تھا کہ کیا میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کی پارٹی کے خلاف اس کی پہلے سے منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ بہرحال میر مرتضیٰ بھٹو اور عاشق حسین جتوئی کی بیواؤں نے سندھ ہائی کورٹ کے سامنے ایک آئینی درخواست دائر کی جو منظور ہوگئی اور ہائی کورٹ کے احکامات کے مطابق تیسری ایف آئی آر درج کی گئی جس کا مدعی نور محمد ہے جو میر مرتضیٰ پارٹی کا ایک رکن ہے۔ یہ شکایت ڈاک کے ذریعے بھی گئی تھی اور اسے ایف آئی آر نمبر 96/443 کے طور پر کلفٹن تھانے میں درج کیا گیا۔ اس میں الزام لگایا گیا ہے کہ پولیس نے میر مرتضیٰ بھٹو اور دوسروں کو قتل کیا اور میر کی پارٹی کے دیگر کئی ارکان زخمی بھی ہوئے اور یہ کہ یہ کارروائی پہلے سے منصوبہ بندی کے تحت کی گئی جس کا اشارہ وفاقی اور صوبائی حکومت سندھ میں میر

مرتضیٰ بھٹو کے مخالفین نے کیا تھا۔ سندھ کے ڈی آئی جی سنٹرل ' ایس ایس پی درانی اور ایس پی رمضان چنا (سی آئی اے) سمیت اعلیٰ پولیس افسران کو اس ایف آئی آر میں ملزم بنایا گیا۔ اس طرح اصل سانحے کے تمام عینی گواہوں کو ایف آئی آر نمبر96/ 386 اور ایف آئی آر نمبر96/443 میں ملزمان بنا دیا گیا۔ ٹریبونل کی کارروائی جاری تھی کہ سرکاری طور پر بتایا گیا کہ ایف آئی آر نمبر اور 96/443 میں چالان پیش کر دیئے گئے ہیں۔ فاضل وکیل کی جانب سے بتایا گیا کہ ملزمان کو بہت مشکل میں ڈال دیا گیا ہے اور وہ اپنے دفاع کو ٹریبونل کے سامنے ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس سے ان کو ٹرائل کورٹ میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس بات کا ذکر بھی یہاں کیا جاسکتا ہے کہ اس سانحے کے آخری تفتیشی افسر اے آئی جی علی گوہر عثمانی نے ٹریبونل کو بتایا کہ جرائم نمبر 386, 397 اور 399 کے بارے میں پولیس نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ 169 کے تحت رپورٹس پیش کی ہیں اور اب جس ایک کیس کی سماعت ٹرائل کورٹ میں فاضل سیشن جج سماعت کریں گے وہ جرم نمبر96/443 ہے جس میں پولیس والے ملزمان ہیں۔ ٹریبونل نے یہ احساس کرتے ہوئے کہ یہ صرف انکوائری ٹریبونل ہے اور اس کی تشکیل کے بعد ایف آئی آر نمبر96/443 درج کی گئی اور کیس کی سماعت شروع ہوئی یہ احتیاط برتی کہ کسی بھی ملزم کو ٹرائل کورٹ میں نقصان نہ پہنچے۔ اس وجہ سے ٹریبونل نے خود کو فائرنگ سے متعلق گواہوں کے بیانات قلمبند کرنے سے روکا۔اس مشکل یا حد کو سامنے رکھتے ہوئے رپورٹ مرتب کی جا رہی ہے۔ ٹریبونل میں 129 گواہوں کے بیانات ریکارڈ کئے گئے اس کے علاوہ دو ملزمان نے ٹریبونل میں اپنے بیانات پڑھ کر سنائے۔ اس مرحلے پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گواہوں کے بیانات کا مختصر جائزہ بھی لیا جائے۔

گواہان

گواہ نمبر1 :- محمد اسلام خان ڈی ایس پی کلفٹن کراچی

محمد اسلام خان ڈی ایس پی کلفٹن کراچی نے 96-10-22 کو اپنا بیان دیا۔ انہوں

نے ایف آئی آر نمبر96/386 کی نقل پیش کی جو انسپکٹر حق نواز سیال نے داخل کی تھی۔انہوں نے ایف آئی آر نمبرز 96/387 سے 1996/397 تک کی کاپی پیش کی۔ ڈی -4/513 اسلحہ آرڈی نینس کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں انہوں نے ایف آئی آر نمبر96/399 کی نقل پیش کی جو شکایت کنندہ اصغر علی نے 96-9-24 کو رجسٹر کروائی۔ تمام ایف آئی آر کلفٹن پولیس اسٹیشن میں رجسٹرڈ کروائی گئی۔

گواہ نمبر2 :- منظور بھٹو

یہ حکومت سندھ کے ہوم سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے 96-10-28، 96-10-29 اور 97-2-11 کو بیان دیا۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ انہیں پولیس کے اس ایکشن کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ روزانہ صورتحال کی رپورٹ میں پولیس کے اس ایکشن کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا لیکن حادثے کے بعد روزانہ صورتحال کی رپورٹ میں 96-9-21 کو حادثے کے بارے میں معلومات دی گئی تھیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے مسلح گارڈز نے سی آئی کے دو مراکز پر 96-9-17 کے ابتدائی گھنٹے میں چڑھائی کی۔ یہ رپورٹ وزیر اعلیٰ کو ٹیلی فون پر دی گئی لیکن انہیں ان دو چھاپوں کا علم تھا۔

گواہ نمبر3 :- محمد سعید آئی جی سندھ

آئی جی سندھ نے 96-10-28 اور 97-2-11 کو اپنے بیانات دیئے۔ ان کے بیان کے مطابق انہیں 20 ستمبر کو پولیس یا قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کی کسی منصوبہ بندی یا آپریشن کا علم نہیں تھا۔ وہ پشاور میں تھے اور 96-9-19 کو 8 بجے رات پشاور سے روانہ ہوئے۔ وہ کراچی میں اپنے گھر 10:30 شب پہنچے۔ انہیں وائرلیس سسٹم پر کنفیوز کرنے والی رپورٹیں مل رہی تھیں۔ معلوم کرنے پر ڈی آئی جی سنٹرل نے انہیں بتایا کہ فائرنگ کا واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ جس میں چھ افراد ہلاک اور چھ زخمی ہوگئے ہیں۔ زخمیوں میں دو پولیس والے بھی شامل ہیں۔

گواہ نمبر4:۔ ڈاکٹر شعیب سڈل ڈی آئی جی کراچی

یہ حادثہ ان کی رہائش گاہ کے عین سامنے پیش آیا۔ انہیں اس واقعے کا علم پونے 9 بجے رات ہوا' جب فائرنگ شروع ہوئی۔ انہوں نے اس ایکشن کے بارے میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی اور پہلی دفعہ انہیں اس کا علم اس وقت ہوا جب درانی نے 8:15 سے 8:30 شب کے درمیان اپنے بنائے ہوئے منصوبے کے بارے میں بات چیت کی۔ انہوں نے اپنی ذات کو اس مکمل آپریشن کے دوران اور آپریشن کے فوراً بعد تک بالکل الگ رکھا تاکہ اس واقعے میں ملوث نہ ہوں اور انہیں ذمہ دار قرار نہ دیا جائے۔ اگرچہ ڈی آئی جی کراچی تھے اور تمام آپریشن ان کی رہائش گاہ کے عین سامنے رونما ہوا۔ اس دوران وہ اپنے گھر کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

گواہ نمبر5:۔ محمد اقبال اے ایس آئی

اے ایس آئی نے 5-11-96 کو اپنا بیان دیا۔ یہ ایرانی قونصل خانے کا گارڈ تھا جو 70 کلفٹن کے ساتھ واقع ہے۔ اس نے کہا کہ میں آپریشن کے وقت وہاں موجود نہیں تھا۔

گواہ نمبر6:۔ مقبول شاہ پولیس گارڈ

نے کہا کہ میں انڈونیشیا کے قونصل خانے میں گارڈ ڈیوٹی پر تھا لیکن میں اندر تھا اس لئے میں نے آپریشن کے متعلق کسی چیز کو نہیں دیکھا۔

گواہ نمبر7:۔ محمد اکرم

نے کہا کہ میں کے ایم سی میں بحیثیت مالی ملازمت کرتا ہوں' میری نیو کلفٹن گارڈن میں ڈیوٹی تھی۔ وہ ایکشن کے دن ڈیوٹی پر نہیں تھا۔

گواہ نمبر8:۔ نصیرالدین ریٹائرڈ سب انسپکٹر

ان کی دوبئی قونصل خانے میں ڈیوٹی تھی۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ جائے حادثہ جس کے بارے میں انہیں بعد میں علم ہوا' جو دوبئی قونصل خانے سے چار پانچ گز دور ہے۔ انہوں نے کارروائی سے متعلق کچھ نہیں دیکھا۔

گواہ نمبر9:۔ واجد علی درانی ایس ایس پی ساؤتھ کراچی

وہ پولیس آپریشن کے انچارج تھے' انہوں نے سارے آپریشن کی منصوبہ بندی کی تھی اور منصوبے کے لئے ڈی آئی جی سڈل سے فائرنگ سے آدھے گھنٹے پہلے اجازت حاصل کی۔ ان کی گواہی پہلے ہی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔

گواہ نمبر10:۔ فیروز

یہ کلفٹن گارڈن کا چوکیدار تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے میر مرتضیٰ کے قافلے کو نہیں دیکھا۔ وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ اچانک فائرنگ شروع ہوگئی جو بہت شدید تھی۔ اس نے خوف کی وجہ سے فائرنگ کی وجہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

گواہ نمبر11:۔ عباس ہیڈ کانسٹیبل

وہ ڈی آئی جی کراچی شعیب سڈل کی رہائش گاہ پر گارڈ کی ڈیوٹی پر تھا اور اپنی ڈیوٹی پر 8 بجے شب آیا۔ کچھ دیر بعد اس نے فائرنگ کی دو آوازیں سنیں۔ وہ جاننے کے لئے باہر جانا چاہتا تھا لیکن گارڈ پولیس کانسٹیبل خان محمد نے کہا کہ جب تک باہر فائرنگ ہو رہی تھی تم باہر نہیں جاؤ۔ ڈی آئی جی اپنے گھر کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فائرنگ ختم ہونے کے 15 منٹ بعد یہ اور خان محمد گیٹ کے پاس پہنچے۔ علاقے میں کئی بڑے درخت ہیں۔ رات کے وقت ان کے سائے میں ہلاک یا زخمی ہونے والے افراد

نظر نہیں آرہے تھے۔ فائرنگ ختم ہونے کے بعد ڈی آئی جی اندر گئے اپنا یونیفارم پہنا اور اپنی جیپ میں چلے گئے۔ مسلح دستہ ان کے پیچھے تھا۔

گواہ نمبر12:۔ ظہیرالدین

یہ پولیس اسٹیشن گارڈن میں اے ایس آئی تھے۔ وہ 20-9-96 کو پولیس اسٹیشن گارڈن آئے تھے اور 9 بجے رات بکتر بند گاڑی میں پیٹرول ڈیوٹی پر تھے' انہیں وائرلیس پر پیغام ملا کہ دو تلوار جاؤ۔ جب یہ وہاں پہنچے وہاں کچھ نہیں تھا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور بجلی بھی نہیں تھی۔ 9:45 بجے شب یہ جائے حادثہ پر پہنچے۔ وہ بکتر بند گاڑی میں 12:30 بجے شب تک رہے' اس وقت وہاں سے لوگوں کو لے جانے کا عمل جاری تھا۔

گواہ نمبر13:۔ عبدالقیوم

یہ کل ٹیکس پیٹرول پمپ واقع دو تلوار چوراہے پر کیشئر تھا۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور کئی لوگ کلفٹن پر جا رہے تھے۔ 8 بجے شب کے بعد فائرنگ شروع ہوئی' کئی افراد جو گاڑیوں پر اپنے بچوں کے ساتھ تھے' دفتر کے اندر آگئے تاکہ فائرنگ سے اپنے آپ کو اور بچوں کو بچایا جا سکے۔ فائرنگ مسلسل 10 سے 20 منٹ تک جاری رہے۔ فائرنگ بہت شدید تھی۔ اس نے باہر جاکر دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور کیوں فائرنگ ہو رہی ہے۔

گواہ نمبر14:۔ محمد شاہد

یہ دو تلوار چورنگی پر واقع ٹائر مرمت کرنے کا کام کرتا ہے۔ وہ حادثے کے دن کام پر نہیں آیا کیونکہ وہ جمعہ کے دن کام نہیں کرتا۔

گواہ نمبر15:۔ فیاض احمد

ٹائر درست کرنے کی دکان میں کام کرتا ہے۔ وہ حادثے کا عینی شاہد نہیں ہے۔

درختوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ کچھ نہیں دیکھ سکا۔

گواہ نمبر16:۔ سلطان افسر پولیس کانسٹیبل

20-9-96 کو یہ اے ایس آئی ظہیرالدین (گواہ نمبر 12) اور سلطان پولیس کانسٹیبل (گواہ نمبر16) کے بیان سے مطابقت رکھتا ہے۔

گواہ نمبر18:۔ سلطان

یہ ایدھی تنظیم کا ایمبولینس ڈرائیور ہے۔ حادثے کے وقت وہ کلفٹن میں آغا سپر مارکیٹ کے قریب واقع ایدھی سینٹر میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ نو بجکر بیس منٹ پر یا نو بج کے 25 منٹ پر مرکزی دفتر کی جانب سے انہیں اطلاع ملی کہ 70 کلفٹن پر ایمبولینس روانہ کی جائے۔ ان کی ایمبولینس جو سوزوکی ہائی روف تھی' میں صرف ایک اسٹریچر کی گنجائش تھی وہ جائے حادثہ رات ساڑھے نو بجے پہنچے تو وہاں پر اندھیرا تھا۔ اسے کہا گیا کہ وہ گاڑی کی بتیاں بجھا دے تو وہاں اسے زمین پر 6 لاشیں دکھائی دیں۔ کئی جگہوں پر خون کے نشانات تھے۔ وہاں کسی زخمی کو نہیں دیکھا۔ آدھی رات کو 12 بج کر پندرہ منٹ پر اس کو مزید ایمبولینسز لانے کے لئے کہا گیا۔ اس نے سینٹر کی طرف جانا چاہا لیکن دو تلوار پولیس چوکی کے قریب تین ایمبولینس کھڑی تھیں۔ اس لئے وہ رک گیا یہ چاروں ایمبولینس اس جگہ آئیں جہاں لاشیں پڑی تھیں۔ ان لوگوں نے اسٹریچروں پر لاشیں رکھیں' انہیں ابتدائی کارروائی کے لئے کلفٹن تھانے پہنچنے کے لئے کہا گیا۔ ڈھائی بجے تا پونے تین بجے انہیں لاشیں جناح ہسپتال لے جانے کے لئے کہا گیا جہاں وہ تین بجے پہنچے۔

گواہ نمبر19:۔ حسین احمد قریشی

یہ دوسری ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔ 20-9-96 کو رات نو بجکر 55 منٹ پر اس کو کنٹرول کی جانب سے اطلاع ملی کہ اپنی ایمبولینس لے کر دو تلوار پہنچے۔ اس کا

بقیہ بیان گواہ نمبر18 سلطان کے بیان کے مطابق ہے۔

گواہ نمبر20:۔ محمد رفیق

یہ بھی ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔ رات نو بجکر 55 منٹ پر کنٹرول کی جانب سے اس کو پیغام موصول ہوا کہ کلفٹن پہنچے۔ وہاں چند زخمی موجود ہیں۔ یہ جب دو تلوار کے قریب موجود پولیس چوکی پر پہنچا تو اس کو وہاں انتظار کرنے کو کہا گیا۔ اس کا باقی کا بیان سلطان گواہ نمبر18 سلطان کے بیان کے مطابق ہے۔

گواہ نمبر21:۔ فردل خان

یہ بھی ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔ رات نو بجے اس کو اطلاع ملی کہ کلفٹن کے علاقے میں زخمی حالت میں کچھ لوگ موجود ہیں اور پہلے دو تلوار کے پاس پہنچو۔ جب وہ رات ساڑھے دس بجے پہنچا تو وہاں پہلے سے دو ایمبولینس موجود تھیں۔ اس کا باقی کا بیان گواہ نمبر18 سلطان کے بیان کے مطابق ہے۔

گواہ نمبر22:۔ عثمان غنی

یہ بھی ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔ 96-9-20 کو رات 8 بج کر 55 منٹ پر ایک پرائیویٹ سوزوکی پر بچل نامی زخمی شخص ایدھی سینٹر میں لایا گیا۔ اس نے اس زخمی کو جناح ہسپتال پہنچایا۔

گواہ نمبر23:۔ محمد سرور

یہ بھی ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جب ڈیوٹی پر موجود تھا تو اس کے سینٹر کے انچارج ابراہیم کلرک کو وائرلیس پر پیغام موصول ہوا۔ اپنی ایمبولینس کلفٹن سینٹر لے کر پہنچو۔ اس کی ایمبولینس میں وائرلیس سیٹ موجود نہیں تھا

وہ رات ساڑھے دس بجے کلفٹن ایدھی سینٹر پہنچا جہاں ان لوگوں سے ایمبولینس کو مڈ ایسٹ ہسپتال لے جانے کے لئے کہا گیا جہاں پہلے ہی ایک ایمبولینس روانہ ہو چکی تھی۔

گواہ نمبر24:۔ ڈاکٹر عبدالغفار جتوئی

یہ مڈایسٹ ہسپتال کے منتظم اعلیٰ ہیں۔ وہ 20 ستمبر1996ء کو نو بجکر 25 منٹ اور ساڑھے نو کے درمیان اپنے گھر میں موجود تھے۔ ان کے نوکر نے ان کو اطلاع دی کہ ہسپتال میں ایمرجنسی ہوگئی ہے۔ انہوں نے اپنے ہسپتال کے دوسرے عملے کو اطلاع دی کہ ہسپتال میں بہت بڑی ایمرجنسی ہوگئی ہے اور میر مرتضیٰ بھٹو کو بہت نازک حالت میں ہسپتال میں لایا جا رہا ہے۔ وہ رات پونے دس بجے ہسپتال پہنچے اور انتہائی نگہداشت کے شعبے گئے جو دوسری منزل پر ہے۔ وہاں انہوں نے میر مرتضیٰ بھٹو کو دیکھا ان کی حالت بہت خراب تھی۔ ان کے منہ اور ناک سے خون ابل رہا تھا۔ رات دس بجے کے قریب ان کے دل کی دھڑکنیں رکیں۔ دس بجکر 50 منٹ پر زبردست کوشش سے دل کی دھڑکنیں بحال کی گئیں۔ رات سوا گیارہ بجے کے قریب ان کو آپریشن تھیٹر لے جایا گیا جہاں ان کو دوسرا دل کا دورہ پڑا اور 11 بجکر 50 منٹ پر ان کی موت کی تصدیق کر دی گئی۔

گواہ نمبر25:۔ سید افتخار حیدر

یہ ایدھی تنظیم کے ملازم ہیں اور کھارادر ٹاور کے آخر میں واقع ایدھی ایمبولینس کنٹرول روم میں اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ حادثے والے دن ان کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ رات 9 بجکر پچاس منٹ پر ان کو پولیس کنٹرول سے پیغام موصول ہوا کہ 70 کلفٹن کے قریب فائرنگ ہو رہی ہے۔ وہاں 8 ایمبولینسوں کی ضرورت ہے۔ انہوں نے عملدرآمد کے لئے اس پیغام کو ایدھی سینٹر کے دوسرے مرکز میں بھیج دیا۔

گواہ نمبر26 :- عبدالساجد

یہ ایدھی تنظیم کے ملازم ہیں اور ٹاور میں سینٹرل کنٹرول کے دفتر میں تعینات ہیں۔ ان کی ڈیوٹی رات 8 بجے سے صبح تک ہوتی ہے۔ ان کے پاس ان تمام کالوں کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ اس میں وہ کالز بھی شامل ہیں جو اس رات پولیس کی جانب سے ایمبولینس کی فراہمی کے سلسلے میں وصول کی گئیں۔

گواہ نمبر27 :- عارف الٰہی

کراچی ساؤتھ کے 27-7-1994 سے 1-10-1996 تک ڈپٹی کمشنر رہے ہیں۔ رات 8 بجکر 55 منٹ پر اور نو بجے کے درمیان حادثے والے دن ان کو ڈی سی ساؤتھ کنٹرول کی جانب سے ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ کلفٹن میں فائرنگ ہو رہی ہے اور ایس ایچ او کلفٹن زخمی ہوگئے ہیں جن کو جناح ہسپتال لے جایا گیا ہے اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق پیغام کچھ یوں تھا: دو پولیس والے جن کا نام اوپر لیا گیا ہے وہ اور دوسرے لوگ زخمی ہوگئے' پولیس پارٹی وہاں میر مرتضیٰ بھٹو کو گرفتار کرنے گئی تھی' اس کے بعد انہوں نے اپنا لباس تبدیل کیا اور جائے وقوع کی جانب روانہ ہوئے' وہ اس وقت اپنی جیپ پر تھے۔ انہوں نے دو تلوار پر پولیس چوکی سے ایس ایس پی ساؤتھ کو لیا۔ وہ اور ایس ایس پی واجد درانی جائے حادثے پر پہنچے' اس وقت تقریباً" نو بجکر 25 منٹ ہوئے تھے۔ جب وہ وہاں پہنچے ایس ایس پی نے ان کو وہ جگہ دکھائی جہاں مقابلہ ہوا تھا۔ جب وہ حادثے کی جگہ پر پہنچے تو صورتحال اس وقت انتہائی چونکا دینے والی تھی۔ انہوں نے ایک لاش دیکھی جو ایک پجارو کے قریب پڑی تھی اور دوسری لاش چند قدم پر تھی۔ انہوں نے دو لاشیں سڑک کے دوسری طرف بھی دیکھیں وہاں بہت زیادہ خون بھی بکھرا ہوا تھا۔ وہ اس جگہ 2 اور 3 منٹ سے زیادہ نہیں رکے انہوں نے وہاں پولیس کی کوئی جیپ یا بکتر بند گاڑی نہیں دیکھی صرف اے ایس پی رائے طاہر اور ایس پی شکیب قریشی اور ایک دو پولیس والے موجود تھے۔

وہ وہاں سے مڈ ایسٹ ہسپتال چلے گئے جہاں وہ تمام وقت موجود رہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے انتقال کے بعد انہوں نے چیف سیکریٹری سے پوسٹ مارٹم کی تیاری کے لئے بات کی۔ ساڑھے نو بجے جب وہ مڈایسٹ ہسپتال پہنچے تو دیکھا کہ صرف ایک ڈاکٹر اور چند ارکان کا عملہ موجود ہے جو انتہائی نگہداشت کے شعبے میں میری مرتضیٰ بھٹو کو دیکھ رہے تھے۔ ساڑھے دس اور پونے گیارہ بجے کے درمیان ماہر امراض قلب' جنرل سرجن' انیستھیٹسٹ آئے اور خون کا انتظام کیا گیا۔

گواہ نمبر28 :- عبدالقادر

یہ بھی ایدھی آرگنائزیشن کا ملازم ہے اور ٹاور میں کنٹرول روم میں تعینات ہے۔ اس نے کنٹرول روم کا ریکارڈ پیش کیا۔

گواہ نمبر29 :- پرویز

ایدھی آرگنائزیشن کا ملازم ٹاور ایدھی آرگنائزیشن کے انفارمیشن بیورو میں تعینات ہے۔ اس نے پیغام کی وصولی اور ارسال کرنے کے بارے میں گواہی دی۔

گواہ نمبر30 :- سید ذیشان حسین کاظمی

وہ پولیس انسپکٹر ہے اور بحیثیت ایس ایچ او کھوکھراپار میں 12-9-96 سے تعینات ہوا۔ 10-11-96 کو اسے معطل کر دیا گیا۔ اس نے 16 اور 17 ستمبر 1996ء کی درمیانی شب علی سنارا کو گرفتار کیا تھا۔ ذیشان کاظمی کے مطابق علی سنارا "را" کا بڑا ایجنٹ ہے جس کی رہائش شانتی کنج بلڈنگ میں ہے جو کہ اس کے (ذیشان کاظمی) علاقے میں نہیں ہے۔ بہرحال اس نے علی سنارا کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے ایس ایس پی تنویر الحق سے اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس کے بیان کا ایک حصہ 1-12-96 کو ریکارڈ ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ پیش نہیں ہوا۔ وہ تیسری ایف آئی آر نمبر 443/96 میں ملزم ہے اور اسے مفرور قرار دیا جا چکا ہے۔

گواہ نمبر 31:- زاہد حسین، پریس فوٹوگرافر

20-09-96 کو وہ ہاکی کلب آف پاکستان کے نزدیک واقع اپنے دفتر میں تھا۔ اس کا نیوز ایڈیٹر قاضی علی 9 بجے شب سے چند منٹ پیشتر اس کے پاس آیا اور اسے مطلع کیا کہ کلفٹن کے نزدیک واقع ڈی آئی جی کا مکان فائرنگ کی زد میں ہے۔ لگ بھگ چھ منٹ میں وہ اسکوٹر پر دو تلوار چوک پہ پہنچا، وہ علاقہ پولیس کے گھیرے میں تھا۔ سڑک کے درمیان میں ایک مردہ جسم پڑا تھا۔ اس نے ایک تصویر بنائی جو کہ بطور دستاویز 31/1 پیش کی گئی ہے۔ اس نے 15 یا 16 فٹ کے فاصلے پر ایک گاڑی دیکھی، اس نے فلیش کے ذریعے ایک اور تصویر بنائی وہ تصویر بطور دستاویز 31/2 پیش کی۔ اس نے تیسری تصویر بطور دستاویز 31/3 پیش کی ہے۔ اس نے ایک اور تصویر بطور دستاویز 31/4 پیش کی۔ شاید یہ پہلی اور واحد تصاویر ہیں جو فائرنگ رکنے کے فوری بعد بنائی گئی ہیں۔

گواہ نمبر 32:- محمد عظیم

وہ بھی پریس فوٹوگرافر ہے۔ 9 بجے شب جب کہ وہ اپنے اخبار قومی اخبار کے دفتر میں تھا کہ کرائم رپورٹر فاروق مورائی نے اسے مطلع کیا کہ 70 کلفٹن میں فائرنگ ہوئی ہے۔ دونوں ایک موٹر سائیکل پہ 70 کلفٹن کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔ وہ کچھ نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ سرخ رنگ کی ایک موبائل پولیس چوکی سے گزری تو وہ یہ دیکھنے کے قابل ہوئے کہ موبائل میں ایک زخمی موجود تھا۔ انہوں نے موبائل کا تعاقب کیا اور مڈایسٹ ہسپتال پہنچے۔ اس اثناء میں جب کہ فاروق مورائی اپنی موٹر سائیکل پارک کر رہا تھا گواہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور اس نے میر مرتضیٰ کو انتہائی زخمی حالت میں دیکھا جن کے منہ سے خون جاری تھا۔ اس نے تصویر بنائی پھر اس نے 4 مزید تصاویر بنائیں۔ یہ تمام تصاویر مورخہ 21-9-96 کے قومی اخبار میں شائع ہوئیں۔ (32/1)

گواہ نمبر 33:- فاروق مورائی

وہ قومی اخبار میں اپنے دفتر میں تھا۔ 8 بجے یا ساڑھے آٹھ یا 9 بجے شب کا عمل تھا کہ کلب میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ایک خاتون نے اردو میں جو وہ وقت سے بول پا رہی تھی، مطلع کیا کہ کلفٹن میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ اس نے فوٹوگرافر محمد عظیم کو بتایا اور کلفٹن پر دو تلوار چوک پہنچا۔ وہاں تاریکی تھی لیکن کلفٹن کی جانب کچھ روشنی تھی۔ عظیم (گواہ نمبر 32) اس کے ہمراہ تھا اور اس نے مڈایسٹ ہسپتال اور جناح ہسپتال میں تصاویر بنالی تھیں۔

گواہ نمبر 34:- محمد فاروق

وہ ورلڈ وائڈ ٹیلی وژن نیوز جو کہ ڈبلیو ٹی این کے طور پر معروف ہے کا کیمرہ مین ہے۔ پونے نو اور نو بجے شب کے درمیان وہ پریس کلب جا چکا تھا۔ جہاں اسے اطلاع ملی کہ 70 کلفٹن پر فائرنگ ہو رہی ہے۔ اس نے ایک چھوٹا لیکن بیش قیمت وڈیو کیمرہ جس کی مالیت 1,60,000 روپے ہے لیا اور موٹر سائیکل پہ کلفٹن گیا اور اپنی موٹر سائیکل کو ایک ایسی جگہ پارک کرنے کا بندوبست کیا جو جائے وقوعہ سے بمشکل 50 گز دور تھی۔ وہاں مکمل تاریکی تھی لیکن موٹر بائیک کی روشنی میں وہ اس جسم کو دیکھنے کے قابل تھا جو زمین پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے دو شاٹس لئے جن میں ہر ایک پہ تین سیکنڈ لگے۔ اس کے بیان کے مطابق پولیس نے اس سے کیمرہ چھین لیا۔ تقریباً 3 ساڑھے تین بجے صبح اس کے مالک نواب کیلی کو کلفٹن پولیس اسٹیشن سے کیمرا واپس ملا لیکن اس میں سے وڈیو کیسٹ نکال لی گئی تھی۔ اپنے دفتر سے دوسرا کیمرا لے کر وہ مڈایسٹ ہسپتال گیا جہاں اس نے متعدد شاٹس بنائے۔

گواہ نمبر 35:- شاہد ندیم

وہ ڈبلیو ٹی این کا کیمرا مین ہے۔ 20-9-96 کی شب اس نے کلفٹن پولیس

اسٹیشن کے احاطے میں تین تباہ شدہ گاڑیوں کے شاٹس لئے۔ وہ 96-9-20 کو 4 بجے شام 70 کلفٹن میں میر مرتضیٰ کی پریس کانفرنس میں بھی موجود تھا۔

گواہ نمبر 36:- محمد اکرم

وہ ڈسٹرکٹ ساؤتھ کراچی میں ایس ڈی ایم پریڈی تھا۔ ساڑھے دس بجے شب اس کو ٹیلی فون پر ڈی سی کنٹرول روم سے پیغام ملا کہ ڈسٹرکٹ ساؤتھ کے تمام سات ایس ڈی ایم مڈایسٹ ہسپتال پہنچ جائیں۔ جب گیارہ بجے شب وہ مڈایسٹ ہسپتال پہنچا تو اس کے بشمول چھ ایس ڈی ایم وہاں موجود تھے ایس ڈی ایم آرام باغ عبدالوہاب میمن وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ مڈایسٹ ہسپتال میں ڈی سی عارف الٰہی کی ہدایات کا منتظر رہا۔ تقریباً" ایک بجے شب اسے ہدایت ملی کہ وہ عاشق جتوئی کے اہل خانہ کے ہمراہ جناح ہسپتال کی جاکر اس کی نعش کے بارے میں معلوم کرے۔ وہ جناح ہسپتال پہنچے لیکن وہاں کوئی نعش نہیں تھی۔ وہ واپس آگئے اور تقریباً" پونے تین بجے صبح دوبارہ وہاں گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد تین ایمبولینسوں میں وہاں نعشیں لائی گئیں۔

گواہ نمبر 37:- محمد علی شاہ

اس وقت ایس ڈی ایم صدر تھے۔ رات 9 بجے انہیں ڈی سی جنوبی کی جانب سے وائرلیس پیغام موصول ہوا کہ کلفٹن پر ہنگامی صورتحال ہے اور کیونکہ جناح ہسپتال ان کے دائرہ اختیار میں آتا ہے اس لئے وہ فوراً" جناح ہسپتال پہنچ کر زخمیوں کے لئے امدادی کارروائی کا انتظام کریں۔ وہ 9 بجکر 15 یا 20 منٹ تک جناح ہسپتال پہنچ گئے اور تقریباً" 9 بجکر 25 منٹ پر پہلے زخمی محمد بچل کو ہسپتال لایا گیا۔ رات 10 بجے پولیس موبائل میں مزید زخمیوں کو لایا گیا جو ڈاکٹر مظہر میمن اور اسمٰعیل تھے۔ رات 10 بجکر 15 منٹ پر انہیں ڈی سی ساؤتھ عارف الٰہی کی جانب سے ایک اور پیغام موصول ہوا کہ ای این ٹی میڈیکل آفیسر اور اینتھیسیسٹ کو لیکر آئیں۔ یہ دو ڈاکٹر مڈایسٹ ہسپتال سے ایس ڈی ایم سول لائنز طارق نیاز لے کر گئے۔

گواہ نمبر 38:- عبدالوہاب میمن

ایس ڈی ایم آرام باغ ہیں۔ حادثے کے روز وہ لیاری میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے بعد تقریباً" ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان گھر پہنچے تو ان کی بہن نے بتایا کہ ڈی سی ساؤتھ کا پیغام تھا کہ ایس ڈی ایم آرام باغ فوراً" مڈایسٹ ہسپتال پہنچ جائیں۔ وہ 1 بجکر 30 منٹ یا دو بجے تک ہسپتال پہنچ گئے۔ انہیں کسی قسم کی ڈیوٹی نہیں دی گئی۔ تقریباً" صبح 4 بجے کے قریب وہ واپس گھر آگئے۔

گواہ نمبر 39:- آغا ظہیرالدین

یہ ایس ڈی ایم عیدگاہ کراچی تھے۔ رات 9 بجکر 30 منٹ پر انہیں پیغام موصول ہوا کہ اے ایس پی صدر اور ایس ایچ او کلفٹن، 70 کلفٹن کے قریب فائرنگ میں زخمی ہوگئے۔ 9 بجکر 45 منٹ پر ایک اور پیغام موصول ہوا کہ وہ فوراً" مڈایسٹ ہسپتال پہنچ جائیں۔ وہ وہاں پہنچے تو ڈی سی نے انہیں کہا کہ چار پوائنٹ خون کا انتظام کریں۔ فوری طور پر انتظام کر کے ڈاکٹر غفار جتوئی کو دے دیا گیا۔ وہ تقریباً" 3 بجکر 30 منٹ تک ہسپتال میں رہے۔ جب تمام ایس ڈی ایم کو ڈی سی ساؤتھ نے کہا کہ وہ گھر چلے جائیں اور اگلی صبح میر مرتضیٰ کی لاش کو لاڑکانہ لے جانے کے انتظامات کے لئے دوبارہ آجائیں تو ہم گھر چلے گئے۔ ایس ڈی ایم عیدگاہ کے مطابق وہ علی ستارا کی گرفتاری سے آگاہ نہیں تھے۔

گواہ نمبر 40:- سید نیاز حسین شاہ

وہ ایس ڈی ایم سٹی ڈسٹرکٹ ساؤتھ کراچی ہیں۔ 96-09-20 رات 9 بجکر 45 منٹ پر انہیں وائرلیس پر پیغام موصول ہوا کہ مڈایسٹ ہسپتال میں ڈی سی ساؤتھ کو فوراً" رپورٹ کریں۔ وہ وہاں پہنچے تو ڈی سی ساؤتھ نے کہا کہ ایک گھنٹے کے اندر آئی

سی یو کے باہر ہاٹ لائن ٹیلی فون کا انتظام کریں۔ ہاٹ لائن ٹیلی فون کا رابطہ مڈایسٹ ہسپتال کے برآمدے سے آئی سی یو تک تھا۔ اس کے علاوہ انہیں اس رات کوئی اور ذمہ داری نہیں دی گئی۔ اگلے دن ڈی سی جنوبی نے کہا کہ میر مرتضٰی بھٹو کی لاش کو لاڑکانہ لے جانے کے لئے ہیلی کاپٹر کا انتظام کیا جائے جو فوری طور پر کر دیا گیا۔ اگلے دن وہ امن و امان کی خراب صورتحال کو کنٹرول کرتے رہے۔

گواہ نمبر41:۔ سید اعجاز حسین

وہ 96-9-20 کو مڈایسٹ ہسپتال میں آر ایم او تھے۔ انہوں نے ایم بی بی ایس کا امتحان 1990ء میں پاس کیا اور 1991ء میں مڈایسٹ ہسپتال سے منسلک ہوگئے۔ رات 9 بجکر 20 منٹ پر انہوں نے مڈایسٹ ہسپتال کے گراؤنڈ فلور پر لفٹ کے قریب میر مرتضٰی بھٹو کو اسٹریچر پر دیکھا۔ ان کی حالت بہت تشویشناک تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہے تھے اور ان کے منہ' ناک اور گردن کے بائیں حصے سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ان کے مطابق مرتضٰی بھٹو ہوش میں نہیں تھے۔ وہ میر مرتضٰی بھٹو کو لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر آئی سی یو میں لے گئے۔ وہ اس وقت واحد ڈاکٹر تھے جو آئی سی یو میں نگہداشت کر رہے تھے۔ انہوں نے ہدایت دی کہ انیستھیسٹ ہسپتال سے منسلک سرجن اور ڈاکٹر غفار جتوئی کو بھی بلایا جائے۔ ہسپتال میں موجود آئی سی یو کے تربیت یافتہ عملے اور ڈاکٹر نے میر مرتضٰی کو طبی امداد دی۔ ان کے مطابق تقریباً" 10 بجے سرجن انیستھیسٹ اور ڈاکٹر غفار جتوئی آئی سی یو پہنچ گئے۔ ان کے مطابق وہ مڈایسٹ ہسپتال میں اگلی صبح 6 بجکر 15 منٹ تک رہے اور جب تک میر مرتضٰی بھٹو کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا گیا تھا۔

گواہ نمبر42:۔ ابراہیم سومرا

مڈایسٹ ہسپتال میں جنرل سرجن ہیں۔ انہوں نے ایم بی بی ایس کا امتحان 1957ء میں پاس کیا۔ تقریباً" ساڑھے نو اور پونے دس کے درمیان انہیں بلایا گیا اور

تقریباً" رات نو بجکر 50 منٹ پر وہ آئی سی یو میں موجود تھے۔ جہاں انہوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر غفار جتوئی' آر ایم او اعجاز اور دیگر طبی عملہ میر مرتضٰی بھٹو کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہوگئے۔ جب انہوں نے کارڈیک مانیٹر کو دیکھا تو جان گئے کہ میر مرتضٰی کا دل نہیں دھڑک رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد دل میں دوبارہ جان آگئی' پھر انہیں آپریشن تھیٹر منتقل کر دیا گیا تاکہ خون بہنے سے روکا جائے۔ اس وقت دو اور ڈاکٹر پہنچ گئے اور تھوڑی دیر بعد مزید دو ڈاکٹر آگئے لیکن میر مرتضٰی کا دل آپریشن تھیٹر میں دوبارہ بند ہوگیا۔ دل کو حرکت میں لانے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں اور 11 بجکر 55 منٹ پر ان کی موت کی تصدیق کر دی گئی۔ ڈاکٹر کے مطابق میر مرتضٰی کی حالت ایسی تھی کہ وہ بچ نہیں سکتے تھے۔

گواہ نمبر43:۔ اصغر جتوئی

ڈاکٹر غفار جتوئی کے ساتھ خاص مددگار کے طور پر ملازم ہیں اور ہسپتال کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ انہوں نے 8 بجکر 35 اور 40 منٹ پر فائرنگ کی آواز سنی جو بہت تیز تھی اور کم از کم دس پندرہ منٹ تک ہوتی رہی۔ 9 بجکر 20 منٹ پر انہوں نے آر ایم او ڈاکٹر اعجاز کو گراؤنڈ فلور پر لفٹ کے قریب ایک مریض کے ساتھ دیکھا جس کے ناک' منہ اور گردن کے بائیں جانب سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ مریض میر مرتضٰی بھٹو تھے۔ انہیں اوپر آئی سی یو میں لے جایا گیا اور طبی عملہ ان کو دیکھنے لگا۔ گواہ کے بارے میں جب بعد میں تحقیق کی گئی تو وہ عاشق جتوئی کے رشتے داروں میں سے تھے۔

گواہ نمبر44 طارق نیاز:۔

یہ ایس ڈی ایم سول لائنز کراچی جنوبی تھے۔ انہیں 9 بجے وائرلیس پر پیغام موصول ہوا کہ 70 کلفٹن کے قریب فائرنگ ہو رہی ہے۔ جس میں کلفٹن پولیس

اسٹیشن کے ایس ایچ او زخمی ہوگئے ہیں۔ یہ علاقہ ان کی حدود میں آتا تھا۔ انہوں نے ڈرائیور کو لیا اور تقریباً 9 بجکر 30 منٹ پر دو تلوار کی چورنگی پر پہنچ گئے۔ تقریباً 11 بجے انہیں جائے حادثہ پر پہنچنے کو کہا گیا۔ وہ شاہراہ ایران سے ہوتے ہوئے کلفٹن پولیس اسٹیشن گئے۔ اس وقت اندھیرا تھا مگر انہوں نے تین پرائیویٹ گاڑیاں دیکھیں لیکن وہاں کوئی لاش موجود نہیں تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں بہت سارا خون پڑا ہوا تھا' کوئی لاش بھی کلفٹن پولیس اسٹیشن نہیں پہنچی تھی۔ وہ واپس مڈایسٹ ہسپتال آئے۔ اس کے علاوہ کوئی خاص کام انہوں نے نہیں کیا۔

گواہ نمبر 45 نجیب احمد :-

وہ جنگ اخبار میں کرائم رپورٹر ہیں۔ وہ پریس کلب میں تھے۔ تقریباً 9 بجے ٹیلی فون کال موصول ہوئی کہ 70 کلفٹن کے قریب فائرنگ ہو رہی ہے۔ وہ موٹر بائیک پر جائے حادثہ پر پہنچے۔ انہوں نے محل وقوع دیکھا اور اس کی رپورٹ بنائی جو جنگ اخبار میں 21-09-96 کو شائع ہوئی۔

گواہ نمبر 46 سید علی مرتضیٰ :-

وہ ایس ڈی ایم گارڈن تھے۔ ان کے مطابق 10 بجے وائرلیس پر پیغام موصول ہونے کے بعد وہ مڈایسٹ ہسپتال پہنچ گئے۔ انہوں نے ڈی سی جنوبی کو آپریشن تھیٹر کے اندر دیکھا جو ٹیلی فون کی براہ راست لائن چاہ رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں کوئی اور ذمہ داری نہیں دی گئی۔

گواہ نمبر 47 سعید الدین خان بنگش :-

فرنچ نیوز ایجنسی میں پریس فوٹوگرافر ہیں۔ وہ پریس کلب میں تھے۔ جب 9 اور سوا نو بجے کے قریب نجیب (جو ان کے ساتھی ہیں اور جنگ سے وابستہ ہیں) کو فون

پر کلفٹن میں فائرنگ سے متعلق اطلاع موصول ہوئی۔ وہ موٹر سائیکل پر اپنے دوسرے اخباری ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہوئے اور جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ اس وقت اندھیرا تھا کچھ گاڑیاں سڑک پر موجود تھیں جن کی عقبی بتیاں جل رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ پہلی گاڑی سے پہلے سڑک پر ایک لاش پڑی تھی اور ایک لاش گاڑی کے سامنے پڑی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی جیپ کے آگے زمین پر بیٹھا ہے۔ پولیس نے انہیں روکا۔ انہوں نے جیب اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کی تصویر کھینچ لی۔ انہوں نے ایک لاش چھوٹی گاڑی کی پچھلی طرف دیکھی۔ ان کا قیمتی کیمرہ پولیس نے چھین لیا جو ابھی تک واپس نہیں ملا۔ وہ ہسپتال بھی گئے جہاں انہوں نے چند تصاویر بنائیں۔ انہوں نے جنازے کے لمحات کی بھی تصاویر بنائیں۔

گواہ نمبر 48 کامران منصور :-

یہ "دی نیوز" کے کرائم رپورٹر ہیں۔ رات 8 بجکر 40 منٹ پر نامعلوم ٹیلی فون کال ان کے آفس میں موصول ہوئی جس سے اطلاع ملی کہ کلفٹن کے علاقے میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ انہوں نے کلفٹن کے پی ایس کو حقائق جاننے کے لئے فون کیا۔ اس کے بعد وہ جائے حادثہ پر پہنچے۔ ٹریبونل کے سامنے اپنا بیان پیش کرنے سے قبل انہوں نے حادثے کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے اپنے اخبار کے لئے رپورٹ تیار کی تھی۔ 21-9-96 کے اخبار "دی نیوز" میں یہ تفصیلات شائع نہیں ہوئیں۔

گواہ نمبر 49 دوست محمد جتوئی :-

یہ ابتداء میں مڈایسٹ ہسپتال میں گیٹ کیپر کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن اب ٹیکنیشن کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ 9 بج کر 20 منٹ پر پولیس موبائل ہسپتال

کے دروازے سے نمودار ہوئی۔ ایک آفیسر اور کانسٹیبل نیچے اترے اور استقبالیہ پر گئے اور اسٹریچر طلب کیا۔ ان کو اسٹریچر دیا گیا جو وہ موبائل کے پچھلی طرف لے گئے۔ پولیس نے ایک آدمی کو اسٹریچر پر منتقل کیا اور اسٹریچر کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ جب تک ہسپتال کا شیشے والا دروازہ نہیں آگیا پولیس افسر کے ساتھ اسٹریچر دھکیلتے ہوئے لے گئے اور واپس موبائل کی طرف آگئے۔ اس نے شناخت کیا کہ اسٹریچر پر موجود مریض مرتضیٰ بھٹو ہیں۔ ان کے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ وہ ہل رہے تھے لیکن ہوش میں نہیں تھے۔ اس نے اسٹریچر کو آئی سی یو لے جانے میں' جو کہ دوسری منزل پر موجود ہے' مدد دی۔

گواہ نمبر 50 ڈاکٹر کلیم شیخ:۔

یہ جناح ہسپتال میں سینئر میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے تعینات ہیں۔ رات 9 بجے ان کو ٹیلی فون پر ڈی سی جنوبی کی جانب سے پیغام موصول ہوا کہ یہاں ایمرجنسی ہوگئی ہے اور کچھ لوگوں کے زخمی ہونے کی اطلاع ہے۔ نو بجکر 25 منٹ پر ایدھی ڈرائیور عثمان ایک زخمی کو اپنی ایمبولینس میں لے کر آیا' اس نے زخمی کو شعبہ حادثات کے ڈریسنگ روم میں پہنچایا۔ زخمی ہوش میں نہیں تھا۔ ایدھی ڈرائیور عثمان کے علاوہ زخمی کے ساتھ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ ایدھی ڈرائیور کو یہ نہیں معلوم تھا کہ زخمی کون ہے۔ اس نے زخمی کی جیب سے ایک پرس نکالا' اس کی شناخت کے لئے پرس میں شناختی کارڈ اور چند سو روپے کے نوٹ موجود تھے۔ شناختی کارڈ پر موجود تصویر سے زخمی کو شناخت کیا گیا۔ انہوں نے شناختی کارڈ نمبر 440-93-070680 عدالت میں پیش کیا۔ بطور گواہ نمبر 51/2 یہ شناختی کارڈ محمد بچل کا تھا۔ انہوں نے تیار شدہ میڈیکل سرٹیفکیٹ نمبر 04813 پیش کیا۔ بطور گواہ نمبر 51/2 کے اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ایک دن کے بعد زخمی مرگیا اور دوسرے آٹھ زخمیوں کو بھی یہیں لایا گیا تھا۔

گواہ نمبر 51 ڈاکٹر شمس الدین شیخ:۔

یہ جناح ہسپتال میں میڈیکو لیگل آفیسر ہیں۔ 96-09-21 کو وہ سو رہے تھے تو

تقریباً" رات کو اڑھائی پونے تین بجے کے درمیان ان کو ڈاکٹر عرفان قریشی جو کہ جے پی ایم سی میں ایڈیشنل پولیس سرجن ہیں کی ٹیلی فون کال موصول ہوئی جو مڈایسٹ ہسپتال سے بات کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں ایمرجنسی ہوگئی ہے اور وہ جناح ہسپتال جا رہے ہیں۔ اس وقت تک ان کو حادثے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ان کو یہ اطلاع بھی ملی کہ کچھ لاشیں جناح ہسپتال لائی جا رہی ہیں۔ وہ انتہائی تیزی کے ساتھ نکلے۔ وہ صبح سوا تین بجے جناح ہسپتال پہنچے۔ وہاں ان کو اطلاع ملی کہ ابھی تک کوئی لاش مردہ خانے میں نہیں پہنچی ہے۔ ساڑھے تین بجے مردہ خانے کے انچارج نے اطلاع دی کہ 6 لاشیں پولیس والے یہاں دے کر گئے ہیں۔ جس میں سے ایک عاشق حسین جتوئی کی بھی تھی۔ ڈاکٹر زاہد جتوئی جو عاشق جتوئی کے بھائی ہیں انہوں نے اپنے بھائی کی لاش لینے کی درخواست کی صبح پونے چار بجے وہ مردہ خانے میں گئے وہاں لائٹ نہیں تھی جس کی وجہ سے ماچس کی مدد سے ڈاکٹر زاہد جتوئی نے عاشق جتوئی کی لاش کی شناخت کی۔

انہوں نے ہسپتال میں ایم آئی روم میں پوسٹ مارٹم کرنے کا فیصلہ کیا۔ عاشق جتوئی کی لاش ایمبولینس میں مردہ خانے سے ایم آئی روم منتقل کی گئی۔ اس وقت بھی لاش کی گردن کے بائیں طرف اور بائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ انہوں نے 4 بجے پوسٹ مارٹم شروع کیا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ڈاکٹر زاہد جتوئی کے حوالے کر دی گئی۔ انہوں نے فارم پر تیار کئے گئے نوٹس کی بنیاد پر پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار کی۔ انہوں نے عاشق جتوئی کی لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نمبر 578/1996 بطور 52/1 کی کاپی پیش کی۔

گواہ نمبر 53' ڈاکٹر اسماعیل راجپر:۔

وہ جے پی ایم سی میں میڈیکو لیگل افسر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ وہ اپنے دفتر اس دن 10 بجے رات سے چند منٹ قبل پہنچے تھے۔ 10 بجنے کے 5 یا 7 منٹ بعد انہوں نے شعبہ ہنگامی طبی امداد سے ایک فون کال وصول کی کہ دو زخمی افراد لائے گئے ہیں۔ وہ پیدل دو یا تین منٹ میں وہاں پہنچے اور دو زخمیوں کو دیکھا۔ انہوں نے اسماعیل

کا معائنہ کیا۔ گواہ نے زخمی اسماعیل سے متعلق میڈیکو لیگل سرٹیفکیٹ نمبر 0481/96 کی فوٹو کاپی پیش کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ زخمی ایاز سے متعلق جس کا بھی انہوں نے معائنہ کیا تھا کا سرٹیفکیٹ نمبر 4817 ہے۔ سرٹیفکیٹ نمبر 4818 اصغر علی سے متعلق تھا اور اس پر میرے دستخط ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہیں' ڈاکٹر عرفان قریشی اور ڈاکٹر ایاز کو مڈایسٹ ہسپتال بلایا گیا اور وہ وہاں رات 12 بجکر 55 منٹ پر پہنچ گئے تھے۔ مڈایسٹ ہسپتال میں ڈاکٹر عرفان قریشی سے کہا گیا کہ وہ میر مرتضیٰ بھٹو کی لاش کا معائنہ کریں۔ وہ آپریشن تھیٹر گئے اور لاش کا معائنہ کیا۔ انہوں نے صبح 6 بجکر 15 منٹ پر مرتضیٰ بھٹو کی لاش کا پوسٹ مارٹم شروع کیا۔ آپریشن تھیٹر میں اس وقت پولیس سرجن نظام الدین میمن بھی موجود تھے' انہوں نے مرتضیٰ بھٹو کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نمبر 577/96 بطور ایکس 53/8 پیش کی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق انہوں نے مرتضیٰ بھٹو کی لاش میں 8 زخم نوٹ کئے۔

گواہ نمبر 54 ڈاکٹر قرار عباسی :-

وہ سول ہسپتال میں میڈیکو لیگل افسر تھے۔ صبح ساڑھے تین بجے انہیں گھر پر اپنے ساتھی ایم ای لاو احمد علی میمن کی طرف سے فون کال ملی کہ جناح ہسپتال کے مردہ خانے میں اس وقت 6 لاشیں لائی گئی ہیں۔ وہ اپنے دفتر سول ہسپتال گئے' جہاں ڈاکٹر احمد علی میمن موجود تھے۔ صبح 5 بجے انہیں پیغام ملا کہ جناح ہسپتال پہنچ جائیں۔ دونوں روانہ ہوئے اور صبح 6 بجے وہاں پہنچے۔ ایک سینئر ایم ایل او ڈاکٹر شمس الدین شیخ وہاں موجود تھے۔ انہیں علم ہوا کہ مردہ خانے میں 6 لاشیں ہیں۔ ان میں سے ایک کا پوسمارٹم ہو چکا تھا۔ 7 یا سوا سات بجے پولیس کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور صبح ساڑھے سات بجے انہوں نے ایک لاش کا پوسٹ مارٹم شروع کیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں پوسٹ مارٹم رپورٹ نمبر 579/96 جاری کی۔ انہوں نے 28 ستمبر 1996ء کو انسپکٹر حق نواز سیال کا بھی پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ انہوں نے حق نواز سیال کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نمبر 411/96 بطور ایکس 55/5 پیش کی۔

گواہ نمبر 56 ڈاکٹر علی بروہی :-

وہ جے پی ایم سی میں ایم ای لاو تھے۔ 21 ستمبر 1996ء کو وہ سہ پہر 3 بجے ڈیوٹی پر تھے کہ اس وقت انسپکٹر حق نواز سیال جو تھانہ کلفٹن کے ایس ایچ او تھے' آئے اور بتایا کہ وہ 70 کلفٹن کے نزدیک فائرنگ میں زخمی ہوگئے تھے' اس لئے ان کے زخم کا معائنہ کیا جائے۔ انہوں نے انسپکٹر سیال کا معائنہ کیا۔ انہوں نے میڈیکو لیگل سرٹیفکیٹ نمبر 04820/96 کی فوٹو کاپی پیش کی۔

گواہ نمبر 57 ڈاکٹر دلیپ کھتری :-

21 ستمبر 1996ء کو وہ جے پی ایم سی میں ایم ایل او تھے۔ صبح 6 بجے انہیں فون کال ملی کہ 6 لاشیں جے پی ایم سی میں لائی گئی ہیں اور وہ وہاں پہنچ جائیں۔ وہ صبح سات بجے کے قریب مردہ خانے پہنچ گئے اور دیکھا کہ مردہ خانے کے اندر 6 لاشیں رکھی ہیں۔ ڈاکٹر احمد علی اور ڈاکٹر قرار موجود تھے۔ انہوں نے دو لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا ایک لاش کا پوسٹ مارٹم صبح 8 بجے شروع کیا اور 9 بجے تک اسے مکمل کرلیا۔ دوسری لاش کا پوسٹ مارٹم 9 بجے شروع کیا اور تقریباً" 9 بجکر 40 منٹ تک اسے مکمل کرلیا گیا۔ لاش نمبر ایک کسی نامعلوم شخص کی تھی لیکن لاش نمبر 2 سجاد حیدر کی بتائی گئی۔ چنانچہ انہوں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کا نام سجاد حیدر ظاہر کیا۔ انہوں نے لاش نمبر 1 کی پوسٹ مارٹم رپورٹ 581/96 تاریخ 21-09-96 کی فوٹو کاپی پیش کی۔ انہوں نے سجاد حیدر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نمبر 582/96 کی فوٹو کاپی بھی پیش کی۔

گواہ نمبر 58' ڈاکٹر احمد علی میمن :-

یہ سول ہسپتال میں ایم ایل او تھے۔ انہیں سول ہسپتال سے جے پی ایم سی طلب کیا گیا۔ وہ 21 ستمبر کو صبح ساڑھے چھ بجے وہاں پہنچے۔ انہوں نے صبح 8 بجے ایک نامعلوم شخص کی لاش کا پوسٹ مارٹم شروع کیا اور صبح ساڑھے 9 بجے اسے مکمل کیا۔ انہوں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ نمبر 580/96 کی فوٹو کاپی پیش کی۔

گواہ نمبر 59' ڈاکٹر عرفان اللہ قریشی:-

وہ جے پی ایم سی میں ایڈیشنل پولیس سرجن تھے۔ جب وہ رات ساڑھے گیارہ بجے اپنے گھر واپس پہنچے تو انہیں پیغام ملا کہ ایمرجنسی میں رابطہ کریں۔ انہوں نے میڈیکو لیگل سیکشن میں فون کیا جہاں سے انہیں علم ہوا کہ ہسپتال میں زخمی لائے جا رہے ہیں۔ اس لیے فوری طور پر ہسپتال پہنچ جائیں۔ وہ فورا" جے پی ایم سی پہنچے اور میڈیکو لیگل سیکشن گئے جہاں انہیں بتایا گیا کہ فائرنگ کے 4 زخمی پہلے ہی وہاں پہنچے ہوئے ہیں انہیں یہ علم ہوا کہ بچل کی حالت نازک ہے۔ تقریبا" سوا بارہ بجے انہیں ڈی سی ساؤتھ کی طرف سے ایک فون کال ملی کہ میر مرتضیٰ بھٹو مڈایسٹ ہسپتال میں انتقال کر گئے ہیں۔انہیں کہا گیا کہ وہ مڈایسٹ ہسپتال پہنچیں۔ وہ ڈاکٹر اسماعیل راجیر اور ڈاکٹر ایاز کے ساتھ مڈایسٹ ہسپتال گئے۔ میر مرتضیٰ کا پوسٹ مارٹم صبح 6 بجے شروع ہوا۔

گواہ نمبر' 60 ڈاکٹر غلام سرور چنا:-

وہ جے پی ایم ایل او تھے۔ تھانہ صدر کے انسپکٹر ریاض نے 21 ستمبر 1996کو ایس ڈی پی او صدر کا ایک خط دیا کہ جناح ہسپتال کے ایم ایل او اے ایس پی صدر شاہد حیات کا معائنہ کرنے آغا خان ہسپتال جائیں گے۔ شاہد حیات 20 ستمبر 1996 کو فائرنگ میں زخمی ہو گئے تھے اور انہیں ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ موبائل میں آغا خان ہسپتال گئے۔ اے ایس پی شاہد حیات بستر پر لیٹے تھے۔ انسپکٹر ریاض نے بتایا کہ یہ زخمی شاہد حیات ہیں انکی بائیں ران میں زخم کا معائنہ کرنے کے بعد وہ اسی موبائل میں واپس آگئے۔ انہوں نے میڈیکو لیگل سرٹیفکیٹ کی فوٹو کاپی پیش کی۔

گواہ نمبر' 61 انور مسیح' مردہ خانے کا اٹینڈنٹ:-

اسکے مطابق صبح ساڑھے تین اور پونے چار کے درمیان 6 لاشیں 4 یا 5 ایدھی ایمبولینسوں میں مردہ خانے لائی گئیں۔ ٹارچوں کی روشنی میں لاشیں ایمبولنس سے

مردہ خانے کے ہال میں منتقل کی گئیں۔

گواہ نمبر' ڈاکٹر کیپٹن نظام الدین:-

یہ پولیس سرجن کراچی تھے۔ انکے مطابق 96-10-30 کو برطانوی ٹیم کے دو ارکان انکے پاس آئے۔ ڈی آئی جی کرائمز مسعود احمد پراچہ نے ان سے کہا کہ ٹیم کے ارکان سے تعاون کیا جائے انہوں نے خط کی فوٹو کاپی پیش کی۔ انہوں نے محکمہ صحت کا بھی ایک خط پیش کیا' انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جہاں تک میر مرتضیٰ بھٹو کے واقعے کا تعلق ہے انہیں صبح ساڑھے تین بجے سول ہسپتال سے ایم ایل او ڈاکٹر احمد علی کی طرف سے ایک فون کال ملی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کی متعدد لاشیں سول ہسپتال آسکتی ہیں۔ وہ صبح سوا چار بجے مڈایسٹ ہسپتال گئے۔ جب ڈاکٹر اسماعیل راجیر' ڈاکٹر ایاز اور ایڈیشنل پولیس سرجن ڈاکٹر عرفان قریشی میر مرتضیٰ بھٹو کا پوسٹمارٹم کر رہے تھے تو وہ اسوقت آپریشن تھیٹر میں تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ پر ایم ایل اوز اور ڈاکٹر عرفان قریشی نے دستخط کئے۔جب انہیں یہ علم ہوا کہ چند لاشیں جناح ہسپتال کے مردہ خانے میں لائی گئی ہیں تو وہ جے ایم سی میں گئے جہاں انہیں بتایا گیا کہ عاشق جتوئی کا پوسٹ مارٹم پہلے ہی ہو چکا ہے۔ وہ ان تین میڈیکل بورڈز کے رکن تھے جو (1) انسپکٹر سیال (جب وہ زندہ تھے' کے بائیں پیر کے زخم (2) اے ایس پی شاہد حیات کی بائیں ران کے زخم (3) اور انسپکٹر سیال کی لاش کا معائنہ کرنے کیلئے قائم کئے گئے تھے۔

گواہ نمبر' 63 عثمان غنی میمن:-

وہ پی ٹی وی کے سینئر نیوز ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے پی ٹی وی کے ان افراد کے نام پیش کئے جنھوں نے واقعے کی کوریج کی۔ ان میں اقبال جمیل نیوز رپورٹر' پرویز عطاء اللہ کیمرہ مین' عامر مختار کیمرہ مین' محمد اصغر کیمرہ مین اور مشکور احمد نجم پی ٹی وی کراچی کے کرنٹ افیئرز سیکشن کے انچارج شامل ہیں۔ انہوں نے وڈیو ٹیپ بھی پیش کی جمع

میں پی ٹی وی کے عملے کی طرف سے تیار کردہ پوری کوریج' واقعے سے متعلق علاقے اور دوسری چیزیں شامل تھیں۔ اس میں پی ٹی وی کا نیوز بلیٹن بھی تھا جسے ریکارڈ کیا گیا تھا۔گواہ کے مطابق واقعے سے متعلق خبر کیلئے پی ٹی وی کراچی نے اے پی پی' ریڈیو پاکستان' پی ٹی وی کے نیوز رپورٹرز' پولیس کے پریس ریلیز' شائع شدہ پیغامات کی فوٹو کاپی پیش کی جسکے ذریعے واقعے سے متعلق خبر تیار کی گئی۔

گواہ نمبر' 64 ڈاکٹر عبدالکریم صدیقی:-

پروفیسر آف سرجری اور سول ہسپتال کراچی کے شعبہ سرجری کے سربراہ ہیں۔ انہوں نے 1960 میں حیدر آباد سے میڈیسن میں گریجویشن کیا اور 1967ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ان کا بیان 96-12-29 اور 97-1-5 کو ٹریبونل کے سامنے ریکارڈ کیا گیا۔ اس وقت وہ ڈی ایم سی کراچی میں پروفیسر آف سرجری تھے۔ ایک خصوصی میڈیکل بورڈ انسپکٹر حق نواز سیال کے بائیں پیر کے زخم کا معائنہ کرنے کیلئے قائم کیا گیا جسکے سربراہ گواہ نمبر 74 ڈی ایم سی کراچی کے پرنسپل اور پروفیسر آف میڈ-سن ڈاکٹر محمد شفیع قریشی' گواہ نمبر 64 عبدالکریم صدیقی (رکن) گواہ نمبر81 ڈی ایم سی کراچی کے پروفیسر آف ریڈیالوجی ڈاکٹر متین اے خان (رکن) گواہ نمبر71 فارسینک میڈ-سن شعبے کے سربراہ اور پروفیسرڈاکٹر طارق مرزا (رکن) گواہ نمبر62 پولیس سرجن کراچی ڈاکٹر نظام الدین میمن (رکن) گواہ نمبر 80 سروسز ہسپتال کراچی کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اور سول سرجن کراچی ڈاکٹر محمد عمر بلوچ (رکن) شامل تھے۔

رپورٹ ایکس 62/3 بتاریخ 96-12-26 (صفحہ 82 باب 13) بورڈ نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ

''زخم کی نوعیت اور سمت جو کہ جسم کا کم خطرناک اور غیر اہم حصہ ہے' بائیں جوتے اور پینٹ کی موجودگی اور ریڈیو لوجیکل رپورٹ کے نتیجے میں بورڈ کے ارکان اس متفقہ نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایس ایچ او کلفٹن انسپکٹر حق نواز سیال کے بائیں پیر پر آنے والا زخم خود ساختہ اور آتشیں مادے کی وجہ سے آیا اور جو نہایت قریب سے فائر کیا گیا۔ ایک اور خصوصی میڈیکل بورڈ قائم کیا گیا جسکا مقصد مرحوم انسپکٹر حق نواز سیال کی

لاش کا معائنہ کرنا تھا۔ لاش کا معائنہ 96-9-28 کو کیا گیا اور اسی روز رپورٹ (صفحہ 85-87 باب 8) پیش کی گئی۔

میڈیکل بورڈ کے سربراہ ڈاکٹر محمد شفیع قریشی جبکہ ارکان میں پروفیسر کریم صدیقی' ڈاکٹر متین احمد خان' ڈاکٹر محمد اسحاق شیخ' ڈاکٹر سید محمد علی شاہ (نجی پریکٹیشنر) ڈاکٹر نظام الدین میمن' ڈاکٹر محمد عمر بلوچ' ڈاکٹر طارق مرزا اور ڈاکٹر اظہر حسین شامل تھے۔

اس بورڈ کی رائے میں مقتول کی بائیں کنپٹی پر آتشیں اسلحے کا زخم ہے اور گولی مقتول کو لگنے کے بعد دائیں کنپٹی سے باہر نکل گئی اور یہ قتل کے عمل کا نتیجہ ہے۔

اے ایس پی شاہد حیات کے زخم کا معائنہ کرنے کیلئے ایک اور خصوصی میڈیکل بورڈ تشکیل دیا گیا اس بورڈ کے ارکان پروفیسر کریم صدیقی (چیئرمین)' ڈاکٹر محمد علی شاہ' ڈاکٹر طارق مرزا' ڈاکٹر اظہر حسین' ڈاکٹر متین اے خان' ڈاکٹر محمد اسحاق شیخ' ڈاکٹر مشتاق احمد' ڈاکٹر شجاع حسین خان' ڈاکٹر نظام الدین میمن اور ڈاکٹر محمد عمر بلوچ تھے۔ 30 ستمبر 1996 کو جاری کردہ اس بورڈ کی رپورٹ (ای ایکس 62/6 صفحہ 59-96 VOL VIII) میں بتایا گیا ہے کہ گولی دو یا تین فٹ کے فاصلے سے ماری گئی اور ران کا زخم خود سے نہیں لگایا گیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اے ایس پی شاہد حیات مبینہ طور پر 20 ستمبر 1996 کو وقوعہ کے دوران زخمی ہوئے تھے جس کے بعد وہ سیدھے آغا خان ہسپتال گئے جہاں ان کا اپریشن کیا گیا۔ ان کا حقیقی زخم نمایاں نہیں تھا اور اس خصوصی میڈیکل بورڈ کی رپورٹ آغا خان ہسپتال کی رپورٹوں پر مبنی تھی۔

گواہ نمبر' 74 آغا خان ہسپتال کے ڈاکٹر شجاع حسین :-

ڈاکٹر شجاع حسین نے اے ایس پی شاہد حیات کے زخم کے بارے میں ایک سرٹیفکیٹ ای ایکس 64/13 پیش کیا اور آغا خان ہسپتال کے ڈاکٹر شفیق احمد جنہوں نے آپریشن کے نوٹس تیار کئے تھے' نے ایسی ہی رپورٹ ای ایکس 71/8 تا 12 پیش کی۔ اے ایس پی شاہد حیات کی ران کا آپریشن گواہ نمبر122 ڈاکٹر شہزاد نے کیا تھا۔ ان کا تعلق بھی آغا خان ہسپتال سے ہے۔ جب بورڈ کے ارکان مرحوم انسپکٹر سیال کی لاش

کا معائنہ کرنے مردہ خانے گئے تو ڈاکٹر عبدالکریم صدیقی کے مطابق مردہ خانے میں دو اٹینڈنٹس موجود تھے جو خاکروب تھے اور انہوں نے بورڈ کے معائنے کیلئے لاش کو پلیٹ فارم پر رکھا۔

گواہ نمبر 65 عامر مختار پاکستان ٹیلیویژن :-

ٹریبونل کی ہدایت پر پی ٹی وی کے کئی کیمرہ مینوں نے اپنے مووی کیمروں سے جائے وقوع کی تصاویر لیں۔ ہر کیمرہ مین نے اپنی علیحدہ کیسٹ تیار کی جس میں صرف وہی مناظر دکھائے گئے ہیں جو اس نے خود فلمبند کئے۔ اس گواہ نے اپنے فلمائے ہوئے مناظر پر مشتمل کیسٹ دستاویز 65/1 پیش کی جو کہ اس میں موجود مناظر کے بارے میں ٹائپ شدہ نوٹس پر مشتمل ہے۔ گواہ کے بیان کے مطابق دستاویز 62/2 میں موجود پہلے گیارہ مناظر اس نے فلمبند کئے تھے۔

گواہ نمبر 66 اقبال جمیل :-

جو پی ٹی وی کراچی کا پروڈیوسر / رپورٹر ہے' وہ گواہ نمبر 65 عامر مختار کے ساتھ تھا۔

گواہ نمبر 67 محمد اصغر :-

پی ٹی وی کراچی میں بحیثیت کیمرہ مین ملازم ہے۔ اس نے اپنے مووی کیمرہ سے کئی مناظر فلمبند کئے۔ گواہ نے اس رات اپنے فلمبند کئے ہوئے مناظر پر مشتمل ایک کیسٹ ای ایکس 67/1 پیش کی۔

گواہ نمبر 68 پرویز عطاء اللہ :-

پی ٹی وی کراچی میں سینئر نیوز کیمرہ مین ہے' یہ بھی دیگر کیمرہ مینوں کے ساتھ تھا۔ گواہ نے سوالات کے دوران اس رات اپنے فلمائے ہوئے مناظر پر مشتمل کیسٹ

ای ایکس 68/1 پیش کی۔

گواہ نمبر 69 کراچی ساؤتھ صدر سب ڈویژن :-

انسپکٹر ریاض احمد ہے جو 21 ستمبر 1996 کو اے ایس پی شاہد حیات کے معائنے کیلئے جناح ہسپتال سے ایک میڈیکو لیگل آفیسر کو آغا خان ہسپتال لے کر گیا تھا۔

گواہ نمبر 70 ڈاکٹر اکبر حسین :-

جناح ہسپتال میں سینئر میڈیکو لیگل آفیسر ہے۔ 21 ستمبر 1996 کو جب گواہ نمبر 69 صدر پولیس اسٹیشن کا انسپکٹر ریاض ایک میڈیکو لیگل افسر کو اپنے ہمراہ لیجانے کیلئے ایک خط لے کر اس کے دفتر آیا تاکہ آغا خان ہسپتال میں اے ایس پی شاہد حیات کا معائنہ کیا جا سکے تو ڈاکٹر غلام سرور چنا کو ڈیوٹی پر مامور کیا گیا۔ گواہ نمبر 71 ڈاکٹر طارق مرزا ایسوسی ایٹ پروفیسر اور 1984 سے ڈاؤ میڈیکل کالج کے شعبہ فارنیزک میڈیسن کے سربراہ ہیں اور یہ ان تینوں میڈیکل بورڈز کے رکن تھے جو انسپکٹر حق نواز سیال کے پیر کے زخم' اے ایس پی شاہد حیات کے زخم کے معائنے اور انسپکٹر حق نواز سیال کی موت کے بارے میں تشکیل دیئے گئے تھے۔ ڈاکٹر طارق مرزا کی شہادت سے یہ بات واضح ہے کہ 30 ستمبر 1996 کو اے ایس پی شاہد حیات کی بائیں ران کے زخم سے متعلق حقیقی رائے کو تبدیل کرنے کی کوششیں کی گئیں جن میں ڈاکٹر طارق مرزا کی شہادت سے پرائیویٹ سرجن ڈاکٹر محمد علی شاہ کی اس شہادت کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ پروفیسر کریم صدیقی اور ڈاکٹر طارق مرزا ڈاکٹر محمد علی شاہ کو ایک مختلف رپورٹ پر دستخط کرنے کیلئے رضامند کرنے کیلئے ان کے گھر گئے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ 30 ستمبر 1996 کو ہاتھ سے لکھی گئی رپورٹ کو ایک ٹائپ شدہ رپورٹ سے بدل دیا جائے جس نے پہلی رپورٹ کو تبدیل کر دیا تھا۔ ان کی شہادت پر اعتماد نہیں کیا گیا۔

گواہ نمبر 72 ڈی آئی جی مسعود پراچہ :-

جو کہ متعلقہ وقت پر ڈی آئی جی کرائمز تھے اور جب اے آئی جی کرائمز نور محمد پیچوہو تفتیش کر رہے تھے تو یہ نگراں افسر تھے۔ یہ تفتیش کی رفتار سے مطمئن تھے اور انہوں نے کہا کہ دوران تفتیش اے آئی جی نور محمد پیچوہو روزانہ یا ہر دوسرے روز تفتیش کی پیشرفت پر ان سے مشورہ کرتے تھے۔ اس بارے میں ٹربیونل کی رائے مختلف ہے۔ خود تفتیش میں شریک پولیس افسران کی پیش کردہ شہادتوں سے یہ بات واضح ہے کہ تفتیشی افسران نے صورتحال کو خراب کیا۔ جرم کے شواہد کو محفوظ نہیں رکھا گیا، لاشوں کے معائنے سے قبل انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔ پہلا تفتیشی افسر ایس آئی خرم وارث رات دس بجے موقع پر پہنچا۔ موقع واردات پر مشیر نامہ تیار نہیں کیا گیا بلکہ شاید اسے اگلے روز تیار کیا گیا۔ اس کے باوجود اس میں بہت سی مطلوبہ باتیں رہ گئیں۔ پولیس اسٹیشن کے روزنامچے کو بھی صحیح طریقے سے نہیں رکھا گیا۔ روزنامچے کے مندرجات بیک وقت نہیں لکھے گئے، بہت سی ایسی باتیں جو روزنامچے میں ہونی چاہیئے تھیں درج نہیں کی گئیں۔ خالی شیل اور آتشیں اسلحے کی برآمدگی کو بھی صحیح طور پر درج نہیں کیا گیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں کی مبینہ فائرنگ سے پولیس کی جن گاڑیوں کو نقصان پہنچا تھا انہیں بھی موقع واردات سے ہٹا دیا گیا تھا۔ دوران تفتیش جن بدعنوانیوں اور ناقص کارکردگی کا ارتکاب کیا گیا ہے، ان کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈی آئی جی کرائمز کی زیر نگرانی انتہائی اعلیٰ اختیاراتی تفتیشی ٹیم کے باوجود تفتیش صحیح طریقے سے نہیں کی گئی۔

ڈی آئی جی پراچہ کے مطابق تحقیقاتی ٹیم ایک ایس پی، دو ڈی ایس پی، تین انسپکٹرز اور ایک یا دو سب انسپکٹرز اور ایک یا دو سب انسپکٹروں پر مشتمل تھی جس کے سربراہ اے آئی جی نور محمد پیچوہو تھے۔ ڈی آئی جی پراچہ نے اس وقت کی وزیراعظم کو تحقیقات کی زبانی رپورٹ بھی دی تھی اور ان کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک کی جانے والی تحقیقات سے مطمئن تھے۔ ڈی آئی جی پراچہ جائے وقوع کے قریب ہی رہائش پذیر تھے۔ ان کے مطابق انہوں نے فائرنگ کی تیز آواز سنی جو قریباً" دس سے پندرہ منٹ تک جاری رہی، تاہم وہ اس رات فائرنگ کے مقام پر نہیں گئے

کیونکہ انہیں ان کے گن مین نے بتایا تھا کہ وہاں جانا بہت خطرناک ہو گا۔ جب فائرنگ ہو رہی تھی تو انہوں نے ڈی آئی جی سٹی کو ٹیلیفون کیا۔ ان کے مطابق ڈی آئی جی نے انہیں بتایا کہ ان کے مکان کے باہر فائرنگ جاری ہے اور پولیس تھانوں پر حملہ کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ناکہ بندی کی جا چکی ہے۔ انہوں نے اس بات سے یہ سمجھا کہ ڈی آئی جی پولیس کارروائی کو درست قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ڈی آئی جی نے اس بات کا ذکر کیا کہ ملوث افراد میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے آدمی ہیں۔ ڈی آئی جی پراچہ نے اتھارٹی لیٹر (ای ایکس 72/1) کی ایک کاپی بھی پیش کی جس میں برطانیہ کی ایک پرائیویٹ انو-سٹی گیٹرز (کل چھ افراد) کی ٹیم کو ضابطہ فوجداری کے سیکشن -39 کے تحت لامحدود اختیارات دیئے گئے تھے۔ اس اتھارٹی لیٹر نے اختیارات سلب کرلئے اور برطانوی ٹیم کے ارکان کو ضابطہ فوجداری اور پولیس رولز کے تحت کسی بھی مقام کا معائنہ کرنے، کسی گواہ کا بیان ریکارڈ کرنے اور کسی پولیس اسٹیشن کے آفیسر انچارج کے تمام امور انجام دینے کا اختیار دیا گیا تھا، جو مذکورہ کیسوں میں شفاف اور غیر جانبدارانہ تحقیقات کے مفاد میں ہوسکتا ہے۔

گواہ نمبر 73، فری لانس کالم نگار امینہ جیلانی :-

انہوں نے ایک مضمون تحریر کیا تھا جس کا سب ٹائیٹل (THAT WHICH SHOULD NEVER HAVE HAPPENED) تھا۔ یہ مضمون 28 ستمبر 1996ء (73/1) کے روزنامہ نیشن میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے مذکورہ آرٹیکل کے مندرجات سمیت اس میں ذکر کردہ حقائق کی تصدیق کی۔

گواہ نمبر 74، ڈاکٹر شجاع حسن خان آغا خان ہسپتال :-

وہ آغا خان ہسپتال کے شعبہ جراحت میں کل وقتی آرتھوپیڈک کنسلٹنٹ ہیں۔ ان کے مطابق زخمی اے ایس پی شاہد حیات کو 20 ستمبر 1996ء کو رات 10 بجکر 19 منٹ پر آغا خان ہسپتال کی ایمرجنسی میں لایا گیا تھا۔ انہوں نے ایس پی شاہد حیات کا

نہ معائنہ کیا تھا اور نہ ہی اے ایس پی شاہد حیات کے ہسپتال میں کئے جانے والے بائیں ران کے آپریشن میں حصہ لیا۔ ان کے مطابق آغا خان ہسپتال کے ڈاکٹر شہزاد نے یہ آپریشن کیا تھا۔

گواہ نمبر، 75 ڈاکٹر تاشفین احمد :-

وہ آغا خان ہسپتال میں جونیئر ریذیڈنٹ ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے اے ایس پی شاہد حیات کی بائیں ران کے آپریشن میں ڈاکٹر شہزاد کی معاونت کی تھی۔

گواہ نمبر76، ڈاکٹر یوسف کمال مرزا :-

وہ آغا خان ہسپتال کے میڈیکل ڈائریکٹر اور آغا خان میڈیکل کالج کے ڈین ہیں۔ انہوں بیان دیا کہ میڈیکو لیگل کیسوں کے بارے میں ہسپتال کی ایک پالیسی ہے اور پالیسی کی ایک کاپی ایکس 76/1 پالیسی پیش کی۔ انہوں نے پالیسی کی مندرجہ ذیل وضاحت کی۔

”میں مختصرا“ آگاہ کرسکتا ہوں کہ معمولی زخموں کے عمومی میڈیکو لیگل کیسوں میں زخمی کو ہمارے ہسپتال میں داخل نہیں کیا جاتا ہے۔

ابتدائی طبی امداد کے مریضوں کو ہمارے ہسپتال میں داخل کیا جاسکتا ہے اور فرسٹ ایڈ فراہم کی جاسکتی ہے لیکن انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ کسی گورنمنٹ ہسپتال میں جائیں جو میڈیکو لیگل کیس نمٹاتے ہیں۔ جب موت و زندگی کے کیس ہوتے ہیں تو ہم پولیس کو ایک باقاعدہ طریقہ کار کے تحت اطلاع دیتے ہیں، تاہم اگر پولیس سے رابطہ نہ ہو سکے تو ہم ضروری طبی امداد فراہم کرتے ہیں کیونکہ معاملہ زندگی بچانے کا ہوتا ہے۔ تیسری کیٹیگری میں وہ کیسز ہوتے ہیں جن میں زخم شدید ہوتے ہیں لیکن وہ موت و زندگی کا معاملہ نہیں ہوتا، ان کیسز میں بھی ہم پولیس کو اطلاع دیتے ہیں اور ضروری علاج معالجے کے بعد مریض کو کہا جاتا ہے کہ میڈیکو لیگل ہسپتال سے رجوع کرے۔ ہم نے آغا خان ہسپتال کے لئے نیوٹاؤن پولیس اسٹیشن کے

تعاون سے ایک معیاری طریقہ طے کیا ہے۔ ہمارا ایک سیکورٹی ڈیپارٹمنٹ ہے، جیسے ہی کوئی میڈیکو لیگل کیس آتا ہے جسے انسانی بنیادوں پر ہمارے ہسپتال کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم اسے علاج فراہم کرتے ہیں اور سیکورٹی ڈیپارٹمنٹ فورا“ نیو ٹاؤن تھانے کو اطلاع کر دیتا ہے۔ مریض کی آمد ریکارڈ میں درج کرلی جاتی اور ایک فارم جو میڈیکو لیگل رپورٹ فارم کہلاتا ہے۔ بھرا جاتا ہے۔

گواہ نمبر77، سرفراز احمد (رپورٹر روزنامہ ڈان) :-

ڈان کے 27 ستمبر 1996ء کے شمارے میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کی سرخی تھی ”میڈیکل بورڈ نے ایس ایچ او کے زخم کو خود ساختہ قرار دے دیا“ گواہ نے تصدیق کی کہ خبر کی بنیاد اس کی رپورٹ ہے۔

گواہ نمبر78، ڈاکٹر محمد علی شاہ :-

گواہ ایک آرتھوپیڈک سرجن، پرائیویٹ پریکٹشنر ہیں اور ناظم آباد کراچی میں اے او کلینک کے نام سے ان کا اسپتال ہے۔ ڈاکٹر شاہ کے مطابق وہ تین میں سے دو میڈیکل بورڈ کے رکن تھے۔ پہلا متوفی انسپکٹر حق نواز سیال کے معائنہ کے لئے اور دوسرا شاہد حیات کے زخم سے متعلق تھا۔ شاہد حیات کے زخم کی رپورٹ پر گواہ سمیت میڈیکل بورڈ کے دس ارکان نے دستخط کئے تھے۔ گواہ نے اعتراف کیا کہ رپورٹ کی بنیاد آغا خان ہسپتال کے ریکارڈ پر تھی، جہاں شاہد حیات کا آپریشن ہوا تھا۔ اس سوال پر کہ اے ایس پی شاہد حیات کے زخم کی رپورٹ تبدیل کرنے کے لئے ان سے رابطہ کیا گیا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ انہیں رپورٹ پر دستخط کرنے اور چیئرمین کے حوالے کرنے کے کئی روز بعد یہ کہا گیا کہ معمولی سی تبدیل شدہ دستاویز پر دستخط کر دیں۔ گواہ کے مطابق یہ کوشش کی گئی کہ وہ رپورٹ جس پر تمام دس ارکان کے دستخط ہیں، ایک ٹائپ شدہ دستاویز سے تبدیل کر دی جائے، جس پر تمام 10 ممبران کے دستخط تھے (ای ایکس 64/6)، گواہ کے مطابق جب اسے پروفیسر کریم صدیق یاور، ڈاکٹر طارق مرزا کی

نئی ٹائپ شدہ رپورٹ دکھائی گئی تو اس پر 10 میں سے 8 ممبران کے پہلے سے دستخط موجود تھے۔ ڈاکٹر پروفیسر کریم صدیقی اور پروفیسر طارق مرزا نے گواہ کو بتایا کہ اس کے دستخطوں کے بعد وہ ڈاکٹر اسحاق شیخ کے دستخط حاصل کرلیں گے۔ بعد میں گواہ نے رپورٹ پر دستخط سے انکار کر دیا اور اس نے محسوس کیا کہ رپورٹ تبدیل کر دی ہے۔ اصلی رپورٹ (ای ایکس 4/64) میں خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ شاہد حیات کی بائیں ران کے زخم خود ساختہ نہیں تھے لیکن ٹائپ شدہ رپورٹ میں زخموں سے متعلق اس رائے کو نظر انداز کر دیا گیا کہ زخم خود ساختہ نہیں ہیں۔ گواہ کے مطابق دونوں پروفیسر 4-5 گھنٹے اس کی رہائش گاہ پر موجود رہے۔ وہ اس کے دستخط لینے کے لئے آئے تھے۔ ڈاکٹر محمد علی شاہ کے مطابق وہ اس پر اصرار کر رہے تھے کہ ٹائپ شدہ دستاویز پر دستخط کر دیں لیکن اس نے انکار کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت جب گواہ کے گھر دونوں ڈاکٹر موجود تھے' وہاں سیکرٹری صحت ڈاکٹر کامل (گواہ نمبر 84) کے 2 یا 3 ٹیلی فون بھی آئے' انہوں نے بھی گواہ سے کہا کہ وہ ٹائپ شدہ دستاویز پر دستخط کر دیں۔

گواہ نمبر 79' ڈاکٹر محمد شفیع قریشی:-

وہ میڈیسن کے پروفیسر اور داؤد میڈیکل کالج کے پروفیسر ہیں۔ وہ دو میڈیکل بورڈ کے ممبر بھی تھے جن میں سے ایک انسپکٹر حق نواز سیال کے بائیں پیر کے معائنہ اور دوسرا اس کی موت کے بعد معائنہ سے متعلق تھا۔ وہ اس میڈیکل بورڈ کے ممبر نہیں تھے جس نے اے ایس پی شاہد حیات کا معائنہ کیا' انسپکٹر حق نواز سیال کی ڈیڈ باڈی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس کے سر میں زخم آتشیں اسلحہ کا ہے اور یہ قتل کا نتیجہ ہے۔ گواہ کے مطابق سیکرٹری صحت ڈاکٹر کامل نے اس کے کلینک پر فون کیا اور کہا کہ تمام ممبران کو جمع کریں اور اسی روز مہیا کریں' چنانچہ اس وقت رپورٹ تیار کی گئی اور اسی دن یعنی 28-09-96 کو جمع کرا دی گئی۔

گواہ نمبر 80' ڈاکٹر محمد عمر بلوچ:-

وہ کراچی کے سول سرجن اور سروسز ہسپتال کراچی کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ

بھی ہیں۔ وہ تین میڈیکل بورڈ کے رکن بھی تھے' انہوں نے اس دوسری' ٹائپ شدہ رپورٹ پر بھی دستخط کئے ہیں' جو اے ایس پی شاہد حیات کے زخم کے بارے میں باقاعدہ تحریر کردہ' اصل رپورٹ کا متبادل ہے۔

گواہ نمبر 81' ڈاکٹر متین اے خان:-

جو داؤد میڈیکل کالج میں پروفیسر اور شعبہ ریڈیالوجی کے سربراہ ہیں۔ وہ تمام میڈیکل بورڈز کے ممبر تھے' انہوں نے بھی اے ایس پی شاہد حیات کے زخمی ہونے کے بارے میں دوسری ٹائپ شدہ رپورٹ پر دستخط کئے تھے۔ ان کے مطابق انہوں نے اس رپورٹ پر شاہد حیات کے زخمی ہونے کی پہلی رپورٹ پر دستخط کرنے کے تین چار دن بعد دستخط کئے تھے۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ انہوں نے دوسری رپورٹ پر کیوں دستخط کئے تو انہوں نے مندرجہ ذیل جواب دیا۔

"میں نے دوسری رپورٹ پر دستخط لینے پر چیئرمین پروفیسر کریم صدیقی اور پولیس سرجن نظام الدین میمن اور داؤد میڈیکل کالج کے وائس پرنسپل ڈاکٹر طارق مرزا سے بھی اعتراض کیا تھا لیکن مجھے تینوں ڈاکٹرز نے مطلع کیا کہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ ہماری تفصیلی رائے نہیں چاہتا' جس طرح کہ ہم نے فاصلے کے بارے میں دی اور یہ کہ یہ خود لگایا گیا تھا یا نہیں۔ انہوں نے مجھ سے مزید کہا کہ ہم نے زخم نہیں دیکھا اور اس لئے ہم زخم کے بارے میں کیسے رائے دے سکتے ہیں"۔ اس نے یہ بھی کہا کہ "میں صرف ایک ریڈیالوجسٹ تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ شعبہ سرجری کے سربراہ اور میڈیکل بورڈ کے چیئرمین پروفیسر کریم صدیقی' پولیس سرجن داؤد میڈیکل کالج کے میڈیکو لیگل شعبے کے سربراہ اور شعبہ فارنزک میڈیسن کے سربراہ پروفیسر طارق مرزا اور پروفیسر سرجری سرجن اظہر اس بات پر متفق تھے کہ اصل تحریری رپورٹ پیش کر دی جائے تو میں بھی اس بات سے متفق ہو گیا"۔

گواہ نمبر 82' عبدالرحیم:-

عبدالرحیم جے پی ایم سی میں میڈیکل لائبریرین ہے۔ وہ ستمبر 1996ء سے

متعلق ایک رجسٹر لے کر آیا اور اس نے 20 ستمبر 1996ء کو رات 9 بجکر 10 منٹ پر ریکارڈ کی جانے والی انٹری (ای ایکس 82/1) دکھائی جس میں کہا گیا ہے کہ "گن شاٹ کلفٹن پولیس اسٹیشن"۔

گواہ نمبر 83، نذیر احمد:۔

سندھ پولیس کے شعبہ ٹیلی مواصلات میں ملازم تھا اور متعلقہ دنوں میں ایس ایس پی ساؤتھ کراچی کے دفتر میں تعینات تھا۔ اس نے متعلقہ انٹریز اور لاگ بک کی نقول پیش کیں۔

گواہ نمبر 84، ڈاکٹر کامل راجپر:۔

متعلقہ دنوں میں سندھ حکومت میں سیکرٹری صحت تھے۔ انہیں 24 ستمبر 1996ء کو محترمہ غنویٰ بھٹو کا ایک خط (ای ایکس 84/1) ملا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ انسپکٹر حق نواز سیال کے بائیں پیر میں لگنے والے زخم کا معائنہ کرنے کے لئے خصوصی میڈیکل بورڈ تشکیل دیا جائے۔ اس درخواست پر سیکرٹری صحت نے فوری طور پر خصوصی میڈیکل بورڈ تشکیل دینے کے احکام جاری کر دیئے۔ اس زخم کے متعلق ایک مختصر رپورٹ (ای ایکس 84/2) جاری کی گئی، جو انہوں نے معاملے کی اہمیت کے پیش نظر پریس کو جاری کر دی۔ انہوں نے دوسرے دو میڈیکل بورڈوں کی تشکیل کا حوالہ بھی دیا جو اے ایس پی شاہد حیات کے زخم اور مرحوم انسپکٹر سیال کی لاش کے معائنے کے لئے بنائے گئے تھے، انہوں نے چیف منسٹر ہاؤس میں ہونے والی میٹنگ کے بارے میں بیان دیا جس میں ہوم سیکریٹری، ایڈووکیٹ جنرل، آئی جی پولیس سندھ سعید خان اور ڈی آئی جی سڈل بھی شریک تھے۔انہوں نے پولیس اور محکمہ صحت کے درمیان نام نہاد رسہ کشی کے بارے میں بھی بتایا۔ ان کے بیان کے مطابق اے ایس پی شاہد حیات کے زخم کے معائنے کے لئے بننے والے بورڈ میں پولیس بالخصوص ڈی آئی جی سڈل کی خواہش پر ڈاکٹر محمد علی شاہ کو بطور ممبر شامل کیا گیا تھا اور وزیر اعلیٰ

عبداللہ شاہ پولیس کی اس خواہش کی حمایت کر رہے تھے کہ ڈاکٹر محمد علی شاہ کو میڈیکل بورڈ میں بطور ممبر شامل کیا جائے۔ جہاں تک شاہد حیات کے زخم کے بارے میں 30-09-96 کی رپورٹ کا تعلق ہے، سیکرٹری صحت نے کہا کہ رپورٹ پر 30 ستمبر 1996ء کی تاریخ پڑی ہوئی تھی مگر وہ ان کے پاس 7 اکتوبر 1996ء کو پہنچی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق ڈاکٹر کریم صدیقی انہیں اس رپورٹ کی تیاری میں تاخیر ہونے کی غلط اطلاع دے رہے تھے اور یہ بتا رہے تھے کہ رپورٹ مکمل نہیں ہوئی ہے۔ انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہ انہوں نے ایک دوسری ٹائپ شدہ رپورٹ پر دستخط کرنے کے لئے ڈاکٹر محمد علی شاہ پر دباؤ ڈالا۔

گواہ نمبر 85، محمد نواز:۔

گواہ نمبر 86، خان زمان:۔

گواہ نمبر 87، محمد یونس:۔

گواہ نمبر 88، آصف محمود:۔

گواہ نمبر 89، ذوالفقار حسین:۔

گواہ نمبر 90، زبیر احمد:۔

گواہ نمبر 85 تا 90 سندھ پولیس کے محکمہ ٹیلی مواصلات میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے ان پیغامات کے بارے میں بیانات دیئے جو انہوں نے وصول کئے یا ارسال کئے، ان میں سے بعض نے ریکارڈ پیش کئے اور متعلقہ اندراجات کی وضاحت کی۔

گواہ نمبر 91، رفیق احمد خانزادہ:۔

جو کے ای ایس سی کراچی کا ملازم ہے۔ اس نے بتایا کہ ایلنڈر روڈ آف چندریگر روڈ پر واقع کے ای ایس سی کے کنٹرول روم میں زیر بحث رات کو جناح ہسپتال میں بجلی نہ ہونے کی شکایت موصول ہوئی تھی۔ کے ای ایس سی کنٹرول روم میں یہ پیغام ڈیوٹی انجینئر نوید اقبال نے وصول کیا۔ اس گواہ نے ایس ڈی ایم پریڈی کا یہ پیغام

پہنچایا کہ ایمرجنسی ہے اور کے ای ایس سی کی گاڑی فوری بھیجی جائے۔

گواہ نمبر92' نوید اقبال :۔

جو کہ کے ای ایس سی کا اسسٹنٹ سب انجینئر ہے اور وقوع والی رات وہ کے ای ایس سی آپریشن کنٹرول روم میں ڈیوٹی انجینئر تھا اور اس نے جناح ہسپتال میں بجلی نہ ہونے سے متعلق پیغام وصول کیا۔ اس نے فوری طور پر کے ای ایس سی کی ایک گاڑی جو کہ آپریشن سینٹر میں دستیاب تھی بھجوائی' گاڑی کا سپروائزر جناح ہسپتال گیا اور جہاں اس نے وائرلیس پر گواہ سے بات کی کہ اس نے جناح ہسپتال کا سب اسٹیشن چیک کیا ہے اور بظاہر کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ سپروائزر نے گواہ کو مطلع کیا کہ سوئچ اور فیوز دونوں صحیح ہیں۔ اس کے بعد اس نے سپروائزر سے کہا کہ وہ جناح ہسپتال کے ایمرجنسی میں جائے اور وہاں پر ایس ڈی ایم کو مطلع کرے کہ کے ای ایس سی کی طرف سے جناح ہسپتال کو بجلی کی فراہمی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس کے بعد سپروائزر نے ایمرجنسی سے رپورٹ دی کہ ایمرجنسی میں لائٹس آن تھیں اور وہ کسی ایس ڈی ایم یا کسی دوسرے ذمہ دار فرد کو تلاش نہیں کر سکا کہ جسے وہ پیغام پہنچا سکے۔

گواہ نمبر93' اے ایس آئی شہزاد حسین :۔

جو 1993ء سے تھانہ کلفٹن میں تعینات ہے۔ اس نے رپورٹس اور جائے وقوعہ پر موجود لاشوں کا مشیر نامہ تیار کیا (ایکس 93/1)- اس نے عاشق حسین جتوئی کی لاش کی دستاویزات اور پوسٹ مارٹم رپورٹس پیش کیں' (93/2)- اس گواہ نے یہ بھی بتایا کہ مردہ خانے میں کوئی لائٹ نہیں تھی اور چنانچہ 5 لاشوں کے پوسٹ مارٹم میں تاخیر ہوئی۔ یہ بات پہلے ہی نوٹ ہو چکی ہے کہ عاشق جتوئی کی لاش مردہ خانے سے جہاں لائٹ نہیں تھی' ایک ایمبولینس کے ذریعے شعبہ ہنگامی طبی امداد منتقل کی گئی اور ایمرجنسی میں ایم آئی روم میں پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ گواہ کے مطابق رات 9:30 بجے ایس پی شکیب قریشی کی طرف سے ایک پیغام ملا کہ 70 کلفٹن کے قریب فائرنگ ہو

رہی ہے اور تھانہ کلفٹن میں جتنے بھی پولیس والے ہیں وہ فوراً" جائے وقوع پر پہنچیں۔ وہ جائے وقوع پر 5 منٹ کے اندر پہنچ گئے۔ اس سوال پر کہ جائے وقوع پر لائٹس روشن تھیں' گواہ نے اس کا جواب نفی میں دیا اس نے ایس پی شکیب قریشی' اے ایس پی درخشاں رائے طاہر اور دوسرے متعدد پولیس افسران کو جائے وقوع پر دیکھا۔ اس موبائل' کہ جس میں وہ جائے وقوع پر پہنچا تھا' کی روشنی میں اس نے سڑک پر رکھی ہوئی چھ لاشیں دیکھیں۔ اس نے وہاں پر بہت سارا خون بھی دیکھا۔ میر مرتضٰی کے قافلے کی گاڑیاں بھی وہاں کھڑی تھیں۔ اس نے مزید بتایا جو درج ذیل ہے: ـ

"جو تاثر میں نے حاصل کیا وہ یہ تھا کہ جب افراد فائرنگ کے تبادلے میں مارے جائیں تو نیچے گر جاتے ہیں اور انہیں وہاں سے منتقل یا ہٹایا نہیں جاتا اور نہ ہی ان کی پوزیشن تبدیل کی جاتی ہے۔ انہیں ان کی قدرتی حالت میں رکھا جاتا ہے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے ایک یا دو لاشیں سیدھی پڑی تھیں جس سے یہ تاثر ملا کہ ان کی پوزیشنیں شاید تبدیل کی گئی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے تمام لوگ مرچکے تھے اور میں اس بارے میں بھی یقینی نہیں ہوں کہ تمام چھ لاشیں سڑک پر پڑی تھیں۔ شاید ایک یا دو لاشیں دونوں سڑکوں کے درمیان فٹ پاتھ پر تھیں۔ ایس پی شکیب قریشی نے مجھ سے کہا کہ میں لاشوں کا معائنہ کروں اور ان کا مشیر نامہ تیار کروں۔ پولیس اہلکاروں کی مدد سے جو یونیفارم اور سادہ کپڑوں میں تھے' لاشیں جو سڑک پر تھیں انہیں مرکزی فٹ پاتھ کی طرف لے جایا گیا پھر ایک لائن میں رکھ دیا گیا۔ اگر مجھے صحیح طریقے سے یاد ہے کہ ایک یا دو لاشیں جو پہلے سے مرکزی فٹ پاتھ پر تھیں انہیں وہیں رہنے دیا گیا۔ جس نے لاشوں کا مشیر نامہ تیار کیا اور وہ دو اشخاص جنہیں مشیر نامہ پر بطور گواہ دستخط کرنا تھے وہ موبائل میں پولیس والے تھے اور ان کا تعلق تھانہ کلفٹن سے تھا۔ میں یہ بات واضح کر دوں کہ وہ پولیس والے جن کا نام مشیر نامے میں بطور گواہ ذکر کیا گیا' اس سے قبل کہ وہ دستخط کرتے وہ شاید موبائل میں چلے گئے اور اسی وجہ سے وہ مشیر نامہ پر دستخط نہ کر سکے' صرف مشیر نامہ پر میں نے ہی دستخط کیے"۔

گواہ کے مطابق جب اس نے جائے وقوعہ دیکھی تو اس وقت اس نے کسی کو تصویریں لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس نے مزید کہا کہ جب وہ وہاں پہنچا تھا اور مشیر نامہ تیار کر رہا تھا تو اس نے شناخت کی خاطر لاشوں کے ہاتھوں پر نمبر لکھ دیئے تاکہ ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے مطابقت ہو سکے اور جائے وقوع پر صرف عاشق جتوئی اور سجاد حیدر کی لاشوں کی ہی شناخت ہو سکی۔

گواہ نمبر94' ایس آئی خرم وارث:۔

اس نے پولیس سروس 1992ء میں بطور اے ایس آئی جوائن کی اور جولائی/ اگست 1996ء میں ایس آئی کے عہدے پر ترقی دی گئی اور اسے پہلی مرتبہ تھانہ کلفٹن میں تعینات کیا گیا اور یہ تقرری یکم ستمبر1996ء کو عمل میں آئی۔ وہ اس وقت تھانے میں تھا جب وائرلیس پر یہ پیغام ملا کہ پونے 9 بجے شب ڈی آئی جی ہاؤس پر حملہ ہوا ہے اور اس کے 5 یا 7 منٹ بعد انسپکٹر سیال ایک موبائل میں زخمی حالت میں تھانے آیا۔ گواہ اور اس کے ساتھ دیگر پولیس اہلکاروں نے انہیں جناح ہسپتال پہنچایا اور ایمرجنسی کے کاؤنٹر سے پرچی بنوائی۔ تب اس وقت انسپکٹر سیال نے کہا کہ اس کی حالت خراب ہے' لہٰذا اسے جناح ہسپتال سے منتقل کیا جائے۔ اس نے ہدایت کی کہ اسے لیاقت نیشنل ہسپتال لے جایا جائے۔ گواہ کے مطابق وہ انہیں لیاقت نیشنل ہسپتال لے گئے' اس سوال پر کہ انسپکٹر حق نواز سیال کی تھانہ آمد اور انہیں دو ہسپتالوں میں لے جانا اور واپس تھانہ آمد اور انسپکٹر سیال کے موبائل میں گواہ کے ساتھ ساتھ اور کون کون تھا جو ہسپتال تک گئے' اس بارے میں روزنامچے میں کس قسم کا اندراج موجود ہے۔

گواہ نے جواب دیا' اس سلسلے میں روزنامچے میں کوئی اندراج نہیں' اس نے کہا کہ تمام اندراج روزنامچے میں ہونا چاہئے لیکن عملی طور پر روزنامچے میں کچھ اندراج ہی ہوتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ ساڑھے دس بجے شب ہسپتال سے واپس آیا۔ جب وہ پولیس اسٹیشن واپس پہنچا تو اسے مطلع کیا گیا کہ انسپکٹر سیال کی شکایت پر ایک ایف آئی آر درج کی گئی ہے اور گواہ اس کیس کی تحقیقات کرے۔ جب ہم ڈی آئی جی مسعود پراچہ کی گواہی پر بحث کر رہے تھے کہ تحقیقات جس انداز میں ہوئی

خصوصاً" گواہ کے حوالے سے تو اس میں بعض تفصیلات ہمارے سامنے آئیں۔ جائے وقوع پر گواہ کو یہ علم ہوا کہ اس کی آمد سے پہلے مرتضیٰ بھٹو قافلے کے تمام بچ جانے والے افراد کو تھانہ درخشاں کے ایس ایچ او شاہنواز نے گرفتار کیا ہے اور ان کے تمام ہتھیار قبضے میں لے لئے ہیں۔ اس سوال پر کہ اگرچہ گواہ ان کاغذات میں واحد تحقیقاتی افسر تھا لیکن اصل میں ایس پی شعیب قریشی اور اے ایس پی رائے طاہر کیس کی تحقیقات کر رہے تھے اور گواہ کا کام یہ تھا کہ جو وہ افسران بتائیں وہ صرف وہی کرے۔ گواہ نے تسلیم کیا کہ ایسا ہی تھا اور افسران تحقیقات کی نگرانی کر رہے تھے' اس نے کہا کہ روزنامچہ روکا ہوا تھا' گواہ کے مطابق انسپکٹر سیال نے گواہ سے کہا کہ وہ روزنامچہ معطل کر دے۔ اس نے مزید کہا جو درج ذیل ہے "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عام طور پر روزنامچے میں جو اندراج کیا جاتا ہے وہ تاخیر سے ہوتا ہے۔ روزنامچہ عموماً" ڈیڑھ دو گھنٹے لیٹ چلتا ہے اور ایسا عملی طور پر ہر پولیس اسٹیشن میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص یہ اندراج کرتا ہے وہ پر یقین ہونا چاہتا ہے۔ وہ جلد بازی میں نامکمل اور غلط اندراج کرنا نہیں چاہتا"۔

سوال۔۔۔۔ آپ کا مطلب ہے کہ کام پکا ہو جائے؟

جواب۔۔۔۔ جی ہاں!

گواہ نے تسلیم کیا کہ جو مشیر نامہ اس نے جائے وقوع پر تیار کیا' دراصل وہ تھانے میں تیار کیا گیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تمام دوسرے تھانوں مین یہی عمل ہوتا ہے کہ جو مشیر نامہ بظاہر یہ کہہ کر تیار ہوتا ہے کہ اسے جائے وقوع پر بنایا گیا ہے تو دراصل وہ تھانے میں جا کر تیار ہوتا ہے' ایسا تمام کیسز میں ہوتا ہے۔

گواہ نمبر96' عبداللہ بلوچ ایڈووکیٹ:۔

وہ پیپلز پارٹی (شہید بھٹو گروپ) کے رکن ہیں' انہوں نے سرجانی ٹاؤن میں اس جلسے میں شرکت کی جس سے میر مرتضیٰ بھٹو نے خطاب کیا تھا۔

گواہ نمبر97' ڈاکٹر زاہد حسین جتوئی:۔

مرحوم عاشق حسین جتوئی کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر زاہد حسین جتوئی نے تفصیل

کے ساتھ بتایا کہ کس طرح انہوں نے اپنے بھائی عاشق حسین جتوئی کی لاش حاصل کی اور اس کے لئے انہوں نے کتنی بھاگ دوڑ کی اور جناح ہسپتال کے مردہ خانے سے لاش حاصل کرنے میں کئی گھنٹے تلاش میں لگے اور پولیس نے ان کے ساتھ کس طرح کا رویہ رکھا۔

گواہ نمبر98' اے ایس آئی بدر عالم:۔

انہوں نے ایس ایچ او حق نواز سیال کو پہلے جناح ہسپتال اور پھر لیاقت نیشنل ہسپتال پہنچایا۔ یہ پولیس موبائل میں بھی تھے' جس کے ساتھ ایدھی ایمبولینس بھی تھیں جن میں لاشیں جناح ہسپتال پہنچائی گئیں۔

گواہ نمبر99' ہیڈ کانسٹیبل غلام یاسین:۔

گواہ نمبر100' پولیس کانسٹیبل عبدالمجید:۔

گواہ نمبر101' اے ایس آئی اظہر اقبال:۔

یہ تینوں گواہ تھانہ کلفٹن میں ہیڈ محرر تھے۔

گواہ نمبر102' ڈاکٹر الطاف حسین خواجہ:۔

پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل ڈاکٹر الطاف حسین نے اس فیکس پیغام کے بارے میں بتایا جو مرتضیٰ بھٹو کو موصول ہوا اور دونوں نے اس فیکس کے مضمرات پر تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے 71 کلفٹن میں 20 ستمبر 1996ء کی دوپہر ہونے والی پریس کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ انہوں نے بسرجانی ٹاؤن میں ہونے والے جلسے میں شرکت نہیں کی جو اسی دن شام کو ہوا تھا' تاہم انہوں نے جلسے کی وڈیو ٹیپ پیش کی' جو گواہ کے مطابق اسے عاشق حسین جتوئی نے فراہم کی تھی۔

گواہ نمبر103' سعید محمد خان ڈی ایس پی تھری کرائم برانچ:۔

سعید احمد خان جو ڈی ایس پی تھری کرائم برانچ کراچی تھے اور اے آئی جی علی گوہر مٹھانی کی معاونت کرتے تھے۔

گواہ نمبر104' کانسٹیبل محمود اختر:۔

پولیس کانسٹیبل محمود اختر جنہوں نے روزنامچے میں اندراج کے بارے میں بتایا۔

گواہ نمبر105' ہیڈ محرر محمد اعجاز:۔

تھانہ کلفٹن کے ہیڈ محرر محمد اعجاز نے تھانے کے مال خانے سے 13 تصاویر کرائمز برانچ کے اے ایس پی سید احمد خان کے حوالے کیں۔

گواہ نمبر106' ڈرائیور گل پیر:۔

پولیس کانسٹیبل اور موبائل ڈرائیور گل پیر جس وقت فائرنگ شروع ہوئی وہ وہاں سے 200 گز کے فاصلے پر تعینات تھا۔ تاہم وہ واقعہ کا عینی گواہ نہیں ہے۔

گواہ نمبر107' کانسٹیبل محمد خان:۔

تھانہ کلفٹن کا کانسٹیبل محمد خان اے ایس آئی خرم واردات کے ساتھ جائے وقوع پر گیا۔

گواہ نمبر108' اے آئی جی علی گوہر مٹھانی:۔

اے آئی جی کرائمز علی گوہر مٹھانی نے چالان جمع کرنے اور جائے وقوع کی تصاویر کے بارے میں بتایا۔

گواہ نمبر109' ایس ایس پی اللہ ڈینو خواجہ :۔

کرائم نمبر 443/96 کے تحقیقاتی افسر تھے مگر تین دن بعد ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔

گواہ نمبر110' نور محمد پیچوہو :۔

نور محمد پیچوہو بھی تحقیقاتی افسر تھے۔ انہوں نے جزوی طور پر ڈی آئی جی کرائمز کی نگرانی میں تحقیقات کی۔

گواہ نمبر111' غلام اصغر خان :۔

غلام اصغر خان جو تحقیقاتی ٹیم کے رکن تھے۔

گواہ نمبر112' احسان الحق بھٹی :۔

احسان الحق بھٹی جو جلاوطنی کے دور میں مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ تھے اور انہی کے ساتھ وطن واپس لوٹے' تاہم وہ واقعہ کے عینی گواہ نہیں تھے۔

گواہ نمبر113' اسحاق خان خاکوانی :۔

اسحاق خان خاکوانی بھی عینی گواہ نہیں تھے اور جب مذکورہ واقعہ پیش آیا وہ اس وقت لاہور میں تھے انہوں نے فیکس پیغام کے بارے میں بتایا۔

گواہ نمبر114' راؤ رشید :۔

پیپلز پارٹی (شہید بھٹو گروپ) کے جنرل سیکرٹری راؤ رشید بھی عینی گواہ نہیں تھے۔

گواہ نمبر115' ایس پی ٹریفک ساؤتھ مولا بخش خشک :۔

انہوں نے ٹریفک کے متبادل انتظامات کئے اور اس کے لئے انہوں نے مطلوبہ مقامات پر اضافی ٹریفک پولیس والے تعینات کئے۔

گواہ نمبر116' اے ایس آئی حاکم علی :۔

انہوں نے مرحوم حق نواز سیال کے گھر کا دورہ کیا۔ اس کے علاوہ اس مقام کا بھی معائنہ کیا جہاں انسپکٹر سیال ہلاک ہوئے۔ اعلاوہ ازیں 27 اور 28 ستمبر 1996ء کے درمیان سول ہسپتال کے مردہ خانے میں انسپکٹر سیال کی لاش کا معائنہ کیا۔

گواہ نمبر117' شاہنواز :۔

15-06-96 سے تعینات تھانہ درخشاں کے ایس ایچ او ایس آئی شاہنواز نے وقوع والے دن وائرلیس پر انسپکٹر حق نواز سیال کو یہ کہتے سنا کہ انہیں پیر پر گولی کا زخم آیا ہے اور وہ ہسپتال جا رہے ہیں۔ وہ تھانہ کلفٹن سے بول رہے تھے۔ متعدد تھانوں کے ایس ایچ اوز بشمول گواہ کے جائے وقوع پر بلایا گیا۔ وہ ساڑھے 9 اور پونے دس بجے کے درمیان ڈی آئی جی ہاؤس کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت کوئی فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اے ایس پی رائے طاہر سے ڈی آئی جی ہاؤس کے سامنے ملا جو اس کے پاس تھے' انہوں نے بتایا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے آدمیوں اور پولیس کے درمیان مقابلہ ہوا ہے اور چند لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ چار زخمیوں کو پہلے ہی بھیجا جا چکا ہے گواہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ میر مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی کے 8 ملزمان جو زمین پر بیٹھے تھے' کو تھانے لے جائے اس نے سڑک اور شاہراہ ایران کے مرکزی فٹ پاتھ پر 6 لاشیں دیکھیں' اس نے سڑک پر بہت سارا خون بھی دیکھا' اس نے لاشوں کے قریب میر مرتضیٰ بھٹو کی نجی گاڑیاں نہیں دیکھیں' تاہم پولیس کی متعدد گاڑیاں وہاں موجود تھیں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ پولیس کی کونسی گاڑیاں واقعہ میں ملوث تھیں۔ رائے طاہر نے گواہ سے کہا کہ وہ 8 ملزمان کو گرفتار کرے' مشیر نامہ تیار کرے اور انہیں تھانہ لے جائے' رائے

طاہر کی ہدایت پر گواہ کو 11 آتشیں ہتھیار دیئے گئے۔ اس نے یہ 11 ہتھیار تھانہ کلفٹن کے ہیڈ محرر کے حوالے کئے۔ اس نے یہ ہتھیار درخشاں تھانے کے مال خانے میں جمع نہیں کرائے۔ گواہ کے مطابق یہ ہتھیار کلفٹن تھانے کے مال خانے میں جمع کرانے کے لئے تھانہ کلفٹن کے ہیڈ محرر کے حوالے کئے گئے تھے۔

گواہ نے یہ نہیں بتایا کہ کس سے یہ ہتھیار برآمد کئے گئے تھے۔ واقعہ سے متعلق کسی کیس میں اسے تحقیقاتی افسر نہیں بتایا گیا۔ اس نے نہ تو کوئی خالی خول جائے وقوع پر دیکھا اور نہ ہی کوئی خول اس کے حوالے کیا گیا۔ اس سوال پر کہ کیا روزنامچے میں 8 ملزمان جنہیں تھانے لایا گیا اور لاک اپ کیا گیا' کے بارے میں کوئی اندراج کیا گیا۔ گواہ نے جواب دیا کہ اس وقت افراتفری کا عالم تھا اور ان کی گرفتاری کے بارے میں اندراج تھانہ کلفٹن کے روزنامچے میں نہیں کیا گیا۔ گواہ کے مطابق اس وقت کی افراتفری کی صورتحال کے پیش نظر اندراج کا کام معرض التوا میں ڈال دیا گیا تھا۔ رات گئے اسے یہ علم ہوا کہ تھانے کے کمپاؤنڈ میں چند ایمبولینس پارک کی گئی ہیں اور ان میں چند لاشیں ہیں۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آیا ایمبولینس پولیس مقابلہ کے بغیر آئی تھیں۔ اسے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ کس نے یہ لاشیں تھانے بھجوائیں۔ اس نے لاشوں کے بارے میں کوئی کاغذ نہیں دیکھے۔ لاشوں کی شناخت لاک اپ کئے گئے دو ملزمان کے ذریعے کی گئی۔ اس کے بعد ایمبولینسوں کو جناح ہسپتال بھجوا دیا گیا۔ گواہ کے مطابق اس وقت ایس پی شکیب قریشی تھانہ کلفٹن میں موجود تھے اور انہوں نے گواہ کو حکم دیا کہ لاشوں کو جناح ہسپتال بھجوایا جائے۔

گواہ نے ملزمان سے برآمد کئے گئے ہتھیاروں کے بارے میں مشیر نامہ تیار کیا۔ اس پر میرے دستخط کے علاوہ تھانہ نیپیئر کے ایس ایچ او آغا محمد جمیل اور تھانہ گارڈن کے ایس ایچ او شبیر احمد قائم خانی کے بھی بطور گواہ دستخط تھے۔ اس پر 96-09-20 کی تاریخ اور وقت 10 بجکر 25 منٹ درج تھا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ مشیر نامہ جائے وقوع پر تیار نہیں کیا گیا تھا' تاہم یہ تھانے میں اگلی صبح تیار کیا گیا۔ مشیر نامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس ملزم سے کونسا ہتھیار برآمد کیا گیا۔ مشیر نامے کے مطابق گرفتار 8 ملزمان میں سے 6 کے پاس سے 6 ہتھیار برآمد کئے گئے۔ ملزم آصف اور اختر سے کوئی ہتھیار برآمد

نہیں ہوا۔ مشیر نامے کے مطابق مرنے والے 6 افراد میں سے 5 سے بھی ہتھیار برآمد ہوئے۔ تاہم عاشق جتوئی سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ ہتھیار حوالے کرتے وقت نہ تو اسے ایس پی طاہر اور نہ ہی کسی دوسرے پولیس افسر نے اسے یہ بتایا کہ کس ملزم سے کونسا ہتھیار برآمد ہوا۔

گواہ کے مطابق ملزم سے دوران تفتیش اسے یہ علم ہوا کہ کونسا ہتھیار اس کے قبضے سے برآمد ہوا' اس نے یہ تسلیم کیا کہ مشیر نامے میں یہ غلط درج ہے کہ یہ جائے وقوع پر 45-21 پر تیار ہوا۔

گواہ کے مطابق ہتھیاروں کی برآمدگی سے متعلق مشیر نامہ 96-09-21 کو 9 سے 10 بجے صبح کے درمیان پولیس اسٹیشن میں تیار ہوا۔ مشیر نامے میں یہ بات موجود ہے کہ مرنے والے 6 افراد میں سے 5 مرے نہیں تھے بلکہ وہ زخمی تھے اور انہیں ہسپتال بھیجا گیا تھا۔ اس بارے میں سوال پر انہوں نے کہا کہ یہ حفظ ماتقدم کے طور پر لکھ دیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ ممکن ہے کہ مرنے والوں میں سے بعض افراد زندہ ہوں۔ گواہ کے مطابق موقع پر ہتھیاروں کو سیل نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم اگلے دن تھانے میں انہیں سیل کیا گیا' گواہ کے مطابق تھانے کے ریکارڈ میں ہتھیاروں کے جمع کرانے کا اندراج اگلے دن کیا گیا اور اس کا اس وقت تک انتظار کیا گیا کہ جب تک روزنامچے میں اس کا اندراج نہ ہو جائے' اسی وجہ سے یہ رکا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ بتایا کہ ایس پی شکیب قریشی واقعہ کے بعد سے 2 سے تین دنوں تک روزانہ تھانے میں بیشتر وقت گزارتے تھے اور وہ تمام اقدامات اور کارروائیوں سے آگاہ تھے۔ سوال پر کہ آیا اس نے تباہ شدہ گاڑیاں دیکھی تھیں جیسا کہ اس نے مشیر نامے میں ذکر کیا ہے۔

اس نے بتایا کہ اس نے اسی شب گاڑیاں نہیں دیکھی تھیں لیکن اگلے دن اس نے یہ گاڑیاں دیکھیں اور جہاں تک مشیر نامے میں ذکر کی گئی گاڑیوں کا تعلق ہے تو وہ مرتضیٰ بھٹو کے قافلے کی گاڑیاں تھیں اور اس نے سرکاری پولیس گاڑیوں کا حوالہ نہیں دیا تھا جو کہ واقعہ میں ملوث تھیں اور جو اس نے نہیں دیکھیں تھیں۔ اس نے مشیر نامہ اگلے دن تیار کیا تھا مشیر نامے میں ذکر ہے کہ پولیس کی گاڑیاں بھی تباہ ہوئی تھیں لیکن گواہ کے مطابق اس نے تباہ ہونے والی یہ گاڑیاں نہیں دیکھی تھیں۔

اس نے یہ تسلیم کیا کہ تمام مشیر نامے اور اندراج اگلے دن صبح تیار ہوئے' اس نے نہ تو جائے وقوع پر سے کوئی خالی خول اٹھایا اور نہ ہی اس نے اپنی موجودگی میں برآمد ہونے والا کوئی خول دیکھا اور اس نے تھانہ کلفٹن میں اگلے دن چند خالی خول پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔ گواہ کے مطابق ایس پی شکیب قریشی اور اے ایس پی رائے طاہر کیس کا ریکارڈ جس طرح تیار ہو رہا تھا اس کے انداز سے پوری طرح مطمئن تھے۔ ایس ایس پی درانی بھی تمام حقائق سے آگاہ تھے اور وہ بھی مطمئن تھے۔ گواہ کے مطابق جب وہ جائے وقوع پر تھا تو اس نے کسی پولیس افسر کو تصویر بناتے نہیں دیکھا۔

گواہ نمبر118' کانسٹیبل مشتاق احمد:۔

وہ دو تلوار کے قریب پولیس ٹریفک سیکشن پر ڈیوٹی پر تھا اور وہ عینی گواہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ جائے وقوع کی طرف گیا۔

گواہ نمبر119' کانسٹیبل ذوالفقار:۔

یہ بھی دو تلوار کے قریب ٹریفک پولیس چوکی پر تعینات تھا۔ گواہ کے مطابق فائرنگ 8 بجکر 55 منٹ پر شروع ہوئی' جو 15 سے 20 منٹ تک جاری رہی۔ وہ زخمی ٹیکسی ڈرائیور بچل کو پہلے مڈایسٹ ہسپتال لے کر گیا جہاں اسے داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا' اس کے بعد وہ اسے ایدھی ایمبولینس میں جناح ہسپتال لے کر گیا۔

گواہ نمبر120' منیر احمد:۔

گواہ نمبر121' محمد اکرم:۔

دونوں پولیس کانسٹیبل دو تلوار پر ٹریفک کی ڈیوٹی پر تھے' دونوں عینی گواہ نہیں ہیں۔

گواہ نمبر122' ہیڈ کانسٹیبل محمد نذیر:۔

یہ پولیس ٹیلی کیمونی کیشن ڈیپارٹمنٹ میں وقوع والی رات تعینات تھا۔ یہ دو تلوار کے قریب پولی چوکی میں وائرلیس آپریٹر تھا اور اس نے ٹریفک چینل نمبر 7 کے حوالے سے اندراج کے بارے میں بتایا۔

گواہ نمبر123' ڈاکٹر راجہ محمد شہزاد خان:۔

جو آغا خان ہسپتال میں سرجن تھے اور انہوں نے اے ایس پی شاہد حیات کا آپریشن کیا۔

گواہ نمبر124' بے نظیر بھٹو:۔

انہوں نے بتایا کہ یہ ایک گہری سازش ہے جس کا نتیجہ ان کے بھائی میر مرتضیٰ کا قتل ہے۔ ان کے مطابق اس سازش کے تین عناصر ہیں پہلا تو یہ کہ ان کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو ختم کر دیا جائے' دوسرا اس قتل میں ان کے شوہر آصف علی زرداری کو ملوث کیا جائے' تیسرا یہ کہ ان کی حکومت کو غیر مستحکم یا اسے ہٹایا جائے' انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جون 1996ء میں انہیں یہ علم ہوا کہ ان کے خلاف سازش ہو رہی ہے لیکن انہیں یہ علم نہیں تھا کہ صدر پاکستان اس سازش کا حصہ ہیں۔ بے نظیر کے مطابق وہ واحد شخص جو سازش کرنے والوں کو میر مرتضیٰ کو ختم کرنے کی یقین دہانی کرا سکتا ہے وہ صدر پاکستان تھے۔ انہوں نے (بے نظیر) خود کو بطور گواہ دوران تحقیقات بیان دینے کے لئے پیش نہیں کیا کیونکہ تحقیقاتی ایجنسی نے ان سے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ بطور گواہ آگے آئیں۔ انہوں نے اس تھیوری کو بھی رد کر دیا کہ مذکورہ واقعہ پولیس مقابلے کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے اس شبے کا اظہار کیا کہ سجاد اور یار بلوچ وہ افراد ہو سکتے ہیں' جنہوں نے شاید فائر کیا ہو اور جس کے نتیجے میں سانحہ رونما ہوا' انہوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ سازش کے پیچھے مرکزی آئیڈیا یہ تھا کہ ایک بھٹو کو قتل کر کے دوسرے بھٹو کو ختم کر دیا جائے۔ بے نظیر کے مطابق یہ واضح ہدایات تھیں کہ 70 کلفٹن کے

تقدس کا احترام کیا جائے اور مرتضیٰ بھٹو کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ان تمام کارروائیوں کے پیچھے ایک خفیہ ہاتھ تھا اور وہ خفیہ ہاتھ صدر فاروق احمد لغاری تھے۔

گواہ نمبر125 :-

125 نمبر کا کوئی گواہ نہیں ہے غلطی سے غنویٰ بھٹو کو گواہ نمبر 126 ظاہر کیا گیا جبکہ ان کا نمبر125 ہے۔

گواہ نمبر126، مرتضیٰ بھٹو کی بیوہ غنویٰ بھٹو :-

انہوں نے بتایا کہ وہ کس طرح سے اس واقعے کے بارے میں آگاہ ہوئیں۔ انہوں نے ایف آئی آر کے اندراج کے بارے میں بھی اپنی کوششوں سے آگاہ کیا کہ انہوں نے سندھ ہائیکورٹ میں ایک رٹ پٹیشن دائر کی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب بے نظیر بھٹو انہیں 70 کلفٹن میں ملیں تو انہوں نے الزام لگایا کہ مڈایسٹ ہسپتال کا عملہ غفلت کا مرتکب ہوا جس کے نتیجے میں مرتضیٰ بھٹو کی موت واقع ہوئی۔ تاہم اس گواہ نے انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ مرتضیٰ کی موت کی ذمہ دار پولیس ہے۔

گواہ نمبر127، ڈاکٹر سکندر علی شاہ :-

جو کیمیکل ایگزامنر ہیں اور انہوں نے اپنی رپورٹ کے مندرجات پیش کیے۔

گواہ نمبر128، ملزم شبیر احمد :-

وہ بیان ہے جو تحریری طور پر ملزم شبیر احمد قائم خانی کا ہے، جو اس وقت تھانہ گارڈن کے ایس ایچ او تھے۔

گواہ نمبر129، آغا محمد جمیل :-

وہ بیان ہے جو تحریری طور پر ملزم آغا محمد جمیل کا ہے، جو اس وقت تھانہ نیپیئر کے ایس ایچ او تھے۔

گواہ نمبر130، ڈاکٹر شبیر احمد شیخ :-

کیمیکل ایگزامینر ڈاکٹر شبیر احمد شیخ جنہوں نے ایکس 130/1 سے 130/15 پیش کیں۔

گواہ نمبر131، انسپکٹر حق نواز سیال :-

انسپکٹر حق نواز سیال کا ایس ایس پی ڈسٹرکٹ ساؤتھ کراچی کے نام 27 نومبر 1996ء کو تحریر کردہ خط ہے جس میں میڈیکو لیگل بورڈ کی اس رائے پر اعتراض کیا گیا ہے کہ انہیں لگنے والا زخم خود ان کا لگایا ہوا ہے۔

گواہ نمبر132، ایس پی شکیب قریشی :-

ایس پی (انوسٹی گیشن) شکیب قریشی کا جے پی ایم سی سے میڈیکو لیگل رجسٹر ہٹانے سے متعلق انکوائری منعقد کرنے کے بارے میں 6 اکتوبر 1996ء کو تحریر کردہ خط ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے تحقیقات کی، ان کے مطابق میڈیکو لیگل رجسٹر میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی۔ یہ چھوٹا سا معاملہ معلوم ہوتا ہے اور متعلقہ اے ایس آئی باسط علی کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کی جا رہی ہے۔

گواہ نمبر133، غلام عباس جعفری :-

غلام عباس جعفری جو بحیثیت اے آئی جی کرمنلسٹک ڈویژن سندھ پولیس میں متعین ہیں۔ ان کا دفتر پولیس ہیڈکوارٹر گارڈن روڈ کراچی میں واقع ہے۔ انہوں نے

کلفٹن پولیس اسٹیشن کی جانب سے بھیجے جانے والے اسلحہ کے ٹیسٹ کی تفصیلات بیان کیں اور اپنی رپورٹ نمبر 133/1 پیش کی۔ ٹریبونل کو اس گواہ کی شہادت ریکارڈ کرنے میں مشکل تھی اس لئے گواہ کو تحریری بیان مع دستاویزات تیار کرنے کی ہدایت کی گئی' دوسری تاریخ پر انہوں نے اپنا تحریری بیان (ایکس 133/1) پیش کیا جو انہوں نے ٹریبونل کے سامنے پڑھا اور دستاویزات ایکس A-1 / 133 سے 133/60 تک بھی پیش کیں۔

گواہ نمبر 134' رائے طاہر:۔

ملزم رائے طاہر سابق اے ایس پی درخشاں کا تحریری بیان' ان کے وکیل مسٹر کے کے آغا نے پیش کیا۔

گواہ نمبر 135' اے ایس پی شاہد حیات :۔

اے ایس پی شاہد حیات کا تحریری بیان ہے۔ یہ بیان ایڈووکیٹ کے کے آغا نے پیش کیا اور ریکارڈ پر لیا گیا۔

گواہ نمبر 136' رحیم بخش جمالی ایڈووکیٹ :۔

انہوں نے دو تحریری بیانات داخل کئے تھے اور ان پر جرح بھی کی گئی تھی انہوں نے تفصیلاً" بیان کیا کہ انہیں رکن سندھ پبلک سروس کمیشن عبداللطیف عباس کے ذریعے معلوم ہوا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو ختم کرنے کے لئے اس وقت کے وزیراعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ اور آصف علی زرداری نے ایک سازش تیار کی ہے۔

(19) حوالے کی اصطلاحات

حوالے کی اصطلاحات (الف) واقعے کی تحقیقات کرنا اور فائرنگ کے واقعے کے بارے میں ان حالات کا تعین کرنا ہے جن میں رکن سندھ اسمبلی میر مرتضیٰ بھٹو اور چھ دیگر افراد کی اموات ہوئی تھیں اور چھ افراد زخمی ہوئے تھے۔ کل ہلاک شدگان 8 ہیں

کیونکہ ایک زخمی اگلے دن جاں بحق ہوگیا تھا۔

کلفٹن تھانے میں درج 1996ء کی ایف آئی آر نمبر 386 شکایت کنندہ کلفٹن پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او انسپکٹر حق نواز سیال اور پولیس کی جانب سے دیئے جانے والے ثبوت کے مطابق پولیس کی فائرنگ سے مرحوم میر مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی کے چھ ارکان موقع ہی پر ہلاک اور دیگر زخمی ہوئے تھے۔ ایف آئی آر اور پولیس کی شہادتوں کے مطابق پولیس نے اپنے دفاع میں فائرنگ کی تھی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں نے پولیس پر پہلے فائر کئے تھے۔ پولیس رات کو تقریباً" 9 بجکر 20 منٹ پر مرتضیٰ بھٹو کو موبائل میں "دو تلوار" چوراہے کے دوسری جانب واقع مڈایسٹ ہسپتال لے گئی اور انہیں ہسپتال کے دروازے پر چھوڑ دیا۔ ہسپتال میں انہیں طبی امداد دی گئی لیکن نصف شب سے چند منٹ قبل ان کی موت کا اعلان کیا گیا۔ بجلی نامی زخمی شخص کا اگلے دن جناح ہسپتال میں انتقال ہوگیا اس طرح مرنے والوں کی تعداد 8 ہوگئی۔

(I) پولیس کے موقف کے مطابق شہر میں دہشت گردی کے متعدد واقعات ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں اطلاع ملی تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی کے ارکان اور ان کے محافظ دہشت گردی اور ملک کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ 17 ستمبر 1996ء کو پیش آیا جب کراچی میں سی آئی اے کے دو سینٹروں پر مرحوم مرتضیٰ بھٹو اور ان کے چند ساتھیوں نے حملہ کیا۔ حملہ آوروں نے سی آئی اے سینٹرز میں پولیس اہلکاروں کو غیر مسلح کر دیا اور ان کی بے عزتی کی۔ یہ لوگ مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی کے ایک عہدیدار علی سنارا کی تلاش میں آئے تھے جسے پولیس نے مبینہ دہشت گردی اور ملک کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ اگلے دن یعنی 18 ستمبر 1996ء کو کراچی میں بم پھٹنے کے دو واقعات ہوئے۔ ایک کراچی جم خانہ اور دوسرا سندھ سیکریٹریٹ کے قریب۔ پولیس کے مطابق علی سنارا نے دوران تفتیش بیان دیا تھا کہ یہ بم دھماکے اس کے ساتھیوں نے کئے ہیں۔ پولیس مرحوم مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں کو تلاش کر رہی تھی جنہوں نے سی آئی اے کے دو مراکز پر حملے کئے تھے۔ پولیس کو یہ اطلاع تھی کہ مرتضیٰ بھٹو کے محافظ بلا لائسنس اسلحہ کے ساتھ گھومتے ہیں۔ اس وقت کے ایس ایس پی ساؤتھ کراچی واجد درانی اور شعیب سڈل کے مطابق

دہشت گرد مرتضیٰ بھٹو کی رہائش گاہ 70 کلفٹن میں رہائش پذیر ہیں لیکن اس وقت کی وزیراعظم بینظیر بھٹو کی واضح ہدایات تھیں کہ پولیس یا دیگر ایجنسیوں کے اہلکار 70 کلفٹن میں داخل نہ ہوں۔ واجد درانی کے مطابق مجرموں کو (ماسوائے مرتضیٰ بھٹو کے جن کے لئے اس وقت کی وزیراعظم کی اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ کے رابطے کے ذریعے واضح ہدایات تھیں کہ انہیں ہاتھ نہ لگایا جائے) 70 کلفٹن سے باہر گرفتار کرنے کی متعدد بار کوشش کی گئی لیکن پولیس اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئی اور ملزم 20 ستمبر 1996ء تک 70 کلفٹن میں روپوش رہے اور باہر نہیں آئے۔ تاہم 70 کلفٹن' اس کے اندر جانے اور باہر آنے والے افراد پر نظر رکھی گئی۔ واجد درانی کے مطابق 20 ستمبر 1996ء کو انہیں اطلاع ملی کہ مرتضیٰ بھٹو اپنے محافظوں کے ساتھ سرجانی ٹاؤن میں جلسے میں شرکت کے لئے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے انہیں 70 کلفٹن سے باہر آنا پڑے گا۔ پولیس کے لئے محافظوں کو روکنے' بلا لائسنس اسلحہ کے لئے ان کی تلاشی اور انہیں حراست میں لینے کا موقع تھا۔ مرتضیٰ بھٹو' عاشق حسین جتوئی اور ان کے محافظوں کو لے کر 6 بجے شام سے تھوڑی دیر قبل 70 کلفٹن سے گاڑیوں کا قافلہ باہر آیا۔ پولیس کے موقف کے مطابق اس وقت پولیس فورس کی وافر نفری علاقے میں نہیں پہنچ سکی اور اس وقت کوئی کارروائی نہیں کی جا سکی۔ واجد درانی نے مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ جانے والی گاڑیوں کو واپسی پر روکنے کا منصوبہ بنایا تاکہ محافظوں کی غیر قانونی اسلحہ کے سلسلے میں تلاشی لیں اور انہیں گرفتار کیا جا سکے۔ واجد درانی کے مطابق گاڑیوں کو روکنے کے لئے انہوں نے جس مقام کا انتخاب کیا وہ 70 کلفٹن کے قریب مین شاہراہ ایران پر ڈی آئی جی ہاؤس کے بالکل سامنے اور "دو تلوار" چوراہے سے جاتے ہوئے کلفٹن کی طرف تھا۔ 70 کلفٹن میں داخل ہونے سے قبل مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھیوں کے اس مقام سے گزرنے کا قوی امکان تھا۔ دیگر چیک پوسٹوں کا بھی انتخاب کیا گیا۔ منتخب مقامات پر مسلح پولیس کے دستے' پولیس کی گاڑیاں بشمول بکتر بند متعین کر دی گئیں۔ پولیس کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو کے کاروں کے قافلے کو روکا گیا تو مرتضیٰ بھٹو کی ہدایت پر ان کے محافظوں نے پولیس پارٹی پر فائر کر دیئے۔ پولیس کو بھی اپنے دفاع میں جوابی فائر کرنے پڑے جس کے نتیجے میں میر مرتضیٰ

بھٹو سمیت ان کے گروپ کے آٹھ افراد کی موت واقع ہوئی اور ان کے چار ساتھی زخمی بھی ہوئے جبکہ ایک گولی سے انسپکٹر حق نواز سیال کے بائیں پیر پر معمولی زخم آیا اور ایک گولی اے ایس پی شاہد حیات کی بائیں ران پر لگی۔ پولیس کا موقف یہ ہے کہ اس نے ایس ایس پی واجد درانی کے حکم کے تحت مرتضیٰ بھٹو کے مسلح محافظوں کو روکنے' تلاشی لینے' سی آئی اے پر حملوں کی تصدیق اور انہیں گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جب انہیں روکا گیا تو مرتضیٰ بھٹو کی ہدایت پر انہوں نے پولیس پر گولیاں چلائیں جس سے دو پولیس افسر زخمی ہوگئے اور دفاع میں جوابی فائرنگ سے مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی کے آٹھ ارکان کی موت واقع ہوئی اور ان کے چار ساتھی زخمی بھی ہوئے۔ پولیس موقف کے مطابق مرتضیٰ بھٹو' ان کے ساتھیوں اور ان کے گروپ کے افراد کو ہلاک کرنے کی کسی بھی مرحلے یا سطح پر کوئی سازش نہیں تھی۔ پولیس کی اپنے دفاع میں کی گئی فائرنگ سے یہ افراد ہلاک ہوئے اور ان میں سے متعدد زخمی ہوئے۔ یہ غیر متوقع مقابلہ تھا۔

(II) پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو گروپ) کی جانب سے پیش کیا جانے والا دوسرا موقف یہ ہے کہ واقعے کے حالات وہ نہیں ہیں جو پولیس نے بیان کئے ہیں بلکہ میر مرتضیٰ بھٹو کو ہلاک کرنے کی سازش ضلع حیدر آباد میں شادی کی ایک تقریب میں تیاری کی گئی۔ سازش کرنے والے آصف زرداری' ڈی آئی جی شعیب سڈل' واجد درانی اور دیگر افراد تھے۔ اس منصوبے کو 19 ستمبر 1996ء کو کراچی میں وزیراعلیٰ ہاؤس میں ایک میٹنگ میں حتمی شکل دی گئی جس میں سید عبداللہ شاہ' آصف علی زرداری' آغا سراج' ستار گیریو رکن سندھ اسمبلی ذوالفقار مرزا' انٹیلی جنس کے مسعود شریف' درانی' سڈل اور انسپکٹر حق نواز سیال نے شرکت کی تھی۔ مرتضیٰ بھٹو اور ان کے آٹھ ساتھیوں کی ہلاکت اور ان کے چار آدمیوں کا زخمی ہونا پہلے سے تیار منصوبہ کا نتیجہ تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو گروپ) اور متاثرین کی جانب سے دریافت کئے جانے والے سوالات کے ذریعے یہ موقف پولیس کے گواہان کے سامنے رکھا گیا اور مندرجہ ذیل گواہان نے بھی پولیس کو اپنے بیانات میں سازش کے بارے میں ذکر کیا۔

(الف) عبداللہ بلوچ (گواہ نمبر 96)

(ب) ڈاکٹر الطاف خواجہ (گواہ نمبر102)

(ج) احسان الحق بھٹی (گواہ نمبر112)

(د) اسحاق خاکوانی (گواہ نمبر113)

(ہ) راؤ اے رشید (گواہ نمبر114)

(و) رحیم بخش جمالی (گواہ نمبر136)

(ز) مسز غنویٰ بھٹو (گواہ نمبر126)

(III) سابق وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو نے ایک دوسرا موقف پیش کیا' جنہیں ٹریبونل نے اپنا بیان دینے کے لئے طلب کیا تھا۔ ان کے مطابق ان کے حقیقی بھائی میر مرتضیٰ کی ہلاکت سازش کا نتیجہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک خفیہ ہاتھ ہے۔ بے نظیر بھٹو کی تھیوری یہ تھی کہ خفیہ ہاتھ کے ایک یا زائد افراد پولیس یا میر مرتضیٰ کے آدمیوں میں شامل کر دیئے گئے تھے جنہوں نے پہلی گولی یا گولیاں چلائیں اور فائرنگ شروع ہوگئی جس کے دوران ان کا بھائی اور متعدد دیگر افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوگئے۔ بینظیر بھٹو کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو کی ہلاکت حادثہ نہیں ہے بلکہ ان کی منتخب حکومت کا تختہ الٹنے اور انہیں وزیراعظم کے عہدے سے ہٹانے کی بدترین سازش کا نتیجہ ہے۔ اس منصوبے کا ایک حصہ میر مرتضیٰ کو ہلاک کرنا اور ہلاکت میں ان کے شوہر کو ملوث کرنا ہے تاکہ حکومت کو بدنام کیا جائے اور ان کے لئے ملک میں نفرت پیدا کی جائے۔ ان کے مطابق ان کے بھائی میر مرتضیٰ کی ہلاکت ان کی حکومت کو متزلزل کرنے کے بڑے تر منصوبے کا ایک حصہ ہیں۔ اس حادثے کا ذمہ دار خفیہ ہاتھ صدر فاروق احمد لغاری کا تھا جو ملک پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بینظیر بھٹو کے مطابق "ایک بھٹو کو قتل کر کے دوسرے بھٹو پر قابو پاؤ" کا طریقہ استعمال کیا گیا۔ بینظیر بھٹو نے دعویٰ کیا کہ ان کی حکومت اور ان پر قابو پانے کے لئے وہ حتمی ہدف ہیں۔ ایک دوسرا بھٹو قتل کر دیا گیا۔

(IV) تاہم ایک دوسرا موقف یہ ہوسکتا ہے کہ پولیس کی جانب سے یہ ماورائے عدالت ہلاکتوں کا کیس ہے۔ پولیس نے میر مرتضیٰ کے گن مینوں' محافظوں اور دیگر ساتھیوں کی ملک دشمن اور دہشت گردی کی سرگرمیاں درحقیقت روک دی تھیں۔

انہیں گرفتار کرکے عدالتوں میں پیش کرنے سے زیادہ وقت لگ سکتا تھا۔ ثبوت دستیاب نہ ہونے اور ملزمان کے خلاف مقدمات میں گواہان کے خوفزدہ ہونے یا اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنے کے باعث اعلیٰ سطح پر میر مرتضیٰ کی پارٹی کے مسلح ارکان کو ختم کرنے اور ہلاکتوں کو حقیقی مقابلے کا نتیجہ ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ اس وقت کی وزیراعظم کی واضح ہدایات تھیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو گرفتار نہ کیا جائے بلکہ انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا جائے۔ اس موقف کے مطابق میر مرتضیٰ کو ہلاک کرنے کا کوئی منصوبہ یا سازش نہیں تھی بلکہ ان کے گروپ کے مسلح ارکان کو ہلاک کرنے کا منصوبہ تھا اور اسے ایک مقابلہ دکھایا گیا۔ اس موقف کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو کو جان بوجھ کر ہلاک نہیں کیا گیا کیونکہ وہ موجودہ وزیراعظم کے بھائی تھے اور انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچنے کی صورت میں انکوائری ہوگی جس سے پولیس اور دیگر ملوث افراد پر انگلی اٹھ سکتی ہے۔

(20) حکومت سندھ کی نمائندگی کرنے والے مسٹر اختر علی جی قاضی' مسز غنویٰ بھٹو' پاکستان پیپلزپارٹی (ش ب) گروپ اور ملزم کے وکلاء کے پیش کردہ دلائل کا اب حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

مسٹر اختر علی جی قاضی کے دلائل

مسٹر اختر علی جی قاضی نے اپنے پیش کردہ دلائل میں کہا کہ یہ پہلے سے منصوبہ بند کارروائی تھی جس کے نتیجے میں میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھی ہلاک کر دیئے گئے۔ ان کے مطابق 20 ستمبر 1996ء کو دن کو گیارہ بجے ڈی آئی جی نے علاقے کے ایس ایس پی واجد درانی کو ٹیلی فون کیا اور 70 کلفٹن کے گن مینوں کے خلاف کارروائی کے سلسلے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ ڈی آئی جی نے انہیں ہدایت کی کہ مزید کوششیں کی جائیں۔ وہ ایک نااہل افسر ہیں اور بم دھماکوں کے کیس میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی ہے۔ اس دباؤ کے نتیجے میں درانی نے ٹیلی فون پر اے ایس پیز اور دیگر پولیس افسران کو ہدایات جاری کیں۔ درانی نے ٹیلی فون پر سنڈل کو پورے منصوبے سے متعلق آگاہ کیا جنہوں نے اس منصوبے کی منظوری دی۔ درانی' میر مرتضیٰ

پارٹی کی آمد سے آدھ گھنٹہ قبل اس مقام پر پہنچ گئے۔ تمام پولیس اہلکار اور پولیس کی گاڑیاں مقررہ مقامات پر متعین کر دی گئیں۔ اہم چیک پوسٹ مین شاہراہ ایران پر ڈی آئی جی کی رہائش گاہ کے بالکل سامنے تھی' تاہم سڈل نے اپنی گواہی میں کہا کہ درانی نے ان سے ایسے کسی منصوبے کے بارے میں بات چیت نہیں کی تھی۔ سڈل آٹھ بجے شب اپنے مکان پر آئے لیکن جائے وقوع پر انہوں نے متعین پولیس یا گاڑیاں نہیں دیکھیں۔

جبکہ درانی نے بیان دیا کہ ڈیوٹی پر موجود پولیس افسران نے انہیں اطلاع دی کہ جائے وقوع پر ساڑھے سات بجے شب سے آٹھ بجے کے درمیان تمام پولیس فورس متعین کر دی گئی ہے۔ مسٹر قاضی کے مطابق اس تجویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ سڈل کے شام کی چہل قدمی سے گھر واپس آنے سے قبل پولیس اور گاڑیاں اپنی پوزیشنیں لے چکی تھیں۔ وقوع کے بعد پولیس گاڑیاں ہٹالی گئی تھیں اور وقوع کے منظر کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا تھا۔ واردات کا کوئی خاکہ تیار نہیں کیا گیا۔ یہ بتانے کے لئے کوئی نقشہ (Plan) نہیں تیار کیا گیا کہ وقوع سے پہلے کی گاڑیاں کہاں کہاں کھڑی تھیں یہ بھی نہیں دکھایا گیا کہ پولیس نے میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کی پارٹی پر کہاں سے فائرنگ کی۔ وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ ویڈیو فلم بنائی جاسکتی تھی لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ پورے وقوعہ کو سینئر پولیس افسران نے دیکھا تھا جو واردات کی جگہ موجود تھے اور ان کی ہدایات پر واردات کی جگہ سے پولیس گاڑیاں ہٹا دی گئیں اور جائے واردات سے دوسری شہادتیں ضائع کر دی گئیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو دوسرے زخمیوں کے ساتھ جائے واردات پر شدید زخمی حالت میں پڑے تھے لیکن پولیس افسران نے ان کے ساتھیوں یا ان کے قریب جانے کی پرواہ نہیں کی۔ مسٹر اختر قاضی نے مزید کہا کہ درخشاں تھانے کے ایس ایچ او سب انسپکٹر شاہنواز (گواہ نمبر 117) نے کہا ہے کہ جائے وقوع پر اے ایس پی طاہر حیات نے اسے بتایا کہ پولیس اور میر مرتضیٰ بھٹو کے آدمیوں کے درمیان تصادم ہوا ہے جس کے دوران بعض لوگ زخمی ہوگئے ہیں اور زمین پر پڑے ہیں اور وہ انہیں پولیس اسٹیشن لے جائے۔ شاہنواز نے مزید کہا کہ اس نے میر مرتضیٰ بھٹو کی گاڑیاں مردہ افراد کے قریب نہیں دیکھیں وہاں متعدد پولیس گاڑیاں تھیں لیکن وہ یہ

نہیں جانتا کہ کون کون سی گاڑیوں نے واردات میں حصہ لیا ہے۔ اے ایس پی درخشاں نے اسے ہدایات کی کہ آٹھ ملزمان کو تھانے لے جاؤں۔ اے ایس پی طاہر نے تھانے لے جانے کے لئے ملزمان سے برآمد ہونے والے 11 ہتھیار بھی دیئے۔ اس نے ملزمان کے خلاف 13 ڈی کے مقدمات درج کئے اور 11 ہتھیاروں کو کلفٹن تھانے کے ہیڈ محرر کے حوالے کیا۔ ان شکایات میں ملزمان کے نام درج ہیں۔ لیکن پولیس کے مؤقف کے مطابق ملزمان میں سے چھ کا واردات کی جگہ ہی پر انتقال ہوگیا تھا۔ اس طرح مردہ افراد کے خلاف ایف آئی آر غلط درج کی گئی اور ایف آئی آر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی موت واقع نہیں ہوئی تھی اور انہیں طبی امداد کے لئے ہسپتال بھیجا گیا تھا۔ ان کی زندگیاں بچائی جاسکتی تھیں۔ پولیس نے تمام مشیرناموں کی تیاری دوسرے دن پولیس اسٹیشن میں کی۔ کسی آزاد شخص کو مشیر نہیں بنایا۔ واردات سے متعلق تمام اشیا اور مواد کو جائے واردات پر نہیں بلکہ دوسرے دن تھانے میں سیل کیا گیا۔ یہ دلیل دی گئی کہ اسٹیشن ڈائری میں اندراج ایس پی تفتیش شکیب قریشی سمیت اعلیٰ افسران کی ہدایات پر کیا گیا۔ پولیس نے اعلیٰ پولیس حکام کے اور دیگر کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے قواعد اور ضوابط کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ حق نواز سیال جو کلفٹن تھانے کا ایس ایچ او تھا 8 بجکر 45 منٹ پر زخمی حالت میں کلفٹن تھانے پہنچا۔ سب انسپکٹر خرم وارث (گواہ نمبر 94) کے مطابق اسٹیشن ڈائری میں کوئی اندراج نہیں کیا گیا اور یہ کہ جب وہ واردات کی جگہ پہنچا اسٹریٹ کی لائٹیں آف تھیں اور پورے علاقے کی ناکہ بندی تھی اور یہ کہ اس نے کلفٹن گارڈن کے قریب پارک پر پرائیویٹ گاڑیاں دیکھیں اور شکیب قریشی دوسرے پولیس افسران اور پولیس والوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ خرم وارث نے مزید بتایا کہ وقوعہ کی تمام تفتیش ایس ایس پی واجد درانی' ایس پی شکیب قریشی اور دوسرے سینئر پولیس افسران کی موجودگی میں کی گئی اور یہ کہ اس نے مشیر نامے پر شکیب قریشی اور اے ایس پی طاہر کی منظوری کے بعد دستخط کئے۔ اس گواہ کے مطابق تمام کی تمام تفتیش ایس پی شکیب قریشی اور اے ایس پی رائے طاہر نے کی۔ چنانچہ اختر علی قاضی نے کہا کہ واقعہ کی تفتیش قواعد کے مطابق نہیں کی گئی کیونکہ تفتیش کرنے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ طبی شہادت

سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق نواز سیال کو لگنے والا زخم خود لگایا گیا زخم تھا' جس سے ثابت ہوا کہ یہ زخم صرف اس سانحہ کو مقابلہ ثابت کرنے کے شہادت کی فراہمی کے لئے لگایا گیا تھا۔ اے ایس پی شاہد حیات کو لگنے والا زخم اس نوعیت کا ہے کہ یہ خود بھی لگایا جاسکتا تھا۔ شاہد حیات جناح ہسپتال یا کسی دوسرے سرکاری ہسپتال نہیں گیا بلکہ اپنی پسند کے آغا خان ہسپتال گیا۔ جہاں اس کا آپریشن کیا گیا۔ دوسرے ڈاکٹروں نے اپنی رائے کا انحصار آغا خان ہسپتال کی فراہم کردہ معلومات اور مواد ہی پر رکھا ہے۔ اس سانحہ کے بعد اصل عینی گواہ حق نواز سیال ایس ایچ او کلفٹن کو پراسرار حالات میں قتل کر دیا گیا۔ اس کا مقصد بھی شہادت کو ضائع کرنا تھا۔ پولیس اپنی پسند کے میڈیکل افسران چاہتی تھیں۔ یہ غالباً" پہلا شخص ہوگا کہ کسی میڈیکل بورڈ میں کسی غیر سرکاری ڈاکٹر کو شامل کیا گیا۔ اس کا مقصد بھی گواہی کو ضائع کرنا تھا۔ ڈی آئی جی کا طرز عمل ظاہر کرتا ہے کہ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ اس سانحہ کی ٹھیک طرح تفتیش کی جا رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی نہ صرف شہادت کو ضائع کرنے میں ایک فریق تھا بلکہ اس سازش کا حصہ تھا۔ جس کے تحت میر مرتضیٰ بھٹو اور دوسروں کو قتل کیا گیا۔ ڈی آئی جی پولیس ایکشن کو روک سکتا تھا جس سے متعدد جانیں بچ سکتی تھیں۔ اس سانحہ کے فریق مخالف کا موقف پولیس نے ریکارڈ نہیں کیا۔ چیف منسٹر کے کہنے پر زخمی اصغر علی کی ایف آئی آر چیف منسٹر ہاؤس میں درج کی گئی۔ کوئی ایسا قانون موجود نہیں جو وزیر اعلیٰ کو پولیس کی حراست سے کسی ملزم کے طلب کرنے کا اختیار دیتا ہو۔ اس سے ان کا ملوث ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ایک ایم پی اے اور متعدد دوسرے افراد مارے گئے لیکن وزیراعلیٰ اور دیگر حکام نے جائے واردات کا معائنہ نہیں کیا اور اس سانحہ کی تفتیش میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو ختم کرنے کی مجرمانہ سازش موجود تھی۔ گاڑیوں کو پہنچنے والے نقصان کا ذکر ایف آئی آر میں نہیں۔ زخمی ٹیکسی ڈرائیور محمد بچل کو 9 بجکر 25 منٹ پر ہسپتال لے جانے کے لئے وہاں سے منتقل کیا گیا جبکہ سب انسپکٹر شاہ نواز ایس ایچ او درخشاں نے اس کی گرفتاری 9 بجکر 45 منٹ دکھائی ہے۔ مرنے والے افراد کی پوسٹ مارٹم رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر نشانے لے کر جسم کے اہم حصوں پر فائرنگ کی

گئی۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ میر مرتضیٰ بھٹو اور دوسروں کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی پر سنگل شاٹس کے 13 نشان تھے اور چار بقیہ گاڑیوں پر بھی 4 ایسے نشانات تھے۔ اختر قاضی مزید کہتے ہیں کہ مسز غنویٰ بھٹو (گواہ 126) احسان اللہ بھٹی (گواہ نمبر 112)' اسحاق خاکوانی (گواہ نمبر 113) اور راؤ عبدالرشید (گواہ نمبر 114) اور رحیم بخش جمالی (گواہ نمبر 136) نے میر مرتضیٰ بھٹو کو قتل کرنے کی سازش کے بارے میں بیانات دیئے۔ اختر قاضی کہتے ہیں کہ مجرمانہ سازش کو ثابت کرنے کے لئے حقائق اور حالات کا بھی جائزہ لیا جائے کہ اس میں بطور ملزم اس وقت کے وزیراعلیٰ' مسٹر آصف زرداری اور دوسرے بااثر افراد شامل تھے۔ اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس پورے سانحہ پر پردہ ڈالا جائے اور کیس کی تفتیش ان پولیس افسران سے کرائی جائے جو خود اس واردات میں ملوث تھے۔ اس طرح ہر قسم کی شہادت مٹانے کی کوششیں کی گئیں۔ زخمی حق نواز سیال اور اے ایس پی شاہد حیات کو فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا مگر مرتضیٰ بھٹو کو فوری طور پر ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ اختر قاضی نے اپنے دلائل کو سمیٹتے ہوئے مزید کہا کہ 70 کلفٹن پر اتنی بھاری پولیس نفری کی تعیناتی کی ضرورت نہیں تھی اور میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کی پارٹی پر فائرنگ کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ ڈی آئی جی پولیس نے بتایا کہ میر مرتضیٰ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے لئے جس جگہ کا تعین کیا گیا تھا وہ مناسب نہیں تھی۔ حقائق اور حالات انکشاف کرتے ہیں کہ یہ پہلے طے شدہ منصوبہ نہیں تھا کہ آپریشن میر مرتضیٰ بھٹو اور دوسروں کو مارنے کے لئے کیا گیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی جانب سے کوئی اشتعال انگیزی نہیں تھی۔

سابق ڈی آئی جی ڈاکٹر شعیب سڈل' اے ایس پی رائے طاہر اور اے ایس پی شاہد حیات کے تحریری دلائل جو کریم خان آغا ایڈووکیٹ نے پیش کئے

پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ کے وکلاء نے سازش کا جائزہ لیا مگر ان میں سے کوئی ایک بھی واقعہ کا عینی گواہ نہیں ہے۔ اور ان کی گواہی ذاتی رائے پر مبنی ہے

پولیس کی طرف سے فرائض کی ادائیگی سازش نہیں ہے پولیس اپنی ذمہ داریاں ادا کرتی ہے۔ پولیس اس ملزم کو گرفتار کرتی ہے جس نے سی آئی اے کے مراکز پر حملے کرکے قانون کی خلاف ورزی کی۔ مسٹر کے کے آغا کے مطابق عبداللہ بلوچ (ڈبلیو 96) پیپلز پارٹی (ایس بی) کا ممبر ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ جلسہ کب منعقد ہوگا۔ جہاں تک مرتضیٰ بھٹو کی اس پیشکش کا تعلق ہے جو انہوں نے 70 کلفٹن میں جلسے سے قبل پریس کانفرنس میں کی اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پولیس وارنٹ لیکر آئے اور مجھے گرفتار کرے۔ لیکن پولیس اس پریس کانفرنس کے بارے میں لاعلم تھی کیونکہ یہ پریس کانفرنس ان کی موت کے بعد تک نشر نہیں ہوئی تھی۔ اگر وہ اس پیشکش کے بارے میں جانتی بھی تھی تو وہ پھر بھی بے معنی تھی کیونکہ سیاسی مداخلت کے باعث پولیس کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ انہیں گرفتار کیا جائے۔ 17 سے 20 ستمبر کے درمیان سیکورٹی میں اضافہ کر دیا گیا تھا کیونکہ پولیس چاہتی تھی کہ میر مرتضیٰ کے مسلح محافظوں کو چیک کیا جائے جو 70 کلفٹن آتے اور جاتے ہیں۔ ڈاکٹر الطاف خواجہ (گواہ 102) نے مشتبہ فیکس کے بارے میں بتایا ہے لیکن یہ پولیس کے خلاف سازش کا ثبوت نہیں ہے۔ اسی طرح احسان الحق بھٹی اور خاکوانی (گواہ نمبر113) کے بیانات بھی سازش کی طرف نشاندہی نہیں کرتے۔ فیکس کا صفحہ نمبر1 یہ بتاتا ہے کہ یہ سب سے پہلے نومبر 1992ء میں ہوا جب شعیب سڈل ڈی آئی جی نہ تھے اور حیات نے پولیس جوائن نہیں کی تھی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ سڈل آصف زرداری کے حمایتی تھے۔ راؤ رشید نے بھی سازش کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں دیا۔ رحیم بخش جمالی گواہ 136) نے ان مختلف اجلاسوں کے بارے میں سنی سنائی بات کہی جس میں کہ وہ ذاتی طور پر خود بھی شریک نہیں تھے۔ کوئی براہ راست شہادت ان اجلاسوں کے بارے میں پیش نہیں کی گئی۔ بیان میں مزید کہا گیا کہ غنویٰ بھٹو (گواہ 126) نے سینئر پولیس اہلکاروں پر شبہ ظاہر کیا ہے' ان کا خیال ہے کہ ان پولیس اہلکاروں' جن کا جائے وقوع سے رابطہ تھا کے ذمہ دار ہیں' انہوں نے سڈل پر شبہ کیا کیونکہ وہ ڈی آئی جی ہاؤس میں رہتے تھے۔ اگر سڈل مرتضیٰ بھٹو کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث تھے تو کیا وہ سارا پلان اپنے گھر کے باہر ہی بنائیں گے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ جس سے ظاہر ہو کہ آیا

سڈل اور پولیس پارٹی کا کوئی رکن مرتضیٰ یا ان کے آدمیوں کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث تھا۔ دلائل میں مزید کہا گیا ہے کہ وزیراعظم کے بھائی ہونے کے باوجود مرتضیٰ کا ماضی کچھ مختلف نوعیت کا ہے انہوں نے الذوالفقار تنظیم کی قیادت کی جو دہشت گرد تنظیم تھی۔ انہوں نے جلاوطنی کی زندگی اختیار کی اور ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کے خلاف متعدد سنگین مقدمات ضیاء الحق کے دور میں درج ہوئے۔ ان کی جماعت کے کارکنوں کا ماضی نہایت مشتبہ رہا ہے۔ ان میں سے بعض الذوالفقار میں تھے اور ان میں سے بعض کو "را" نے بھارت میں تربیت دی اور ان میں سے بعض کو بے نظیر بھٹو کے مطابق آئی ایس آئی نے پلانٹ کیا تھا۔ حتیٰ کہ عبداللہ بلوچ نے دعویٰ کیا کہ سجاد جو پارٹی کا سینئر رکن تھا) اسے ایک تھرڈ پارٹی سے حاصل کیا تاکہ 25 لاکھ کے عوض سیاسی قتل کیا جاسکے۔

کراچی پولیس کے لئے مرتضیٰ بھٹو کو ڈیل کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا' خصوصاً" اس صورت میں کہ جب ان کی والدہ کے نام پر انہیں آتشیں ہتھیاروں کے 85 لائسنس جاری کئے گئے۔ میر کراچی میں گھومنے کے لئے آزاد تھے ان کے پاس اپنی پرائیویٹ آرمی تھی جس میں انتہائی تربیت یافتہ افراد تھے"۔

جب میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے آدمیوں نے سی آئی اے کے دو مراکز پر حملہ کیا ان کا مقصد علی سنارا کو غیر قانونی طور پر آزاد کرانا تھا۔ ان حملوں کے بعد میر نے وہ حد عبور کرلی کہ جس پر پولیس آنکھیں بند کئے نہیں رہ سکتی تھی اور اس نے ایکشن لیا۔ اگر پولی ان حملوں کو نظر انداز کر دیتی تو کراچی کے ہر بااثر آدمی کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ تاہم سڈل قانون پر عملدرآمد کے پابند تھے۔ انہوں نے اپنے سے بالا حکام کی رہنمائی چاہی اور 17 نومبر 1996ء کی سہ پہر کے بعد انہوں نے وفاقی وزیر داخلہ نصیر بابر سے مشورہ کیا اور انہوں نے واضح ہدایات دیں کہ سی آئی اے کے مراکز پر حملوں میں ملوث افراد کے خلاف قانون کے مطابق ایکشن لیا جائے اور میر مرتضیٰ کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ پولیس کو یہ معلوم نہ تھا کہ مرتضیٰ کے علاوہ اور دوسرے وہ کون ہیں جو حملوں میں ملوث تھے۔ 18 ستمبر کی دوپہر کو ضلع جنوبی میں جو درانی کا علاقہ تھا دو بم دھماکے ہوئے۔ 18 ستمبر کو ہی علی سنارا نے دوران تفتیش اپنے ساتھیوں کے نام

ظاہر کئے' تاہم درانی نے خالد ڈالیما کے بیان پر انحصار کیا جو دوسرے کیس میں ملزم تھا
- علی سنارا نے جن افراد کے نام بتائے وہ بم دھماکوں میں ملوث رہے ہیں۔ بم دھماکوں کو
علی سنارا کی گرفتاری کے ردعمل سے مربوط نہیں کر سکتے تھے' تاہم اس کے بہت زیادہ
امکانات تھے۔ درانی کی یہ معلومات تھیں کہ مشتبہ افراد 70 کلفٹن میں چھپے بیٹھے ہیں۔
سڈل نے درانی کو ہدایت دی کہ ان مشتبہ افراد کو پکڑنے کے لئے کوششیں تیز کر
دے۔

20 ستمبر 1996ء کی شام کو سانحہ وقوع پذیر ہوا۔ پولیس افسران کا بیان ہے کہ
شام 5 بجکر پینتالیس منٹ پر سیال نے وائرلیس پر تصدیق کی کہ کچھ لوگ 70 کلفٹن میں
داخل ہو گئے ہیں اور وہ تھوڑی دیر کے بعد میر کے ساتھ ریلی میں شرکت کیلئے جائیں
گے۔ درانی نے طاہر کو ہدایت کی کہ وہ سیال کے ساتھ جائے جو کہ پہلے میر کے ساتھ
جانیوالے اشخاص کے پاس بغیر لائسنس والے اسلحے کی تلاشی کیلئے بطور انچارج تعینات
تھا۔ اس موقع پر جب وہ 70 کلفٹن تک پہنچے تو وہ پہلے ہی جا چکے تھے۔ درانی کو خیال
آیا کہ اسے میر اور ان کے محافظوں کی تلاشی کا ایک اور موقع مل سکتا ہے کہ جب وہ
واپس آئیں۔ شام ساڑھے سات بجے درانی نے طاہر سے رابطہ کیا۔ ان کے درمیان
تلاشی کے بارے میں کسی منصوبہ بندی کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی۔ سڈل کے
مطابق درانی نے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ نہ تو میر کو روکا جائے گا اور نہ ہی اسے گرفتار کیا
جائے گا۔ درانی کو ذاتی طور پر آپریشن کی نگرانی کرنا تھی اور اس بات کا امکان بہت کم
تھا کہ فائرنگ ہو کیونکہ اس سے پہلے اس طرح کے تین چار واقعات ہو چکے تھے۔ درانی
نے یہ تاثر دیا کہ یہ ایک معمول کا آپریشن تھا۔ سانحہ کے رونما ہونے سے اندازاً" 20
منٹ قبل درانی نے طاہر کو تلاشی کے بارے میں اصل منصوبے سے آگاہ کیا۔ منصوبہ
یہ تھا کہ میر کی گاڑی قافلے میں آگے ہو گی اور اسے گزرنے دیا جائے گا اور بعد والی
گاڑیوں کو جن میں محافظ ہوں گے روکا جائے گا اور بغیر لائسنس والے اسلحے کی تلاشی لی
جائے گی۔ درانی موقع پر موجود نہ تھا اور اس نے ٹریفک چوکی پر پوزیشن سنبھالی ہوئی
تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب پولیس مقابلہ شروع ہوا تو وہ آپریشن کی نگرانی کر
رہا تھا۔ 8 بجکر 33 منٹ پر اے ایس پی حیات پہنچا اسے اسکے ڈرائیور نے ساڑھے آٹھ

بجے بتایا کہ درانی چاہ رہا تھا کہ وہ طاہر کو رپورٹ کرے۔ یہ ان تین پولیس افسران کا
پلان تھا کہ مقابلہ میر کے آدمیوں نے شروع کیا تھا جنھوں نے ابتدا میں شاہد حیات کو
ران میں گولی ماری تھی۔ میر یا اسکے آدمیوں کو ہلاک کرنے کیلئے کراچی پولیس نے کوئی
سازش نہیں کی۔ انہوں نے فرائض کی انجام دہی میں اپنا دفاع کیا۔

درانی نے صورتحال کا غلط تجزیہ کیا اور جیساکہ وہ اسے ایک معمول کا آپریشن
سمجھ رہا تھا اس طرح کے آپریشن کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے ایک ناتجربہ کار افسر کو
اکیلے چھوڑ دیا۔ ناقص منصوبہ بندی اور غیر مناسب نگرانی اس فیصلے کی غلطیاں ہیں۔
سڈل اپنے گھر سے باہر میر پر گھات لگانے کی جگہ منتخب نہیں کرتا۔ وہ اسکے لئے سرجانی
ٹاؤن سے واپسی کے دوران کسی اور مقام کا انتخاب کرتا اور خود بھی شہر سے باہر رہنے کا
انتظام کرتا۔ پولیس ہر ایک پلان کر سکتی تھی لیکن زخمیوں کو ہسپتالوں تک لے جاتی
پولیس نے میر کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ گواہوں کی اکثریت کے مطابق
فائرنگ شروع ہونے کا وقت رات 8 بجکر 45 منٹ تھا اور ختم ہونے کا 9 بجے رات۔
لوگ زخمی تھے' اسلحہ زمین پر پڑا تھا اور فائرنگ دوبارہ کسی بھی وقت شروع ہو سکتی
تھی۔ یہ ابھی بھی خطرناک تھا کہ جب طاہر رات 9 بجے بکتر بند گاڑی کی حفاظت میں میر
کی گاڑیوں تک پہنچا۔ فائرنگ ختم ہونے کے بعد اندازاً" 15 منٹ بعد میر کو مڈایسٹ
ہسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں پر صرف ایک ناتجربہ کار ڈاکٹر اعجاز (گواہ نمبر14) موجود تھا۔ فون
دستیاب نہیں تھا لہٰذا ایس ڈی ایم عید گاہ نے اس کا انتظام کیا۔ طاہر نے خلوص اور
نیک نیتی کا مظاہرہ کیا جب وہ میر کو مڈایسٹ لے گیا اور ڈاکٹر اعجاز نے بھی میر کی جان
بچانے کیلئے نیک نیتی اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔

میر کے قافلے میں چار اشخاص زخمی ہوئے تھے۔ زخمی اسمٰعیل اور ڈاکٹر مظہر
میمن تقریباً" 10 بجے رات جناح ہسپتال پہنچے۔ زخمی ایاز اور اصغر علی بھی اسی ہسپتال
میں تقریباً" آدھی رات کو پہنچے۔ یہ موقف پولیس افسران کا ہے کہ یہ حقیقی پولیس
مقابلہ تھا کیونکہ دونوں پارٹیاں مسلح تھیں اور دونوں نے فائرنگ کی۔ اسکی شہادت بھی
موجود ہے کہ مقابلے کے دوران دونوں نے اپنے اسلحوں کو ڈسچارج کیا۔ اسلحہ کے ماہر
گواہ نمبر152 کی گواہی کے مطابق میر کے آدمیوں نے گولیوں کا ڈسچارج کیا۔ دو پولیس

افسران بھی مقابلے کے دوران موقع پر زخمی ہوئے۔ پولیس نے زیادہ طاقت کا استعمال نہیں کیا۔ موقع پر برآمد ہونیوالے 141 خالی کارتوسوں کے بارے میں پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس کے اسلحے سے فائر ہوئے' جس سے اس امر کو تقویت ملتی ہے کہ میر کے کچھ آدمی مقابلے کے دوران یا بعد میں وقوعہ سے فرار ہو گئے۔ امیر بخش ڈوکلی اور ابراہیم گبول کا نام اصغر علی کی ایف آئی آر میں درج ہے۔ دستاویز نمبر 57 کے مطابق پولیس نے صرف 61 راؤنڈ ڈسچارج کئے۔ میر کے قافلے کو بغیر لائسنس کے اسلحے کی تلاشی کیلئے روکا گیا اور میر کے آدمیوں نے کسی اشتعال دلانے کے بغیر پولیس پر فائرنگ کی جس کے باعث صورتحال کو نظرانداز کرنا ناممکن رہا اور کتنی بڑی احتیاط اور خبرداری کے باوجود معاملہ ٹل نہیں سکتا تھا۔ سیال کے زخموں سے متعلق جعلی شہادت اور زخموں کی تحقیق کیلئے قائم ہونیوالا میڈیکل بورڈ دونوں جانبدار تھے۔ ڈاکٹر شہزاد گواہ نمبر 123 اہم ہے کیونکہ اس نے حیات کے زخموں کا آپریشن کیا تھا۔

سیال کے پاؤں کے زخم کو خود ساختہ قرار دیا گیا تاکہ ظاہر کیا جائے کہ پولیس مقابلہ جعلی تھا۔ سیال نے اطلاع دی کہ وہ 8 بجکر 50 منٹ پر زخمی ہوا (ای ایکس /83) خرم وارث نے 9 بجے رات اسے پولیس اسٹیشن میں زخمی حالت میں دیکھا۔ سیال جائے وقوع سے رات 8 بجکر 50 منٹ پر روانہ ہوا۔ پولیس مقابلہ کے نتائج معلوم نہیں تھے۔ میڈیکل اسلحے اور واقعاتی گواہوں سے یہ بات قائم ہوتی ہے کہ اس کا زخم حقیقی تھا۔ جہاں تک حیات کے زخموں کا تعلق ہے ڈاکٹر شہزاد کے بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکے خیال میں اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ زخم خود ساختہ تھا۔ ڈاکٹر شہزاد نے خود زخم کا آپریشن کیا تھا۔ شاہد حیات کے اپنے بیان (ای ایکس 135) اور میڈیکل رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وہ میر کے آدمیوں کی گولی کا نشانہ بنا۔ وائرلیس پیغام (ای ایکس 83) کی رپورٹ جو رات 8 بجکر 59 منٹ پر ریکارڈ ہوئی میں اس بات کا ذکر ہے کہ حیات کو گولی لگی تھی۔

پولیس افسران کے مطابق یہ سوال کہ سیال نے خودکشی کی یا وہ قتل ہوا اہمیت کا حامل نہیں کیونکہ اسکے رونما ہونیوالے سانحہ کے مابین کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اسلحہ کا ماہر جانبدار ہے اور اس نے غلط رپورٹ دی ہے۔ اسلحہ کا ماہر اپنی رپورٹ کی حدود سے

تجاوز کر گیا اس نے کئی آراء دیں جسکے لئے اسے کہا نہیں گیا تھا اور اس طرح اس نے اپنی غیرجانبداری ختم کر دی۔

دستاویز نمبر 57 کے مطابق پستول نمبر 564 جو 9 ملی میٹر کی تھی اور اس میں 35 راؤنڈ تھے ماہر کو 6 مارچ 1996 کو جاری کی گئی' 8 دسمبر 1996 کو اس نے وہی پستول بمع اتنے ہی راؤنڈز کے واپس کئے۔ لہٰذا ماہر نے وقوعہ کے دوران اپنا اسلحہ ڈسچارج نہیں کیا اور 8 دسمبر 1996 سے 17 فروری 1997ء - جو کہ دوبارہ سے زائد عرصہ ہے اسکا اسلحہ اور راؤنڈ کرائم برانچ کے پاس بغیر کسی سیل کے جمع رہے۔ اس دوران کسی بھی شخص کی اس اسلحے تک رسائی ہو سکتی تھی اور وہ گولی ڈسچارج کرکے خالی گولی رکھ سکتا تھا۔ یہ اسلحہ کسی اور پولیس افسر کو بھی جاری کیا جا سکتا تھا۔ اس درمیانی مدت میں ایک راؤنڈ ڈسچارج کیا گیا اور خالی گولی کو وقوعہ پر ملنے والی اصل خالی گولی سے تبدیل کیا گیا۔

طریقہ کار کی بے قاعدگیوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان پولیس افسران نے کہا کہ ہسپتالوں نے اسوقت بغیر کسی قانونی اختیار کے میڈیکو لیگل کیسوں کو داخل اندراج کیا۔ میر کا پوسٹ مارٹم طبی ہدایات کے مطابق نہیں کیا گیا۔ میت خانے کے ملازمین نے اپنے فرائض سے کہیں بڑھ کر پوسٹ مارٹم کی کارروائی میں اپنا کردار ادا کیا۔ ایم ایل او حضرات نے زخموں کی پیمائش پیمانے کی بجائے مشاہدے کی بنا پر کی۔ ڈپٹی کمشنر صورتحال کو سنبھالنے کی بجائے پرائیویٹ ہسپتال میں موجود رہا۔ ایس ڈی ایم حضرات نے خون اکٹھا کرنے اور ٹیلی فون نصب کرنے جیسے کلریکل کام کئے۔ ان پولیس افسران کے مطابق سرجن' ایم ایل او اور ایس ڈی ایم پڑھے لکھے تربیت یافتہ اور پیشہ ور افراد ہوتے ہیں لیکن انکے کام اور طریقہ کار کی بدولت بہت ساری چیزیں رہ گئیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایسا لگتا تھا کہ وقوع کے بعد ابتدائی تفتیش ایک پیشہ وارانہ انداز سے نہیں کی گئی لیکن اسے اسوقت کے حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ آئی جی سعید خان گواہ نمبر 3 نے کہا ہے کہ موجودہ نظام اصلاحات کا متقاضی ہے لیکن اسکے لیے وسائل نہیں پولیس سروس میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسٹریٹ لائٹس روشن نہیں تھیں' اسکا پولیس سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ ان کا انتظام کے ای ایس سی کی ذمہ داری ہے اور ایسا کوئی جادو کا بٹن نہیں کہ پولیس اسکے ذریعے لائٹس

آن کر دیتی۔ یہ کراچی میں کوئی خلاف معمول بات نہیں۔

پولیس نے ثبوت تباہ کرنیکی کوشش نہیں کی۔ 2 بجے صبح تک فون اور شیشے کی کرچیاں وقوعہ پر موجود تھیں' جیساکہ پی ٹی وی کی فلم میں دکھایا گیا گواہ نمبر63- اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ کوئی ثبوت ضائع کر دیا گیا ہو۔ جائے وقوعہ کو محفوظ نہیں کیا گیا کیونکہ ایک تو ایسا کرنا ناقابل عمل تھا اور دوسرے حالات کے باعث ممکن نہیں تھا۔

ایم ایل او کا رجسٹر کا چھیننا غیر دانشمندانہ تھا لیکن اس میں کوئی بدنیتی شامل نہیں تھی۔ اگر ایم ایل او سیال اور حیات کو ایم ایل سی جاری کرنے میں معاون اور مدد گار ہوتا تو ایسی صورتحال پیش نہ آتی۔

کے کے آغا ایڈووکیٹ نے اپنے دلائل ختم کرتے ہوئے کہا کہ پولیس نے میر یا اسکے آدمیوں کو قتل کرنیکی کوئی سازش نہیں کی' یہ ایک حقیقی پولیس مقابلہ تھا اور ایسے حالات میں میر کو ہسپتال پہنچانے میں کوئی غیر قدرتی تاخیر نہیں کی گئی۔ طریقہ کار کی بے قاعدگیاں ضرور موجود ہیں لیکن اس میں کوئی بدنیتی شامل نہیں۔ ضمنی دلائل میں کے کے آغا نے کہا ہے کہ میر کے چھ آدمی جنہیں گرفتار کیا گیا زخمی نہیں ہوئے تھے۔ اسکے کم از کم دو آدمی فرار ہوئے - گواہ نمبر117- میر کے قافلے کے سترہ آدمیوں میں سے صرف تین کے سروں پر زخم لگا۔ فائرنگ جان بوجھ کر یا نشانہ لے کر نہیں کی گئی۔

ایس ایچ او شاہنواز (گواہ نمبر1/117) نے اپنے مشیر نامے میں کہا ہے کہ بعض افراد زندہ تھے لیکن کیا ایس ایچ او کو ان کی موت کا علم تھا۔ اس بارے میں ایس ایچ او نے یہ دلیل دی ہے کہ مردوں کی تصدیق کرنا ان کی ذمہ داری نہیں ہے اور حد سے زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہوئے انہوں نے یہ کام ہسپتال کے ڈاکٹروں پر چھوڑ دیا جن کا کام موت کی تصدیق کرنا ہے۔ لہٰذا چھ مردہ افراد کے خلاف جو ایف آئی آر درج کی گئی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ زندہ تھے بلکہ اس لئے درج کی گئی کہ شاہنواز نے اپنی حد سے زیادہ احتیاط کے باعث کنفیوژن پیدا کر دیا تھا۔ درانی نو بجکر 25 منٹ پر وقوعہ پر پہنچے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے وہاں پڑے ہوئے جسموں کا معائنہ کیا تھا اور چھ افراد کو مردہ پایا تھا۔

نہال ہاشمی ایڈووکیٹ کے دلائل

فاضل وکیل نے ہیڈ کانسٹیبل فیصل حفیظ' اے ایس آئی عبدالباسط' پولیس کانسٹیبل غلام شبیر' پولیس کانسٹیبل ذوالفقار' ایف سی مسلم شاہ' پولیس کانسٹیبل ظفر اقبال' پولیس کانسٹیبل غلام مصطفیٰ' پولیس کانسٹیبل راجہ حامد' پولیس کانسٹیبل گلزار خاں ' پولیس کانسٹیبل ڈاکٹر محمود اور پولیس کانسٹیبل طاہر کی پیروی کرتے ہوئے کہا کہ یہ تمام ملزمان کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل ہونے کی بنا پر ماتحت تھے' ان کے ساتھ ایک اے ایس آئی بھی تھا لیکن ان میں سے کسی کے پاس انتظامی اختیارات نہیں تھے۔ ان ملزمان میں سے کسی کے خلاف کوئی براہ راست شہادت نہیں ہے ان ملزم پولیس اہلکاروں کی کسی مرنے یا زخمی ہونے والے سے دشمنی نہیں تھی' ان کے قبضے سے ہتھیار حاصل نہیں کیے گئے تھے' انہوں نے مقابلے میں حصہ نہیں لیا تھا' اور انہیں مقابلے کے ایک ماہ بعد گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ اپنے افسروں کے احکامات کی بجا آوری کے پابند تھے۔ یہ پولیس اہلکار بے گناہ ہیں۔

منظور بھٹہ اور ندیم قریشی ایڈووکیٹس کے دلائل

پی پی پی (شہید بھٹو) ڈاکٹر مظہر میمن اور دوسروں کی جانب سے تحریری دلائل پیش کئے گئے ہیں جن میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو پولیس اور سازش کرنے والوں نے جان بوجھ کر ہلاک کیا۔ سازش علی سنارا کی گرفتاری کے بعد تیار کی گئی۔ سازشی جانتے تھے کہ میر مرتضیٰ بھٹو علی سنارا کی گرفتاری پر رد عمل ظاہر کریں گے۔ میر مرتضیٰ بھٹو علی سنارا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے سی آئی اے کے دو مراکز پر گئے لیکن ان کے وہاں جانے کے اگلے دن میر مرتضیٰ اور ان کے محافظوں کے خلاف جھوٹی ایف آئی آر درج کر لی گئیں۔ 18 ستمبر 1996 کو کراچی شہر میں بموں کے چند دھماکے ہوئے جسکا الزام وزیر داخلہ نصیر اللہ خاں بابر' حکومت سندھ اور سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے میر مرتضیٰ اور ان کی پارٹی پر عائد کیا گیا۔

آئی جی محمد سعید (گواہ نمبر3) نے صفحہ 17 پر کہا ہے کہ انہیں چیف منسٹر ہاؤس سے ایک پیغام ملا تھا کہ وہ وزیراعلیٰ ہاؤس پہنچیں' چنانچہ وہ وزیراعلیٰ ہاؤس گئے اور وہاں انہوں نے وزیراعلیٰ سے ملاقات کی۔ اس موقع پر ایڈووکیٹ جنرل سندھ عبدالغفور منگی بھی وہاں موجود تھے۔ وزیراعلیٰ (عبداللہ شاہ) نے مرحوم حق نواز سیال کے پاؤں کے زخم کے معائنے کیلئے بورڈ کے قیام پر سخت جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ سعید خان (گواہ نمبر3) کے بیان کی روشنی میں عبداللہ شاہ براہ راست ملوث ہیں۔ وہ وزیراعلیٰ تھے اور انہوں نے اس کیس کی شہادت ضائع کی۔

ڈاکٹر شعیب سڈل نے ایس ایس پی درانی کو وقوعے کا ذمہ دار قرار دیا۔ درانی نے کہا کہ مجوزہ کارروائی عبداللہ شاہ اور ڈی آئی جی کراچی شعیب سڈل سے مشورے کے بعد کی گئی۔

سب انسپکٹر خرم وارث پہلے تفتیشی افسر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ 70 کلفٹن کے واقعے سے تعلق رکھنے والا اہم مواد خفیہ ہاتھوں نے ضائع کر دیا۔ مدعی نور محمد کی ایف آئی آر 45 دن بعد درج کی گئی۔ یہ ایف آئی آر محترمہ غنویٰ بھٹو کی آئینی پٹیشن پر ہائیکورٹ کی ہدایت جاری ہونے کے بعد درج ہوئی۔ عبداللہ بلوچ (گواہ نمبر 96) اور احسان الحق بھٹی (گواہ نمبر112) کے بیانات کے مطابق سازش کی گئی تھی گواہ نمبر 113, 114 اور 136 نے بھی سازش کا الزام عائد کیا۔ ان گواہوں کے بیانات کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو نے انہیں بتایا تھا کہ جب وہ جولائی 1996ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملے تو میر مرتضیٰ اور آصف علی زرداری کے درمیان گرما گرمی ہوئی جس کے بعد سازش تیار کی گئی اور منصوبہ بندی کی گئی جو علی سنارا کی گرفتاری پر منتج ہوئی۔ تحریری دلائل میں سازشیوں کے جو نام ظاہر کئے گئے ہیں ان میں (1) آصف علی زرداری (2) مسعود شریف (3) نصیراللہ خان بابر (4) عبداللہ شاہ (5) آغا سراج درانی اور پولیس اُفسران و اہلکاران شامل ہیں۔ ان دلائل کے مطابق آصف علی زرداری کو میر مرتضیٰ بھٹو سے حقیقی خطرہ تھا اس لئے آصف علی زرداری نے پولیس' اپنی حکومت اور ایجنسیوں کے ذریعے کارروائی کی منصوبہ بندی کی جو میر مرتضیٰ کے قتل پر منتج ہوئی۔ گواہ رحیم بخش جمالی نے آصف علی زرداری اور واجد علی درانی کا فوٹو گراف

ٹربیونل کے ریکارڈ کے لئے پیش کیا۔ رحیم بخش جمالی کے بیان کے مطابق واجد علی درانی اور آغا سراج درانی پڑوسی ہیں اور ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آغا سراج درانی آصف علی زرداری کے بہت قریب رہے۔ 16 ستمبر 1996 کو میر مرتضیٰ بھٹو' آصف علی زرداری اور آغا سراج نے اسلام آباد سے کراچی تک ایک ہی طیارے میں سفر کیا اور ایئر پورٹ پر آغا سراج درانی اور میر مرتضیٰ کے محافظوں میں جھڑپ ہوئی تھی۔ میر صاحب اور آصف علی زرداری ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے ایئر پورٹ سے کلاپل تک گئے۔ رحیم بخش جمالی کے بیان کے مطابق سازش حیدر آباد کے گاؤں جتان سومرو میں تیار کی گئی اور اسے چیف منسٹر ہاؤس میں حتمی شکل دی گئی۔ علی سنارا کو گرفتار کیا گیا اور میر صاحب کو ان کے ساتھیوں سمیت قتل کیا گیا۔ میر مرتضیٰ کیلئے "مہمان" کا کوڈ ورڈ استعمال کیا گیا۔

20 یا 21 ستمبر 1996 کا واقعہ ایک مقابلہ (Encounter) تھا جس میں حملہ آور میر مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی تھی اور پولیس اپنے دفاع میں جوابی فائرنگ کرنے میں حق بجانب تھی یا کہ میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کی پارٹی پولیس کے حملے کا نشانہ بنی تھی۔ اس بات کا جائزہ لینے کے ضمن میں یہ بات نوٹ کی گئی کہ پولیس کے موقف کے کیس سے (جو انسپکٹر حق نواز سیال کی مدعیت میں درج ایف آئی آر نمبر 386/96 اور درانی سمیت پولیس افسروں کے بیانات کی صورت میں ٹربیونل کے ریکارڈ پر آچکا ہے) یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میر مرتضیٰ کی پارٹی کے 18 افراد کی ہلاکت اور چار افراد کے زخمی ہونے کی وجہ وقوعہ پر تعینات پولیس کی فائرنگ بنی۔ اگر یہ بات درست ہے تو یہ ثابت کرنے کی ذمہ داری کہ یہ کارروائی خود حفاظتی کی تھی اور پولیس نے خود حفاظتی کے حق سے تجاوز نہیں کیا تھا' ان پولیس اہلکاروں پر عائد ہوتی ہے جو میر مرتضیٰ کی پارٹی پر فائرنگ کا حکم دینے یا فائرنگ کرنے میں ملوث ہیں۔

اس سلسلے میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ یہ حادثہ اچانک وقوع پذیر ہوا اور پولیس نے پہلے سے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ سماعت کے دوران ٹربیونل کے سامنے گواہوں کے بیانات اور دستاویزات کی شکل میں جو ریکارڈ پیش کیا گیا اس کو دیکھ کر درج ذیل مفید حقائق و نکات ہمارے سامنے آئے ہیں۔

(اے) درانی کے خیال میں میر مرتضٰی کے مسلح محافظوں اور ساتھیوں کو تلاشی کیلئے روک کر ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کے دوران پولیس کو حملے یا فائرنگ کی توقع نہیں تھی۔ درانی نے یہ رائے اس لیے قائم کی تھی کہ اس سے قبل بھی دو تین بار میر مرتضٰی اور / یا اس کے مسلح محافظوں اور ساتھیوں کو روکا گیا تھا۔ ہم درانی کی اس رائے سے متاثر نہیں۔ اولاً" یوں کہ درانی کا یہ ایک عمومی بیان ہے کہ میر مرتضٰی اور / یا اس کے ساتھیوں کو پہلے بھی دو تین بار روکا گیا تھا لیکن انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ درانی نے تلاشیوں کے اوقات اور مقامات کا کوئی حوالہ نہیں پیش کیا۔ ماضی کے دو تین واقعات سے کسی سینئر پولیس افسر کا یہ نتیجہ اخذ کرنا معقول بات نظر نہیں آتی۔ اس سے قبل بھی پولیس کے سینئر افسران نے ٹریبونل کے سامنے اپنے تحریری بیان حلفی میں کہا تھا کہ میر مرتضٰی کے مسلح ذاتی محافظوں اور ساتھیوں میں "را" کے ایجنٹ موجود ہیں' اگر یہ بات درست ہے تو انہوں نے جدید ترین اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت بھی حاصل کی ہو گی۔ اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا کہ اگر ان کو روک کر تلاشی لیکر گرفتار کیا گیا تو یہ مسلح محافظ اور ساتھی بزدلی کا مظاہرہ کریں گے' سینئر پولیس افسران کی یہ سوچ حقیقت پسندانہ نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ بیشتر پولیس اہلکاروں کو خود کار اور نیم خود کار ہتھیاروں سے مسلح کر کے متعین کیا گیا تھا۔ بعض اہلکار بلٹ پروف بنیانیں پہنے ہوئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ذمہ دار پولیس افسران اس آپریشن کو معمول کا واقعہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر خصوصی انتظامات کئے تھے' یہ ایک خصوصی آپریشن تھا۔ یہ معمول کے مطابق تلاشی اور گرفتاری کی ذمہ داری پوری کرنے کا عمل نہیں تھا۔

(بی) ایف آئی آر نمبر 96/386 کے مطابق جب میر مرتضٰی پارٹی کی گاڑیوں کو روکا گیا تو میر مرتضٰی نے پولیس کے خلاف اشتعال انگیز کلمات ادا کر کے اپنے ساتھیوں کو اکسایا کہ وہ پولیس اہلکاروں کو قتل کر دیں۔ میر مرتضٰی کے مسلح محافظوں نے جو آتشیں اسلحے سے لیس تھے' مشتعل ہو کر پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔ اگر واقعی ایسا ہی ہوا تو میر مرتضٰی کے ذاتی محافظ / مسلح افراد اور ساتھی' جن کی تعداد بھی خاصی تھی ان میں "را" کے ایجنٹ بھی تھے۔ تاہم پھر بھی پولیس اہلکاروں میں انسپکٹر سیال کے

ایک معمولی زخم آیا دوسرے افسر اے ایس پی شاہد حیات کے بھی جسم کے NON VITAL حصے پر زخم آیا۔ اور پولیس افسران اور اہلکاروں کی بھاری تعداد نے اس آپریشن میں حصہ لیا۔ مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی اور زخم بھی شدید تھے' اس سلسلے میں پولیس کا رد عمل کیا تھا؟ انہوں نے بھی فائرنگ کی تھی۔ جس کے نتیجے میں میر مرتضٰی پارٹی کے 8 افراد مارے گئے اور 4 زخمی ہوئے۔

(سی) 8 مقتولوں اور چار زخمیوں کے زخموں کی تفصیل اس طرح ہے۔

(I) اسمٰعیل زخمی ای ایکس 53/1 تین زخم آئے' گولیاں زیریں شکم' دائیں ران اور دائیں بازو میں لگ کر پار ہو گئیں۔

(II) ایاز' زخمی' ای ایکس 53/1 نمبر1' دائیں ٹانگ (گہرائی میں) نمبر2' دائیں ٹانگ میں زخم آئے۔

(III) اصغر علی (زخمی) ایک ایکس 53/6' بائیں بازو سے گولی آر پار ہو گئی۔

(IV) ڈاکٹر مظہر میمن (زخمی) ایک ایکس 54/1 ایک گولی دائیں ران کو زخمی کرتی ہوئی آر پار ہو گئی۔

(V) محمد بچل (زخمی تھا دوسرے دن انتقال ہو گیا) ای ایکس 51/2 ایک گولی دائیں کنپٹی میں داخل ہو کر آر پار ہو گئی۔

(VI) نامعلوم (انتقال کر گیا) ای ایکس 58/1' 1- گولی شکم میں داخل ہو گئی۔ 2- بائیں کولہے کو زخمی کر کے آرپار ہو گئی۔

(VII) نامعلوم (انتقال کر گیا) ای ایکس 55/1- ایک گولی بائیں کان میں داخل ہوئی اور نمایاں زخم آئے۔

(VIII) نامعلوم (انتقال کر گیا) ای ایکس 53/10- ماتھے کی دائیں سمت زخم آئے۔ گولی داخل ہو کر زخم لگاتی ہوئی آر پار ہو گئی۔

(IX) نامعلوم (انتقال کر گیا) ای ایکس 57/1- زخم شکم کے بائیں جانب آیا' گولی داخل ہو کر آر پار ہونے کے زخم۔

یہ چار نعشیں جنہیں پوسٹ مارٹم رپورٹ میں "نامعلوم" کہا گیا ہے۔ وہ (1) وجاہت جوکھیو (2) محمد رحیم بروہی (3) عبدستار راجپر (4) یار محمد بلوچ کی

تھیں۔

(X) سجاد حیدر گاکھڑو (انتقال کر گیا) ای ایکس 57/2' 1- ایک گولی بائیں بازو کے اوپری حصے میں داخل ہوئی۔ 2- ایک گولی گردن کے اوپری حصے پر بائیں جانب لگی۔ آر پار ہونے کے زخم۔

(XI) عاشق حسین جتوئی (انتقال کر گئے) ای ایکس 52/1' 1- ایک گولی بائیں بازو کے اوپری حصے میں داخل ہوئی 2- ایک گولی گردن کے اوپری حصے پر بائیں جانب لگی' آر پار ہونے کے زخم۔

(XII) میر مرتضیٰ بھٹو (انتقال کر گئے) ای ایکس 52/8' 1- بائیں جانب 0.5 سینٹی میٹر قطر کا ایک کھلا ہوا زخم' گولی کے داخل ہو کر آر پار ہونے کا زخم' 2- گال کے بائیں جانب شگاف لگاتا ہوا 1 cm x 0.5 cm قطر کا ایک زخم' 3- چہرے پر جبڑے کے قریب ایک 1 cm قطر کا زخم' گولی داخل ہو کر آر پار ہوگئی (مہلک وار) 4- بائیں شانے پر 0.5 cm کا ایک زخم' گولی کے داخل اور آر پار ہونے کا زخم' 5- سینے کے دائیں جانب رگڑ کا نشان۔

یہ پولیس کا موقف ہے کہ سارے انتظامات کئے گئے۔ پولیس نے 70 کلفٹن کی چیک پوسٹوں اور دوسرے راستوں پر پولیس تعینات کر دی تھی جو اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ گویا میر مرتضیٰ کی پارٹی کے گھڑ سواروں کا دستہ آنے والا ہے۔ زخموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پولیس نے نشانہ لیکر فائرنگ کی تھی۔ اگر یہ حادثہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں کی اچانک فائرنگ کے باعث ہوتا اور پولیس پارٹی اپنے دفاع میں ہاتھوں میں موجود خود کار ہتھیاروں سے فائرنگ کرتی تو اس طرح کی فائرنگ کے نتیجے میں نشانہ بننے والوں کو زیادہ زخم آتے۔ میر مرتضیٰ کے علاوہ 7 میں سے 4 ہلاک ہونے والوں کے صرف ایک گولی سے مہلک زخم لگا۔ بقیہ تین جاں بحق ہونے والوں کو دو دو گولیوں سے زخم لگے۔

(ڈی) پولیس کے گواہان' پرائیویٹ گواہان' جن میں پریس اور دیگر ذرائع ابلاغ سے متعلق افراد شامل ہیں' کی شہادتوں سے یہ بات سامنے آئی کہ جس وقت یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا اس وقت شاہراہ ایران کی اسٹریٹ لائٹس بند تھیں۔ اس ضمن میں درج

ذیل گواہان کے بیانات پیش کئے جاتے ہیں۔

گواہ نمبر 12- ظہیرالدین اے ایس آئی نے اپنے بیان میں کہا کہ اس وقت اندھیرا تھا اور صرف ایک لائٹ جل رہی تھی۔ وہ ایک بکتر بند گاڑی میں بیٹھا تھا' وہ فائرنگ کے مقام سے تقریباً" 50 گز دور تھا۔ اس وقت رات کے پونے دس بجے تھے۔ اس کا بیان ہے۔ "روشنی کم ہونے کے باعث میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ لوگ قتل ہوئے ہیں۔ میں نے زمین پر بہت سے افراد پڑے ہوئے دیکھے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں روشنی کم ہونے کی وجہ سے مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں سے ایک یا ایک سے زائد افراد ہلاک ہو چکے ہیں یا زخمی ہیں"۔

گواہ نمبر 16- سلطان افسر پولیس کانسٹیبل۔ جو اے ایس آئی ظہیرالدین کے ساتھ بکتر بند گاڑی میں موجود تھا' اس کا بیان ہے کہ بکتر بند گاڑی کو ڈی آئی جی ہاؤس کے قریب کھڑا کیا گیا یہ پونے دس بجے کا وقت تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس وقت وہاں اندھیرا تھا اور اسٹریٹ لائٹس نہیں جل رہی تھیں۔

گواہ نمبر 17- عطاء اللہ ہیڈ کانسٹیبل - یہ ظہیرالدین اے ایس آئی کی بکتر بند گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ اس کا بیان ہے کہ ایک کے علاوہ تمام اسٹریٹ لائٹس بند تھیں۔ یہ لائٹس اس جگہ سے دور تھیں جہاں گاڑی کھڑی کی گئی تھی۔ گواہ نمبر 18 سلطان' یہ ایدھی کلفٹن سینٹر کا ایک ڈرائیور ہے۔ اسے اپنے مرکزی کنٹرول روم سے ہدایت کی گئی کہ وہ کلفٹن پہنچ جائے۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی ایمبولینس سب سے پہلے جائے وقوعہ پر پہنچی۔ اس کے بیان کے مطابق "میں حادثے کی جگہ 9:30 بجے شب کو پہنچا جو کلفٹن گارڈن کے قریب تھی۔ اس وقت وہاں روشنی نہیں تھی۔ اسٹریٹ لائٹس بھی بند تھیں"۔

گواہ نمبر 19- حسین احمد قریشی' یہ بھی ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔ اس کا بیان ہے "میں 9:55 پر روانہ ہو کر "دو تلوار" کے قریب پولیس چوکی پر پہنچا۔ 10 یا 15 منٹ بعد۔۔۔ اس وقت چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت پولیس چوکی پر روشنی تھی۔ میں تاریکی کے باعث نہیں دیکھ سکا کہ جائے وقوعہ پر کوئی شخص یا گاڑی کھڑی ہوئی تھی"۔

گواہ نمبر 20- محمد رفیق۔ یہ بھی ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔ اس نے بتایا کہ "میں نے جائے وقوعہ پر خاصا خون دیکھا۔ اس وقت اسٹریٹ لائٹس بند تھیں۔ پولیس کی گاڑیوں کی ایک یا دو لائٹس جل رہی تھیں۔ اس لئے میں اچھی طرح سے دیکھ سکتا تھا"۔ گواہ نمبر 21- فرول خان، یہ بھی ایدھی ایمبولینس کا ڈرائیور ہے۔ اس نے اپنے بیان میں کہا "ہم جس وقت جائے وقوع پر پہنچے تو ایمبولینس کی لائٹس جل رہی تھیں، لائٹ جلتی رہیں۔ قریب کے دفتر میں بھی ایک لائٹ جل رہی تھی۔ ان لائٹس کے باعث ہم جائے قوع کو اچھی طرح سے دیکھ سکتے تھے" وہ دو تلوار کے چوراہے پر ساڑھے دس بجے شب کو پہنچا جہاں ایدھی کی مزید دو ایمبولینس پولیس چوکی کے قریب کھڑی تھیں۔ ہم کو نصف شب کے بعد جائے وقوع پر جانے کی اجازت دی گئی۔

گواہ نمبر 27- عارف الٰہی ڈپٹی کمشنر جنوبی کراچی، اس کا بیان ہے کہ ہم جس وقت جائے وقوع پر پہنچے اس وقت رات کے سوا نو بجے تھے ---- جائے وقوع پر ایک سمت میں ایک لائٹ جل رہی تھی لیکن دوسری طرف کلفٹن کی سمت میں زیادہ روشنی نہیں تھی اس لئے اس سمت میں کوئی شخص واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

گواہ نمبر 31- زاہد حسین، یہ ایک پریس فوٹو گرافر ہے۔ اس کا بیان ہے کہ "جیسے ہی میں پولیس چوکی پر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں روشنی تھی، مجھے پٹرول پمپ بھی نظر آ رہا تھا لیکن کلفٹن جانے والی سڑک پر روشنی نہیں تھی۔ پولیس کے جو اہلکار بطور گارڈز وہاں تعینات تھے وہ تاریکی میں تھے" اس طرح وہ جائے وقوع پر پہنچ گیا۔ بعد ازاں اس نے اپنے بیان میں کہا "یہ سارا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں 5 یا 6 فٹ سے زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتا تھا" یہ گواہ اس علاقے میں 9 بجکر 10 منٹ پر پہنچا۔

گواہ نمبر 32- محمد عظیم، یہ بھی ایک پریس فوٹو گرافر ہے۔ اس کا بیان ہے کہ "اس وقت وہاں مکمل تاریکی تھی، میں موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا تھا (جو گواہ نمبر 33، فاروق مورائی کو ائر میں وہاں کچھ نہ دیکھ سکا اس لئے ہم پولیس چوکی پر پہنچ گئے"۔

گواہ نمبر 33- فاروق مورائی جو روزنامہ "قومی اخبار" کا کرائم رپورٹر ہے۔ اس کا بیان ہے کہ "حالانکہ اس وقت تاریکی تھی لیکن کلفٹن کی جانب کچھ روشنی تھی اور

میں نے دیکھا کہ وہاں کچھ ناکہ بندی کی گئی تھی"۔

گواہ نمبر 34- محمد فاروق، یہ ورلڈ وائڈ ٹیلی ویژن کا کیمرہ مین ہے۔ اس کا بیان ہے کہ "اس وقت وہاں مکمل تاریکی تھی لیکن موٹر سائیکل کی روشنی تھی، اس روشنی کی حد 20/30 فٹ تک ہے، تاہم میں زمین پر پڑے ہوئے جسم کو دیکھ سکتا تھا۔

گواہ نمبر 47- سعید الدین خان بنگش۔ یہ ایک فوٹو گرافر ہے جو اے ایف پی فرانس کی نیوز ایجنسی کے لئے کام کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے جس وقت ہم لوگ کلفٹن جانے والی سڑک پر پہنچے اس وقت اسٹریٹ لائٹس بند تھیں اور مکمل تاریکی تھی"۔

گواہ نمبر 67- محمد اصغر، یہ پاکستان ٹیلی ویژن کا کیمرہ مین ہے۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ "پٹرول پمپ پر اس وقت معمولی روشنی تھی۔ دو تلوار کے چوراہے پر واقع پولیس چوکی میں روشنی تھی۔ اس کے علاوہ جائے وقوع تک کوئی روشنی نہیں تھی۔ کچھ مکانات میں روشنیاں دکھائی دیتی تھیں لیکن وہ مکانات دور تھے"۔ گواہ نمبر 93- شہزاد حسین، اے ایس آئی۔ اس کی ڈیوٹی کلفٹن پولیس اسٹیشن پر تھی۔ وہ جائے وقوع پر 9 بجکر 35 منٹ شب کو پہنچا۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا اس وقت وہاں روشنی تھی، اس کا جواب تھا "اندھیرا سا تھا" بعد ازاں اس نے بتایا کہ پولیس کی گاڑیوں کی روشنیاں جل رہی تھیں۔

گواہ نمبر 94- خرم وارث، پولیس اسٹیشن کلفٹن کا سب انسپکٹر پہلا آئی او۔ اس کا بیان ہے کہ اس وقت اسٹریٹ لائٹس روشن نہیں تھیں۔ وہ بطور آئی او جائے وقوع پر ساڑھے دس بجے رات کو پہنچا۔

ڈی آئی جی سڈل، اے ایس پی شاہد حیات اور رائے طاہر کے وکیل مسٹر کے کے آغا نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ اگر اس وقت لائٹس نہیں جل رہی تھیں تو اس کا سبب لوڈ شیڈنگ بھی ہو سکتا ہے جو کراچی کے لئے ایک عام بات ہے۔ کسی گواہ نے یہ نہیں کہا کہ اس وقت علاقے میں لوڈ شیڈنگ تھی۔ اس کے برعکس اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ٹریفک چوکی میں جہاں درانی نے آپریشن کے لئے پوسٹ قائم کی تھی، بجلی موجود تھی۔ جس وقت فائرنگ شروع ہوئی تو پولیس چوکی کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ دو تلوار کے چوراہے پر کالٹیکس کا پٹرول پمپ ہے اور اس امر کا ثبوت

ٹریبونل کے ریکارڈ میں ہے کہ اس پٹرول پمپ کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ کچھ روشنیاں قریب میں واقع قونصل خانوں کی بھی جل رہی تھیں لیکن جائے وقوع کے اطراف کی اسٹریٹ لائٹس نہیں جل رہی تھیں۔ کیا روشنیوں کو قصداً" بجھایا گیا؟ اگر یہ عمومی طریقہ کار ہوتا کہ اسلحے کی چیکنگ کے دوران جب کہ اس بات کی توقع نہ ہو کہ فائرنگ کا تبادلہ ہو سکتا ہے یا پولیس کو فائرنگ کرنے کی اجازت بھی نہ دی گئی ہو تو اس وقت اس بات کا کوئی موقع یا ضرورت نہیں ہوتی کہ روشنیاں بجھا دی جائیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روشنیاں اس لئے بجھائی گئیں کہ اسلحے کی اس چیکنگ کو عمومی واقعہ نہیں سمجھا گیا تھا۔ اس بات کا کوئی جواب ریکارڈ نہیں کرایا گیا کہ اسلحے کی چیکنگ کی منصوبہ بندی اندھیرے میں کیوں ضروری سمجھی گئی۔

(ای) درانی کا بیان ہے کہ اس نے رائے طاہر سے بات کر کے اسے ہدایات دیں جو اس نے پولیس افسروں اور جوانوں تک پہنچا دیں جو مختلف چیک پوسٹوں پر تعینات تھے۔ تاہم ہمارے ریکارڈ میں ایسی کوئی شہادت نہیں کہ جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ ہدایات کیا تھیں۔ کیا یہ ہدایات اس قسم کی تھیں کہ صورتحال کو قابو میں رکھا جائے اور آخری چارہ کار کے طور پر فائرنگ کی جائے اور صورت حال کچھ بھی ہو اتنی زیادہ قوت اور اسلحہ نہ استعمال کیا جائے کہ جانیں ضائع ہونے کا اندیشہ ہو؟ لیکن دیکھا یہ گیا کہ میر مرتضیٰ کے مسلح محافظ' جن میں سے کچھ پر "را" کے ایجنٹ ہونے کا الزام بھی عائد کیا گیا تھا' کی فائرنگ سے صرف دو پولیس افسروں کو معمولی سے زخم آئے جبکہ پولیس کی اپنے دفاع میں فائرنگ سے 8 افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور چار زخمی ہوئے۔ یہ بھی کہا گیا کہ کمانڈر کی طرف سے جو ہدایات دی گئیں وہ پولیس افسران تک پہنچا دی گئیں' لیکن پولیس افسران ان ہدایات پر عمل کرنے سے محروم رہے کہ حالات کو قابو میں رکھا جائے' زیادہ قوت کو استعمال نہ کیا جائے اور جسم کے اہم حصوں کو گولی کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

(ایف) فائرنگ سے قبل کی جو شہادتیں عدالت کے علم میں لائی گئیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصل شہادتیں قصداً" فوری طور پر ضائع کر دی گئیں۔ اس ضمن میں۔

(i) پولیس کے موقف کے مطابق آپریشن میں پولیس کی گاڑیوں کو ہٹ کیا گیا لیکن فائرنگ ختم ہونے اور پہلے تفتیشی افسر سب انسپکٹر خرم وارث (گواہ نمبر 94) اور سب انسپکٹر شاہنواز (گواہ نمبر 117) سمیت دوسرے پولیس افسران جائے واردات پر پہنچنے کے بعد یہ تین گاڑیاں وہاں موجود نہیں تھیں۔ ان گاڑیوں کو تفتیشی افسر کے پہنچنے سے پہلے اپنی اپنی جگہوں سے کیوں ہٹایا گیا؟ سوائے اس بات کے اس کی کوئی توجیح پیش نہیں کی گئی کہ ان گاڑیوں کی افسران کو استعمال کے لئے ضرورت تھی۔ ایک شہادت ایسی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جائے وقوعہ پر پولیس کی متعدد گاڑیاں موجود تھیں۔

(ii) مبینہ طور پر میر مرتضیٰ بھٹو اور انکی پارٹی کے مردہ افراد' زخمیوں اور دیگر سے برآمد ہونے والے اسلحہ کو جمع کیا گیا اور برآمدگی کا مشیر نامہ سب انسپکٹر شاہنواز نے تیار کیا۔ اس میں بتایا گیا کہ کونسا آتشیں اسلحہ کس شخص سے برآمد ہوا لیکن شاہنواز نے تسلیم کیا کہ یہ غلط ہے۔ مشیر نامہ مبینہ طور پر جائے وقوعہ پر 10 بجکر 35 منٹ پر تیار کیا گیا جبکہ شاہنواز کے مطابق یہ مشیر نامہ دوسرے دن وقوعہ کے تقریباً" 12 گھنٹے بعد تیار کیا گیا اور اسے مختلف ملزموں سے ہتھیاروں کی برآمدگی کا علم پولیس اسٹیشن میں مختلف ملزمان سے پوچھ گچھ کے دوران ہوا۔

(iii) شہادت سے پتہ چلا ہے کہ جب تفتیشی افسر وہاں پہنچا تو متعدد افسران جائے وقوعہ کی مختلف جگہوں سے خالی کارتوس جمع کر رہے تھے اور پھر سب کو ایک جگہ جمع کیا گیا اور تفتیشی افسر خرم وارث کو دے دیئے گئے' جس نے مشیر نامہ تیار کیا جس میں کسی بنیاد کے بغیر دکھایا گیا کہ کونسا خالی کارتوس کس گاڑی سے یا جگہ سے برآمد کیا گیا ہے۔ اس نے اگلی صبح اعلیٰ افسران کی ہدایت کے مطابق مشیر نامہ تیار کیا۔

(iv) پولیس کے مطابق پولیس کی فائرنگ کے نتیجے میں میر مرتضیٰ بھٹو کے چھ ساتھی موقع ہی پر دم توڑ گئے۔ اگر یہ بات اسی طرح ہے اور فائرنگ ختم ہونے کے آدھے گھنٹے کے اندر تفتیشی افسر وہاں پہنچا تو مرنے والوں کی

لاشوں کی پوزیشن میں تبدیلی نہیں آنی چاہئے تھی اور انہیں اسی طرح ہونا چاہئے تھا جس طرح فائرنگ کے بعد ان کی پوزیشن تھی۔ اس طرح کیس کی تفتیش کرنے میں مدد مل سکتی تھی لیکن تفتیشی افسر شاہنواز اور دوسروں کی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی تمام مرنے والوں کو ان کی اصل جگہوں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

(v) اسٹریٹ لائٹس اس وقت بھی بند تھیں جب تفتیشی افسر جائے واردات پر اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔

(vi) تفتیش کے دوران رات کے وقت کی لی گئی جائے واردات کی کوئی تصویر دستیاب نہیں تھی۔ یہ تفتیشی افسر خرم وارث کے پاس بھی نہیں تھیں جس نے کہا کہ شکیب قریشی ایس پی تفتیش کی نگرانی میں پولیس نے رات کے وقت کافی تصویریں بنائی تھیں۔

(vii) تفتیشی افسر نے کوئی سائٹ پلان (جائے واردات کا نقشہ) نہیں تیار کیا۔ (جی) شہادتوں' خصوصاً" خرم وارث اور شاہنواز کی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ مشکوک مشیر نامہ تیار کیا گیا تھا اور پولیس اسٹیشنوں کے روزناچوں میں غلط اندراج کئے گئے۔ اس وقوعہ کے بارے میں جو اندراج کئے جانے چاہئیں تھے وہ سرے سے کئے ہی نہیں گئے۔ مشیر ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وقوعہ کے بعد مختصر عرصے میں موقع پر ہی تیار کئے گئے لیکن خرم وارث' سب انسپکٹر شاہنواز اور محرروں سمیت متعدد دیگر گواہوں نے اعتراف کیا ہے کہ مشیرنامے جائے واردات پر تیار نہیں کئے گئے تھے بلکہ دوسرے دن واردات کے 12 گھنٹے کے بعد تھانے میں تیار کئے گئے۔ اعلیٰ افسران بشمول درانی اور شکیب ان تمام باتوں سے واقف تھے یہی حال روزناچوں میں اندراج کا بھی ہے جو گواہی کا نہایت اہم حصہ ہوتے ہیں۔ بعض گواہوں کے مطابق روزناچہ کو روک دیا گیا تھا۔ اندراج کو اسی وقت کرنے کی بجائے اگلے دن کرنے کا اعتراف کیا گیا۔ اعلیٰ پولیس افسران کی ہدایات پر اور ان کی خواہش کے مطابق مشیر نامے تیار کئے گئے اور

روزناچوں میں اندراجات کئے گئے۔ (ایچ) شہادتوں سے یہ بھی واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ تفتیش کے بارے میں قواعد کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزی کی گئی اور حیران کن طور پر اعلیٰ افسران تفتیش کے طریق کار اور پیشرفت سے مطمئن تھے۔ ریکارڈ پر آنے والی شہادتوں اور حقائق کے مطابق ہم پولیس کا موقف تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پولیس کو یہ اطلاع ملی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے انتہا پسند گروپ' دہشت گردی اور بم دھماکوں سمیت ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کا منصوبہ بنایا گیا اور اس کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ منصوبہ یا فیصلہ میر مرتضیٰ کے باڈی گارڈ یا ان کے مسلح ساتھیوں کی تلاشی کا کیا گیا تھا جن کے پاس غیر لائسنس یافتہ اسلحہ تھا اور سی آئی اے سینٹرز پر حملے اور بم دھماکوں سے متعلق مقدمات کے سلسلے میں ان کو گرفتار کرنا تھا۔ لیکن یہ کہ یہ منصوبہ تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو پارٹی کے انتہا پسند ارکان کی ضمانت پر رہائی یا گرفتاری کے بعد بری ہونے کے خطرے سے بچنے کے لئے ان کو ختم کر دیا جائے۔ اس کی شہادت ان کے خلاف نہیں آئی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اس وقت کی وزیراعظم کی واضح ہدایات تھیں کہ نہ پولیس اور دوسری ایجنسیاں 70 کلفٹن میں داخل ہوں اور نہ میر مرتضیٰ بھٹو کو ہاتھ لگایا جائے۔ اگر نہایت سنگین جرائم میں ملوث افراد اور خاص طور پر اس کیس میں دہشت گردی اور دوسری سماج دشمن سرگرمیوں میں ملوث افراد کسی عمارت یا گھر میں چھپے ہوئے تھے' ملک کی کسی بھی اتھارٹی کی جانب سے یہ ہدایات نہیں دی جا سکتی تھیں اور نہ آرڈر دیئے جا سکتے تھے کہ ایسے افراد کو گرفتار نہ کیا جائے یا ان کی گرفتاری کے لئے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ایسی عمارت یا گھر میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ بہرحال اعلیٰ پولیس افسران نے اس وقت کی وزیراعظم کے احکامات کی تعمیل کی اور ملزمان کی گرفتاری کے لئے 70 کلفٹن میں داخل نہیں ہوئے۔ چنانچہ منصوبہ یہ بنایا گیا کہ ان کو 70 کلفٹن میں داخل ہونے سے پہلے روکا جائے۔ اظاہر

ان کو (پولیس والوں) کو یہ ہدایات نہیں دی گئیں کہ چیک پوائنٹس پر چیکنگ کے دوران مہلک ہتھیاروں کے استعمال میں احتیاط برتی جائے۔

یہ خواہش کہ میر مرتضٰی بھٹو کی پارٹی کے انتہا پسند مسلح ارکان کو ختم کیا جائے' احکامات اس طرح دیئے گئے ہوں گے کہ آتشیں اسلحہ کا استعمال آزادانہ طور پر کیا جائے اور جن افراد کو ہدف بنایا جائے انہیں قتل کردیا جائے۔ اس وقت کی وزیراعظم کے واضح احکامات کے پیش نظر کہ میر مرتضٰی بھٹو کو کچھ نہ کہا جائے یہ بات عیاں ہے کہ ان پر فائرنگ کرنے کے کوئی واضح احکامات نہیں تھے۔ تاہم آپریشن کی منصوبہ بندی کرنے والے متعلقہ پولیس افسران کو یہ بات لازماً" محسوس کرلینی چاہیئے تھی کہ اس میں رسک موجود ہے اور یہ کہ میر مرتضٰی بھٹو بھی فائرنگ کی زد میں آسکتے ہیں باوجود یہ کہ صریحاً" دیگر کارروائی منصوبہ بندی کے مطابق کی گئی۔

جیسا کہ اس رائے کا اظہار کیا گیا پاکستان پیپلزپارٹی (شہید بھٹو) گروپ کے مطابق میر مرتضٰی بھٹو کو قتل کرنے کے لئے ضلع حیدرآباد کے گوٹھ جنھان سومرو میں ایک شادی کی تقریب میں سازش تیار کی اور سازش کرنے والوں میں آصف علی زرداری' ڈی آئی جی شعیب سڈل' واجد درانی اور دیگر شامل تھے اور اس منصوبے کی تفصیلات 19-06-96 کو چیف منسٹر ہاؤس کراچی میں طے کی گئیں۔ سازش کے اس نکتے پر شہادت عبداللہ بلوچ (گواہ نمبر 96) ڈاکٹر الطاف خواجہ (گواہ نمبر 102) احسان الحق بھٹی (گواہ نمبر 112) اسحاق خاکوانی (گواہ نمبر 113) راؤ اے رشید (گواہ نمبر 114) رحیم بخش جمالی (گواہ نمبر 136) اور مسز غنویٰ بھٹو نے پیش کی۔ اگر کوئی ایسی سازش تھی تو مذکورہ گواہوں کی شہادت صرف مبینہ سازش کی طرف اشارہ کرنے تک محدود تھی۔ ان کی شہادت مبہم تھی اور اس کی بنیاد سنی سنائی باتوں پر تھی۔ صرف شبہات پیدا کئے گئے تھے مگر مضبوط شبہ اور/قیاس بھی قانونی شہادت کی جگہ نہیں لے سکتا۔ میر مرتضٰی بھٹو کی قتل کی سازش کو ثابت کرنے کے لئے ایسی شہادت ہونی چاہیئے جو قانونی طور پر قابل قبول ہو اور جو یہ ثابت کرے کہ سازش کی منصوبہ بندی نامزد افراد نے کی تھی۔ نہ تو حکومت سندھ کی نمائندگی کرنے والے فاضل وکیل اختر علی جی قاضی اور نہ یہ پی پی پی (ش ب) گروپ کے فاضل وکیل اور نہ ہی پارٹی کے بعض ارکان اور عہدیدار

اور نہ کوئی اور وکیل یہ ثابت کرسکا کہ ریکارڈ پر آنے والی شہادت سے ثابت ہوگیا ہے کہ میر مرتضٰی بھٹو کو قتل کرنے کی سازش کی گئی تھی۔

سابق وزیراعظم بینظیر بھٹو نے صدر فاروق احمد لغاری پر میر مرتضٰی بھٹو کو ختم کرنے اور اس کا الزام آصف علی زرداری پر لگانے کی سازش تیار کرنے کا الزام لگایا تھا۔ ان کے مطابق میر مرتضٰی بھٹو کا قتل پولیس کے ساتھ ایک حادثاتی مقابلہ نہیں تھا بلکہ ان کی حکومت کو ختم کرنے اور وزیراعظم کی حیثیت سے ان کو برطرف کرنے کی ایک بڑی سازش تھی۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت ہمارے سامنے 4 سیشن میں ریکارڈ کی گئی۔ قانون کے عام اصولوں اور قانون شہادت کے مطابق ان کے بیان کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی گواہی مبہم ہے اور اس میں تضادات ہیں۔ انہوں نے عام انداز میں صدر کے خلاف شکوک کا اظہار کیا۔

اگرچہ انہوں نے کافی طویل عرصہ تک کبھی صدر کے خلاف کوئی الزام نہیں لگایا۔ انہوں نے اپنی خاموشی کو اس واقعہ کے بعد توڑا تاہم ان کی درخواست پر ٹریبونل نے ان کو گواہی کے لئے طلب کیا چونکہ ان کے پاس اس سانحہ کی مبینہ سازش کے بارے میں حقائق اور تفصیلات تھیں جس کے نتیجے میں ان کے بھائی کا قتل ہوا۔ انہوں نے اس شبہے کا اظہار کیا کہ موقع پر موجود پولیس والوں میں سے کچھ یا میر مرتضٰی بھٹو کے باڈی گارڈز میں سے کسی نے ایک دوسرے پر فائرنگ شروع کی۔ یہ بات ٹریبونل میں درست ثابت نہیں ہوئی۔ ٹریبونل کے سامنے ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی جس کے مطابق محترمہ بینظیر بھٹو کے کہنے کے مطابق فائرنگ شروع کی گئی۔ ٹریبونل کے سامنے جو گواہیاں پیش کی گئیں' ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میر مرتضٰی بھٹو کا قتل بینظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے کسی بڑے منصوبے کا حصہ تھا۔ جہاں تک دوسرے موقف کا تعلق ہے کہ یہ پولیس کی جانب سے ماورائے عدالت قتل کا کیس ہے' ٹریبونل کی رائے ہے کہ جو شہادت ریکارڈ پر لائی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ماورائے عدالت قتل کا کیس ہے۔ شہادت سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ میر مرتضٰی بھٹو کو قتل کرنے کا کوئی خاص منصوبہ تھا لیکن اتنا واضح ہے کہ جن پولیس افسران نے آپریشن کا منصوبہ بنایا تھا وہ فائرنگ کی صورت میں اپنے باڈی گارڈز

کے ساتھ میر مرتضیٰ بھٹو کے نشانہ بننے کے خطرے سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس پلان میں واضح امکان تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو زخمی ہو سکتے ہیں یا مارے جا سکتے ہیں۔ درانی اور سڈل متعلقہ صوبائی یا وفاقی اعلیٰ حکام سے منظوری کے بغیر اتنا آگے نہیں جا سکتے تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہاں ہم قانون کی حکمرانی کے بارے میں چند آبزرویشن دیں گے۔ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے۔ ہم پر ایک تحریری دستور کے ذریعہ حکمرانی کی جاتی ہے۔ پاکستان میں سرکاری ملازمین سمیت ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ قانون کے مطابق کام کرے اور قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی کام نہ کرے۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ موجودہ کیس میں اگر پولیس افسران اپنے ذہنوں میں مطمئن تھے کہ میر مرتضیٰ کے باڈی گارڈز یا دوسرے ساتھیوں نے بڑے سنگین جرائم کئے تھے یا وہ دہشت گردی اور دوسری ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھے تو پاکستان کے دستور اور قوانین کا تقاضا تھا کہ پولیس افسران ان لوگوں کو مجاز عدالت میں لاتے' ان کے خلاف گواہی پیش کرتے اور عدالت کو فیصلہ کرنے کا موقعہ دیتے کہ آیا وہ ملک کے پینل لاز (Laws) کے تحت مجرم ہیں یا نہیں۔ ہمارا دستور یا قانون کسی اتھارٹی کو یا ادارے کو بشمول پولیس یا کسی اور ایجنسی کو اجازت نہیں دیتا کہ ملزمان کو ماورائے عدالت طریقوں سے ختم ہی کر دیا جائے۔

ہم یہاں ایک قومی روزنامے کے تازہ شمارے کے اداریئے کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہے۔ "پولیس اور لوگ دونوں ایک ایسے مجرم کے جرم سے مطمئن ہو سکتے ہیں جس کے خلاف متعدد مقدمات میں کوئی شہادت آسانی کے ساتھ سامنے نہ آ رہی ہو کیونکہ لوگ اس کے خلاف گواہی دینے سے خوفزدہ ہیں لیکن ایسے مشکوک افراد کے بہیمانہ قتل (Cold blooded murder) کو بھی انصاف کے راستے کو مختصر کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے اور اسے ماورائے عدالت قتل ہی تصور کیا جائے گا۔

اس طریقہ کار کو کوئی مہذب معاشرہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر حکام بلا یہ محسوس بھی کریں کہ ان کی ایسی کارروائی سے ایک بدنام ڈاکو یا دہشت گرد سے چھٹکارا مل جائے گا اور شہریوں کی حمایت حاصل ہوگی تو بھی پولیس کو

قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہم اس اصول کی توثیق کرتے اور اس پر زور دیتے ہیں۔

ٹرم آف ریفرنس کے نکتے (اے) کے بارے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں کو ٹریپ کرنے اور ان کے باڈی گارڈز اور دوسرے مسلح ساتھیوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اور دکھانا یہ تھا کہ یہ واقعہ مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی کے ساتھ ایک حقیقی مقابلے کا نتیجہ ہے' جو جارح (Aggresser) تھی اور پولیس نے فائرنگ اپنے دفاع میں کی تھی۔ بظاہر میر مرتضیٰ اور پولیس نے فائرنگ اپنے دفاع میں کی تھی۔ بظاہر میر مرتضیٰ بھٹو کو قتل کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا کیونکہ وزیراعظم کی واضح ہدایات تھیں کہ اس (مرتضیٰ) کو ہاتھ نہ لگایا جائے لیکن منصوبہ سازوں کو اس کا علم ہونا چاہئے تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو بھی نشانہ بن سکتے ہیں اس لئے لازماً" اس منصوبے کی منظوری درانی اور سڈل کے مقابلے میں زیادہ اعلیٰ اتھارٹی سے لی گئی ہوگی۔ ٹرم آف ریفرنس کے دوسرے نکتے (بی) کا کہ 70 کلفٹن کے قریب بھاری پولیس پکٹ کی تعیناتی کے جواز کی تحقیق کی جائے یہ موقف ہے کہ اس کا جواب پہلے نکتے کے جواب میں آ گیا ہے۔ ٹرم آف ریفرنس (اے) کے بارے میں ہمارے جواب کے پیش نظر ہم (ٹریبونل) اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پولیس پارٹی کو میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کی پارٹی پر فائرنگ کرنے کا کوئی قانونی جواز حاصل نہیں تھا۔ ہمارے سامنے پیش کئے گئے ریکارڈ اور حقائق کے مطابق منصوبہ صرف میر مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز اور دوسرے مسلح ساتھیوں کو قتل کرنے کا تھا۔ ٹرم آف ریفرنس کے چوتھے نکتے (ڈی) کے جواب میں کہ اس بات کا تعین کیا جائے کہ کیا میر مرتضیٰ بھٹو اور دوسروں پر فائرنگ سے مناسب احتیاط اختیار کرتے ہوئے بچا جا سکتا تھا یا نہیں' ٹریبونل نے رپورٹ میں کہا ہے کہ یہ ٹرم آف ریفرنس اس وقت ٹھیک ہوتا جب پولیس کے اس موقف کو تسلیم کیا جائے کہ آپریشن کا مقصد صرف میر مرتضیٰ بھٹو کی پارٹی کے مقابلے کو روکنا' باڈی گارڈز سے اسلحہ کی تلاشی اور ان کی گرفتاری تھا۔ اگر پولیس کا مقصد ان ملزموں کی صرف تلاشی اور ان کی گرفتاری ہی ہوتا تو بھی یہ نہایت ناقص اور بلا جواز منصوبہ تھا۔ یہ درانی کو معلوم تھا بلکہ غالباً" آئی جی سندھ اور ڈی آئی جی سڈل سمیت سندھ پولیس کے تمام

سینئر پولیس افسران جانتے تھے کہ میر مرتضیٰ بھٹو بڑی تعداد میں مسلح باڈی گارڈز کی ہمراہی میں باہر جاتے ہیں جو جدید ترین اسلحہ سے بھی لیس ہوتے ہیں۔ ان حالات میں پولیس کو بھاری تعداد میں خود کار اور نیم خود کار اسلحہ کے ساتھ 70 کلفٹن کے قریب متعین کرنا اور ان کی اہم مقامات پر ڈیوٹی لگانے اور قافلے کو روکنے جیسے اقدامات سمیت تفصیلی انتظامات کرنے کے بعد یہ توقع کرنا کہ یہ معمول کی تلاشی اور گرفتاری کا عمل ہے ایک احمقانہ منصوبہ تھا جس کے نہایت خطرناک نتائج نکل سکتے تھے۔ درانی اور ڈی آئی جی سڈل کو' جنہوں نے منصوبے کی منظوری دی تھی' یہ محسوس کرنا چاہئے تھا کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حرکت یا اشارے پر دونوں طرف سے پوری طرح فائرنگ شروع ہو سکتی ہے جس کے نتیجے میں بھاری جانی نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ ایک خراب (Bad) اور خطرناک منصوبہ تھا۔ شعیب سڈل کا بھی یہی خیال تھا جب اس کو درانی نے اس پلان کے بارے میں بتایا لیکن اس کے باوجود اس نے اس کی منظوری دیدی۔ سڈل اس پوزیشن میں تھا کہ وہ اس سانحہ کو وقوع پذیر ہونے سے روک سکتا تھا۔ وہ درانی کو بتا سکتا تھا کہ اس پلان کو ترک کر دو لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اگر دہشت گرد 70 کلفٹن میں چھپے ہوئے تھے تو سینئر پولیس افسران کو اس وقت کی وزیراعظم کی ہدایات کے باوجود 70 کلفٹن کے اندر داخل ہونے کی منصوبہ بندی کرنی چاہئے تھی اور ملزمان کو گرفتار کرنا چاہئے تھا۔ وزیراعظم کا یہ حکم غیر قانونی تھا کہ مبینہ دہشت گردوں کی 70 کلفٹن میں موجودگی کے باوجود کسی بھی ایجنسی کو 70 کلفٹن کے اندر داخل نہیں ہونا چاہئے۔ رپورٹ میں اس کے حق میں زاہد اختر بنام حکومت پنجاب (پی ایل ڈی 1995ء سپریم کورٹ 530) کے سپریم کورٹ کے فیصلے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ فیصلے میں کہا گیا ہے "اس کے ذکر کرنے کی مشکل ہی ضرورت ہوگی کہ حکومت کے ایک ملازم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے سے سینئر افسران کے ان ہی احکامات اور ہدایات کی تعمیل کرے گا جو قانونی اور اس کی اہلیت کے دائرے کے اندر ہو۔ اس بنیاد پر کسی غیر قانونی یا نامکمل ہدایات/ آرڈر کی تعمیل کا اس بنیاد پر کوئی جواز ہے کہ اس اعلیٰ اتھارٹی نے جاری کیا ہے اور نہ اس بنیاد پر اس کا دفاع کیا جاسکتا ہے کہ اس کی عدم تعمیل کی بنا پر متعلقہ سرکاری ملازم کو تادیبی کارروائی کا خدشہ رہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دہشت گردوں' سماج دشمن عناصر یا قانون شکن افراد کو عدالتوں کے سامنے لانے میں کتنی ہی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے کسی بھی طور پر ماورائے عدالت قتل کا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ یہ خیال سرے سے غلط ہے کہ ملک کے کسی علاقے میں جہاں قتل و غارتگری اور لاقانونیت روز مرہ کا معمول ہو وہاں قانون شکنوں کو ماورائے عدالت قتل کر کے امن بحال کیا جاسکتا ہے۔ عارضی سکون کو دائمی امن کے برابر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت عوام کے اندر انتشار اور بے بسی کا احساس پایا جاتا ہے جب کوئی شخص ریاست کے خلاف دہشت گردی کے سنگین جرائم میں ملوث ہونے میں بری شہرت رکھتا ہو یا وہ اقتصادی یا مالی جرائم میں ملوث ہو' پکڑا جائے اور ضمانت پر رہا ہو جائے یا بری ہو جائے۔ اگر وہ شخص واقعی مجرم تھا اور رہا ہوگیا ہے تو اس کی رہائی ناقص تفتیش اور شہادت کو جمع کرنے کے لئے موجودہ جدید طریقوں کے عدم اطلاق کا نتیجہ ہو سکتی ہے یا یہ کریمینل جسٹس کے ہمارے طریقے میں خرابیوں کا سبب ہو سکتا ہے۔ ان خامیوں کو دور کرنا چاہئے نہ کہ پولیس یا دوسری ایجنسیوں کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم یا اس کی اجازت دینی چاہئے۔ اگر پولیس کو اطلاع تھی کہ 70 کلفٹن کے اندر دہشت گرد چھپے ہوئے ہیں اور وہ دہشت گردی اور دیگر سماج دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور ان کے خلاف ماضی میں بم دھماکوں سمیت مختلف مقدمات بھی درج تھے تو کم از کم آئی جی اور ڈی آئی جی کو براہ راست یا وفاقی وزیر داخلہ کے ذریعے جن کے ساتھ ان کا براہ راست رابطہ تھا' وزیراعظم سے رابطے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے تھی اور ملزموں کو گرفتار کرنے کے لئے فوری کارروائی کے لئے انہیں ایک اچھا کیس پیش کرنا چاہئے تھا۔ اس کے بعد وہ 70 کلفٹن کے خلاف اس مقصد کے لئے کارروائی کرتے۔ اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ بدقسمتی سے سینئر پولیس افسران اور تمام محکموں کے بیوروکریٹس سینئر اور جونیئر چند حضرات کو چھوڑ کر' غیر قانونی اور ملک کے مفادات کے خلاف ہونے کے باوجود اپنے سینئر حکام کے احکامات کی پابندی کرتے ہیں اور اپنے سینئرز کو یہ بتانے تک کی جرات نہیں کرتے کہ ان کے یہ اقدامات غیر قانونی اور ملک کے مفادات کے خلاف ہیں اور اگر ان احکامات پر عملدر آمد کیا گیا تو

ملک کی سلامتی اور مفادات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ بہرحال ہم نے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ایک سرکاری ملازم سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ صرف قانونی اور جائز احکامات ہی کی پابندی کرے اور غیر قانونی اور غیر مکمل احکامات اور ہدایات کی پابندی نہ کرے۔ چنانچہ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر پولیس کے اس موقف کو تسلیم کر لیا جائے کہ منصوبہ صرف میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی تلاشی لینا اور گرفتار کرنا تھا تو بھی اس منصوبے پر عملدرآمد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ احساس کرتے ہوئے کہ اس پر عملدرآمد کے نتیجے میں جانوں کا بھاری نقصان ہو سکتا تھا درانی کو یہ منصوبہ ترک کر دینا چاہیے تھا جو ایک بہت تجربہ کار افسر تھا' بہرحال جب سڈل کو فائرنگ شروع ہونے کے واقعہ سے آدھ گھنٹے قبل کی تفصیلات بتائی گئیں تو سڈل کو اس وجہ سے اس پلان کو ترک کرنے کا حکم دینا چاہیے تھا کہ یہ جگہ تلاشی لینے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اگر اس پلان پر عمل کرنا ہی تھا تو واضح ہدایات دی جانی چاہیئے تھیں کہ کوئی فائرنگ نہیں کی جائے گی سوائے اس کے کہ نہایت ضروری ہو جائے۔ پھر سیال اور ناتجربہ کار اے ایس آئی کی بجائے جائے وقوع پر درانی کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ شاید اس سے کچھ فرق واقع ہو جاتا۔ اگر میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھی تلاشی دینے سے انکار کرتے اور تلاشی اور گرفتاری کی اجازت نہ دیتے تو بھی پیش نظر خطرات کی بنا پر ان حالات میں ان کی گرفتاری کے لئے کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیئے تھی ورنہ دوسری صورت میں بھاری جانی نقصان ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہمارا ٹرم آف ریفرنس (ڈی) کا جواب یہ ہے کہ مناسب احتیاط اختیار کرتے ہوئے فائرنگ کے سانحہ سے بچا سکتا تھا۔ ٹرم آف ریفرنس کا نکتہ (ای) یہ تھا کہ اس بات کا تعین کیا جائے کہ آیا میر مرتضیٰ بھٹو اور دوسروں کو طبی امداد دینے میں تاخیر کی گئی اور کیا اسپتال نے میر مرتضیٰ بھٹو کو مناسب طبی امداد فوری طور پر فراہم کی اور کیا انہیں مطلوبہ ہنگامی طبی امداد کی فراہمی کے لئے کبھی دوسرے ہسپتال میں لے جانے کے لئے اقدامات کئے گئے۔ اگر نہیں تو اس غفلت کی ذمہ داری کس فرد' افراد یا انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس نکتے کا مناسب جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک میر مرتضیٰ بھٹو کا تعلق ہے ان کے زخموں کی نوعیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

پوسٹ مارٹم کے نوٹس کے مطابق ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو یکے بعد دیگرے چار گولیاں لگیں' بائیں جانب سے فائر کی جانے والی ایک گولی نے ان کی ناک کو توڑ دیا اور دوسری گولی دائیں جانب سے سفر کرتی ہوئی سینے کی طرف چلی گئی' تیسری گولی بائیں جانب سے فائر کی گئی' وہ بائیں بازو میں لگی' چوتھی اور جان لیوا گولی دائیں گال سے لگ کر گردن سے اپنا راستہ بناتی ہوئی دوسری طرف سے باہر نکل آئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور ڈاکٹر عرفان قریشی' ایڈیشنل پولیس سرجن ڈاکٹر اسمٰعیل' ڈاکٹر ایاز' میڈیکو لیگل افسران (جناح ہسپتال) کے بیانات کے مطابق مہلک (Projectile) چہرے میں دائیں طرف سے داخل ہوا جس نے اوپر کا جبڑا توڑ دیا' پھر وہاں کی خالی جگہ (Cavity) کی چھت سے ہوتا ہوا سخت حصے میں سوراخ کرتا ہوا زبان کے پچھلے حصے سے باہر نکلا اور پھر (Cavity) کے فلور سے داخل ہو کر گردن کے بائیں حصے سے نکلا۔ اس کی شہ رگ کٹ گئی تھی اور Common Carotid آرٹری کو بھی جزوی طور پر نقصان پہنچا تھا۔ ان کو یقینی طور پر 8 بجکر 40 منٹ اور 8 بجکر 55 منٹ کے فوراً" بعد جب فائرنگ ختم ہوئی کوئی وقت ضائع کئے بغیر کسی ایسے ہسپتال میں پہنچا دینا چاہیئے تھا جو طبی سازو سامان سے پوری طرح لیس ہو اور اس قسم کے ہنگامی مریضوں کو طبی امداد فراہم کر سکتا ہو۔ اے ایس پی طاہر' جس نے میر مرتضیٰ بھٹو کو شدید زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ پہلے اے پی سی میں درانی کے پاس گیا جو دو تلوار کے نزدیک وقوعہ کی جگہ سے تین سو گز دور ٹریفک چوکی میں اپنی کمانڈ پوسٹ پر تھا۔ اس نے درانی کو بتایا کہ میر مرتضیٰ نازک حالت میں زخمی پڑے ہیں۔ درانی نے رائے طاہر سے کہا کہ "اسے جلدی یہاں سے نکال لے جاؤ" رائے طاہر پھر اسی اے پی سی میں واپس گیا اور میر مرتضیٰ بھٹو کو چلتا ہوا (Walking) دیکھا اور وہ پولیس موبائل میں آگیا۔ یہ بات بھی شہادت میں ہے کہ اے ایس پی رائے طاہر نے میر مرتضیٰ بھٹو کو پھر پولیس موبائل میں ڈالا اور انہیں ٹریفک چوکی لے گئے اور درانی کو کہا کہ وہ میر مرتضیٰ کو مڈایسٹ لے جا رہا ہے جس کی درانی نے اجازت دے دی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو ایک پولیس موبائل میں تقریباً" 9 بجکر 20 منٹ پر مڈایسٹ ہسپتال لایا گیا اور انہیں ہسپتال کے دروازے پر ایک اسٹریچر پر رکھ کر رائے طاہر اور اس کی پولیس پارٹی اسی پولیس موبائل میں وہاں سے فرار ہو گئی۔

رائے طاہر نے ہسپتال کے ریکارڈ میں کوئی اندراج نہیں کیا۔ درانی جیسے تجربہ کار افسر اور رائے طاہر دونوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی کہ آیا اس جیسے میڈیکو لیگل کیس سے نمٹنے کے لئے یہ ہسپتال موزوں بھی ہے یا نہیں۔ چونکہ میر مرتضیٰ کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا اس لئے وقت بڑا اہم عنصر تھا۔ کیونکہ ان کی شہ رگ کٹ چکی تھی اس لئے ایک ایک لمحے میں ان کے بچنے کا امکان کم ہو رہا تھا' خون کے رسنے کو فوراً" روکنا ضروری تھا۔ پولیس والے یقیناً جانتے ہوں گے کہ مڈایسٹ ہسپتال ایک عام ہسپتال تھا۔ جیساکہ اس کے مالک ڈاکٹر عبدالغفار جتوئی نے بتایا کہ ہسپتال میں پہنچنے کے ساتھ ہی ہم نے ماہرین قلب' بیہوش کرنے والے ماہرین اور دوسرے سرجنز کو ہسپتال پہنچنے کے لئے پیغامات دیئے کیونکہ ہمارا ہسپتال ایسا نہیں جو ایسے ہنگامی مریضوں کو طبی امداد فراہم کر سکے۔ ہمارے ہسپتال اور ہمارے جیسے دیگر ہسپتالوں میں مذکورہ ماہرین ہر وقت موجود نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مڈایسٹ میں ایک جونیئر ڈاکٹر سہولتوں اور سازوسامان کے بغیر آدھا گھنٹہ تک میر مرتضیٰ بھٹو کو طبی امداد فراہم کرتا رہا۔ میڈیکو لیگل کیسز کو قبول کرنے کے بارے میں ڈاکٹر غفار جتوئی کہتے ہیں کہ 3/2 سال پہلے ایک شدید زخمی سعودی طالبعلم کو مڈایسٹ ہسپتال لایا گیا تھا لیکن میڈیکو لیگل کیس ہونے کی وجہ سے اس کو جناح ہسپتال بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے بعد حکومت سندھ نے مڈایسٹ ہسپتال کو مطلع کیا کہ میڈیکو لیگل کیسز کی صورت میں بھی مڈایسٹ ہسپتال زخمیوں کو ضروری طبی امداد فراہم کر سکتا ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر غفار جتوئی نے اپنے عملے کو ہدایت کی کہ انہیں میر مرتضیٰ کو طبی امداد فراہم کرنے کی اجازت ہے۔ مرتضیٰ بھٹو کو مڈایسٹ میں طبی امداد کے لئے لے جانے کا فیصلہ بالکل غلط تھا۔ اول یہ ہسپتال ایسے سنگین اور نازک قسم کے زخمیوں کو طبی امداد فراہم کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اگر اے ایس پی شاہد حیات کو فوری طور پر آغا خان ہسپتال اور انسپکٹر سیال کو پہلے جناح ہسپتال اور پھر لیاقت ہسپتال لے جایا جاسکتا تھا' حالانکہ ان کو معمولی زخم آئے تھے' تو میر مرتضیٰ بھٹو کو اتنی نازک حالت میں براہ راست میڈیکو لیگل کے لئے متعین ہسپتال میں کیوں لے جانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بہرحال رائے طاہر کو زندگی کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے اور تیزی سے بہتے خون کے ساتھ مرتضیٰ بھٹو کو ہسپتال

کے دروازے پر چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے تھا بلکہ ہسپتال سے معلومات کرنی چاہئے تھیں کہ آیا اس ہسپتال میں ایسے زخمی کو طبی امداد کی فراہمی کا انتظام ہے یا نہیں (جس میں دو یا تین منٹ لگتے) اور منفی جواب ملنے کی صورت میں میر مرتضیٰ کو کسی دوسرے بہتر ہسپتال میں منتقل کر سکتا تھا۔ اس طرح درانی اور رائے طاہر نے مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا۔ مڈایسٹ میں میر مرتضیٰ بھٹو کو فراہم کئے گئے علاج کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا کہ مڈایسٹ کے ملازمین دوست محمد جتوئی اور انور علی نے اسٹریچر کا چارج لیا اور اسی دوران ڈاکٹر (یا آر ایم او) بھی گراؤنڈ فلور پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ مینجر اصغر بھی تھا۔ ایک نرسنگ اسٹاف میر مرتضیٰ کو آئی سی یو میں لے گیا جو دوسری منزل پر ہے۔ اس وقت تک ہسپتال میں کوئی سرجن یا بیہوش کرنے والا ماہر ڈاکٹر نہیں تھا۔ ہاں صرف ایک ڈاکٹر' ڈاکٹر اعجاز شمیم ار ایم او موجود تھا۔ شمیم کے مطابق جب میر مرتضیٰ کو ہسپتال لایا گیا ان کا رنگ زرد تھا اور وہ بیہوش تھے۔ 9 بجکر 55 منٹ پر ان کو دل کا دورہ پڑا اور ان کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ 11 بجے یا 11 بجکر 15 منٹ پر ان کے دل میں حرکت پیدا ہوئی' بعد میں 11 بجکر 55 منٹ پر ان کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ کیا مڈایسٹ ہسپتال یا ڈاکٹروں کو میر مرتضیٰ کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے' ہم ایسا نہیں سمجھتے۔ میر مرتضیٰ کو نہایت نازک حالت میں ہسپتال کے دروازے پر ڈال کر اے ایس پی رائے طاہر اور ان کی پارٹی چلی گئی۔ وہ ہسپتال کے عملے کو کچھ بھی بتائے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ ہسپتال میں صرف ایک جونیئر ڈاکٹر موجود تھا جو میر کو آئی سی یو میں لے گیا۔ ڈاکٹر غفار جتوئی کو پیغام دیا اور نرسنگ اسٹاف کے ساتھ میر مرتضیٰ کو طبی امداد دیتا رہا اور جان بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب دوسرے ڈاکٹر 9 بجکر 50 منٹ پر پہنچے میر مرتضیٰ کی حالت مزید خراب ہو چکی تھی۔ اس وقت میر کو دوسرے متعین ہسپتال میں شفٹ کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس وقت ان کے دل نے حرکت کرنا چھوڑ دی جس کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی' جو ایک گھنٹے بعد بحال ہوئی لیکن میر کو دل کا ایک اور دورہ پڑا اور 11 بجکر 55 منٹ پر ان کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ ہم مڈایسٹ ہسپتال کو یا وہاں کے ڈاکٹروں کو میر کی موت کا ذمہ دار قرار نہیں دیتے۔ ہم ایسا نہیں سوچتے۔ درانی نے دوسرے زخمیوں اور ہلاک ہونے والے میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں

کے بارے میں کہا کہ 10 بجے شب تک دو زخمی اسماعیل اور مظہر ہسپتال پہنچے جبکہ دوسرے دو زخمی ایاز اور اصغر نصف شب کے بعد ہسپتال پہنچے۔ ایک اور زخمی بچل کو 8 بجکر 45 منٹ پر سب سے پہلے ٹریفک چوکی کے پاس ٹیکسی میں دیکھا گیا۔ اس کے سر پر گولی کا زخم تھا اور وہ بیہوش تھا۔ درانی نے اسے فوری طور پر مڈایسٹ بھیجا جہاں اسے داخل نہیں کیا گیا اور اسے ایدھی ایمبولینس میں جناح ہسپتال بھیجا گیا جہاں وہ آئی سی یو میں تھا کہ اگلے دن اس کا انتقال ہوگیا۔ درانی نے مزید بتایا کہ اس نے جائے وقوعہ پر 6 افراد کو دیکھا جو مرچکے تھے لیکن اس سلسلے میں اس کا بیان مشکوک ہو جاتا ہے کیونکہ وہ خود بیان کرتا ہے کہ ان میں سے ایک ابھی مرا نہیں تھا اور پھر ایس ایچ او درخشاں جو اسلحہ کی برآمدگی کے مشیر نامے کا مصنف ہے مردہ افراد سے اسلحہ کی برآمدگی دکھاتا ہے۔ اگر وہ مردہ تھے تو ان سے اسلحہ کی برآمدگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ موقع واردات پر مردہ پائے گئے یا ان میں سے بعض کچھ دیر تک زندہ رہے لیکن ان کو فوری طبی امداد فراہم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اصل میں ان کو سرے سے کوئی طبی امداد فراہم ہی نہیں کی گئی۔ ان کی لاشیں جائے وقوعہ پر پڑی رہیں۔ ان میں سے اگر سارے یا کچھ فوری طور پر مرے نہیں تھے تو ان کو بہتر سہولتوں والے کسی ہسپتال میں طبی امداد کے لئے بھیجا جاسکتا تھا' ایسا نہیں کیا گیا' کیوں؟

یہ بہتر ہوگا کہ گواہ سب انسپکٹر شاہنواز (گواہ نمبر117) کے بیان کا مندرجہ ذیل حصہ بیان کیا جائے۔

سوال: کیا آپ نے اسلحہ کی برآمدگی کا کوئی مشیر نامہ تیار کیا؟

جواب: میں ملزمان سے اسلحہ کی برآمدگی کے مشیر نامے کی ایک نقل پیش کرتا ہوں۔ (ضمیمہ نمبر117/1)اس مشیر نامہ پر میرے اور دو گواہوں کے دستخط ہیں جن کے نام آغا محمد جمیل ایس ایچ او اور نیپیئر تھانہ اور گارڈن تھانے کے ایس ایچ او شبیر احمد قائم خانی ہیں۔ ضمیمہ 117/1 پر وقت 20 ستمبر1996ء رات 11 بجکر 45 منٹ درج ہے۔

سوال: کیا یہ مشیر نامہ تھانے میں تیار کیا گیا؟

جواب: سب انسپکٹر عرفان کی تحریر میں ہے جو اس وقت میٹھا در تھانے میں تھا یا کھارادر تھانے میں تھا اور جسے کلفٹن میں تعینات کیا گیا ہے۔

سوال: کیا مشیر نامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس ملزم سے کونسا ہتھیار برآمد کیا گیا؟

جواب: جی ہاں! 8 ملزمان میں سے دو کو غیر مسلح دکھلایا گیا۔

سوال: آپ نے کہا ہے کہ آپ نے 11 ہتھیار اے ایس پی طاہر کے حوالے کئے تھے جو ملزم پارٹی سے برآمد ہوئے لیکن زخمیوں کی تعداد صرف 8 ہے' جن کو اے ایس پی طاہر کی ہدایت پر پولیس اسٹیشن لایا گیا اور چھ لاشیں تھیں۔ مشیر نامے میں کتنے ہتھیار زخمیوں سے اور کتنے مردہ افراد سے برآمد دکھائے گئے؟

جواب: چھ ہتھیار ملزمان سے برآمد دکھائے گئے جس کا مطلب یہ ہے کہ دو ملزمان سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا اور یہ دو افراد آصف اور اختر ہیں۔ مشیر نامہ کے مطابق 6 مرنے والوں میں سے 5 سے ہتھیار برآمد کئے گئے۔ مرحوم عاشق حسین جتوئی سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں دکھلایا گیا۔ مشیر نامے میں واضح طور پر دکھلایا گیا ہے کہ کس زخمی یا مردہ شخص سے کونسا ہتھیار برآمد کیا گیا۔

سوال: آپ کے پہلے بیان کے پیش نظر کیا یہ واضح نہیں ہے کہ یہ مشیر نامہ ایک جعلی مشیر نامہ تھا اور اسے آپ نے اعلیٰ افسران کے اشارے پر ڈکٹیشن پر تیار کیا؟

جواب: یہ بات درست نہیں ہے اگرچہ یہ درست ہے کہ نہ اے ایس پی طاہر اور نہ کسی دوسرے افسر نے مجھے جائے واردات پر کچھ بتایا۔ جب ہتھیار میرے حوالے کئے گئے کہ کس سے کونسا ہتھیار برآمد کیا گیا۔ تھانے میں ملزمان سے تفتیش کے دوران مجھے پتہ چلا کہ کس سے کونسا ہتھیار برآمد ہوا تھا۔

سوال: کیا مشیر نامہ جائے واردات پر تیار کیا گیا یا پولیس اسٹیشن میں؟

جواب: پولیس اسٹیشن میں۔

سوال: کیا یہ بات مشیر نامے میں درج ہے کہ یہ جائے واردات پر تیار کیا گیا؟

جواب: جی ہاں۔

سوال: پھر کیا یہ درست ہے کہ مشیر نامے میں اس کی تیاری کی جگہ کا اندراج غلط کیا گیا؟

جواب: جی ہاں؟

سوال: مشیر نامے کے اوپر کے حصے پر وقت 11 بجکر 45 منٹ درج ہے۔ کیا مشیر نامہ

اس وقت تیار کیا گیا تھا؟

جواب: نہیں۔

سوال: کب تیار ہوا؟

جواب: یہ دوسرے دن یعنی 21 ستمبر 1996ء کو تیار کیا گیا۔

سوال: اس لئے یہ درست ہے کہ مشیر نامے میں اس کی تیاری کا وقت غلط تحریر ہے۔

جواب: مشیر نامے میں دیا گیا وقت کارروائی کا وقت ہے۔

سوال: مشیر نامہ کی تیاری کا وقت کہاں دیا گیا؟

جواب: مشیر نامے کی تیاری کا وقت نہیں دیا گیا۔

سوال: آپ نے سینکڑوں مشیر نامے تیار کئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے تعداد ہزاروں میں ہو، جن میں سنگین نوعیت کے جرائم کے مشیر نامے بھی شامل ہوں، ان تمام سینکڑوں یا ہزاروں مشیر ناموں میں آپ وقت نہیں لکھتے۔ جب آپ لکھنا شروع کرتے ہیں بلکہ آپ وہ وقت لکھتے ہیں جو آپ کو واردات کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں بتایا جاتا ہے؟

جواب: یہ درست نہیں ہے۔ ہم وہ وقت دیتے ہیں جب ہم جائے واردات پر پہنچتے ہیں اور جائے واردات پر پہنچنے اور مشیر نامے کی تیاری میں ٹائم کا فرق 5 سے 10 منٹ کا ہوتا ہے۔

سوال: کیا موجودہ واردات میں وقت کا فرق 5 سے 10 منٹ کا ہے؟

جواب: نہیں بلکہ یہ فرق 12 گھنٹے کا ہے۔

سوال: اس مشیر نامے میں اس بات کا ذکر ہے کہ 5 سے 6 افراد جو مردہ نہیں تھے بلکہ زخمی تھے اور جن کو ہسپتال بھیجا گیا تھا کا مشیر نامے میں کیوں ذکر کیا گیا ہے۔؟

جواب: حفظ ماتقدم کے طور پر لکھ دیا گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ مردہ افراد میں بعض زندہ بھی ہوں۔ یہ درست ہے کہ مجھے اے ایس پی طاہر نے جو ہتھیار دیئے اور جنہیں میں لے کر پولیس اسٹیشن گیا وہ موقع پر سیل نہیں کئے گئے تھے۔ وہ دوسرے دن تھانے میں سیل کئے گئے۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ ایف آئی آر نمبر 387/96 سے بھی جسے

سب انسپکٹر شاہنواز ایس ایچ او درخشاں (گواہ نمبر 117) نے آرمز آرڈیننس کی دفعہ 13- ڈی کے تحت اسی رات 11 بجکر 20 منٹ پر درج کرائی تھی۔ شاہنواز کے تیار کردہ مشیر نامے کی توثیق ہوئی ہے۔ اس ایف آئی آر میں پہلے پولیس پارٹی پر فائرنگ کا ریفرنس ہے اور پھر جائے واردات سے 18 ملزمان کی گرفتاری کا ذکر ہے (جن میں ان کے نام بھی ہیں جو مر چکے تھے) اس کے بعد ایف آئی آر میں یہ کہا گیا۔

گرفتاری عمل میں آئی' اسلحہ قبضہ پولیس میں لیا گیا۔ مزید جامہ تلاشی مطابق عمل میں آئی کہ ملزمان مظہر میمن' اسماعیل بچل' میر مرتضٰی بھٹو' رحمان بروہی' علی راجپر' ایاز' عاشق جتوئی' سجاد حیدر' عبدالستار راجپر' یار محمد بلوچ' وجاہت جوکھیو' جو کہ زخمی حالت میں گرفتار ہوئے ہیں' کو زیر نگرانی افسران و ملزمان فوری طور پر بغرض طبی امداد ہسپتال روانہ کیا گیا۔ ملزمان کے بعد میں ابراہیم بلوچ ڈوکی' مزید آٹھ دس مسلح و غیر مسلح موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔

پولیس کارروائی:۔

زخمی گرفتار شدہ برآمد شدہ اسلحہ کو تحویل میں لے لیا اور بیان بدست اے ایس آئی غلام علی تھانہ کلفٹن بغرض قائمی مقدمہ ارسال کیا گیا۔

اے ایس آئی راسب خان تصدیق کرتا ہے کہ بیان موصولہ کی نقل حرف بہ حرف تحریر کی گئی۔ ملزمان کے خلاف 13- ڈی اسلحہ آرڈیننس جرم ہونا پایا جاتا ہے۔

ایف آئی آر نمبر 387/96 کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مظہر میمن' اسماعیل' بچل' میر مرتضٰی بھٹو' رحمٰن بروہی' علی راجپر' ایاز' عاشق جتوئی' سجاد حیدر' عبدالستار راجپر' یار محمد بلوچ اور وجاہت جوکھیو کو موقع سے گرفتار کیا گیا کیونکہ وہ زخمی تھے اس لئے ان کو پولیس کی راست میں طبی امداد کے لئے ہسپتال بھیجا گیا۔ پھر ان چھ مرنے والوں کی لاشیں جناح ہسپتال کے مردہ خانے میں 21 ستمبر کی صبح 3 بجے تک نہیں پہنچی تھیں۔ ان چھ لاشوں کو جائے وقوعہ سے کلفٹن تھانے لے جایا گیا اور پھر وہاں سے پولیس کی نگرانی میں مردہ خانے لے جایا گیا۔ اس پورے کام میں آدھ گھنٹے ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگنا چاہئے تھا لیکن اس کام میں 5 گھنٹے صرف ہوئے۔ اتنا زیادہ وقت کیوں لگا اس کی

کوئی وضاحت ریکارڈ سے ہمیں نہیں ملی۔ یہ بھی پولیس کی غفلت کا ثبوت ہے۔ چنانچہ ٹرم آف ریفرنس (ای) کے بارے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے میر مرتضیٰ بھٹو کو زخمی ہونے کے بعد ہسپتال منتقل کرنے میں تاخیر کی گی۔ وہ 25 سے 30 منٹ زخمی حالت میں جائے وقوعہ پر پڑے رہے جس کے دوران ان کا بہت سارا خون ضائع ہوگیا پھر انہیں مڈایسٹ ہسپتال لے جایا گیا جو ایسے شدید زخمی مریضوں کے علاج کے لئے موزوں نہیں تھا۔ اگر رائے طاہر دروازے پر چھوڑ کر نہ جاتا اور مرتضیٰ کو دوسرے بہتر ہسپتال میں منتقل کرتا تو ان کی جان بچائی جاسکتی تھی۔ مڈایسٹ میں مرتضیٰ بھٹو کو ہنگامی طبی امداد فراہم نہ کی جاسکی کیونکہ وہاں ایسی سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ اسی طرح دوسرے زخمیوں کو بھی فوری طور پر ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ رپورٹ میں مرتضیٰ کو فوری طور پر ہسپتال نہ لے جانے کا ذمہ دار درانی' رائے طاہر اور دوسرے افسران کو قرار دیا گیا۔ وہ دوسرے زخمیوں کی مناسب اور بروقت دیکھ بھال نہ کرنے کی غفلت کے ذمہ دار ہیں جس کی وجہ سے ان میں سے بعض کی موت واقع ہوگئی۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جہاں تک ٹرم آف ریفرنس کے نکتے الیف کا تعلق ہے اس میں اس امر کا تعین کرنا تھا کہ آیا یہ سانحہ میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی جانب سے کسی اشتعال کے بغیر رونما ہوا اور اگر کوئی اشتعال تھا تو کیا پولیس پارٹی نے زیادہ طاقت استعمال کی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ٹریبونل نے رپورٹ میں کہا ہے کہ ریکارڈ پر ایسی کوئی شہادت نہیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی طرف سے کسی قسم کا اشتعال تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ملزمان کے کریمنل ٹرائل کے پیش نظر ٹریبونل نے پولیس پارٹی اور میر مرتضیٰ بھٹو کے ایسے ارکان جو وقوعہ میں مارے نہیں گئے تھے اور عینی گواہ تھے بیانات قلمبند نہیں کئے کیونکہ ٹریبونل نے اصل فائرنگ کے بارے میں گواہی کو ریکارڈ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ اشتعال کے سوال کو ٹرائل کورٹ ہی متعین کرے گی لیکن ٹرم آف ریفرنس کے نکتے (اے) کے بارے میں ہمارے جواب (کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز اور دوسرے مسلح ساتھیوں کو قتل کرنے کا باقاعدہ منصوبہ تھا) کے پیش نظر اگر میر مرتضیٰ بھٹو کی جانب سے اشتعال تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگر پولیس کے اس موقف کو کہ میر مرتضیٰ کی جانب سے اشتعال کا مظاہرہ کیا گیا تھا

جنہوں نے اپنے ساتھیوں کو پولیس پر فائرنگ کے لئے کہا تھا اور ان کی جانب سے پہلے فائرنگ شروع ہوئی۔ ہم نے پہلے ہی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا کہ پولیس پارٹی نے حد سے زیادہ طاقت کا استعمال کیا۔ ٹرم آف ریفرنس کے نکتے (جی) میں اس بات کا تعین کرنا ہے کہ آیا یہ سانحہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق تھا اور کیا اس پورے آپریشن کا مقصد میر مرتضیٰ بھٹو اور دوسرے کو قتل کرنا تھا۔ اگر ایسا ہے تو ان افراد کی نشاندہی کی جائے کہ اس منصوبہ بندی اور آپریشن کو عملی جامہ پہنانے کے ذمہ دار کون لوگ ہیں۔ اس ٹرم آف ریفرنس کا جواب ہماری بحث اور ٹرم آف ریفرنس کے نکتے (اے) میں آگیا ہے۔ آخری ٹرم آف ریفرنس (ایچ) میں اس بات کا تعین کرنا مقصود تھا کہ اس واقعہ میں ملوث ایسے افراد یا افراد کے گروپ کی نشاندہی کی جائے جو مبینہ طور پر اس سانحہ میں ملوث ہوں اور اس معاملے میں مزید قانونی کارروائی کی سفارش کی جائے۔ جہاں اس نکتے کے پہلے حصے کا تعلق ہے ہماری بحث اور ٹرم آف ریفرنس کے نکتے (اے) کے جواب میں اس کا جواب بھی آگیا ہے۔ جہاں تک اس کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو ہماری سفارش یہ ہوگی کہ ان افراد کے خلاف کیس رجسٹر کیا جائے اور قانون کے مطابق (یعنی ضابطہ فوجداری کی مجاز عدالت میں کیس کی سماعت کے لئے) مزید کارروائی کی جائے' تاہم سندھ ہائیکورٹ کے احکامات کے مطابق پہلے ہی ایک ایف آئی آر درج ہو چکی ہے اور ملزمان کے خلاف کیس کی سماعت اخباری اطلاعات کے مطابق شروع ہونے والی ہے۔ جرم کرنے کی ذمہ داری کا تعین ٹرائل کورٹ کرے گی جو اس کے سامنے پیش کی گئی شہادتوں کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ موجودہ پولیس نظام برطانیہ نے 1861ء میں تشکیل دیا تھا۔ اس سلسلے میں 22 مارچ 1861ء کو پولیس ایکٹ V-1861ء کا اجراء عمل میں آیا۔ پولیس رولز 1934ء کے ہیں۔ اسے صوبائی سطح پر انسپکٹر جنرل پولیس کے تحت منظم کیا گیا۔ ہر صوبے میں پولیس رینج ہے اور ہر ایک کا سربراہ ایک ڈی آئی جی ہے۔ ہر صوبے میں انسپکٹر جنرل آف پولیس کی معاونت ضلعی سطح پر متعدد ایس پیز یا ایس ایس پیز کرتے ہیں۔ ایک ڈی آئی جی (کرائمز) بھی ہے جو آئی جی کی سنگین جرائم کی تحقیقات میں معاون کرتا ہے۔ ٹریبونل نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پولیس کی کارکردگی میں کوتاہیوں اور کمزوریوں کے

باعث تیزی سے زوال آیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس معاملے پر فوری توجہ دی جائے۔ اس رجحان کو روکا جائے اور متعلقہ حلقوں کی جانب سے اصلاح احوال کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں۔ یہاں تک کہ ٹریبونل کے سامنے پیش ہونے والے سینئر پولیس افسران نے ان کمزوریوں اور خامیوں کا خود اعتراف کیا ہے۔ یہ ہر شخص کے علم میں ہے کہ برس ہا برس سے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہر سطح پر بڑے پیمانے پر ہونے والی بھرتیاں اہلیت اور میرٹ کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے سیاسی پشت پناہی کے ساتھ ہوتی رہی ہیں۔ جب بھرتی ہوگئے تو ان افسران نے تو تربیتی عمل کو سنجیدگی سے لیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے فورس کے نظم و ضبط کو کنفرم ہونے کے لئے خاطر میں لایا یا تعیناتی، تبادلے اور کیریئر میں پیرفت کے لئے مطلوبہ طریقہ کار کی پیروی کیں انہیں صرف ایک چیز کی سنجیدگی سے پرواہ تھی وہ یہ کہ ان کے "گاڈ فادر" کو خوش رکھ سکے اور اس کے لئے وہ ہر کام کرنے کے لئے تیار ہیں اور سالوں سے ان کالی بھیڑوں کی موجودگی کی وجہ سے پولیس پر منفی اثرات پڑے ہیں اور اس خوبی کو ختم کر دیا ہے جو امن و امان رکھنے اور مجرموں کی سرکوبی اور مناسب تحقیقات کے لئے ناگزیر ہوگئی ہیں۔ ٹریبونل نے رائے دی کہ پولیس کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تاہم اس وقت سب سے سنگین چیلنج جو پولیس کو درپیش ہے وہ معیار کا بحران ہے' اس صورتحال پر اس طرح قابو پایا جاسکتا ہے اور اسے بہتر بنایا جاسکتا ہے کہ پولیس کی مہارت' علم تربیت کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔ پولیس میں بھرتی کا معیار میرٹ ہونا چاہئے۔ انصاف اور قانون کے نفاذ کو یقینی بنانے اور غیر جانبدار طور پر فرائض کی انجام دہی کے لئے پولیس کو ایسی تربیت دی جائے جو سخت بھی اور پیشہ ورانہ ہو جو سماجی تقاضوں پر پورا اترتی ہو۔ ٹریبونل نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ پولیس کے فرسودہ تنظیمی ڈھانچے اور ملک کی بدلتی ہوئی سماجی اقتصادی' معاشرتی اور دیگر ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے تنظیمی ڈھانچے میں اصلاح کی جائے۔ پولیس کے کام نئی جہتوں کے حامل ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے ضروری ہوگیا ہے کہ 21 ویں صدی کے پولیس اہلکاروں کو جدید' علم' مہارت اور طرز عمل سے لیس کیا جائے جو آنے والی صدی کے تقاضوں کے مطابق ہو اور کوئی وجہ نہیں کہ اگر ہم چاہیں تو یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے' اگر ہم چاہیں تو سیاسی اور

پولیس قیادت اور عوام کی تمام سماجی پروگراموں میں حوصلہ افزائی کے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم جرائم پر کنٹرول اور امن و امان برقرار رکھنے کے لئے دوسرے ملکوں کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

تفتیش

تفتیش کی وضاحت ضابطہ فوجداری کی دفعہ 4 (1) میں کی گئی ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ "تفتیش سے مراد وہ ساری کارروائیاں ہیں' جو کوئی پولیس افسر یا کوئی شخص (علاوہ مجسٹریٹ کے)' جسے کسی مجسٹریٹ نے اس ضمن میں مقرر کیا ہو' شواہد جمع کرنے کے لئے اس ضابطہ کے تحت کرتا ہے" تفتیش عمومی طور پر درج ذیل اقدامات پر مشتمل ہوتی ہے:

1- جائے واردات پر کارروائی۔

2- کیس کے حقائق اور حالات کا تعین۔

3- مشتبہ مجرموں کی نشاندہی اور گرفتاری۔

4- جرم کے ارتکاب سے متعلق شواہد کو جمع کرنا جو درج ذیل اقدامات پر مشتمل ہو (اے) مختلف افراد سے پوچھ گچھ کرنا (بشمول اس شخص کے' جو اس ضمن میں حقائق اور حالات کے حوالے سے ملزم نظر آ رہا ہو) اور ان افراد کے بیانات کو ایسے افسر کی طرف سے تحریری شکل میں لانا' جسے مناسب تصور کیا گیا ہو (بی) مختلف جگہوں کی تلاشی لینا اور مختلف اشیاء کو تحویل میں لینا' جو تفتیش کے لئے ضروری ہوں اور جنہیں عدالتی کارروائی میں پیش کیا جا سکے۔

5- رائے قائم کرنا کہ آیا جو مواد جمع کیا گیا ہے' اس کی بنیاد پر ملزم کو مجسٹریٹ کے روبرو یا عدالتی کارروائی میں پیش کرنے کا جواز موجود ہے' اگر ہے تو پھر دفعہ 173 ضابطہ فوجداری کے تحت چارج شیٹ عائد کرنے کے لئے ضروری اقدامات کئے جاتے ہیں۔ جرم کی موثر تفتیش فوجداری مقدمات کا فیصلہ

کرنے والی انتظامیہ کے لئے بہت اہم ہوتی ہے۔ فوجداری قانون کے دست عمل کی حیثیت سے پولیس کا یہ فرض ہے کہ وہ قانونی شواہد جمع کرے جو عدالت کو اس قابل بنائیں کہ ملزم کے قصوروار ہونے کا تعین کر سکے۔ اس مقصد کے لئے جرم کی تفتیش کرنے والے شخص کو متعلقہ قواعد و ضوابط کا لازماً علم ہونا چاہئے اور دیگر امور میں بھی مہارت ہونی چاہئے۔

سینئر پولیس افسروں نیز اس کیس کی تفتیش کرنے والے افسروں کی چھان بین کے بعد ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ پولیس ایکٹ 1861ء میں دیئے گئے قوانین اور ان کے تحت تشکیل کردہ ضوابط کی بنیادی ضرورتوں پر عملدرآمد کے باوجود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی ثبوت کو شعوری طور پر ضائع کرنے کی کوشش کی گئی۔ قابل اعتماد ثبوت جمع کرنے کے طریقہ کار' اس کے مناسب استعمال اور روایات کا واضح طور پر خیال نہیں رکھا گیا' لہٰذا ٹریبونل کی رائے یہ ہے کہ معاملے کے اس انتہائی اہم پہلو پر متعلقہ حکام سنجیدگی سے غور کریں اور اس پر ایک مناسب کارروائی کریں۔ وہ ایسے طریقے اور ذرائع اختیار کریں جن کی وجہ آئندہ ایسی کوتاہیوں کا اعادہ نہ ہو سکے۔

آتشیں اسلحہ کی فوجداری تحقیقات اور جانچ پڑتال

آتشیں اسلحہ کا کیمیکل ایگزیمیشن اسلحہ کے علوم کا ایک حصہ ہے جو ایک کثیر الموضوع مضمون ہے۔ اس کے جو بنیادی اصول ہیں ان کے تحت کسی نمایاں تبدیلی کے بغیر حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ حالیہ برسوں میں آتش گیر مادے کے تجزیے کے اسکوپ اور اس کی جہتوں میں تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں:

1- آتشیں اسلحہ کی شناخت کا ایک معیار مقرر ہے جو دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

2- الیکٹرون مائیکرو اسکوپی کے ذریعے **سکیننگ** کا جو جدید نظام ہے اس سے معمولی نشان کا بس پتہ چل جاتا ہے۔

3- نیوٹرون کی افزودگی و تجزیئے اور دیگر ٹیکنیک کے ذریعے ذرات پر مشتمل (بارود کے) بچے ہوئے پاؤڈر کی شناخت ہو جاتی ہے۔

4- عام بور کے آتشیں اسلحہ سے جو گولی فائر کی جاتی ہے اس کی شناخت ہو جاتی ہے کہ کس اسلحہ سے چلائی گئی ہے۔

5- فائرنگ کے وقت کا اندازہ کرنے کے معاملے میں بھی خاطر خواہ ترقی ہو گئی ہے۔

6- آتشیں اسلحہ سے آنے والے زخم کے ذریعے واقعات کی ترتیب کی از سر نو تشکیل اور دستیاب تاریخ وغیرہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

7- بہت سے واقعات میں آتش گیر مادے کے تجزیئے میں گھپلا کیا جاتا ہے اس کے باوجود جرائم کی تحقیقات کے دوران اسلحہ کی شناخت یا پہچان بڑی اہمیت کی حامل ہے' جن کی وجوہات درج ذیل ہیں:

1- آتشیں اسلحہ گھناؤنے جرائم میں استعمال کیا جاتا ہے۔

2- اس کی شہادت فیصلہ کن نوعیت کی ہوتی ہے۔

3- شہادت عدالتیں بھی تسلیم کر لیتی ہیں۔

4- شہادت تمام عملی امور کے لئے مستقل رہتی ہے۔

5- شہادت دکھائی دیتی ہے۔

ٹریبونل اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جرائم کا سراغ لگانے کا یہ اہم موضوع ابھی تک نظر انداز کیا گیا ہے اور اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ پورے صوبہ سندھ میں اس کا ماہر صرف ایک شخص ہے جو کراچی میں تعینات ہے' لہٰذا پر زور سفارش کی جاتی ہے کہ جرائم کی تحقیقات اور شہادتوں کے حصول میں بہتر نتائج اور غیر ضروری تاخیر سے بچنے کے لئے آتش گیر مادے کے تجزیئے کی پولیس اہلکاروں کو تربیت دلانے کے انتظامات کئے جائیں اور ضلعی ہیڈ کوارٹر کی سطح پر اس سلسلے میں زیادہ تربیت یافتہ عملہ اور بہتر آلات دستیاب ہونے چاہئیں۔

فنگر پرنٹس

برصغیر میں فنگر پرنٹس لینے کا طریقہ عملی طور پر پہلی مرتبہ انڈین سول سروس کے ایک آفسر سر ولیم ہرشل نے استعمال کیا تھا' انہوں نے 1877ء میں بنگال کے ضلع

ہگلی میں یہ طریقہ متعارف کرایا جس کے ذریعہ ان پڑھ قلیوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے شناخت کی جاتی تھی اور رجسٹریشن کے لئے دستاویزات کی تعمیل کرنے والوں کو پہچانا جاتا تھا۔ اس وقت سے اب تک زندگی کے ہر شعبے پر ٹیکنالوجی کی ترقی کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ سائنس نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی ہے۔ تجزیاتی سائنس کے شعبے میں پرانے طریقوں کی جگہ جدید طریقوں نے لے لی ہے جو تیز تر اور حساس اور زیادہ درست ہیں۔ یہ صورتحال اس بات کا تقاضا کرتی ہے ہم اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ ایک صدی قبل فنگر پرنٹس کو تشخیص کرنے کی سائنس نے ایک قطعی حیثیت اختیار کرلی ہے جس میں کسی غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ٹریبونل نے یہ محسوس کیا ہے کہ متعلقہ حکام کو اس حقیقت کا ابھی تک احساس ہی نہیں ہوا ہے۔ کسی شعبے میں علم کی جہت لامحدود ہوتی ہے' لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ فنگر پرنٹس کی تشخیص زیادہ بہتر ہو' اعلیٰ تعلیم یافتہ اسٹاف اور جدید آلات ہوں' بجائے اس کے کہ ایسے بیورو پر انحصار کیا جائے جو کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کام کر رہا ہے۔

کیمیکل ایگزامنر

عام رائے یہی ہے کہ گہرا مشاہدہ جرم کی تشخیص میں بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے زیادہ تر تحقیقات میں کامیابی اس شعبے کی مرہون منت ہے۔ پوری دنیا میں امن و امان کی ذمہ دار فورسز مشاہدے کی طاقت کا ہمیشہ بھرپور استعمال کرتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دیگر ماہرین کی طرح کیمیکل ایگزامنر کا کردار جرائم کی سائنسی تفتیش کے لئے بہت اہم ہے کیونکہ وہ ایک مخصوص کام انجام دیتا ہے۔ ٹریبونل نے یہ بات محسوس کی ہے کہ اس انتہائی اسپیشلائزڈ فیلڈ میں تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد دستیاب نہیں ہے۔ عام طور پر ایسے میڈیکل افسروں کو معمول کے مطابق کیمیکل ایگزامنر تعینات کیا جاتا ہے جن کا بہت معمولی اور سرے سے کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ ٹیکنیشنز اور ایکویپمنٹ کے معاملے میں بھی یہی صورتحال ہے لہٰذا یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ مناسب جگہوں پر سائنسی لیبارٹریز اور ٹریننگ انسٹی ٹیوشن قائم کئے جائیں۔

پوسٹ مارٹم

پوسٹ مارٹم یا لاش کا طبی معائنہ مردہ جسم کا سائنسی اور منظم مطالعہ ہے۔ یہ ابتدائی طور پر قانون کی بعض ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ ٹریبونل نے یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کی کہ میڈیکولیگل کا کام خصوصاً" پوسٹ مارٹم کرنے والوں میں مہارت کی کمی ہے۔ قانون نافذ کرنے والوں اور جرائم کی تفتیش کرنے والے اداروں کو چاہئے کہ وہ مطلوبہ مہارت اور علم حاصل کریں تاکہ پوچھ گچھ اور روزنامچہ کی تیاری کا کام بہتر طریقے سے انجام دیا جاسکے۔ اس مہارت اور علم کے فقدان سے مطلوبہ حقائق کے تعین میں ناکامی ہوتی ہے' لہٰذا مشورہ دیا جاتا ہے کہ میڈیکولیگل افسروں کو لاش کے مکمل طبی معائنے' اندرونی اعضاء کی چیر پھاڑ' پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھنے' نیز لاش کو پولیس یا رشتہ داروں کے حوالے کرنے سے متعلق اختیار کردہ طریق ہائے کار کی تربیت اور تعلیم دینی چاہئے۔ بالفاظ دیگر مختلف میڈیکو لیگل پوسٹ مارٹمز کے کثیر النوع پہلوؤں کی عملی تربیت دی جانی چاہئے' مزید یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ لاشوں کے طبی معائنے کے لئے کافی تعداد میں اسپتال قائم کئے جائیں۔ مزید برآں' چونکہ میڈیکولیگل پوسٹ مارٹم انتہائی خصوصی نوعیت کا سائنسی معائنہ ہے لہٰذا اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ یہ کام میڈیکو لیگل آفیسر ذاتی طور پر انجام دے تاکہ وہ حقیقی طبی رپورٹ مہیا کرسکے۔ گواہوں کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردہ خانے کے ٹیکنیشنز اور اٹینڈنٹس عموماً" خاکروب ہوتے ہیں جو نہ صرف میڈیکولیگل آفیسر کی معاونت کرتے ہیں بلکہ درحقیت وہ پوسٹ مارٹم کے عمل میں حصہ لیتے ہیں حالانکہ وہ لاش کے طبی معائنے کے دوران میڈیکولیگل آفیسر کی معاونت کے اہل بھی نہیں ہوتے' چنانچہ تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ افراد کو یہاں تعینات کیا جانا چاہئے۔ ایک ٹیکنیشن مختلف طریقوں سے میڈیکو لیگل افسروں کی معاونت کرتا ہے مثلاً" وہ اعضاء کو باہر نکالنے سے پہلے ان کا وزن کرتا ہے' پوسٹ مارٹم کے بعد پولیس یا رشتہ داروں کو لاش حوالے کرنے سے پہلے لاش کو صاف کرتا اور دھوتا ہے۔ اس تناظر میں ہمیں یہ موقع ملا ہے کہ ہم وی پی بھون کا وہ آرٹیکل دوبارہ پیش کریں جو "میڈیکل پوسٹ مارٹمز ان انڈیا" نامی کتاب میں شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب 1985ء میں ڈاکٹر

ڈی سی پارکھ نے شائع کی جو کہ جرائم کی تفتیش کے لئے ایک گائیڈ لائن ہے۔

مثالی پوسٹ مارٹم کی ضروریات

از ڈاکٹر پی وی پر بھون (تصویروں کے لئے اٹلس سیکشن دیکھئے) وہ لکھتے ہیں " پوسٹ مارٹم ایک مردہ جسم کا ایک سائنسی اور منظم مطالعہ ہے۔ اگرچہ یہ امراض اور حقیقی اسباب' تشخیص اور موت کی وجہ' موت کے بعد کے عرصہ وغیرہ سے متعلق اہم معلومات فراہم کرتا ہے لیکن کسی ایک آٹوپسی سیکشن کے ڈیزائن اور کنسٹرکشن پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ اس کی ایک جزوی وجہ تو یہ ہے کہ مردہ اجسام کے طبی معائنے کے دوران حاصل کردہ معلومات کو اس طرح قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا جس طرح سمجھا جانا چاہئے۔ دوسرا جزوی سبب یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں فنڈز کی کمی ہے جہاں دستیاب فنڈز زیادہ تر زندہ مریضوں کی ضرورتوں پر خرچ کئے جاتے ہیں۔ بھارت کی زیادہ تر آبادی دیہات پر مشتمل ہے جنہیں تعلقہ اور ضلع کے اسپتالوں سے طبی سہولت میسر آتی ہے۔ شہروں میں جہاں بڑے اسپتال اور ان سے منسلک کالج ہیں' وہ سبتاً" کم ہیں۔ بڑے اسپتالوں خصوصاً" جن کے ساتھ میڈیکل کالج منسلک ہیں' کی نسبت تعلقہ اور ضلع کے اسپتالوں میں پوسٹ مارٹم کی سہولتیں یقینی طور پر مختلف ہیں۔ تعلقہ یا ضلع کے اسپتالوں میں میڈیکولیگل پوسٹ مارٹمز' طبی معائنے کے بڑے کام پر مشتمل ہے اور اگر کوئی معمول کے میڈیکل پوسٹ مارٹم ہوں بھی تو وہ بہت کم ہوتے ہیں۔ لاشوں کا طبی معائنہ اکثر وہ میڈیکل افسر کرتے ہیں جو زیادہ تر مریضوں کے علاج میں مصروف ہوتے ہیں' ان میں سے اکثر کے پاس اس ضمن میں کوئی بہت کم تجربہ ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا۔ بڑے اسپتالوں میں خصوصاً" جن کے ساتھ میڈیکل کالج منسلک ہوتے ہیں دونوں طرح کے پوسٹ مارٹم ہوتے ہیں۔ وہاں بڑی تعداد میں میڈیکل افسر ہوتے ہیں جو میڈیکولیگل کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور انہیں ضرورت کے مطابق سینئر پیتھالوجسٹس اور ماہرین کی رہنمائی بھی حاصل ہوتی ہے۔

بڑے اسپتالوں کی ضروریات

بڑے اسپتالوں میں آٹوپسی سیکشن مین اسپتال سے الگ ہونے چاہئیں۔ متوفی کے لواحقین کو سہولت بہم پہنچانے' ٹرانسپورٹ اور پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ورثا کے حوالے کرنے کے لئے آٹوپسی سیکشن کے آنے اور جانے کا راستہ الگ ہو' آٹوپسی سیکشن میں درج ذیل سہولتیں موجود ہوں۔

1- میڈیکل آفیسر کا دفتر
2- پوسٹ مارٹم کے لئے یونٹس اور کمرے
3- مردہ خانہ
4- لاش کو حوالے کرنے کے لئے ایک کمرہ
5- سروسز روم
6- متوفی پر خصوصی کارروائیوں کا ایک کمرہ
7- لیبارٹریز' ریڈیالوجیکل پروسیجرز' اسٹوریج اور ریکارڈ وغیرہ کے کمرے۔
8- لواحقین کے شیڈ یا ویٹنگ روم
9- سینٹرل کی مناسب سہولتیں۔

میڈیکل آفیسر کا کمرہ

اس کمرے میں میڈیکل آفیسر متعلقہ دستاویزات مثلاً" کیس پیپرز' لاش کے چالان' انکوئسٹ رپورٹ وغیرہ کا مطالعہ کر سکتا ہے اور ایکسریز دیکھ سکتا ہے' وہ پولیس یا لاش کے ساتھ آئے ہوئے ورثاء سے اضافی معلومات بھی حاصل کر سکتا ہے۔ موت کی مشتبہ وجہ پر انحصار کرتے ہوئے' وہ ان طریق ہائے کار کی منصوبہ بندی بھی کر سکتا ہے' جو پوسٹ مارٹم کے وقت اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ مزید برآں اسٹینڈرڈ ٹیکسٹ بکس سے فوری طور پر اپنی یادداشت کو بھی تازہ کر سکتا ہے' تاکہ پوسٹ مارٹم کرتے وقت کسی غلطی کا احتمال نہ رہے۔ وہ اس کمرے میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ٹائپ کر سکتا ہے' طبی معائنے کے بعد وہ پولیس یا رشتہ داروں سے رابطہ بھی کر سکتا ہے' لہٰذا اس

دفتر میں اندرونی اور بیرونی ٹیلیفون دستیاب ہوں۔

پوسٹ مارٹم کے لئے یونٹس/کمرے

لاشوں کے طبی معائنے (آٹوپسی) کے تین یونٹس/کمرے ہونے چاہئیں۔ ایک یونٹ میڈیکل آٹوپسی کے لئے' دوسرا میڈیکولیگل آٹوپسی کے لئے اور تیسرا اضافی یونٹ ہو۔ پہلے دو یونٹس گیلری ٹائپ ہوں اور ان میں بیک وقت 25-30 طلباء کی رہائش کا انتظام ہو' تیسرے یونٹ میں اس طرح کے انتظامات کی ضرورت نہیں ہے۔ آٹوپسی یونٹس کے فرش اور دیواروں پر گلیزڈ ٹائلز لگی ہوئی ہوں۔ ہر آٹوپسی یونٹ میں دو میزیں ہوں' ایک اسٹینڈرڈ آٹوپسی ٹیبل اور دوسری ٹیبل کے اوپر ماربل لگا ہو تاکہ اندرونی اعضاء کو اس پر الگ کیا جاسکے یا دیگر اعضاء کی چیر پھاڑ کی جاسکے۔ دونوں میزوں پر پانی کی فراہمی اور ڈرینیج کے مناسب انتظامات ہوں۔ ہر میز پر دو سنک ہوں ایک گندگی کی صفائی کے لئے اور دوسرا واش بیسن ہو۔ ہر یونٹ میں قدرتی روشنی کا انتظام ہو' تاہم مناسب مصنوعی روشنی کا اہتمام بھی ہونا چاہئے جس میں ایڈجسٹ ایبل لائٹس بھی نصیب ہوں تاکہ چیزوں کو صحیح طریقے سے دیکھا جاسکے۔ ہوا کا گزر اور ایگزاسٹ فین بھی موجود ہوں۔ آٹوپسی روم میں مناسب جگہوں اور تدریس کی غرض سے اسپتال کی بعض جگہوں پر کلوزڈ سرکٹ ٹیلیویژن سسٹم بھی فراہم کیا جانا چاہئے۔ ہر یونٹ میں چارٹس بھی نصب ہوں جن میں جسم کے مختلف اعضاء کا اوسط وزن دیا گیا ہو۔ ان یونٹوں میں ایکسرے دیکھنے کے بکس اور بلیک بورڈز بھی موجود ہونے چاہئیں۔

مردہ خانہ

یہ وہ جگہ ہے جہاں لاش اس وقت تک رکھی جاتی ہے جب تک وہ لواحقین یا دیگر کو تدفین کے لئے حوالے نہ کردی جائے۔ مردہ خانے میں ریفریجریٹیڈ بکس ہونے چاہئیں' جس میں لاش کو ٹھنڈا رکھا جاسکے۔ دوسری صورت میں لاش سڑنے کے باعث اس سے بدبو نکلنا شروع ہو جائے گی۔ 1000 بستروں کے اسپتال میں 16 سے 20 لاشوں

کو رکھنے کی گنجائش ہونی چاہئے' تاہم وقت کا تقاضا ہے کہ کسی بڑے حادثے کے پیش نظر اضافی ضروریات سے نمٹنے کے لئے 28 سے 32 کمرے ہونے چاہئیں۔

لاش کو حوالے کرنے کا کمرہ

لاش کو اچھی طرح صاف ستھرا کرنے کے بعد پوسٹ مارٹم کے کمرے میں لایا جاتا ہے۔ لاش کو میز پر رکھا جاتا ہے۔ لواحقین کو شناخت کے لئے بلایا جاتا ہے پھر مذہبی رسومات کے مطابق اسے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ اس جگہ پر چھوٹی چھوٹی روایتی اور مذہبی رسومات ادا کی جاسکتی ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش کو لواحقین یا پولیس کے حوالے کرنے کے موقع پر میڈیکل افسر وہاں موجود ہوں۔ میڈیکو لیگل پوسٹ مارٹم کے کیس میں یہ ضروری ہے کہ لاش کو پولیس کے حوالے کیا جائے۔ میڈیکل پوسٹ مارٹم کے کیس میں لاش کو لواحقین کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔

ملازمین کا کمرہ

ایک علیحدہ کمرہ ہونا چاہئے جو پوسٹ مارٹم کا کام کرنے یا لاش کو حاصل کرنے کے لئے 24 گھنٹے فرائض انجام دینے والے ملازمین کے لئے ہو۔

لاش پر خصوصی عملے کے لئے کمرہ

ٹرانسپلانٹیشن کے مقصد کی خاطر یہاں لاش کا قرنیہ اور جسم کے دیگر اعضاء نکالے جاسکیں۔ ایک ریفریجریٹر فراہم کیا جانا چاہئے تاکہ نکالے گئے اعضا کو محفوظ رکھا جاسکے۔ یہ کمرہ ترجیحی طور پر ایئرکنڈیشنڈ ہونا چاہئے۔

لیبارٹری اور ریڈیالوجیکل پروسیجر اسٹوریج اور ریکارڈ برقرار رکھنے کے لئے کمرے

اگرچہ یہ کمرے چھوٹے سائز کے ہو سکتے ہیں تاہم یہ علیحدہ علیحدہ ہونے

چاہئیں اور جس مقصد کے لئے بنائے جائیں اس مقصد کے لئے استعمال ہونے چاہئیں۔

ایک کمرہ پوسٹ مارٹم میں لاش کے جسم سے نکالے جانے والے اعضاء کو محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے اور اسے اس وقت تک وہاں رکھا جانا چاہئے جب تک وہ دیگر متعلقہ شعبوں کو مزید تفتیش کے لئے فراہم نہ کر دیئے جائیں۔ یہاں بالٹیاں' ٹرے' بڑے سائز کے گلاس جار وغیرہ مناسب تعداد میں ہونے چاہئیں۔

ایک کمرہ سائیڈ لیبارٹری کے طور پر استعمال کیا جانا چاہئے جہاں چھوٹے چھوٹے لیبارٹری ٹیسٹ ہو سکیں۔ یہاں ایک فریزنگ مائیکروٹوم یا کریسٹیٹ بھی نصب کیا جاسکتا ہے اور ہسٹولوجیکل سیکشنز تیار کئے جاسکتے ہیں۔

پوسٹ مارٹم سیکشن کے تمام اسٹور ایک کمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ یہ اسٹورز بشمول متفرقات اشیاء جن میں ٹیسٹ ٹیوب گلاس' جار' ٹوکریاں' شرے' گاؤن' ماسک' ربر کے گلووز' فرس ٹائیڈ کا سامان وغیرہ کے لئے ہوں۔

ایک کمرہ میڈیکل کے ریکارڈ کو رکھنے کے لئے ہونا چاہئے جیسا کہ پولیس تحقیقات اور پوسٹ مارٹم رپورٹ وغیرہ۔

ایک کمرہ ایسے مواد کو محفوظ رکھنے کے لئے مہیا کیا جانا ہے جو کیمیائی تجزیئے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔

ایک کمرے میں مناسب ایکسرے مشین نصب کی جانی چاہئے تاکہ پوسٹ مارٹم سے پہلے' بعد میں یا دوران میں مردے کی ریڈیالوجیکل پلیٹس حاصل کرنے کی سہولت مل سکے۔ اس کمرے سے ملحق ایک کمرہ ایکسرے پلیٹ کی ڈیولپنگ کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے۔ یہ سائیڈ روم میڈیکل اور میڈیکولیگل اہمیت کے فوٹوگرافس کی تیاری کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پوسٹ مارٹم یونٹ میں اور لیبارٹری میں گیس بھی فراہم کی جانی چاہئے۔

پوسٹ مارٹم سیکشن میں رجسٹرز رکھے جائیں

پوسٹ مارٹم سیکشن میں پانچ طرح کے رجسٹرز ہونے چاہئیں' جن میں (1 اور 2) جنرل رجسٹر برائے میڈیکل اور میڈیکولیگل پوسٹ مارٹم (3 اور 4) پوسٹ مارٹم رپورٹ

رجسٹرز برائے میڈیکل اور میڈیکولیگل پوسٹ مارٹم اور (5) مردہ خانہ رجسٹر۔

جنرل رجسٹر برائے میڈیکل اور میڈیکولیگل پوسٹ مارٹم علیحدہ علیحدہ ہونے چاہئیں۔ علیحدہ سیریل نمبر جیسا کہ اے 1' اے 2' اے 3 اور ایم ایل 1' ایم ایل 2' ایم ایل 3۔ میڈیکل اور میڈیکولیگل پوسٹ مارٹم کو دینے چاہئیں۔

ہر رجسٹر (جدول) ٹیبولیٹڈ فارم میں ہونا چاہئے جس میں درج ذیل ڈیٹا ہو۔ پوسٹ مارٹم کا سیریل نمبر اور مردے کی جنس' انڈور یا آؤٹ ڈور رجسٹر نمبر' کیس انچارج میڈیکل افسر' مریض کے داخلے اور موت کی تاریخ اور وقت' پوسٹ مارٹم کی تاریخ اور وقت' موت کا سبب اور پوسٹ مارٹم کرنے والے میڈیکل افسر کا نام اور دستخط۔

میڈیکل اور میڈیکولیگل پوسٹ مارٹم کے لئے علیحدہ علیحدہ رجسٹر ہونا ان میں اوپر دی گئی تمام تفصیل دی جانی چاہئے' اس کے علاوہ ان میں کئے گئے اندرون اور بیرون معائنوں کی رائے کو مکمل اور ترتیب وار طور پر رکھا جانا چاہئے' اس طرح لیبارٹری اور ہسٹاریکل معائنوں کے نتائج تمام اعضاء کے وزن اور پیمائش' اہم نتائج کی سمری' بیماریوں کی نوعیت اور موت کے سبب اور انداز بھی ان رجسٹروں میں درج کیے جانے چاہئیں۔

ان رجسٹروں کی کاپیاں بنائی جانی چاہئیں تاکہ ضرورت پڑنے پر مناسب حکام کو فراہم کی جاسکیں۔

مردہ خانے کا رجسٹر

اس رجسٹر میں ٹیبولر فارم میں ریکارڈ درج ہو خصوصاً" مردے کو مردہ خانے لانے اور لیجائے جانے کی تفصیل ہو۔ ریکارڈ میں سیریل نمبر' نام' عمر' جنس' انڈور اور آؤٹ ڈور رجسٹر نمبر' میڈیکل افسر انچارج' مردے پر شناخت کے نشانات' پولیس کانسٹیبل کی تعداد' موت کا وقت' مردہ خانے لائے جانے کا وقت' مردہ خانے میں مردے کو حاصل کرتے وقت اس کی حالت (آیا بہتر یا خستہ) پوسٹ مارٹم کئے جانے کا وقت (اگر کیا گیا ہو)' پولیس یا لواحقین کو لاش حوالے کرنے کا وقت (ان کے دستخط کے

ساتھ) یا اناٹومی ڈیپارٹمنٹ کو دینے کا وقت اور میڈیکل افسر کے دستخط۔ مردہ خانے کا درجہ حرارت روزانہ ریکارڈ کیا جانا چاہئے۔

پانچوں رجسٹروں میں تمام تر اندراجات صرف پوسٹ مارٹم سیکشن کے اندر ہی کئے جانے چاہئیں اور ان رجسٹروں کو کسی بھی حالت میں سیکشن سے نہیں ہٹایا جانا چاہئے۔

چھپر یا انتظار گاہ برائے لواحقین

یہ علاقہ لواحقین کے لئے ہو جو پوسٹ مارٹم کے ختم ہونے اور لاش حاصل کرنے کے انتظار میں بیٹھے ہوں۔ یہ جگہ پوسٹ مارٹم سیکشن (کمپلیکس) سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہونی چاہئے اور لواحقین کی مردہ خانے یا پوسٹ مارٹم یونٹ تک آسانی سے رسائی نہیں ہونی چاہئے۔ پوسٹ مارٹم ہو جانے کے بعد جب لاش اس کمرے میں لائی جائے جو لواحقین کو لاش حوالے کرنے کے لئے مخصوص ہو تو وہاں چند لواحقین کو بلا کر لاش ان کے حوالے کر دینی چاہئے۔

پوسٹ مارٹم سیکشن اور لواحقین کے لئے چھپرے (انتظار گاہ) کے ارد گرد ایک چھوٹا باغ ضروری ہے تاکہ لواحقین کی توجہ بٹی رہے اور بہتر منظر نظر آئے۔

صحت و صفائی کی مناسب سہولتیں

متعلقہ جگہوں پر میڈیکل افسروں' ملازمین اور لواحقین کے لئے صحت و صفائی کی مناسب سہولتیں ہونی چاہئیں۔

اسٹافنگ پیٹرن' اسپتال

کام کے دباؤ پر منحصر ہے۔ میڈیکل افسروں کے علاوہ پوسٹ مارٹم سیکشن میں جو عملہ ضروری ہے ان کی تعداد اس طرح ہونی چاہئے۔ سیکرٹری (1) لیبارٹری ٹیکنیشنز (1) لیبارٹری اسسٹنٹ (1) پوسٹ مارٹم اٹینڈنٹ (6)_

مزید یہ کہ ریڈیو گرافر اور فوٹو گرافر کی خدمات اسپتال کے متعلقہ شعبے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

چھوٹے اسپتال کی ضروریات

چھوٹے اسپتال میں جہاں سال بھر میں پوسٹ مارٹم کئے جانے کی تعداد 25-20 سے زیادہ نہیں ہوتی اس لئے پوسٹ مارٹم سیکشن کی ضروریات وہ نہیں ہوتیں جو بڑے اسپتال کی ہوتی ہیں۔ تاہم پوسٹ مارٹم سیکشن کی بنیادی ضروریات مناسب طور پر ضرور پوری کی جانی چاہئیں۔ لہٰذا ایک پوٹ مارٹم کے لئے (ایک یونٹ) ایک کمرہ ضرور ہونا چاہئے۔ ایک کمرہ مردہ خانے کا کام انجام دے اور ایک کمرہ لاش لواحقین کے حوالے کرنے کے لئے ہونا چاہئے۔ پوسٹ مارٹم سیکشن کے دیگر فنکشن اسپتال کے اندر انجام دیئے جاسکتے ہیں۔

چھوٹے اسپتال میں پوسٹ مارٹم سیکشن کا اسٹافنگ پیٹرن

پوسٹ مارٹم اٹینڈنٹ (2) دیگر عملے کو اسپتال کے دیگر سیکشنز سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ایکوپمنٹ اور انسٹرومنٹس

ایکوپمنٹ

(1) پورے جسم کا وزن کرنے والی مشین۔ (2) ایک چھوٹا افقی اسکیل ایک گرام سے 5 کلو گرام تک وزن کے لئے۔ (3) لکڑی کے بلاکس جن میں ایک طرف درمیان میں خلا ہو۔ (4) بلیک بورڈ۔ (5) اسٹین لیس اسٹیل کی ایک پوسٹ مارٹم ٹیبل 2 x 0.7 میٹر اور اونچائی 0.8 میٹر ہو ساتھ ہی اس کے ڈرینج کا نظام بھی ہو۔ (6) لاش لانے کے لئے ٹرالی اور اسٹریچر۔ (7) ڈائی سیکشن آپریٹس۔ (8) انسٹرومنٹ کی الماری۔ (9) اسٹیل کیبنٹس _ (10) ہینڈ لینز۔ (11) مائیکرو اسکوپ۔ (12) فریزنگ مائیکرو فوم/کرائیو اسٹیٹ۔

(13) گلاس جار۔ (14) بالٹی' ٹرے' پیالے۔ (15) اسپرٹ لیمپس۔ (16) سیلنگ ویکس۔ (17) کاغذ/پلاسٹک کے تھیلے۔ (18) ربڑ کے گلووز۔ (19) فرسٹ ایڈ ایکوپمنٹ_ (20) گاؤنز' ماسکس۔ (21) کاٹن۔ (22) اسٹیچنگ کے لئے سامان -(23) اور دفتر کا سامان' اسٹیل کی میزیں' کرسیاں' ریکس' اسٹولز' بلیک بورڈ' کی بورڈز' ویونگ بکس وغیرہ۔

انسٹرومنٹس

(1) بڑے سائز کا برین نائف۔ (2) چھوٹے سائز کا برین نائف۔ (3) مختلف سائز کے چاقو۔ (4) مختلف سائز کے ریٹریکٹرز۔ (5) بڑے اور چھوٹے اسموتھ فورسیپس۔ (6) آرٹری فورسیپس_ (7) ٹوتھ فورسیپس _ (8) چھوٹی بڑی قینچیاں۔ (9) دھری کند قینچیاں۔ (10) ایسٹروٹوم۔ (11) ہتھوڑا۔ (12) چھینی۔ (13) بون کٹرز۔ (14) بکیلے کلیمس۔ (15) جراحی کے مختلف سائز کے آلات۔ (16) کوروزری قینچیاں۔ (17) ہاتھ کی آری/بجلی کی آری۔ (18) پیریوا سٹیل ایلیویٹر۔ (19) پلاسٹک رولرز' 15 سینٹی میٹر' 30 سینٹی میٹر۔ (20) پیائش کا ٹیپ۔ (21) سیدھی اور بیضوی سوئیاں۔ (22) سلائی کا سامان اور (23) چھلنی۔

انسٹرومنٹس کے استعمال پر بعض اشارے

پوسٹ مارٹم کے چاقو لاش کو کھولنے کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اس امر کو یقینی بنانا چاہئے کہ دماغ' پھیپھڑے' جگر' گردے اور دیگر اعضاء کی سطح کاٹتے وقت وہ یکساں اور بہتر رہے۔ اسکلپل کو سر کی کھال تراشنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک طرف دھار اور ایک طرف کند قینچی کو دل کی شریان' پتے کی نالی اور چھوٹی شریانوں کو کھولنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دو طرفہ کند قینچی کو گردن کی شریانوں اور کند چیر پھاڑ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ آنتوں کی قینچی کو آنت' پیٹ اور دل کھولنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک کوسٹو ٹوم یا ہڈی کاٹنے کا آلہ پسلی کاٹنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ہاتھ کی آری اور بجلی کی آری کو کھوپڑی کا اوپر کا حصہ اور ریڑھ کی ہڈی کو کاٹنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

پوسٹ مارٹم دستاویزی شرائط کا مسودہ:۔

(ایک دور مار کرنے والے بیلسٹک میزائل کا حوالہ دینے کا خاکہ ہے) یہ دستاویز دستخط شدہ تحریری ریکارڈ ہے اور اس کو وقت ضرورت شہادت کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک پوسٹ مارٹم دستاویز میں پوسٹ مارٹم کے اندراجات ریکارڈ ہوتے ہیں جس میں وجہ موت' طریقہ موت اور موت کا وقت ریکارڈ کر کے شہادت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے' یہ دستاویز الفاظ کی حقیقی تصویر کی مدد سے نقشہ کھینچتی ہے جس میں اس پوسٹ مارٹم کا عمل اور اس کے نتائج شامل ہوتے ہیں۔ اس میں مثبت اور منفی سفارشات ہونا ضروری ہیں۔ پوسٹ مارٹم دستاویز میں دی گئی سہولتوں کے مطابق اسے مختلف مرحلوں میں تیار کیا جاسکتا ہے۔ معائنہ کی تفصیلات زبانی طور پر ایک اسسٹنٹ کی مدد سے ریکارڈ کی جاسکتی ہیں اور اسسٹنٹ کی غیر حاضری میں ایک پاکٹ ٹیپ ریکارڈ کو بہت اہمیت حاصل ہے جس میں زبانی طور پر سفارشات کو ریکارڈ کیا جاسکتا ہے اور مکمل پوسٹ مارٹم رپورٹ کا تصاویر آنے تک انتظار کیا جاسکتا ہے تاکہ پوسٹ مارٹم اور اس کے نتائج مکمل طور پر غلطی سے پاک ہوں اور پوسٹ مارٹم کے تمام مثبت پہلوؤں کا ریکارڈ کیا جائے تاکہ اس میں کوئی اہم پہلو نہ رہ جائے جو کہ قانون کے تقاضے پورے کرتا ہو' جس میں وجہ موت یعنی موت کس طرح اور کس وقت واقع ہوئی۔ میڈیکل آفیسر کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنی رپورٹ عدالت میں جرح کے دوران اپنے تجزیئے اور مشاہدات کو بیان کر سکے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ فنی اصطلاح استعمال کئے بغیر آسان انگریزی زبان میں تحریر کی جائے تاکہ اس کو آسانی سے پڑھا جاسکے اور ہر حال میں ہر ایک شخص اس کو پڑھ سکے خواہ یہ رپورٹ کریمنل عنوان کے لئے ہو یا دیوانی سماعت کے لئے ضروری ہو۔ جامع اور اچھی تفصیلات کا ہونا ضروری ہے۔ پوسٹ مارٹم میں منطقی مشاہدات کو مدنظر رکھا جائے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ قانون کے مطابق عمومی اجزاء' بیرونی مشاہدات' واقعہ کے وقت موجود اجزا پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ اندرونی

رپورٹ مرکزی حیثیت میں موجود اجزا کے تجزیئے سے متعلق ہوتی ہے۔

خصوصی تجزیہ اور تحقیقاتی رائے :۔

پوسٹ مارٹم کرنے والے کو اہم نکات کا خیال رکھنا چاہئے ہر میڈیکل آفیسر ایک عام طریقہ اپنے طور پر وضع کرے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھنے والی اتھارٹی پر واضح ہونا چاہئے کہ مرنے والے کا نام تاریخ جگہ اور وقت جہاں سے لاش پائی گئی' تاریخ جگہ' وقت اور پوسٹ مارٹم کی تکمیل کے مراحل اور ان اشخاص کے نام جنہوں نے لاش کی شناخت کی ہو' اس وقت جب لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لائی گئی ہو' اس کے علاوہ اس مجموعی رپورٹ جو کہ واقعہ کے ظاہری اجزاء سے متعلق ہو' مرنے والے کے کپڑوں کی فہرست عمر اور جس حالت میں پایا گیا' زخموں کی تفصیل کہ کتنا عرصہ قبل اس کو زخم آئے ہیں' ریکارڈ میں رکھی گئی ترتیب وار تفصیلات ہوں۔ مزید براں تصاویر یا خاکہ (اگر کوئی یاد کیا گیا ہو) تفتیش کے دوران نوٹ کی گئی زخموں کی موجودگی یا عدم موجودگی کی تفصیلات بھی خاص طور پر تحریر کی جائیں اور اس میں جسم کے اندرونی اجزاء کی رپورٹ شامل ہو۔ اندرونی رپورٹ میں معدے میں موجود اجزاء اور ظاہری حالت کی تفصیلات بیان کی جائیں' غیر متعلقہ اور غیر اہم اعضا کی تفصیلات درج نہ کی جائیں' اگر خوردبین مطالعہ یا خصوصی مشاہدہ ریڈیوگرافی وغیرہ کے ذریعے کیا گیا ہو' تو ان کی تفصیلات بھی درج کی جائیں نمونوں کی تفصیل جو جسم کے حصوں سے محفوظ کئے گئے ہوں اس پر درج کی جائے گی۔ میڈیکولیگل شعبہ سے متعلق پوسٹ مارٹم دستاویز ہی وجہ موت کا واضح ثبوت ہوگا (خاص کر تشدد اور زہر خورانی) دیگر تمام زخموں کی تفصیلات کو ترتیب وار مختصرو جامع تجزیہ میں درج کیا جائے جو زخم کی تفصیلات بیان کر سکے۔ زہر خورانی کا کوئی بھی وقوعہ اسی طرح درج کیا جائے' کوئی بیماری اگرچہ مریض کو تھی تو اس کے بارے میں تفصیل بھی درج کی جائے۔ جس وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہو اور اس میں بھی اس عمل کا خیال رکھا جائے کہ وجہ موت طریقہ موت اور موت کا وقت درج کیا جائے۔ پوسٹ مارٹم کے مشاہدات کے لئے لازمی طور پر ظاہری تفصیلات فوٹوگراف' نقشہ' وزن اور پیمائش بھی تفصیلات ریکارڈ رکھنے میں معاون ہوں

گے۔وجہ موت اور طریقہ موت میں کسی قسم کا الجھاؤ پیدا نہیں ہونا چاہئے وجہ موت سے مراد حالت یا اس بیماری کی تشریح ہے جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ موت کے اسباب میں دی گئی موت کی پانچ تشریحات قدرتی' خودکشی' قتل' حادثاتی یا لاعلم وجوہات شامل ہونی چاہئیں۔ ان نکات کی وضاحت کے لئے چند مثالیں دی گئی ہیں ۔(الف) وجہ موت' دل کے امراض' طریقہ موت' قدرتی (ب) موت کی وجہ : مزاحمت کے دوران کلائی پر موجود زخمی' خود ساختہ زخم' موت کا سبب خودکشی' گلا دبا کر ہلاک کرنا قتل کے زمرے میں آئے گا۔ موت کا سبب زہر یا کسی کند آری آلہ سے زخم' ٹرک سے کچلا جانا' یہ حادثاتی موت قرار پائے گی۔ موت کا سبب نامعلوم کوئی بیماری کوئی زخم یا زہر خورانی کی کوئی علامت نہ ہونے کے باعث وجہ نامعلوم درج کی جائے گی۔ موت کے اسباب سے متعلقہ رائے شفاف اور واضح ہونی چاہئے اس میں کسی قسم کے غیر طبعی حقائق یا تفصیلات شامل نہ کی جائیں۔ مثال کے طور پر میری رائے میں مسرٹ اے بی سی ایک 25 سالہ صحت مند شخص سینے کی بائیں جانب گہرے زخم کے سبب' جو کہ چوتھی پسلی کے نیچے برف توڑنے والے سوئے سے کیا گیا' نیچے جاکر دل اور اس کے اردگرد شریانوں کو نقصان پہنچانے کے باعث موت کا سبب بنا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کسی بیماری کی علامت نہیں پائی گئی۔ اگر بیان کی تفصیلات پولیس ذرائع سے اخذ کی جائیں تو رپورٹ میں اس کا بھی لازمی اندراج کیا جائے' مثال کے طور پر کیس کی تاریخ کے حوالے سے میری رائے میں موت کا سبب دل کا دورہ تھا جو پیٹ پر آنے والی ضرب کا نتیجہ تھا۔ اگر موت قدرتی اسباب کی بنا پر وقوع پذیر ہوئی ہے تو اس کو بھی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا جائے' مثال کے طور پر میری رائے میں مسٹر ایکس وائی زیڈ 82 سالہ بوڑھے شخص کی موت کا سبب دل کی شریانوں کا تنگ ہونا ہے جن کے باعث چھوٹی شریانیں جو دل تک خون فراہم کرتی ہیں اپنا عمل مکمل نہ کر سکیں اور موت واقع ہوئی۔ پوسٹ مارٹم کے دوران کسی قسم کے زخموں کی نشاندہی نہیں ہوئی۔ موت کے دیگر اسباب بھی بیان کئے جانے چاہئیں۔ موت کے اسباب ایک سرٹیفکیٹ فارم کالم میں درج کئے جائیں' جن کے آخر میں میڈیکل آفیسر کا عہدہ تعلیم اور دستخط درج کئے جائیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور موت کا تصدیق ہونا بھی جدول میں درج کیا جائے۔

موت کا سرٹیفکیٹ جاری ہونے کے 24 گھنٹے کے اندر پوسٹ مارٹم رپورٹ مکمل کرلی جائے اگرچہ وجہ موت میں زہر خورانی' مسخ شدہ لاش یا اور ایسی موت جس کی مزید تفصیلات درکار ہوں مثلاً" کیمیائی یا خوردبینی تجزیے کی ضرورت ہو اور اس رپورٹ کے آنے تک پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کے سبب کی رائے کو محفوظ رکھا جائے۔ اس قسم کے نتائج ظاہر ہونے کے بعد موت کے سبب سے متعلقہ رائے کا اندراج بھی کردیا جائے۔ مکمل پوسٹ مارٹم رپورٹ کیمیائی تجزیہ خوردبینی "مشاہدات کے باوجود بھی موت کا سبب طے نہیں ہوپاتا جو کہ صرف انہی حالات میں ممکن ہے کہ جب میڈیکل آفیسر موت کی وجوہات ناقابل شناخت قرار دیتا ہے اور نہ ہی طریقہ ہلاکت معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اگر تفتیشی آفیسر چاہے تو حالات اور واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیس کی مزید تفصیلات حاصل کرنے کا مجاز ہے تاکہ مزید شہادتیں جمع کرسکے۔

کراچی میں' جہاں کی آبادی بڑھ کر تقریباً" ایک کروڑ 30 لاکھ نفوس تک پہنچ چکی ہے' بمشکل 4 یا 5 اسپتال ایسے ہیں جو میڈیکولیگل کیس کو نمٹا سکتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت جبکہ کراچی کی آبادی لگ بھگ 3 لاکھ نفوس تھی ممکن ہے کہ ایسے 2 یا 3 اسپتال عوام کی ضروریات کی تکمیل کیا کرتے تھے لیکن آج کل ممکن ہے کہ 30 اسپتال بھی میٹروپولیٹن شہر کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ناکافی ہوں۔ مثال کے طور پر ممکن ہے کہ کوئی شخص لانڈھی' نارتھ کراچی یا اورنگی میں کسی مجرم کے ہاتھوں زخمی ہو جائے تو کوئی بھی قریبی اسپتال علاج معالجے کے لئے ایسے زخمی کو اس بنیاد پر قبول نہیں کرے گا کہ یہ ایک میڈیکولیگل کیس ہے اور کہے گا کہ زخمی کو کسی نامزد اسپتال' جیسے جناح یا سول اسپتال لیجایا جائے اور ہو سکتا ہے کہ ایسا اسپتال 10 یا 20 میل دور ہو۔ اگر کوئی پرائیویٹ کنوینس دستیاب نہ ہو تو پھر زخمی کے رشتہ دار یا دوست اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ وہ اس کے لئے کسی ٹیکسی یا رکشہ کا بندوبست کریں جو بہت زیادہ کرائے کی ادائیگی کا مطالبہ کرسکتا ہے اور پھر زخمی کو کسی نامزد اسپتال تک پہنچانے میں اتنا طویل وقت صرف ہو سکتا ہے جس کے دوران زخمی کی حالت بگڑ سکتی ہے یا اس کے زندہ بچ جانے کے امکانات میں کمی واقع ہوسکتی ہے۔

ٹربیونل نے سماعت کے دوران اس بات کو نوٹ کیا کہ ڈسٹرکٹ کراچی ساؤتھ

میں سات سب ڈویژن ہیں جن میں سے ہرایک کا سربراہ ایک اسسٹنٹ کمشنر/ڈویژنل مجسٹریٹ ہے' کسی ڈسٹرکٹ کے ہر سب ڈویژن میں ایک ایسا اسپتال ہونا چاہئے جو میڈیکولیگل کیس کو نمٹانے کا مجاز ہو۔ ایک مثالی صورتحال تو وہی ہو سکتی ہے جس میں کوئی نامزد اسپتال زیادہ سے زیادہ دو میل نصف قطر تک کے علاقے کی مذکورہ ضروریات کا احاطہ کرے۔ ہر نامزد اسپتال میں باقاعدہ کوالیفائیڈ موزوں تربیت یافتہ اور خاصے تجربہ کار ایک یا زائد میڈیکولیگل کیس کو نمٹا سکیں۔ ایسے اسپتال کو اس لائق بھی رہنا چاہئے کہ وہ مریضوں کے علاج معالجے کے لئے ان پر بھرپور توجہ دے سکے۔ اس کے علاوہ ایسے اسپتالوں میں ایمبولینسز بھی دستیاب رہنی چاہئیں تاکہ وہ سنگین کیسوں کو ایسے نسبتاً" زیادہ بڑے اسپتالوں کو منتقل کرسکیں جو کہ ان مریضوں کا جن کی حالت نازک ہو علاج معالجہ کرنے کے لئے تمام ضروری سہولتوں سے لیس ہوں۔

ابتدائی مرحلے میں یعنی حتی الامکان جلد سے جلد سرکاری/نجی شعبے میں پہلے سے کارگزار اسپتال کو ایسے اسپتالوں کے طور پر نامزد کیا جاسکتا ہے جو کہ میڈیکولیگل کیسوں کو نمٹانے کے مجاز ہوں۔ حکومت میڈیکو لیگل آفیسرز کا تقرر کر سکتی ہے اور ایدھی آرگنائزیشن یا اس جیسی سماجی خدمت انجام دینے والے ادارے یا این جی اوز سے بھی رابطہ کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ دیگر مطلوبہ انتظامات کرے' جیسے افرادی طاقت کی فراہمی مطلوبہ رجسٹرز کی مینٹیننس اور دیگر پیپرورک کی انجام دہی' نیز ایمبولینسز بھی اس وقت تک فراہم کرتا رہے تاوقتیکہ حکومت ایسے تمام انتظامات کرنے کے لائق نہ ہو جائے۔

ٹربیونل نے سماعت کے دوران ان گواہوں کے منفی رویہ کو افسوس کے ساتھ نوٹ کیا جو ٹربیونل کے روبرو پیش ہوئے تھے۔ جہاں تک آفیشل گواہوں کا تعلق ہے چند شخصیات کو چھوڑ کر اس امر کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ایسے گواہان نے اس امر کے باوجود کہ وہ باقاعدہ کوالیفائیڈ تھے اور اپنے جاب کا کافی تجربہ رکھتے تھے لاپرواہی' غفلت ڈسپلن اور کمٹ منٹ اور ٹریجڈی سے متاثرہ عام آدمی کے سلسلے میں تعلق خاطر کے فقدان کا مظاہرہ کیا ہم یہاں چند مثالوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈسٹرکٹ کے متعلقہ ایگزیکٹو عہدیداروں نے لاشوں اور زخمی مریضوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ قطعی اطمینان بخش

نہیں تھا۔ مردہ افراد کی لاشوں کا کئی گھنٹے تک پتہ ہی نہیں چل سکا اور کوئی بھی شخص بشمول سینئر پولیس افسران' ڈی سی ساؤتھ اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے ماتحت افسران اس امر کی نشاندہی نہیں کرسکتے تھے کہ لاشیں کہاں پر ہیں۔ رات بھر مردہ خانے میں بجلی نہیں تھی ساری انتظامیہ بجلی بحال نہیں کراسکی۔ لاشیں شب کے تین بجے سے تاریکی میں پڑی رہیں اور پوسٹ مارٹم کو کئی گھنٹوں تک ملتوی کر دینا پڑا اور وہ صرف اس وقت کیا جاسکا جبکہ سورج طلوع ہوگیا اور مردہ خانہ کے اندر کافی روشنی آگئی۔ کے ای ایس سی کے افسران کی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناح اسپتال کی بجلی کی سپلائی منقطع نہیں کی گئی تھی اور اسپتال کی داخلی وائرنگ کے ذمہ دار اسپتال کے حکام تھے۔ مردہ خانہ کے سوا سارے جناح اسپتال میں روشنی موجود تھی غالباً" مردہ خانے کا بلب فیوز ہوگیا تھا یا کوئی چھوٹا موٹا مقامی مسئلہ پیدا ہوگیا تھا اور اگر اسپتال کے حکام' ایگزیکٹو افسران یا پولیس نے چوکس رہنے اور اپنے کام سے لگن اور مردہ افراد کی لاشوں کے بارے میں دلسوزی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو یہ مسئلہ منٹوں میں حل ہو چکا ہوتا۔ اکثر میڈیکو لیگل آفیسرز اور ان کے ساتھ ساتھ نہایت سینئر ڈاکٹر جو سرکاری ملازم ہیں اور جو تین اسپیشل میڈیکل بورڈ میں شامل تھے کا رویہ اور کارکرگی مطلوبہ خواہش سے بہت کم تھی۔ تین اسپیشل میڈیکل بورڈز کی کوالٹی رپورٹس مطلوبہ میعار کے مطابق نہیں تھیں۔ اسپیشل میڈیکل بورڈز کے ممبرز کے کام میں ہیلتھ سیکرٹری کی مداخلت کو بھی تشویش کے ساتھ نوٹ کیا گیا۔

عوام کے گواہوں کے عمومی رویہ سے بھی سچائی کی تلاش کے سلسلے میں ٹریبونل کی اعانت کرنے کی کمٹ منٹ کے فقدان کا اظہار ہوا تھا۔ ایسے کئی گواہوں نے عمومی ڈھنگ کے یا مبہم بیانات دیئے ہیں اور یہ بیان قلمبند کرایا ہے کہ وہ کسی ایسی بات سے واقف نہیں ہیں' جس سے ٹریبونل کو اس کے تفویض شدہ فریضہ کی تکمیل میں مدد مل سکے۔ ہم اس موقع پر ان تمام فاضل وکلاء کے لئے اپنا شکریہ ریکارڈ پر لے آئے ہیں جو مختلف فریقوں کی پیروی کرتے ہوئے ٹریبونل کے روبرو پیش ہوئے بشمول مسٹر اختر علی جی قاضی جنہوں نے سندھ حکومت کی نمائندگی کی۔ خصوصی طور پر مسٹر کریم خاں آغا ایڈووکیٹ اور مسٹر عبداللطیف انصاری (سابق اے اے جی) قابل ذکر

ہیں جو ٹریبونل کی سماعت کی ساری کارروائی کے دوران حاضر رہے۔ سندھ حکومت نے بھی ٹریبونل کو اپنی سماعت منعقد کرنے کی غرض سے ضروری سہولتیں فراہم کرنے میں اعانت کی۔ تمام فاضل وکلاء جنہوں نے ٹریبونل کے کام میں اس کی اعانت کی' ماحول کو سازگار بنایا۔ نیوز میڈیا بشمول ٹی وی کا رول بھی ٹریبونل کی کارروائی کی عمدگی سے اور معروضی طریقے سے کوریج کرنے پر تحسین و ستائش کا مستحق ہے۔ ہمارے پرسنل اسٹاف بشمول سیکرٹری اسٹینو گرافرز اور ریڈرز بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہیں اوور ٹائم اور شدید دباؤ کے تحت کام کرنا پڑا یہ بات سب کو معلوم ہے کہ صوبائی اور اس کے ساتھ ساتھ فیڈرل ٹریبونل آف انکوائری کے قوانین کے تحت تشکیل شدہ ٹریبونلز کی جانب سے مرتب کردہ رپورٹیں عام طور پر شائع نہیں کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے اہم اور حساس امور کی تحقیقات منعقد کرانے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

موجودہ ٹریبونل نے اپنی ساری کارروائی کھلے طور پر منعقد کی اور اس کارروائی کی کوریج کے سلسلے میں ٹی وی سمیت نیوز میڈیا پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ سندھ حکومت نے بھی ٹریبونل کی کارروائی کی کوریج کے سلسلے میں کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ درحقیقت جب ٹریبونل کی کارروائی شروع ہوئی تو اس وقت کے ایڈووکیٹ جنرل سندھ نے یہ درخواست کی تھی کہ اس ساری کارروائی کو ٹیلیویژن پر پیش کرنے کی اجازت دی جائے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کارروائی کو شفاف رکھا جائے چونکہ انکوائری ٹریبونل کی رپورٹ اس کی کارروائی کا ایک لازمی جزو ہے (اس لئے) اس کے شفاف رہنے کا عمل اس وقت مکمل ہوگا جبکہ اس کی رپورٹ شائع کردی جائے۔

ہم اس بات کی پرزور سفارش کرتے ہیں کہ اس رپورٹ کو وقت ضائع کئے بغیر منظر عام پر لایا جائے اور اسے شائع کرنے کی اجازت دی جائے۔

میر مرتضیٰ بھٹو کا قاتل کون؟

14 اگست 1996ء کو یوم پاکستان کے موقع پر جب پوری قوم خوشیاں منا رہی تھی تو اس روز محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم ہاؤس میں بیٹھی میاں نواز شریف کے ساتھ صلح کے لئے اپنے قریبی ساتھیوں سے صلاح و مشورے میں مصروف تھیں کیونکہ قاضی حسین احمد نے حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے بے نظیر بھٹو کے ایلچی حضرات کو صاف صاف جواب دے دیا تھا جبکہ صدر مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ دونوں کے درمیان ہفتہ ہفتہ ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری کی 1996ء کے شروع میں امور مملکت میں مداخلت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ اس کے حکومتی عہدیداروں اور کابینہ کے بعض ارکان کو ایوان صدر طلب کر کے بالکل اس طرح ڈانٹا کرتے تھے جس طرح غلام اسحاق خاں امور مملکت انجام دیا کرتے تھے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری کی ان حرکتوں کی وجہ سے سیاسی اور سفارتی حلقوں میں اگست 1996ء میں چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں کہ حکومت اب گئی کہ اب گئی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی کوشش تھی کہ ان کی میاں نواز شریف کے ساتھ صلح ہو جائے کیونکہ اپوزیشن نے 13 اگست 1996ء کو حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو چاہتی تھیں کہ میاں نواز شریف مڈٹرم الیکشن کے مسئلہ پر سردار فاروق احمد خاں لغاری کے ساتھ ساز باز کرنے کی بجائے ان کے ساتھ مذاکرات کریں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ستمبر 1996ء کے شروع میں معین قریشی بھی پاکستان آنے والے ہیں جبکہ عالمی بنک کے سینئر حکام کی اپوزیشن رہنماؤں اور سردار فاروق احمد خاں لغاری کے

ساتھ ملاقاتیں کوئی راز نہیں رہی تھیں۔ بے نظیر بھٹو اپنے دور حکومت میں نواز شریف کے خاندان کے خلاف درج ہونے والے مقدمات کو مرحلہ وار واپس لینے کے لئے بھی تیار تھیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مسئلہ یہ تھا کہ میاں نواز شریف ان کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ سابق نگران وزیراعظم معین قریشی 5 ستمبر 1996ء کو پاکستان آئے۔ انہوں نے اپنے اس مختصر دورے کے دوران 6 ستمبر 1996ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو سے ملاقات کی۔ معین قریشی چونکہ امریکی حکام کے بہت زیادہ قریب تھے اس لیے ان کے ساتھ ملاقات کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو پریشان ہو گئیں کیونکہ وہ اتنا جان گئی تھیں کہ اپوزیشن کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قوتیں بھی ان کے خلاف ہو گئی ہیں۔ معین قریشی کو میاں نواز شریف اور غلام اسحاق خاں کو 1993ء میں ہٹانے کے بعد نگران وزیراعظم بنایا گیا تھا۔ اگرچہ معین قریشی کی حمایت کرنے والوں میں خود نواز شریف بھی شامل تھے لیکن سب سے زیادہ انہوں نے نقصان نواز شریف کو ہی پہنچایا۔ ستمبر 1996ء کے شروع میں یہ بات کافی حد تک واضح ہو چکی تھی کہ فوج امن عامہ کی ناگفتہ بہ صورتحال اور معاشی مسائل کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ ان تمام تفکرات اور پریشانیوں سے دوچار محترمہ بے نظیر بھٹو نے 8 ستمبر 1996ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران میاں نواز شریف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اگر ماضی میں ان کی طرف سے کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہو تو وہ اسے معاف کر دیں جس پر نواز شریف نے کہا کہ "محترمہ اب بہت دیر ہو چکی' آپ نظام (جمہوریت) بچانے کیلئے نئے الیکشن کی تاریخ کا اعلان کریں" یہ وہ حالات تھے جن حالات میں میر مرتضیٰ کو قتل کرنے کی سازش تیار ہوئی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کا پولیس مقابلے میں مارا جانا کوئی اتفاق یا حادثہ نہ تھا بلکہ 20 ستمبر 1996ء کی رات جو کچھ بھی ہوا وہ اس منصوبے کا حصہ تھا جس منصوبے پر عمل درآمد کر کے بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنا مقصود تھا۔ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت کے آخری تین ماہ کے دوران ملک میں دہشت گردی کی وارداتوں میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا اور سردار فاروق احمد خاں لغاری نے فوج کے اداروں کے علاوہ سندھ حکومت کو ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ ملک دشمن عناصر کو کچلنے کیلئے کسی قسم کے سیاسی دباؤ میں نہ آئیں۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری

نے مرتضیٰ کے قتل کا حکم دے رکھا تھا بلکہ یہاں صرف اس پس منظر کو واضح کرنا مقصود ہے جن حالات میں کراچی پولیس نے مرتضیٰ کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ 20 ستمبر 1996ء کی صبح سردار فاروق احمد خاں عمرہ کی ادائیگی کے بعد سعودی عرب سے وطن واپس لوٹے تو چکلالہ ایئر پورٹ پر نصراللہ بابر اور غلام مصطفیٰ کھر ان کا استقبال کرنے کیلئے موجود تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کا ایئر پورٹ پر موجود نہ ہونا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ ان کے صدر مملکت کے ساتھ تعلقات میں کوئی بہتری نہیں ہوئی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے وطن واپس آتے ہی ملک میں امن عامہ کی صورتحال کو بہتر بنانے کیلئے مختلف تجاویز پر غور شروع کر دیا کیونکہ ان کی ملک سے عدم موجودگی کے دوران دہشت گردی کی متعدد وارداتیں ہو چکی تھیں، خصوصاً" پنجاب اور کراچی میں حالات بہت خراب تھے۔ اس روز کراچی پولیس نے ہنگامی بنیادوں پر مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مرتضیٰ طے شدہ پروگرام کے تحت 20 ستمبر 1996 کو سرجانی ٹاؤن کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے کے بعد اپنے سیکورٹی گارڈز کے ہمراہ 70 کلفٹن روانہ ہوئے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کے ایک قریبی عزیز عاشق جتوئی اس نیلے رنگ کی پجارو کو چلا رہے تھے جس میں مرتضیٰ سوار تھے۔ ان کے عقب میں دو ملازم یار محمد اور اصغر علی بیٹھے تھے۔ مرتضیٰ کے باڈی گارڈ ان کے آگے اور پیچھے گاڑیوں میں موجود تھے۔ مرتضیٰ اور ان کے ساتھی رات پونے 9 بجے کے قریب جونہی 70 کلفٹن کی طرف مڑے' اچانک ان کی نظر پولیس کی بھاری جمعیت پر پڑی جو جدید اسلحہ ہاتھوں میں لیے شاہراہ ایران پر موجود تھی۔ مرتضیٰ بھٹو نے پولیس کی ایک سیکورٹی پلان کے تحت تعیناتی کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے کیونکہ کراچی پولیس کے جوان تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔ اگرچہ مرتضیٰ کے ساتھ سرجانی ٹاؤن سے درجنوں گاڑیاں روانہ ہوئی تھیں' تاہم عاشق جتوئی اور مرتضیٰ کے باڈی گارڈز نے اس قدر تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا کہ زیادہ تر گاڑیاں پیچھے رہ گئیں وگرنہ عام حالات میں مرتضیٰ درجن بھر گاڑیوں کے ہمراہ ضرور شاہراہ ایران پر پہنچتے اور ممکن ہے کہ اس قدر زیادہ گاڑیوں کو دیکھ کر پولیس اپنا پلان بدل دیتی۔ مرتضیٰ جونہی پولیس کے ناکے کے قریب پہنچے' ایک پولیس ملازم نے ٹارچ کی روشنی کے

ذریعے انہیں رکنے کا اشارہ کیا جبکہ اے ایس پی رائے طاہر اور اے ایس پی شاہد حیات نے مرتضیٰ کی گاڑی کو رکنے کیلئے ہاتھ سے اشارہ دیا۔ اے ایس پی شاہد حیات میر مرتضیٰ بھٹو اور ان کے باڈی گارڈز کی گاڑیاں رکتے ہی تیزی کے ساتھ ان کی طرف گئے اور انہیں اس بات پر قائل کرنے لگے کہ وہ اپنے باڈی گارڈ کو پولیس کے حوالے کر کے خود 70 کلفٹن چلے جائیں۔ پولیس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مرتضیٰ بھٹو کبھی بھی اپنے ساتھیوں کو سیکورٹی حکام کے حوالے نہیں کریں گے۔ یہ تو ممکن تھا کہ مرتضیٰ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتے اور بدلے میں اپنے باڈی گارڈز کو رہا کروا لیتے لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود کو بچانے کیلئے اپنے ساتھیوں کو بے یارو مددگار چھوڑ کر گھر چلے جاتے۔ ایس ایس پی پولیس واجد درانی اس رات مرتضیٰ اپریشن کی خود نگرانی کر رہے تھے جبکہ ڈی آئی جی شعیب سڈل کے علم میں وہ سارا منصوبہ تھا جس پر عمل درآمد کیلئے پولیس بلٹ پروف جیکٹس پہن کر موقع پر موجود تھی۔ مرتضیٰ کے تصور میں بھی نہ تھا کہ ان کے اپنے شہر میں ان کے اپنے گھر کے قریب پولیس ان پر فائرنگ کرے گی اور پولیس کی فائرنگ کا جواز بھی نہ تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ مرتضیٰ کے پولیس کے اعلیٰ حکام کے ساتھ مذاکرات کا کوئی نتیجہ نکلتا' اچانک گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو اچانک ہونے والی فائرنگ سے گھبرا گئے کیونکہ گولیوں کی بوچھاڑ کا رخ ان کی نیلی پجارو کی طرف تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز جدید اسلحہ سے لیس تھے لیکن پولیس کے کمانڈوز نے انہیں اسلحہ استعمال کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی گاڑی میں موجود عاشق جتوئی سب سے پہلے گولی کا نشانہ بنے جس کے اگلے ہی لمحے میر مرتضیٰ بھٹو بھی زخمی ہو گئے۔ گاڑی میں موجود ان کا ذاتی ملازم اصغر علی فائرنگ سے ڈر کر پجارو کے فرش پر لیٹ گیا جس کے باعث وہ اندھا دھند ہونے والی فائرنگ سے محفوظ رہا۔ چند منٹ بعد فائرنگ میں وقفہ آیا تو اصغر علی نے میر مرتضیٰ کو مخاطب کیا جن کی نحیف آواز یہ سمجھ لینے کیلئے کافی تھی کہ وہ زخمی ہیں۔ اصغر نے گاڑی میں سے ہاتھ باہر نکالا اور پولیس کو فائرنگ بند کرنے کو کہا۔ مرتضیٰ کو گولی لگ چکی تھی لیکن وہ ابھی تک زندہ تھے۔ اصغر علی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے پولیس کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ خدا کیلئے فائرنگ بند کرو' میر مرتضیٰ کو گولی لگ چکی ہے۔ پولیس تو شاید

سمجھ رہی تھی کہ مرتضیٰ ہلاک ہو گئے ہوں گے۔ اصغر علی کی اطلاع نے پولیس کو بدحواس کر دیا جس نے دوبارہ اندھا دھند فائرنگ کر کے مرتضیٰ کو شدید زخمی کر دیا۔ دوسری مرتبہ ہونے والی فائرنگ کے باعث ایک گولی مرتضیٰ کی گردن میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر گاڑی سے باہر گر پڑے۔ اگر پولیس مقابلے میں مرتضیٰ کو قتل کرنا مقصود نہ ہوتا تو اول تو ان کی گاڑی پر فائرنگ ہی نہ کی جاتی۔ دوم اگر ان کی گاڑی پر فائرنگ کر ہی دی گئی تھی تو مرتضیٰ کو ایمرجنسی بنیادوں پر طبی امداد دینے کا بندوبست کیا جاتا۔ شاہراہ ایران پر پولیس اور مرتضیٰ کے باڈی گارڈز کے درمیان ہونے والے اس پولیس مقابلے کے 20 منٹ بعد تک مرتضیٰ کو ہسپتال منتقل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ مرتضیٰ اپنے گھر کے قریب زخمی حالت میں پڑے تھے' ان کی اہلیہ اور بچے 70 کلفٹن میں فائرنگ کی آواز سن کر گھر سے باہر نہ نکلے کیونکہ کراچی میں اچانک فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو جانا ان کیلئے اب کوئی نئی بات نہ رہی تھی۔ تاہم غنویٰ بھٹو کے ملازم نے اتنا ضرور کیا کہ انہوں نے نزدیکی پولیس سٹیشن کو اپنی رہائش گاہ کے قریب ہونے والی فائرنگ کی اطلاع دی۔ مرتضیٰ کے زخمی ہونے کی اطلاع سب سے پہلے ایک نامعلوم فرد نے غنویٰ کو دی جس نے 70 کلفٹن فون کر کے کہا کہ مرتضیٰ کو پولیس نے فائرنگ کر کے شدید زخمی کر دیا ہے۔ اب غنویٰ اور ان کی صاحبزادی کو پتہ چلا کہ جس فائرنگ کی آواز پر انہوں نے توجہ نہ دی تھی وہ دراصل ان کے اپنے ہی گھر کو تباہ کرنے کیلئے کی گئی تھی۔ مرتضیٰ کو زخمی حالت میں ڈرائیسٹ نامی ایسے ہسپتال میں لے جایا گیا جہاں علاج کی مناسب سہولتیں موجود نہ تھیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ پولیس کو اس کے بارے میں کوئی خبر ہی نہ ہو۔ مرتضیٰ کو زخمی حالت میں کیا سیدھا ہسپتال لے جایا گیا تھا یا اس سے قبل انہیں کسی اور جگہ لے جایا گیا' اس سوال کا جواب مرتضیٰ کی موت کے بھی بعد نہ مل سکا۔ مرتضیٰ کو لگنے والی گولیوں میں سے ایک گولی انہیں چند فٹ کے فاصلے سے ماری گئی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ آخر وہ کون تھا جس نے مرتضیٰ کو طبی امداد دینے کی بجائے مزید زخمی کیا؟ ان تمام سوالات کے جوابات 24 گھنٹوں کے اندر مرتضیٰ کو گرفتار کرنے کیلئے تعینات کئے جانے والے اہلکاروں کو گرفتار کر کے اس طرح حاصل کئے جا سکتے تھے جس طرح پولیس عموماً ملزموں سے اقرار جرم کرایا کرتی ہے۔ لیکن

مرتضیٰ کو ہلاک کرنے والے پولیس ملازمین کے خلاف شروع میں تو کوئی کارروائی ہی نہ کی گئی اور جب پولیس مقابلے میں حصہ لینے والے چند ملازمین کو معطل کیا بھی گیا تو ان کے ساتھ تھانے میں اس طرح کا سلوک نہ کیا گیا جس قسم کا سلوک ملزموں کے ساتھ ہوتا ہے اور کچھ عرصہ بعد وہ دوبارہ ملازمت پر بحال کر دیئے گئے۔

20 ستمبر 1996ء کی رات جب مرتضیٰ ڈرائیسٹ ہسپتال میں آخری سانسیں لے رہے تھے ان کی اہلیہ غنویٰ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ مرتضیٰ کی والدہ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے جبکہ بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم ہاؤس میں تسلی دی جا رہی تھی کہ مرتضیٰ زیادہ زخمی نہیں ہیں۔ بے نظیر بھٹو جو 20 ستمبر 1996ء کی رات جب ان کے بھائی کو پولیس مقابلے میں شدید زخمی کیا گیا' اسلام آباد میں اپنے بچوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ مرتضیٰ کے زخمی ہونے کی اطلاع بین الاقوامی نشریاتی اداروں تک پہلے پہنچی جبکہ وزیراعظم' جن کا بھائی اس سانحے کا شکار ہوئے تھے' کو اس کی خبر بعد میں ہوئی۔ صدر مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری کو مرتضیٰ کے زخمی ہونے کی اطلاع حساس اداروں نے دی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری اسی روز سعودی عرب سے پاکستان آئے تھے اور ان کے بے نظیر بھٹو کے ساتھ تعلقات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ 20 ستمبر 1996ء کی صبح سعودی عرب سے واپس آنے کے بعد سردار فاروق احمد خاں لغاری کا بے نظیر بھٹو سے کوئی رابطہ نہ ہوا لیکن جب انہیں مرتضیٰ کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے وزیراعظم ہاؤس فون کر کے بے نظیر سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن بے نظیر نے لغاری کا فون نہ سنا اور وہ زارو قطار روتی ہوئیں ایئرپورٹ روانہ ہو گئیں جہاں ایک خصوصی طیارہ انہیں کراچی لے جانے کیلئے تیار تھا۔ ایوان صدر کے عملے نے جب لغاری کو مطلع کیا کہ بے نظیر بھٹو کراچی جانے کیلئے ائرپورٹ روانہ ہو گئی ہیں تو وہ بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ ائرپورٹ روانہ ہو گئے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری سے بے نظیر بھٹو ناراض ضرور تھیں لیکن انہیں 20 ستمبر 1996ء کی اس رات تک قطعاً" اندازہ نہ تھا کہ مرتضیٰ کے قتل میں ان کے اپنے نامزد کردہ صدر مملکت کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ سردار فاروق احمد خان لغاری نے ائرپورٹ پر بھی بے نظیر کے ساتھ اظہار افسوس کیا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس سانحے کے بعد ایوان صدر کی طرف سے بے نظیر بھٹو پر کوئی وار نہ کیا جاتا لیکن اس کے برعکس سردار فاروق احمد خاں لغاری نے اپنے ایک وکیل دوست شاہد حامد سے مشورہ کرنے کے بعد 21 ستمبر 1996 کو بے نظیر بھٹو سے ججوں کی تعیناتی کے مسئلہ پر اپنے اختلافات کا اعتراض کرتے ہوئے سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کر دیا۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری کی طرف سے سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کئے جانے کے بعد کسی کے ذہن میں یہ غلط فہمی نہ رہی کہ آنے والے دنوں میں جمہوریت کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ایوان صدر کی طرف سے ججوں کی تعیناتی کے مسئلہ پر سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عدالت عالیہ کی رائے معلوم کی جا سکے کہ کیا ججوں کی تعیناتی کے وقت صدر کیلئے وزیراعظم سے مشورہ کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ کیا یہ اتنا ہی اہم معاملہ تھا جسے چند ہفتے روکا نہیں جا سکتا تھا؟ اگر یہ ریفرنس 21 ستمبر 1996ء کو دائر نہ کیا جاتا تو کیا کوئی قیامت بپا ہو جاتی۔ بے نظیر بھٹو کیلئے 20 اور 21 ستمبر 1996 کے دن کسی بھی طور پر آزمائش سے کم نہ تھے۔ 20 ستمبر 1996ء کی رات جب وہ کراچی کے مڈایسٹ ہسپتال پہنچیں تو ان کے سامنے اپنے بھائی کی لاش پڑی تھی۔ یہ وہی مرتضیٰ بھٹو تھے جن کی ان کے ساتھ صلح ہونے والی تھی اور کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انہوں نے گھنٹوں اکٹھے بیٹھ کر گلے شکوے کئے تھے۔ بے نظیر بھٹو کی جب مرتضیٰ سے صلح ہوتی تو یقیناً" دونوں بہن بھائی گھنٹوں بلکہ دنوں تک گلے شکوے کرتے' ایک دوسرے پر گزرنے والی دکھ اور غم کی راتوں کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے۔ مگر 20 ستمبر 1996 کی رات بے نظیر ہی بولے جا رہی تھیں لیکن مرتضیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ بے نظیر چاہتی تھیں کہ مرتضیٰ اور ان کے درمیان کوئی موجود نہ ہو' اور وہ اب ایسی دنیا میں جا چکے تھے جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہ تھی۔ بے نظیر بھٹو کا اس رات رو رو کر برا حال ہو گیا۔ ان کے سامنے 18 جولائی 1985 کی وہ رات گھوم گئی جب وہ شاہ نواز کے ہلاک ہونے کی خبر سن کر بے چین ہو گئی تھیں اور پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی کی لاش لے کر پاکستان آئیں۔ بے نظیر بھٹو نے ایک مرتبہ پھر وہی دکھ اٹھایا تھا۔ انہیں پھر اپنے بھائی کی لاش کی تدفین کرنا تھی۔ 1985ء میں جب ان کے چھوٹے بھائی فوت ہوئے تھے تو انہیں

اس حد تک آزادی ضرور حاصل تھی کہ وہ شاہ نواز کی میت کی جس طرح اور جس انداز میں چاہیں تدفین کرتیں' لیکن 20 ستمبر 1996 کی رات جب ان کے سامنے مرتضیٰ کی لاش پڑی تھی تو وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھیں کہ انہیں مرتضیٰ کی آخری رسومات کی ادائیگی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس مرتبہ وہ اپنے بھائی کے قتل کا الزام کسی ڈکٹیٹر پر نہیں لگا سکتی تھیں بلکہ ان کے بھائی کو ان کے ہی دور حکومت میں قتل کیا گیا تھا۔ اور مرتضیٰ کے مرنے سے قبل مڈایسٹ ہسپتال کے باہر الذوالفقار کے سینکڑوں کارکن حکومت کے خلاف نعرے بازی میں مصروف تھے۔ بے نظیر بھٹو یہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ آخر کار ان کی واضح ہدایات کے باوجود پولیس نے مرتضیٰ کی گاڑی پر فائرنگ کیوں کی؟ یہ وقت ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کا نہیں تھا بلکہ اس وقت حالات کا تقاضا یہی تھا کہ بے نظیر بھٹو اور غنویٰ ایک دوسرے کے گلے لپٹ کر خوب روتیں کیونکہ مرتضیٰ اور بے نظیر کے دشمن مشترک تھے۔ بے نظیر بھٹو 20 ستمبر 1996 کو رات بھر روتی رہیں اور اگلے روز انہوں نے بھٹو خاندان کے آبائی خاندان میں مرتضیٰ کو شاہ نواز کے پہلو میں سپرد خاک کرنے کے تمام انتظامات اپنی نگرانی میں مکمل کرائے۔ بے نظیر بھٹو سہ پہر ساڑھے تین بجے کراچی سے لاڑکانہ آئیں۔ اس سے ایک گھنٹہ قبل بیگم نصرت بھٹو، غنویٰ بھٹو' فاطمہ اور ذوالفقار جونیئر کو ایک خصوصی ہیلی کاپٹر کے ذریعے لاڑکانہ پہنچا دیا گیا تھا جبکہ مرتضیٰ کا تابوت لیے ایک اور ہیلی کاپٹر 2 بجکر 50 منٹ پر پولیس ٹریننگ سکول لاڑکانہ کے ہیلی پیڈ پر اترا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی تدفین کے موقع پر ایک لاکھ کے قریب افراد موجود تھے۔ بے نظیر بھٹو کو جس بات کا خدشہ تھا آخر وہی بات ہو کر رہی۔ مرتضیٰ کے حامیوں نے مرتضیٰ کی رسم قل کے موقع پر کئے جانے والے انتظامات درہم برہم کر دیے اور بے نظیر اپنے شوہر کے ہمراہ "المرتضیٰ" (بھٹو خاندان کی آبائی حویلی) میں داخل نہ ہو سکیں جس پر رسم قل وزیراعظم ہاؤس نوڈیرو میں ادا کی گئی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے 22 ستمبر 1996ء کو نوڈیرو میں بے نظیر بھٹو سے اظہار تعزیت کیا۔ اسی روز صنم بھٹو خاموشی سے بے نظیر اور زرداری کو یہ کہہ کر گڑھی خدا بخش قبرستان چلی گئیں کہ وہ بیگم بھٹو کو وہاں لے کر پہنچ رہی ہیں۔ اس طرح مرتضیٰ کی ہلاکت کے بعد بھٹو خاندان کے افراد

سب کے ہمراہ گڑھی خدا بخش قبرستان میں اکٹھے ہوئے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری جب بے نظیر بھٹو کو ملے تو اس وقت وہ سیاہ رنگ کا ماتمی لباس پہنے ہوئے تھیں جبکہ رو رو کر ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ رسم دنیا کیلئے بے نظیر بھٹو سے اظہار تعزیت کرنے کے بعد سردار فاروق احمد خاں لغاری نے آئین کے آرٹیکل 56 (2) کے تحت اختیارات استعمال کرتے ہوئے بیک وقت سینٹ اور قومی اسمبلی کو مراسلہ بھجوایا جس کے ذریعے ارکان پارلیمنٹ اور حکومت کو کہا کہ وہ سارے کام چھوڑ کر احتساب کا عمل شروع کرنے کیلئے آئین سازی کریں۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی صدر نے پہلی مرتبہ اس قسم کے اختیارات استعمال کئے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری کی طرف سے ارکان پارلیمنٹ کو ارسال کئے جانے والے اس مراسلے کی کاپیاں خصوصی طور پر اخبارات اور ارکان پارلیمنٹ کو ارسال کی گئیں۔ اس روز پنجاب میں دہشت گردی کی وارداتوں میں شدت آگئی۔ بے نظیر بھٹو جانتی تھیں کہ ان کے خلاف یہ سب کچھ کیوں اور کس کے اشارے پر کیا جا رہا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے پاس ایٹمی پروگرام کو ختم کرنے کیلئے 20 ستمبر 1996 تک کی مہلت تھی اور اس مہلت کے گزرتے ہی سانحے پہ سانحہ رونما ہوا۔ 24 ستمبر 1996 کو روس، چین، امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے بارے میں ایک معاہدے CTBT پر دستخط کئے اور پاکستان ان ممالک کی فہرست میں شامل تھا جنہوں نے امریکی موقف کو نظرانداز کرتے ہوئے ایٹمی پروگرام پر عمل درآمد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیا CTBT پر دستخط نہ کرنے کے بعد بے نظیر بھٹو کو مزید کچھ عرصہ اقتدار میں رہنے دیا جا سکتا تھا؟

میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد سردار فاروق احمد خاں لغاری نے ایک تسلسل کے ساتھ بے نظیر بھٹو پر وار کئے۔ 25 ستمبر 1996 کو ایوان صدر سے سندھ اور پنجاب کے گورنر حضرات کو خط لکھے گئے کہ وہ امن عامہ کی صورتحال بہتر بنائیں۔ دراصل یہ تمام اقدامات بے نظیر بھٹو کے خلاف چارج شیٹ تیار کرنے کیلئے کئے جا رہے تھے۔ بے نظیر بھٹو جانتی تھیں کہ سردار فاروق احمد خاں نے ہر قسم کی مروت کو نظرانداز کر کے ان کے خلاف کارروائی شروع کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ صدر مملکت کے اس اقدام سے ان احباب کو ضرور حوصلہ ملا ہو گا جنہوں نے مرتضیٰ بھٹو کو قتل کیا تھا کیونکہ اتنی

بڑی واردات کے مجرم سزا سے کیسے بچ سکتے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو اگر دہشت گردی (بم دھماکے وغیرہ) کے ذریعے قتل ہوئے ہوتے تو صورتحال شاید مختلف ہوتی اور ملکی انٹیلی جنس ایجنسیوں اور سیکورٹی حکام کو اس سانحہ کی ذمہ داری تخریب کاروں پر ڈالنے کا موقع مل جاتا لیکن اس معاملے میں تو صورتحال ہی مختلف تھی۔ مرتضیٰ بھٹو درجنوں افراد کے سامنے قتل کئے گئے تھے۔ بے نظیر بھٹو نے 20 ستمبر سے 25 ستمبر 1996 تک صورتحال کا بڑے صبر، ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کیا۔ 25 ستمبر 1996 کو مسلم افواج کے سربراہ بے نظیر بھٹو سے اظہار تعزیت کیلئے وزیراعظم ہاؤس گئے۔ اس موقع پر بے نظیر بھٹو نے نہایت عزم و استقلال سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے اصل قاتل کو بے نقاب کر کے رہیں گی۔ اور انہوں نے فوج کے سربراہ جنرل جہانگیر کرامت کو کہا کہ وہ مرتضیٰ قتل کیس حل کروانے میں ان کی مدد کریں۔ بے نظیر بھٹو کو 25 ستمبر 1996 کو اطلاع ملی تھی کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے ان کی حکومت ختم کرنے کیلئے منصوبہ بندی مکمل کر لی ہے اور ان کی اس سلسلے میں میاں نواز شریف سے جلد ہی ملاقات متوقع ہے۔ اس اطلاع پر بے نظیر نے جوابی حملہ کرتے ہوئے 26 ستمبر 1996 کو کراچی سے اسلام آباد جا کر پہلے وفاقی کابینہ کے اجلاس کی صدارت کی۔ کابینہ کے اس اجلاس کے موقع پر فضا سوگوار تھی کیونکہ بے نظیر بھٹو اپنے بھائی کو لحد میں اتارنے کے بعد پہلی مرتبہ اسلام آباد آئی تھیں۔ اس روز بے نظیر نے 20 ستمبر 1996 سے 25 ستمبر 1996 تک کئے جانے والے صدارتی اقدامات پر غور کرنے کے بعد سردار فاروق احمد خاں لغاری کے خلاف کھل کر بیان بازی کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کی مسلسل خاموشی سے ایوان صدر کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ بے نظیر بھٹو نے 26 ستمبر 1996 کو انتہائی جذباتی انداز میں کہا کہ اے مسلمان (لغاری) ذرا ٹھہرو! کم از کم مرتضیٰ کے چہلم تک تو صبر کر لو......... اللہ سے ڈرو تمہیں جلدی کس بات کی ہے۔" اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بے نظیر نے کہا کہ "مرتضیٰ کا قتل ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا اور یہ طے تھا کہ 20 ستمبر 1996 کو کیا ہونا ہے اور 21 ستمبر کو کیا کیا جائے گا۔ یہ بھی طے تھا کہ مرتضیٰ کے سوئم کے موقع پر کیا ہو گا .... جو لوگ سمجھتے تھے کہ یہ عورت ہے، روئے گی، چلائے گی اور پیٹے گی تو میں ان کی غلط فہمیاں دور کر کے رہوں گی۔ میں مقابلہ کروں

گی' میں شہید بابا (ذوالفقار علی بھٹو) اور شہید مرتضیٰ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو بے نقاب کروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ آج کیا ہوا (بے نظیر بھٹو دراصل 26 ستمبر 1996 کو ایوان صدر میں لغاری اور نواز شریف کے درمیان ہونے والی ملاقات کا حوالہ دے رہی تھیں۔ لغاری نے اس ملاقات کے موقع پر نواز شریف کو یقین دلایا کہ وہ اپنے آئینی کردار کو ادا کریں گے' (یعنی اسمبلی توڑی جائے گی) اور کل کیا ہونے والا ہے۔" محترمہ بے نظیر بھٹو کے اس طرز عمل کی وجہ سے سردار فاروق احمد خاں لغاری ناراض تھے کیونکہ بے نظیر بھٹو نے مرتضیٰ کے قتل کی ذمہ داری بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر ان پر ڈال دی تھی۔ 27 ستمبر 1996 کو ایوان صدر کے ترجمان نے بے نظیر بھٹو کے بیان پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "وزیراعظم صاحبہ! آپ کٹھن مرحلہ سکون اور شائستگی سے گزاریں۔" بے نظیر بھٹو کو 27 ستمبر 1996 کو اطلاع ملی تھی کہ مرتضیٰ بھٹو کے قاتل ان تمام شہادتوں کو ختم کر دیں گے جن سے مرتضیٰ کے قتل کی سازش بے نقاب کرنے میں مدد مل سکتی ہو۔ اس اطلاع کے بعد بے نظیر بھٹو نے مرتضیٰ کے ذاتی ملازم اصغر علی کی حفاظت کیلئے خصوصی ہدایات جاری کیں۔ مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ پولیس مقابلے میں حصہ لینے والوں کو ایک ایک کرکے فوج کے ایک حساس ادارے کے سامنے پیش کرنے کیلئے 30 ستمبر 1996 کی تاریخ طے تھی لیکن 28 ستمبر 1996 کو کراچی تھانے کے ایس ایچ او حق نواز سیال کو نامعلوم دہشت گردوں نے انتہائی پراسرار انداز میں قتل کر دیا۔ حق نواز نے مبینہ طور پر اپنے پاؤں پر خود گولی مارنے کے بعد مرتضیٰ قتل کیس کو پولیس مقابلے کی شکل دینے کی کوشش کی تھی۔ حق نواز سیال کو اس روز قتل کیا گیا جب بے نظیر کی ایوان صدر میں سردار فاروق احمد خاں لغاری سے گرما گرمی ہوئی۔ اسی روز مرتضیٰ کے بچوں کو شام بھجوا دیا گیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو طے شدہ پروگرام کے تحت 30 ستمبر 1996 کو امریکہ روانہ ہوئیں۔ بے نظیر بھٹو کو خطرہ تھا کہ اگر بیگم نصرت بھٹو ان کے ساتھ نہ گئیں تو ان کے مخالفین انہیں Misguide کریں گے۔ اس لیے وہ جاتی دفعہ اپنی والدہ کو ساتھ لے گئیں۔ یکم اکتوبر 1996 کو جب بے نظیر بھٹو امریکہ میں اعلیٰ حکام سے ملاقاتیں کر رہی تھیں تو اسلام آباد میں ایوان صدر کا عملہ قاضی حسین احمد کو مطلع کر رہا تھا کہ ان

کی سردار فاروق لغاری سے 2 اکتوبر 1996 کو ملاقات طے کر دی گئی ہے۔ قاضی حسین احمد نے 2 اکتوبر 1996 کو لغاری سے ملاقات کے بعد 24 اکتوبر 1996 کو اسلام آباد میں دھرنا دینے کا اعلان کر دیا۔ جبکہ اسی روز میاں نواز شریف نے غنویٰ بھٹو سے 70 کلفٹن میں ملاقات کر کے مرتضیٰ کے قتل پر اظہار تعزیت کیا۔ بے نظیر بھٹو نے 3 اکتوبر 1996 کو اقوام متحدہ کی جنرل کونسل سے خطاب کیا اور 4 اکتوبر 1996 کو ان کی آئی ایم ایف اور عالمی بنک کے اعلیٰ حکام کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ بے نظیر بھٹو کا دورہ امریکہ دراصل اپنے اقتدار کو بچانے کی آخری کوشش تھی اور ان کا یہ دورہ بری طرح ناکام رہا جس کے بعد نواز شریف نے 7 اکتوبر 1996 کو لاہور میں ایک زبردست ریلی سے خطاب کیا۔ تاہم نواز شریف کے پنجاب اسمبلی کے سامنے خطاب کے دوران پولیس نے وحشیانہ لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے استعمال کے ذریعے ریلی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی مگر نواز شریف میدان میں ڈٹے رہے اور انہوں نے اعلان کیا کہ میں نے بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کرنے کے لیے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ نواز شریف کا یہ اعتماد ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ بے نظیر بھٹو ہر سطح پر بازی ہار گئی ہیں۔ بے نظیر بھٹو نے پہلی مرتبہ 18 اکتوبر 1996 کو اعتراف کیا کہ مرتضیٰ ان کا محافظ تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اقتصادی بحران پر قابو پانے کیلئے 22 اکتوبر 1996 کو سٹیٹ بنک کے گورنر یعقوب کے ذریعے 27 ارب روپے کا منی بجٹ پیش کیا جس کے بعد عوامی رائے عامہ ان کے خلاف ہو گئی۔ سندھ' جو بے نظیر کا اپنا صوبہ تھا' منی بجٹ کے خلاف احتجاج کرنے لگا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے مرتضیٰ بھٹو کے چہلم کے موقع پر 25 اکتوبر 1996 کو لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کر کے عوامی قوت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ مرتضیٰ کے چہلم کے موقع پر منعقدہ تعزیتی جلسے میں لوگوں کی زیادہ تعداد موجود نہ تھی۔ 28 اکتوبر 1996 کو قاضی حسین احمد نے پارلیمنٹ کے سامنے دھرنا دینے کی کوشش کی تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ بے نظیر بھٹو ابھی قاضی حسین احمد کے مظاہروں میں ہی الجھی ہوئی تھیں کہ انہیں پتہ چلا کہ لاہور ہائی کورٹ نے میاں منظور احمد وٹو کی طرف سے پنجاب میں گورنر راج کے نفاذ کے خلاف رٹ پٹیشن پر سماعت مکمل کر لی ہے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی حکومت بچانے کیلئے آخری

حربے کے طور پر پی پی کے ناراض ارکان سے لاہور آکر ملاقاتیں کیں جبکہ آصف علی زرداری نے گورنر پنجاب راجہ سروپ کے ساتھ مل کر وٹو کو اعتماد کا ووٹ لینے سے روکنے کیلئے ارکان اسمبلی کی مطلوبہ تعداد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ 3 نومبر 1996 کو ہائی کورٹ نے وٹو کی حکومت بحال کر دی۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے اس روز آڈیٹر جنرل کانفرنس میں شرکت کیلئے لاہور آنا تھا لیکن انہوں نے عین وقت پہ لاہور آنے کا فیصلہ تبدیل کرلیا۔ بے نظیر بھٹو نے مرتضٰی پر فائرنگ کرنے والے تمام پولیس ملازمین کے علاوہ ان افراد کی فہرست حاصل کرلی تھی جو کاغذات میں تھانوں میں موجود تھے لیکن حقیقتاً" وہ 20 ستمبر 1996 کی رات شاہراہ ایران پر مرتضٰی کو قتل کرنے کیلئے موجود تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو وٹو صاحب کو پنجاب میں اقتدار سے الگ کرنے کے فوراً" بعد مرتضٰی کے قاتلوں کے بارے میں اہم فیصلے کرنے والی تھیں کہ اچانک 4 نومبر 1996 کی رات سردار فاروق احمد لغاری کے حکم پر فوج نے اہم تنصیبات کو اپنے قبضے میں لے لیا جبکہ بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم ہاؤس میں حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا۔ عملاً" بے نظیر بھٹو گرفتار ہو چکی تھیں اور اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ کہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیا جائے۔ بے یقینی کی یہ کیفیت 2 دن تک باقی رہی اور جب بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم ہاؤس میں فوج کی حفاظتی تحویل سے رہا کیا گیا تو ان کا پہلا فقرہ یہ تھا کہ "مرتضٰی کو قتل کرنے کے منصوبے کا اگلا مرحلہ میری حکومت ختم کرنا تھا۔" کیا یہ سازش سردار فاروق احمد خاں لغاری کی تھی؟ اور اگر لغاری اتنے ہی بااختیار ہوتے تو وہ 2 دسمبر 1997 کی شام کبھی بھی استعفٰی نہ دیتے۔ 2 دسمبر 1997 کی صبح قومی اسمبلی توڑنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا سردار فاروق احمد خاں لغاری کے مستعفی ہونے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ 1996 میں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کرنے کے فیصلے میں لغاری کا کس قدر ہاتھ تھا؟

بے نظیر نے جلاوطنی ختم کیوں کی؟

30 دسمبر 1985ء کو ضیاء الحق نے بالآخر 90 روز کی بجائے 5475 دن ڈنڈے کے زور پر حکومت کرنے کے بعد محمد خاں جونیجو کو شریک اقتدار کیا اور ملک بھر سے مارشل لاء ختم کروا دیا گیا۔ 1977ء میں مارشل لاء لگاتے وقت ضیاء الحق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ 90 روز کے اندر انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن ان کے یہ 3 ماہ 8 سالوں میں تبدیل ہو گئے۔ بہرحال مارشل لاء کا خاتمہ ایک قابل تحسین اقدام تھا اور بجا طور پر ایم آر ڈی میں شامل وہ جماعتیں بھی مبارکباد کی مستحق تھیں جنہوں نے مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے جمہوریت کے خلاف سازشیں کیں اور پھر طویل مارشل لاء سے گھبرا کر انہوں نے اسی بھٹو خاندان کا ساتھ دیا جس کے عظیم سپوت ذوالفقار علی بھٹو کو انہوں نے ضیاء الحق کے ساتھ ساز باز کر کے تختہ دار پر لٹکوایا تھا --- ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ سیاستدان 8 سالہ مارشل لاء سے سبق حاصل کرتے اور اختلافات کو فراموش کر کے جمہوریت کے استحکام کے لئے متحد ہو جاتے --- لیکن سیاستدانوں نے ماضی کی غلطیوں سے کچھ نہ سیکھا اور سیاسی اختلافات خاندانی دشمنی کی شکل اختیار کر گئے - محمد خاں جونیجو کسی منشور یا سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑ کر اقتدار میں نہیں آئے تھے بلکہ ان کو اقتدار ملنا کسی بھی طور پر ایک حادثے سے کم نہ تھا - جونیجو کو اس چیز کا احساس تک نہ تھا کیونکہ وہ اقتدار میں نووارد تھے جنرل ضیاء الحق کی مہربانی سے اقتدار حاصل کرنے کے بعد جونیجو نے قوم سے خطاب کے دوران اپنے 5 نکاتی منشور کا اعلان کیا جس کے تحت انہوں نے عزم کیا کہ ان کا مقصد درج ذیل پروگرام کے تحت ملک و قوم کو خوشحالی کے راستے پر ڈالنا ہے (1) بے روزگاری

دور کرنے اور عوام کی خوشحالی کے لئے منصفانہ اقتصادی نظام کا قیام (2) بد عنوانیاں ختم کرکے عوام کو احساس تحفظ اور انصاف فراہم کرنا (3) نظریاتی بنیادوں پر ایک مستحکم اسلامی جمہوری سیاسی نظام کا قیام (4) ناخواندگی دور کرکے قوم کو جدید سائنسی دور کے لئے تیار کرنا اور (5) مضبوط دفاع' غیر جانبدار اور متوازن خارجہ پالیسی پر عمل در آمد یقینی بنانا۔

جونیجو نے کہا کہ "جمہوریت صرف نعروں سے نہیں آسکتی بلکہ اس کے لئے سیاستدانوں کو جمہوری رویہ اختیار کرنا پڑے گا اور ماضی کی تلخیوں اور اختلافات کو فراموش کرنا ہوگا" --- محمد خاں جونیجو کا تعلق سندھ سے تھا اور ان کی بطور وزیراعظم تعیناتی کا مقصد عوام کو یہ تاثر دینا تھا کہ فوج کی سندھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے جس سے تعلق رکھنے والے سیاستدان ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی --- ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد ضیاء الحق پر جرنیلوں کی طرف سے بھی دباؤ بڑھنا شروع ہوگیا تھا کہ وہ انتخابات کے لئے نئی تاریخ کا اعلان کریں بلکہ بعض جرنیلوں نے ضیاء الحق کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر ان کا انتخابات کرانے کا ارادہ نہیں ہے تو وہ ان کو اعتماد میں لیں تاکہ عوام اور سیاستدانوں کو بتا دیا جائے کہ فی الحال ہمارا انتخابات کرانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے --- ضیاء الحق نے اس قسم کے حالات میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو یقین دلایا کہ وہ انتخابی عمل سے فرار نہیں چاہتے - ضیاء الحق کبھی افغانستان کی صورتحال کا بہانہ بناتے اور کبھی اندرونی حالات کا تذکرہ کرکے سیاسی سرگرمیوں سے پابندی اٹھانے سے انکار کردیتے - تاہم ایک وقت ایسا بھی آگیا جب ایم آر ڈی اور بین الاقوامی پریشر کے باعث ضیاء الحق نے وسیع البنیاد قومی حکومت بنانے پر حامی بھرلی - انہوں نے سندھ سے ہی تعلق رکھنے والے ایک سیاستدان غلام مصطفیٰ جتوئی سے فروری 1982ء میں ملاقات کی - اس موقع پر متعدد جرنیل بھی موجود تھے --- ضیاء الحق نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو مجوزہ قومی حکومت میں شمولیت کی دعوت دی --- جتوئی کو جنرل فیض علی چشتی نے اس بات سے پہلے ہی آگاہ کردیا تھا کہ ضیاء الحق انہیں وزیراعظم کا عہدہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور جتوئی سے بات چیت کے بعد ہی ضیاء الحق سے ان کی ملاقات کرائی گئی تھی تاکہ انہیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی طرف سے باقاعدہ

طور پر حکومت سازی کی دعوت دی جاسکے - "میں آپ کو قومی حکومت میں اہم عہدہ دینا چاہتا ہوں" - ضیاء الحق نے جتوئی کو کہا اور "اہم عہدے" سے یقینی طور پر مراد وزیراعظم کا عہدہ تھا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی فوری طور پر اس پیشکش کو قبول کرلیتے تو ملکی تاریخ بڑی مختلف ہوتی لیکن انہوں نے دلی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا کہ "مجھے تھوڑا وقت دیا جائے تاکہ میں بیگم نصرت بھٹو اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرسکوں" --- ضیاء الحق کا خیال تھا کہ وزارت اعظمیٰ کے عہدے کے لالچ میں جتوئی پیپلزپارٹی سے بغاوت پر آمادہ ہوجائیں گے لیکن جتوئی نے انہیں کہا کہ پہلے مجھے بیگم نصرت بھٹو سے بات کرنے کا موقع دیا جائے جس پر ضیاء الحق نے نیم رضامندی سے یہ درخواست قبول کرلی - بیگم نصرت بھٹو کو پہلے ہی جتوئی کے بارے میں شک تھا کہ ان کے جرنیلوں کے ساتھ روابط ہیں اور بے نظیر بھٹو کی جتوئی کے بارے میں 1982ء میں بھی رائے اچھی نہ تھی - بے نظیر بھٹو کے بس میں ہوتا تو وہ 1982ء میں ہی بھٹو کی پارٹی سے نکال دیتیں کیونکہ وہ انہیں "ڈبل ایجنٹ" سمجھتی تھیں - جتوئی کو ضیاء الحق نے مشورہ دیا کہ وہ بھٹو خاندان کے علاوہ کسی اور سے اس پیشکش کے بارے میں فی الحال کوئی ذکر نہ کریں --- غلام مصطفیٰ کھر ان دنوں لندن میں مقیم تھے جہاں بیٹھ کر وہ بھٹو خاندان کے خلاف بیان بازی کیا کرتے تھے - کھر نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد ضیاء الحق سے ملاقات کرکے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ضیاء نے غلام مصطفیٰ کھر پر اعتماد نہ کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر کھر جیسا شخص بھٹو سے غداری کرسکتا ہے تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے - ضیاء الحق نے زندگی بھر کھر پر اعتماد نہیں کیا --- اور جتوئی نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ جرنیلوں کو کھر کے بھارتی سیاستدانوں اور انٹیلی جنس کے ساتھ روابط کا علم ہے چپکے سے سعودی عرب میں کھر سے ملاقات کی اور یہ رپورٹ ضیاء الحق تک پہنچی تو انہوں نے نہ صرف قومی حکومت بنانے کا ارادہ ترک کردیا بلکہ انہوں نے جتوئی کا کیس بھی بند کردیا --- یوں جتوئی نے اپنی غلطی سے وزارت اعظمیٰ حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا --- محمد خاں جونیجو چونکہ ان دنوں عملی سیاست میں تھے اس لئے انہیں بھی ضیاء الحق کے جتوئی کے ساتھ روابط کا علم تھا --- اور جونیجو یہ بھی جانتے تھے کہ ضیاء الحق جب کسی کے بارے میں کوئی بری رائے قائم کرلیں تو قبر تک اس کا پیچھا

نہیں چھوڑتے --- لیکن اس کے باوجود جونیجو نے بہت شروع ہی میں مارشل لاء حکام سے ٹکر لے لی --- امریکی سفارتکاروں اور دوسرے غیر ملکی سفیروں سے دوران ملاقات جونیجو یہی تاثر دیتے رہے کہ پاکستان میں بھٹو خاندان پر سیاست میں حصہ لینے پر کوئی پابندی نہیں ہے - محمد خاں جونیجو نے ہی بے نظیر بھٹو کو اس وقت فرانس جانے کی اجازت دی تھی جب وہ شاہنواز بھٹو کی وفات کے بعد پاکستان آئیں۔ شاہ نواز بھٹو کی وفات پر جونیجو نے ہی سب سے پہلے بیگم نصرت بھٹو کے نام تعزیتی پیغام ارسال کیا تھا --- ضیاء الحق چاہتے تھے کہ جونیجو غیر جماعتی ایوان کو غیر جماعتی ہی رہنے دیں لیکن انتخابات کے بعد جب ضیاء الحق نے دیکھا کہ ایوان کے اندر ان کے خلاف ایک پریشر گروپ قائم ہوگیا ہے تو انہوں نے جونیجو کو سرکاری سیاسی جماعت بنانے کا اختیار دے دیا --- ان دنوں جونیجو نے ضیاء الحق کو کہا کہ وہ خود پیر پگاڑا کو مسلم لیگ کی صدارت سے سبکدوش ہونے کا مشورہ نہیں دیں گے" --- جس پر ضیاء الحق نے یہ ذمہ داری قبول کرلی حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ پگاڑا انکار بھی کرسکتے ہیں - ضیاء الحق نے 5 جنوری 1986ء کو پگاڑا کو کہا کہ وہ از راہ کرم مسلم لیگ کی صدرت جونیجو کے حوالے کردیں" --- جس پر پگاڑا نے کہا کہ جونیجو کی بجائے اگر آپ خود مسلم لیگ کا صدر بننا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں --- لیکن ضیاء الحق نے مسلم لیگ کا صدر بننے سے انکار کردیا کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں انہیں فوج سے استعفیٰ دینا پڑتا اور وہ اس قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے - محمد خاں جونیجو نے 6 جنوری 1986ء کو لاہور کا دورہ کیا جہاں انہوں نے گورنر ہاؤس میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلیں کیونکہ جمہوری اداروں کو کسی قسم کے نقصان سے بچانے کے لئے جماعتی ایوان کی موجودگی بہت ضروری ہے - پنجاب میں اس وقت صاحبزادہ حسن محمود کردار ادا کررہے تھے اور وہ پیر پگاڑا کے قریبی عزیز تھے - انہوں نے پگاڑا کے کہنے پر محمد خاں جونیجو کی طرف سے مسلم لیگ پر قبضے کی مخالفت شروع کردی - لیکن پنجاب سے تعلق رکھنے والے ارکان کی اکثریت نے چند منٹوں کے اندر سیاسی وفاداری تبدیل کرلی ور وہ 6 جنوری 1986ء کو مسلم لیگ میں شامل ہوگئے - مسلم لیگ پر سرکاری ارکان کے قبضے سے ایوب خاں کے دور حکومت جیسے حالات پیدا ہوگئے' جب

ایوب خاں نے بھی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے مسلم لیگ کی صدارت قبول کرلی تھی - ایم آر ڈی کی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ ان ارکان کو جو کبھی پی پی پی یا ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کے ساتھ منسلک رہ چکے ہے ایم آر ڈی میں شامل کرلیا جائے - لیکن نوابزادہ نصراللہ خاں اور اور جتوئی کو کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور جونیجو نے مسلم لیگ پر قبضہ کرلیا نتیجتاً پگاڑا نے مسلم لیگ کی صدارت چھوڑ دی --- اس طرح 18 جنوری 1986ء کو سرکاری مسلم لیگ کا باقاعدہ قیام عمل میں آگیا جس کے صدر جونیجو منتخب کرلئے گئے - جبکہ پنجاب کا صدر نواز شریف کو بنادیا گیا - سرکاری مسلم لیگ کا صدر بننے کے بعد محمد خاں جونیجو نے از سر نو کابینہ تشکیل دی اور 28 جنوری 1986ء کو انہوں نے ضیاء الحق کو سرپرائز دیتے ہوئے محبوب الحق' ڈاکٹر اسد اور جمالی کو کابینہ سے نکال دیا اور جونیجو کی نئی کابینہ میں جو نمایاں شخصیات شامل ہوئیں ان میں یاسین وٹو' صاحبزادہ یعقوب خاں' اسلم خٹک' یوسف رضا گیلانی اور چوہدری شجاعت حسین شامل تھے - ضیاء الحق کے دباؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے جونیجو نے ڈاکٹر محبوب الحق کو کابینہ میں دوبارہ شامل نہ کیا جس کا ضیاء نے سخت برا منایا۔ سینئر مسلم لیگی رہنماؤں نے جب دیکھا کہ ضیاء الحق اور جونیجو کے درمیان ڈیڈ لاک پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں تو انہوں نے جونیجو کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ محبوب الحق کو کابینہ میں شامل کرلیں چنانچہ محبوب الحق نے کابینہ بننے کے دو ہفتے بعد وزیر حلف اٹھایا۔ محمد خاں جونیجو اور ضیاء الحق کے درمیان بہت معمولی باتوں پر 1986ء میں اختلافات پیدا ہونا شروع ہوگئے تھے - ایم آر ڈی کو 20 جنوری 1986ء کو ہی اطلاع مل گئی تھی کہ بے نظیر بھٹو جلد ہی پاکستان واپس پہنچ رہی ہیں کیونکہ جونیجو نے بے نظیر کو پاکستان آکر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دے دی تھی --- چنانچہ جتوئی اور نوابزادہ نصراللہ خاں نے بے نظیر کی وطن واپسی سے قبل ہی سیاسی فضا کو "خوشگوار" بنانے کے لئے جدوجہد شروع کردی - ایم آر ڈی کی قیادت نے 29 جنوری 1986ء کو لاہور کے موچی گیٹ میں جلسہ عام کرنے کا اعلان کردیا --- پاکستان پیپلزپارٹی کی طرف سے جتوئی نے نوابزادہ نصراللہ خاں کا بھرپور ساتھ دیا اور 29 جنوری 1986ء کو جب لاہور میں احتجاجی جلسہ منعقد ہوا تو اسی روز شہر میں جشن کا سماں تھا - بی

پی پی کے کارکن بڑی تعداد میں "جئے بھٹو ہزار سال جئے" کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے کیونکہ اب انہیں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے جرم میں گرفتار کرنے کے لئے سڑکوں پر فوج کے ٹرک موجود نہیں تھے - محمد خان جونیجو نے ایم آر ڈی کو نہ صرف موچی گیٹ میں جلسہ کرنے کی اجازت دے دی بلکہ انہوں نے پنجاب کے وزیراعلیٰ نواز شریف کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ اپوزیشن رہنماؤں کی حفاظت کا مناسب بندوبست کریں اور جلسہ گاہ سے پولیس کو دور رکھا جائے تاکہ مشتعل عوام پولیس کو دیکھ کر جذباتی نہ ہوجائیں --- جونیجو نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ ہم ایم آر ڈی کے مقابلے میں زیادہ قوت کا مظاہرہ کریں گے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ملک گیر سطح کا 8 فروری 1986ء کو لاہور میں کنونشن طلب کرلیا --- مسلم لیگ کی صدارت حاصل کرنے کے بعد جونیجو کا یہ پہلا سیاسی جلسہ تھا جو انہوں نے لاہور میں کیا --- ایم آر ڈی نے اپنے جلسہ عام میں 1973ء کے آئین کی بحالی اور جماعتی بنیادوں پر مڈٹرم الیکشن کرانے کا مطالبہ کیا --- جسے ضیاء الحق نے فوری طور پر مسترد کردیا جبکہ جونیجو نے بھی کہا کہ ایم آر ڈی کی قیادت اب انتخابات کے لئے 1990ء کا انتظار کرے --- سرکاری وسائل کے بے دریغ استعمال کے باوجود 8 فروری 1986ء کو مسلم لیگ اتنا بڑا اجتماع نہ کرسکی جس قدر عوام نے ایم آر ڈی کے موچی گیٹ کے جلسہ میں شرکت کی تھی --- حالانکہ جونیجو چاروں صوبوں سے مسلم لیگی رہنماؤں کو کنونشن میں مدعو کیا تھا --- ایم آر ڈی کے جلسہ عام میں جن قومی رہنماؤں نے شرکت کی ان میں نصراللہ خاں' جتوئی' فضل الرحمٰن' ولی خاں' اصغر خاں' اور غوث بخش بزنجو شامل تھے- قومی جماعتوں کو سیاسی اجتماع کی اجازت ملی تو ایم آر ڈی کے مقابلے میں مذہبی جماعتوں نے بھی جلسوں سے خطاب کا اعلان کردیا- جماعت اسلامی نے 6 مارچ 1986ء کو موچی گیٹ میں جلسہ کیا - بلاشبہ جماعت اسلامی تنظیمی لحاظ سے پاکستان کی منظم ترین جماعت ہے لیکن اس کے جلسے میں موجود افراد کی تعداد ایم آر ڈی کے جلسے کے مقابلے میں بہت کم تھی --- لیکن جماعت اسلامی کے جلسے کو ناکام قطعاً" نہیں کہا جاسکتا تھا --- جماعت اسلامی نے 6 مارچ 1986ء کو جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مڈٹرم انتخابات کی مخالفت کردی اور میاں طفیل محمد نے اپنی تقریر کے دوران موقف اختیار کیا کہ مڈٹرم انتخابات کے انعقاد کے لئے چلانے سے ملک میں چوتھا مارشل لاء لگ جائے گا- سیاسی مبصرین کے نزدیک میاں طفیل محمد نے ضیاء الحق کے جذبات کی عکاسی کی تھی --- چونکہ بے نظیر بھٹو نے پاکستان آنے کا فیصلہ کرلیا تھا اس لئے انہوں نے جہانگیر بدر کو لندن طلب کیا تاکہ وہ پاکستان میں اپنی واپسی کے موقع پر کئے جانے والے انتظامات کے حوالے سے ان سے بات چیت کرسکیں - جہانگیر بدر نے بے نظیر کو بتایا کہ 10 اپریل 1986ء کو جب وہ لاہور ائرپورٹ پر پہنچیں گیں تو کم از کم 5 لاکھ افراد ان کا استقبال کریں گے --- جہانگیر بدر کو اہم ہدایات دے کر بے نظیر نے اسے لندن سے ایک ماہ قبل وطن واپس بھیج دیا - جہانگیر بدر 9 مارچ 1986ء کو لندن سے لاہور پہنچے جہاں ہزاروں کارکنوں نے ان کا استقبال کیا- "میں پاکستان پہنچ کر کوری اکینو جیسا کردار ادا کروں گی" --- بے نظیر نے 6 اپریل 1986ء کو غیر ملکی اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا اور توقع ظاہر کی کہ جونیجو کو اپنے رویے سے ثابت کرنا ہو گا کہ پاکستان میں واقعی جمہوریت بحال ہوگئی ہے یا ابھی ملک پر ایک بے بس وزیراعظم مسلط ہے - جونیجو نے بے نظیر بھٹو کے دورہ لاہور کو مدنظر رکھتے ہوئے 7 اپریل 1986ء کو یعنی بے نظیر کی لاہور آمد سے تین روز قبل موچی گیٹ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کچی آبادی کے مکینوں کو مالکانہ حقوق دیئے --- لیکن جونیجو کے تمام اقدامات کے باوجود 10 اپریل 1986ء کو جب بے نظیر بھٹو لاہور پہنچیں تو وہاں عوام کا ایک سمندر ان کے استقبال کے لئے موجود تھا --- یہ بے نظیر کا پہلا سیاسی جلسہ تھا جس سے انہوں نے جمہوریت کی بحالی کے بعد لاہور میں خطاب کیا --- بے نظیر نے مینار پاکستان کے سائے تلے 10 اپریل 1986ء کو خطاب کرتے ہوئے فوری طور پر عام انتخابات کے انعقاد کا مطالبہ کیا اور تین روز بعد انہوں نے جونیجو کو تجویز دی کہ وہ نئے انتخابات کرانے کیلئے ریفرنڈم کروالیں --- لیکن اس سے پہلے کہ جونیجو اس تجویز پر ردعمل کا اظہار کرتے ضیاء الحق نے بے نظیر کی تجویز مسترد کردی اور کہا "بے نظیر کو مجھے 1990ء تک برداشت کرنا پڑے گا" --- لیکن وقت نے ضیاء الحق کو 1990ء تک جینے کا موقع ہی نہ دیا اور ان کے تمام منصوبے اس وقت دھرے کے دھرے رہ گئے جب 17 اگست 1988ء کو ان کا طیارہ بہاولپور کے نزدیک گر کر تباہ ہوگیا-
محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی خود ساختہ جلاوطنی ختم کرنے کا فیصلہ اپنے طور پر

نہیں کیا تھا بلکہ ایسا کرنے سے قبل انہوں نے لندن اور امریکہ میں واشنگٹن حکام سے مذاکرات کئے تھے۔ امریکہ کے مفاد میں یہ تھا کہ پاکستان میں ایک ایسی مضبوط اپوزیشن ہو جو ضیاالحق کو بوقت ضرورت دبا سکے اور آنے والے دنوں میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے ثابت کیا کہ وہ ایک بہت اچھی اپوزیشن لیڈر ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو جب 1986ء میں جلاوطنی ختم کر کے واپس آ رہی تھیں تو انہوں نے مرتضیٰ بھٹو کو کہا تھا کہ آئندہ ڈیڑھ دو سال کے اندر پاکستان میں شہید بابا کی پارٹی کی حکومت ہو گی اور سیاست کی بساط پر چالیں چلنے والوں نے ضیاالحق اور محمد خاں جونیجو کے درمیان کچھ اس انداز میں اختلافات پیدا کرائے کہ آناً" فاناً" محمد خاں جونیجو کا اس وقت بستر گول کر دیا گیا جب وہ 29 مئی 1988ء کی شام غیر ملکی دورے سے وطن واپس لوٹے۔ محمد خاں جونیجو کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ ضیاالحق نے خود اپنے سامنے ٹائپ کرایا اور جس وقت ضیاالحق ایوان صدر میں اسمبلی توڑنے کا اعلان کر رہے تھے' بے نظیر بھٹو اپنے قریبی ساتھیوں کو بتا رہی تھیں کہ 1988ء الیکشن کا سال ہے۔

بے نظیر بھٹو کی سیاسی غلطیاں

محترمہ بے نظیر بھٹو اس لحاظ سے خوش قسمت تھیں کہ انہیں مختصر سیاسی جدوجہد کے بعد ہی اقتدار مل گیا- بے نظیر کو اقتدار ملنا بھٹو خاندان کی خوش قسمتی تھی کیونکہ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد بے نظیر بھٹو اپنے خاندان کو متحدہ کر سکتی تھیں۔ فوج اور اسحاق خاں نے بے نظیر بھٹو کو شریک اقتدار کرنے کے بعد سوچا کہ بی بی احسان مند رہے گی لیکن احسان مندی بے نظیر کی سرشت میں ہی شامل نہ تھی - وہ ایک جمہوری سیاسی پارٹی کی ڈکٹیٹر سربراہ تھیں - اور اس پر ظلم یہ ہوا کہ بے نظیر کو خوشامدی رہنماؤں کا قرب حاصل ہو گیا۔ اس ماحول میں بے نظیر کو اندازہ نہ ہو سکا کہ جس دنیا کو وہ اصل سمجھ رہی ہیں وہ دراصل ایک سراب ہے اور جب پردہ ہٹ جائے گا تو وہ ایک گہری کھائی میں دھنستی چلی جائیں گی - بے نظیر ایک ایسے خوشنما قالین پر کھڑی تھیں جس کے نیچے فرش نہ تھا بلکہ وہ قالین دیواروں کے کونوں کے ساتھ بندھا تھا - اور رسی کے سرے فوج' اسحاق خاں اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ہاتھ میں تھے --- ان حالات میں بے نظیر کو نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے نہایت ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اس پیڑ پر کلہاڑی چلانا شروع کر دی جس پر وہ خود بھی بیٹھی ہوئی تھیں - بے نظیر کو مرکز میں حکومت مل گئی تھی --- وہ خود کو ڈیمو کریٹ کہلواتی تھیں اور ایک بڑی سیاسی جماعت کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی - ان حالات میں انہیں تو زیادہ جمہوری رویے کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا --- انہیں تو جمہوریت کے پودے کی آبیاری کے لئے زیادہ خلوص نیت کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا --- لیکن انہوں نے کمل بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جماعت کے مخلص کارکنوں

اور رہنماؤں کو نظر انداز کرنا شروع کردیا - جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارٹی میں ان کے خلاف سازشیں ہونا شروع ہوگئیں - دوسرا محاذ انہوں نے بلوچستان اور پنجاب میں کھول دیا --- بلوچستان کی اسمبلی 15 دسمبر 1988ء کو توڑی گئی - اگرچہ بے نظیر بھٹو نے اسمبلی تڑوانے میں براہ راست اہم کردار ادا نہ کیا تھا لیکن انہوں نے اسمبلی بچانے کی بھی کوشش نہ کی تھی - بلوچستان کے وزیر اعلیٰ ظفر اللہ جمالی بے نظیر کی حمایت سے وزیراعلیٰ بنے تھے - جب انہیں اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا تو انہوں نے گورنر بلوچستان موسیٰ خاں کو اسمبلی توڑنے کا مشورہ دے دیا - بے نظیر کا خیال تھا کہ صوبے میں نئے انتخابات کے نتیجے میں ان کی حکومت قائم ہوجائے گی - لیکن فیصلہ کرنے والی قوتوں کو بھی اس چیز کا اچھی طرح علم تھا لہٰذا بلوچستان اسمبلی ٹوٹنے کے بعد جنرل مرزا اسلم بیگ نے بے نظیر کو کہا کہ وہ بلوچستان کے امور میں کسی فریق کی حمایت یا مخالفت نہ کریں - بے نظیر نے اگرچہ جنرل مرزا اسلم بیگ کی بات سے اتفاق کرلیا لیکن در پردہ انہوں نے اپنے ایلچی بلوچستان بھجوانے کا سلسلہ جاری رکھا - بلوچستان اسمبلی کی بحالی کے بعد ملک کا اہم صوبہ بے نظیر سے چھن گیا اور بلوچستان میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت قائم ہوگئی --- اب نواز شریف کو ایک مزید صوبے کی حمایت حاصل تھی - بے نظیر کے لئے بہتری اسی میں تھی کہ وہ باقی دو صوبوں سرحد اور سندھ کو اپنے خلاف نہ کرتیں لیکن انہوں نے کمال ہوشیاری سے وہ تمام کام کرنا شروع کردیئے جن سے ولی خاں سرحد اور الطاف حسین سندھ میں ان سے ناراض ہو جائیں۔ ایک طرف تو بے نظیر نے بلوچستان کے خلاف جہاد شروع کردیا تو دوسری طرف انہوں نے پنجاب پر چڑھائی کردی --- اب بے چارہ ولی خاں بچ گیا تھا سو بے نظیر نے انہیں بھی ناراض کردیا۔ سرحد میں مخلوط حکومت بناتے وقت بے نظیر نے ولی خاں سے وعدہ کیا تھا کہ صوبے میں وزیراعلیٰ پی پی پی کا اور گورنر اے این پی کا ہوگا - اس انڈر سٹینڈنگ کی وجہ سے ولی خاں نے قومی اسمبلی میں بے نظیر کی حمایت کی تھی --- لیکن بے نظیر نے اے این پی کے نامزد کردہ عبدالخالق کو گورنر کے عہدے پر تعینات نہ کیا --- جس کی وجہ سے نواز شریف نے سرحد میں نقب لگانا شروع کردی --- بے نظیر نے صورتحال کا " دلیرانہ " مقابلہ کیا اور 19 جنوری 1989ء کو انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد میں بغاوت

کروا کے اس کے 10 ارکان کو سرحد میں شامل کرلیا - ان 10 ارکان نے ڈیموکریٹ گروپ بناکر آفتاب شیرپاؤ کی سرحد حکومت میں شمولیت اختیار کرلی --- اگرچہ سرحد میں بظاہر بے نظیر کو کامیابی حاصل ہوئی تھی کیونکہ بلوچستان میں ابھی تک ظفراللہ جمالی ہی نگران وزیراعلیٰ تھے - لیکن 19 جنوری 1989ء کی کامیابی کی خوشیاں سرحد میں منانے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ہائی کورٹ نے 22 جنوری 1989ء کو بلوچستان اسمبلی بحال کردی - نتیجتاً ظفراللہ جمالی کو مستعفی ہونا پڑا اور اسلامی جمہوری اتحاد نے بلوچستان نیشنل الائنس اور جے یو آئی کے ساتھ شراکت اقتدار کا معاہدہ کرکے بلوچستان میں نواب اکبر بگٹی کو جمالی کی جگہ وزیراعلیٰ بنوا لیا --- یوں بے نظیر کے لئے مشکلات کا آغاز ہوگیا --- اور نوازشریف نے قومی سطح کے لیڈر کی حیثیت سے سیاسی افق پر ابھرنا شروع کردیا - چونکہ مسلم لیگ کی صدارت ابھی تک جونیجو کے ہاتھ میں تھی لہٰذا نوازشریف کے حامی ارکان نے ایک منصوبے کے تحت جونیجو پر دباؤ ڈلوانا شروع کردیا کہ وہ مسلم لیگ کی صدارت چھوڑ دیں - لیکن جونیجو نے آسانی کے ساتھ یہ عہدہ چھوڑنے سے انکار کردیا اس کا فوری حل نواز شریف نے یہ نکالا کہ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر بننے کے لئے امیدوار بن گئے - غلام مصطفیٰ جتوئی جو آئی جے آئی کے صدر تھے قومی اسمبلی کا الیکشن ہار جانے کی وجہ سے خاصے دلبرداشتہ تھے - لہٰذا انہوں نے نوازشریف کو آئی جے آئی کا صدر بننے سے روکنے کے لئے اپنے کارڈ استعمال نہ کئے - اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غلام مصطفیٰ جتوئی ان کو اس پر الیکشن لڑوانا چاہتے تھے - اور جتوئی نے قومی اسمبلی میں پارلیمانی لیڈر بننے کی پیش کش کے عوض خود کو آئی جے آئی سے الگ کرلیا - مولانا سمیع الحق نے قربانی دیتے ہوئے خود کو اسلامی جمہوری اتحاد کا صدر بنوانے کی بجائے اس عہدے کے لئے نوازشریف کو ایک موزوں امیدوار قرار دے دیا - اور نتیجتاً نوازشریف 11 فروری 1989ء کو اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر بن گئے --- اب نوازشریف قومی سطح کے ایک سیاسی اتحاد کے صدر تھے اور ان کا منصب انہیں بے نظیر بھٹو کے مدمقابل کھڑے ہونے کی اجازت دیتا تھا - نوازشریف کے اسلامی جمہوری اتحاد کا صدر بننے کی اطلاع بے نظیر بھٹو کو چین میں ایک سرکاری دورے کے دوران ملی - بے نظیر کے لئے یہ کوئی اچھی خبر نہ تھی لیکن اس

بری خبر انہیں اگلے روز یعنی 12 فروری 1989ء کو ملی جب مولانا کوثر نیازی نے مولانا فضل الرحمٰن اور دیگر پی پی پی مخالف سیاستدانوں اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل کر توہین رسالت کے مرتکب سلمان رشدی کی شیطانی کتاب کے خلاف اسلام آباد میں زبردست مظاہرہ کیا - مظاہرین امریکی سفارتخانے کے سامنے جاکر اپنے غم و غصے کا اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن پولیس نے انہیں آڑھے ہاتھوں لیا اور یوں اسلام پسندوں اور پولیس کے درمیان زبردست تصادم ہوا - اور اس حد تک جھگڑا بڑھ گیا کہ حکومت کو فوج سے مدد کی درخواست کرنا پڑی - فیصل آباد میں شیعہ سنی فسادات اور حیدر آباد میں تخریب کاروں کی سرگرمیوں نے بے نظیر کی امور مملکت پر کمزور گرفت کا راز فاش کردیا --- ملک کے کئی مقامات پر حالات قابو میں کرنے کے لئے فوج کو طلب کرنا پڑا۔ فروری 1989ء کا مہینہ بے نظیر کے لئے مشکلات کا مہینہ تھا - کیونکہ پورے ملک میں افراتفری عروج پر تھی - اور ان حالات میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ بہتر ورکنگ ریلیشن شپ قائم کرنے کی بجائے سردار فاروق لغاری کے اصرار پر بے نظیر نے مخدوم الطاف کو نواز شریف کے خلاف کھڑا کر دیا۔ بے نظیر کہنے کو تو یہ کہہ رہی تھیں کہ وہ پنجاب میں اپنا وزیر اعلیٰ نہیں لائیں گی لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ "اگر نواز شریف کے خلاف کوئی شخص بغاوت کرے گا تو ہم اس پر اعتراض نہیں کریں گے" --- نواز شریف کے خلاف سازشوں میں تیزی آئی تو پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور ضیاء الحق کے جانشین غلام اسحاق خاں اور جنرل اسلم بیگ کے ذریعے پنجاب میں پی پی پی کے ارکان اسمبلی سے ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لانے کے لئے اپنے حامی ارکان سے دستخط کروانا شروع کردیئے تھے۔ سردار فاروق لغاری نواز شریف کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرکے اپنے دوست مخدوم الطاف کو وزیر اعلیٰ بنوانا چاہتے تھے جو اس وقت مسلم لیگ میں شامل تھے لیکن وہ نواز شریف سے نالاں تھے - پنجاب پی پی پی نے 6 مارچ 1989ء کو پنجاب اسمبلی کا اجلاس بلانے کے لئے سپیکر میاں منظور احمد وٹو کو درخواست دی۔ اس درخواست پر 80 ارکان کے دستخط موجود تھے اور قیاس کیا جاتا تھا کہ بے نظیر نے نواز شریف کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کروانے کے لئے قومی خزانے کا منہ کھول دیا ہے - پنجاب سپیشل برانچ کے سربراہ اس وقت چوہدری سردار

تھے جنہیں نواز شریف نے ان کی ضروریات سے بڑھ کر فنڈز فراہم کرنے کا سلسلہ تیز کردیا - اب صورتحال یہ تھی کہ راؤ عبدالرشید ' خالد کھرل اور سردار فاروق لغاری کی سربراہی میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے ارکان صوبائی اسمبلی کو توڑنے کا سلسلہ تیز ہوگیا - نواز شریف نے الزام عائد کیا کہ "بریف کیس گروپ" نے لاہور میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں اور ارکان اسمبلی کو بھیڑ بکریوں کی طرح خریدا جارہا ہے --- نواز شریف کی درخواست پر جنرل مرزا اسلم بیگ اور اسحاق خاں نے 6 مارچ 1989ء کو ہنگامی بنیادوں پر بے نظیر بھٹو کو ایوان صدر طلب کیا --- بے نظیر بخوبی جانتی تھیں کہ اسحاق اور جنرل اسلم بیگ انہیں کیا کہنے والے ہیں --- لیکن وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھیں کیونکہ ان کے خوشامدی مشیروں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ پنجاب کے بغیر مرکز میں حکومت کا ملنا بیکار ہے - اسحاق خاں نے 6 مارچ 1989ء کو جنرل مرزا اسلم بیگ کی موجودگی میں بے نظیر کو کہا کہ ان کی پارٹی سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی ہارس ٹریڈنگ میں ملوث ہورہے ہیں اور وفاقی وزراء لاہور میں موجود ہیں۔ اس قسم کی حرکتوں سے مرکز پنجاب محاذ آرائی مزید شدت اختیار کرے گی --- "میری جماعت کا کوئی رکن نواز شریف کے مقابلے میں وزارت اعلیٰ کا امیدوار نہیں ہے" --- بے نظیر نے اصرار کیا اور اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے منفی رویے کی وجہ سے انہیں نواز شریف کے مخالفین کی حمایت کا فیصلہ کرنا پڑا ہے - چنانچہ جنرل مرزا اسلم بیگ اور اسحاق خاں نے بے نظیر کو کہا کہ وہ پنجاب میں نواز شریف کے خلاف جاری سازشیں بند کریں اور اس کے بدلے وہ کوشش کریں گے کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت پھر مرکز میں ان کے ساتھ تعاون کرے - بے نظیر نے اڑھائی گھنٹے تک اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ کے ساتھ ایوان صدر میں اس روز مغز ماری کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواز شریف اور جتوئی کی طرف سے ان کے خلاف ہونے والی سازشوں کے وقتی طور پر خاتمے کے آثار پیدا ہوگئے --- بے نظیر بھٹو پنجاب میں نثار چیمہ کو آئی جی پولیس کے عہدے پر فائز کرنا چاہتی تھیں لیکن نواز شریف نے چوہدری منظور کو آئی جی پولیس مقرر کردیا۔

بے نظیر بھٹو کے مشیروں نے انہیں جو سبز باغ دکھایا تھا اس کے خدوخال کچھ یہ

تھے کہ "پی پی پی کی طرف سے نواز شریف کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کی دھمکی کارگر ثابت ہوگی کیونکہ نواز شریف اپنی شکست کو سامنے دیکھ کر اسمبلی توڑ دیں گے اور پھر گورنر پنجاب ٹکا خاں کی مدد سے ملک کے سب سے بڑے صوبے میں مرضی کا نگران وزیراعلیٰ لگاکر انتخابات کروا دیئے جائیں گے" --- دراصل یہ ایک فضول پلان تھا - اسی منصوبے کے تحت مخدوم الطاف کی سربراہی میں مسلم لیگ کا فارورڈ بلاک بنوایا گیا تھا اور مقصود لغاری نے نواز شریف کی کابینہ سے 7 مارچ 1989ء کو محض اس لئے استعفیٰ دے دیا کہ انہیں چند دنوں کے بعد یہ عہدہ واپس مل جانے کی امید تھی --- چوہدری شجاعت حسین نے 7 مارچ 1989ء کو الزام عائد کیا کہ نواز شریف کے ساتھیوں کو توڑنے کے لئے بے نظیر نے 25 کروڑ روپے اپنی جماعت کے حوالے کر دیئے ہیں اور بریف کیسوں میں بند یہ رقم مسلم لیگی رہنماؤں کو دے کر پنجاب میں حکومت تبدیل کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں - اگرچہ بے نظیر نے اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ پنجاب میں حکومت حاصل کرنے کیلئے ہارس ٹریڈنگ نہیں کریں گی لیکن انہوں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا جس پر نواز شریف نے اپنے مہربانوں سے مشورہ کرنے کے بعد 64 ارکان قومی اسمبلی کے دستخطوں سے بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کی غرض سے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرلیا - اب دونوں طرف سے کھلی جنگ شروع ہوگئی - ملک میں سیاسی محاذ آرائی عروج پر پہنچ گئی --- انہی حالات میں فلسطینی رہنما یاسر عرفات پاکستان آئے - یاسر عرفات کی بھٹو کے ساتھ دوستی کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں تھی - انہیں پاکستان کے سیاسی حالات کا بخوبی علم تھا چنانچہ جنرل مرزا اسلم بیگ اور اسحاق خاں کے ساتھ ملاقات کے دوران یاسر عرفات نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ بے نظیر کے خلاف ہونے والی سازشوں کا قلع قمع کیا جائے --- دوبئی کے فرمانروا شیخ زید بن سلطان نے بھی اسحاق خاں کو اس قسم کا پیغام بھیجا ---

ان حالات میں میاں منظور احمد وٹو نے پنجاب اسمبلی کے سپیکر کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کا 10 مارچ 1989ء کو اجلاس طلب کرلیا جبکہ معراج خالد نے جو قومی اسمبلی کے سپیکر تھے' کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجلاس کیلئے 22 مارچ 1989ء کی تاریخ

مقرر کر دی - پاکستان کی تاریخ کے نازک ایام میں اس وقت جبکہ بے نظیر کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری تھا' مرکزی حکومت نے ایک حماقت یہ کی کہ بے نظیر بھٹو کے مقرر کردہ وزیر قانون افتخار گیلانی اور اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے اسحاق خاں کے خلاف محاذ کھول دیا - وفاقی حکومت نے ججوں کی تعیناتی کے حوالے سے سپریم کورٹ میں موقف اختیار کیا کہ صدر کے مقرر کردہ جج حضرات فارغ ہوگئے ہیں اور ججوں کی تعیناتی وزیراعظم کا صوابدیدی حق ہے - صدر اسحاق خاں نے 12 مارچ 1989ء کو بے نظیر کو ججوں کی تعیناتی کے سلسلے میں پیدا ہونے والے تنازعے کے حوالے سے ایوان صدر طلب کرکے انہیں سمجھایا کہ وہ آئین کی تشریح صحیح طریقے سے کریں کیونکہ ججوں کی تعیناتی صدر کا حق ہے --- اسحاق خاں کے دلائل میں وزن تھا - چنانچہ بے نظیر نے ججوں کی تعیناتی کے سلسلے میں اسحاق خاں کے ساتھ جنگ ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا --- کیونکہ انہیں نظر آنا شروع ہوگیا تھا کہ قومی اہمیت کے فیصلوں میں وہ بے بس ہیں اور ملک میں وہی ہوگا جو فوج اور اسحاق خاں چاہیں گے - بے نظیر اور اسحاق خاں کے درمیان انڈر سٹینڈنگ کے بعد یہ بات یقینی ہوگئی تھی کہ مرکز اور پنجاب کے درمیان جاری محاذ آرائی وقتی طور پر ختم ہوجائے گی -13 مارچ 1989ء کو نواز شریف نے پنجاب اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا - انہیں 152 ارکان نے اعتماد کا ووٹ دیا جبکہ ایوان میں موجود ارکان کی ٹوٹل تعداد 240 تھی --- اس طرح یہ بات طے ہوگئی کہ پی پی پی کو صوبے میں اکثریت حاصل نہیں ہے - اسحاق خاں نے نواز شریف اور بے نظیر کے درمیان اس وقت کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے "سیز فائر" کروانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا --- لیکن بے نظیر کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اسحاق خاں نے اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ بھرپور تیاری کے بعد بے نظیر پر وار کریں --- بے نظیر وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد لاہور آنے سے کتراتی تھیں کیونکہ نواز شریف بطور وزیراعلیٰ ان کا استقبال کرنے سے بچنے کے لئے شہر سے باہر چلے جاتے تھے - تاہم جب نواز شریف نے 13 مارچ 1989ء کو اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا تو اسحاق خاں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بے نظیر کو وزیراعظم کا پروٹوکول فراہم کریں جو 14 مارچ کو لاہور آئیں گی - چنانچہ اسحاق خاں کے کہنے پر نواز شریف نے 14 مارچ 1989ء کو بے

نظیر بھٹو کی لاہور آمد پر استقبال کیا --- اور بے نظیر کے کہنے پر پی پی پی نے میاں منظور احمد وٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک واپس لے لی۔ وٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ پی پی پی اپنی طاقت کا اندازہ کرنا چاہتی تھی --- لیکن میاں نواز شریف نے 13 مارچ 1989ء کو نہ صرف خود اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تھا بلکہ انہوں نے وٹو کو بھی اعتماد کا ووٹ دلوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا - ان حالات میں وٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا "ہم نے یہ فیصلہ جذبہ خیر سگالی کے طور پر کیا ہے" --- لیکن سردار فاروق لغاری نے جو اس وقت پانی و بجلی کے وفاقی وزیر تھے ان تمام کوششوں پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ "نواز شریف کے خلاف معرکہ ختم نہیں بلکہ شروع ہوا ہے" --- بے نظیر بھٹو کی 11 مارچ 1989ء کو لاہور میں نواز شریف کے ساتھ ملاقات اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ انہیں نواز شریف کا موقف سننے اور انہیں سمجھنے کا موقع ملا - اب اگر وہ سمجھ کر بھی نہ سمجھتیں تو اس میں حالات کا نہیں بلکہ ان کا اپنا قصور تھا - 14 مارچ 1989ء کی اس ملاقات کے بعد دونوں طرف سے سیز فائر ہوجانا چاہئے تھا --- نواز شریف چاہتے تھے کہ بے نظیر بھٹو ترقیاتی فنڈز جیالوں کے حوالے کرنے کی بجائے یہ رقم پنجاب حکومت کے حوالے کریں جو ہر قسم کی سیاسی مصلحتوں سے بالا تر ہوکر صوبے میں ترقیاتی منصوبے مکمل کرے گی - لیکن بے نظیر نے پیپلز ورکس پروگرام کے تحت صوبے میں متبادل حکومت قائم کرکے ترقیاتی منصوبے شروع کرنے کا اعلان کردیا --- جس پر نواز شریف نے سخت احتجاج کیا اور بے نظیر نے یہ مسئلہ حل کرنے کیلئے نواز شریف کو 22 مارچ 1989ء کو کھانے کی دعوت دے دی --- دونوں رہنماؤں کے پاس یہ ایک نیا موقع تھا --- بے نظیر بھٹو بطور وزیراعظم بہتر فیصلے کرکے پنجاب کے عوام کے دل جیت سکتی تھیں - صوبوں اور مرکز کے درمیان محاذ آرائی ختم کروانے میں امریکی سفیر رابرٹ اوکلے بھی ان دنوں سرگرم رہے - رابرٹ اوکلے نے اسحاق خاں، جنرل مرزا اسلم بیگ اور نواز شریف کے ساتھ مارچ 1989ء میں ملاقاتوں کے دوران موقف اختیار کیا کہ بے نظیر کو کمزور کرنے کی بجائے انہیں مضبوط کیا جائے کیونکہ جمہوری عمل کے تسلسل کی وجہ سے امریکہ کے لئے کانگریس اور سینٹ سے پاکستان کے لئے امداد کا بل منظور کروانا آسان ہوجائے گا -- امریکی سفیر

رابرٹ اوکلے نے بے نظیر بھٹو کے ساتھ متعدد ملاقاتیں کیں --- دراصل امریکہ اپنے مفادات کی جنگ لڑرہا تھا --- بلوچستان میں امریکہ کو اڈے قائم کرنے کی اجازت ضیاء الحق نے دی تھی اور بے نظیر نے بھی امریکہ کو بلوچستان کی سرزمین استعمال کرنے سے منع نہ کیا جبکہ سرحد اور بلوچستان میں تعینات امریکی سی آئی اے کے حکام افغان جنگ کی کمان کررہے تھے۔ رابرٹ اوکلے نے آئی ایس آئی کا افغان امور پر کنٹرول ختم کروانے کے لئے بے نظیر بھٹو سے اہم فیصلے کروائے - ایک فیصلے کے تحت بے نظیر نے آئی ایس آئی کا افغان مجاہدین کے ساتھ براہ راست رابطہ ختم کرنے کے احکامات جاری کردیئے اور انہوں نے حکم صادر کیا کہ افغان امور سے متعلق فیصلوں کا اختیار کابینہ کو ہے اور وزارت خارجہ ان کے فیصلوں پر عمل کرے گی --- یہ ایسا فیصلہ تھا جس سے جرنیلوں اور آئی ایس آئی کے ان اعلیٰ افسران کو سخت تشویش ہوئی جو ملکی مفادات کے لئے براہ راست افغان مجاہدین سے معاملات طے کرتے تھے اور انہیں اسلحہ سپلائی کیا جاتا تھا - امریکہ کی پاکستان کے امور میں مسلسل مداخلت کی وجہ سے اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ مارچ 1989ء میں پریشان ہوگئے کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ امریکہ چاہتا ہے کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کردے - اس کا حل جنرل بیگ نے یہ نکالا کہ انہوں نے اسحاق خاں کی موجودگی میں ڈاکٹر عبدالقدیر کو ایٹم بم بنانے کا ہدف جلد از جلد حاصل کرنے کا حکم دے دیا --- چنانچہ پاکستان نے ایٹمی ترقی کا ہدف مارچ 1989ء میں ہی حاصل کرلیا --- جس کے بعد رابرٹ اوکلے کے ذریعے پاکستان کو ملنے والے امریکی پیغام کی روشنی میں اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ نے ایک روز بے نظیر کو ایوان صدر طلب کیا اور ان سے اس دستاویز پر دستخط کروائے جس کے تحت پاکستان کا ایٹمی پروگرام "کیپ" کیا جانا مقصود تھا - امریکہ کی یہ بہت بڑی "کامیابی" تھی - لیکن بے نظیر کو معلوم نہیں تھا کہ ایٹمی پروگرام "کیپ" کرنے سے پہلے کہوٹہ میں کیا کچھ ہوتا رہا - امریکہ کی پاکستان کے ساتھ اس قدر قربت کا روس نے برا منانا ہی تھا چنانچہ مارچ 1989ء کے اواخر میں یحییٰ بختیار بے نظیر بھٹو کے خصوصی ایلچی کی حیثیت سے ماسکو گئے تو روس کے وزیر خارجہ نے انہیں دھمکی دی کہ "پاکستان اپنی سرزمین پر موجود امریکی اڈوں کو فوراً ختم کردے" اسحاق خان اور جنرل مرزا اسلم بیگ

نے بے نظیر بھٹو کے ناز نخرے محض امریکی فوجی و اقتصادی امداد بحال کرانے کے لئے اٹھائے تھے --- لیکن بے نظیر اس میدان میں بھی اسحاق خاں اور فوج کی توقعات پر پورا نہ اتر سکیں - پاکستان کا ایٹمی پروگرام کیپ کروانے کے بعد امریکہ نے بے نظیر کو دوسرا اہم مشن یہ دیا کہ وہ منشیات کے خلاف بڑے پیمانے پر آپریشن شروع کریں -- چنانچہ بے نظیر بھٹو نے 25 اپریل 1989ء کو وزیر داخلہ اعتزاز احسن کو منشیات فروشوں اور اسمگلروں کے خلاف بڑے پیمانے پر اپریشن کی تیاریاں کرنے کا حکم دے دیا --- منشیات کے خلاف جہاد شروع کرنے کا بے نظیر کو نقصان یہ ہوا کہ سرحد سے تعلق رکھنے والے منشیات کے سمگلروں نے بے نظیر کے خلاف روپیہ پانی کی طرح بہانا شروع کردیا --- سرحد حکومت اور بے نظیر کے درمیان اختلافات تو کئی ماہ سے جاری تھے --- اور ان حالات میں منشیات کی کمائی سے سیاستدانوں کو دی جانے والی رقم نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور 27 اپریل 1989ء کو سرحد کے اے این پی سے تعلق رکھنے والے وزراء نے صوبائی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا --- اور بے نظیر بری طرح پھنس گئیں --- ایک طرف سرحد میں یہ کھیل جاری تھا تو ادھر یہ واقعہ پیش آیا۔ 30 اپریل 1989ء کو سندھ کی نااہل انتظامیہ نے حیدر آباد میں مقیم ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین کو ان کی جماعت کے سینئر رہنما سمیت ایک مکان پر 3 گھنٹے قید کئے رکھا - جس پر الطاف حسین نے یکم مئی 1989ء کو بے نظیر کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے حیدر آباد کی انتظامیہ کو فوری طور پر برطرف نہ کیا تو ان کے ارکان سندھ کابینہ سے مستعفی ہوجائیں گے - بے نظیر بھٹو کے لئے یہ آزمائش کا وقت تھا کیونکہ ایم کیو ایم نے ریاستی قوت کو للکارا تھا --- کور کمانڈر کراچی لیفٹننیٹ جنرل آصف نواز اس حق میں نہ تھے کہ ایم کیو ایم کی قیادت کی دھمکی پر حیدر آباد کی انتظامیہ کو تبدیل کردیا جائے - بے نظیر بھٹو نے حالات کا سیاسی انداز میں مقابلہ کرنے کی بجائے غیر سیاسی رویہ اختیار کیا - ایم کیو ایم بلاشبہ ایک بڑی قوت تھی اور سندھ اور مرکز میں بے نظیر کی حکومت بنوانے میں الطاف حسین نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا --- لیکن بے نظیر نے ایم کیو ایم کے مطالبات کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے ایجنٹوں کے سامنے نہیں جھکوں گی" - ہماری لڑائی آمریت کے ایجنٹوں کے خلاف ہے' میں جمہوریت اور آئین پر یقین رکھتی ہوں - میری

جماعت شیروں کی جماعت ہے اور جو گیدڑ ہیں وہ گیدڑوں کی جماعت میں چلے جائیں" - بے نظیر کے اس جواب کا ایم کیو ایم نے نہایت برا منایا اور الطاف حسین نے سندھ کابینہ میں شامل تین وزراء جاوید اختر' الطاف کاظمی' اور شمس العارفین کے استعفے سندھ اسمبلی کے سپیکر کو بھجوا دیئے - نواز شریف چاہتے تھے کہ الطاف حسین مرکزی سطح پر بھی بے نظیر کے ساتھ عدم تعاون کا اعلان کردیں لیکن ایم کیو ایم کی مرکزی قیادت نے کافی غور و خوض کے بعد اعلان کیا کہ " ایم کیو ایم وفاقی سطح پر فی الحال پی پی پی کی حمایت جاری رکھے گی" ---

3 مئی 1989ء کو رمضان المبارک کی 26 تاریخ تھی - اسی روز فوجی قیادت نے چکلالہ میں افطار پارٹی دی جس میں اسحاق نے بھی شرکت کی - اس موقع پر موضوع بحث ملکی حالات رہے - لیکن خصوصی طور پر بے نظیر کے متوقع دورہ امریکہ کے شرکاء محفل نے بھی گفتگو میں حصہ لیا --- بے نظیر کے دورہ امریکہ کو کامیاب بنانے کے لئے اسحاق خاں اور فوج نے منشیات کے سمگلروں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی کی منظوری دے دی - حالانکہ اس قسم کی کارروائی کے نتیجے میں منشیات کے کاروبار سے منسلک حضرات بین الاقوامی سطح پر حکومت پاکستان کے لئے مسائل پیدا کرسکتے تھے کیونکہ افغان جنگ کے دوران بعض منشیات فروشوں کی سرکاری طور پر سرپرستی کی جاتی رہی تھی --- بے نظیر بھٹو کے اقتدار کے اگر پہلے 6 ماہ کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوگا کہ انہوں نے اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں ہی بڑے بڑے معرکے سرانجام دیئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں اپنے دشمنوں کی تعداد میں سرعت کے ساتھ اضافہ کرنے کی اس قدر جلدی کیا تھی۔ بے نظیر نے برسوں کا کام مہینوں میں انجام دے دیا --- تین صوبوں (پنجاب' سرحد اور بلوچستان) کو انہوں نے اپنے خلاف کرلیا - صدر اسحاق خاں کے ساتھ انہوں نے پھڈے بازی کرلی' اپنی جماعت کے سینئر رہنماؤں کے ساتھ انہوں نے توہین آمیز رویہ اپنائے رکھا اور ایم آر ڈی میں شامل سیاسی جماعتوں کی جمہوریت کے لئے جدوجہد کو نظرانداز کرتے ہوئے بے نظیر نے بزرگ سیاستدان کے ساتھ ہاتھ کردیا - اب صرف عدلیہ اور فوج دو ایسے ادارے تھے جو بے نظیر کے پہلے دور حکومت میں ان کے ہاتھوں محفوظ رہے --- لیکن 6 ماہ بعد بے نظیر نے عدلیہ پر بھی

ہاتھ ڈال دیا - وہ ججوں کو اپنی مرضی کے مطابق اعلیٰ عدالتوں میں تعینات کرنا چاہتی تھیں جس کا اسحاق خاں نے سخت برا منایا --- بے نظیر کی امریکی صدر بش کے ساتھ 5 جون 1989ء کو ملاقات طے تھی اور پاکستان نے اس ملاقات کو کامیاب کرانے کے لئے 5 مئی 1989ء سے ہی اعلیٰ سطح پر روابط اور کوششوں کا سلسلہ شروع کردیا تھا - بے نظیر امریکہ جاکر ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ پاکستان میں انسانی حقوق کا بہت خیال رکھا جاتا ہے' پاکستان منشیات کے خلاف جہاد میں امریکہ کے ساتھ تعاون کررہا ہے' پاکستان دہشت گردی کے خلاف امریکہ سمیت دوسرے ممالک بشمول بھارت کے ساتھ بھی تعاون کررہا ہے' پاکستان ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے خلاف ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان اب افغانستان کے مسئلے کا فوری حل چاہتا ہے --- اپنی باتوں میں وزن پیدا کرنے کے لئے بے نظیر نے ملک کے سب سے بڑے سمگلر اقبال بیگ کو گرفتار کرکے امریکہ کے حوالے کردیا - بھارت کے خلاف احتجاجی تحریک میں مصروف سکھوں کی مبینہ طور پر فہرست اعتزاز احسن کے ذریعے راجیو گاندھی کو پہنچائی گئی - یہ وہ الزام ہے جو سب سے پہلے اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت نے بے نظیر پر عائد کیا --- لیکن اپوزیشن کے الزامات کا جواب دینے کی بجائے بے نظیر نے ہمسایہ ممالک سے خوشگوار تعلقات کے فروغ کے لئے اپنے خصوصی نمائندے مسٹر اخوند کے ذریعے بھارت کے ساتھ مذاکرات کئے۔ 20 مئی 1989ء کو اسلم بیگ نے جی ایچ کیو کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائے جانے والے دفاعی بجٹ کو بے نظیر کے حوالے کردیا --- ظاہر ہے کہ ماضی کی طرح حکومت وقت سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ بے نظیر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر دفاعی بجٹ کی منظوری عنایت کردیں گی --- لیکن بے نظیر دفاعی بجٹ کی فائل دبا کر بیٹھ گئیں - لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں حکمرانوں کے پر جلتے ہیں --- بے نظیر نے اس پر دوسری غلطی یہ کی کہ انہوں نے 22 مئی 1989ء کو ٹیلی ویژن پر ضیاء الحق کے خاندان کے پانچ مکانات کی خبرنامے میں فلم چلوا دی - اس ساری کارروائی کا مقصد ضیاء الحق کے خاندان کو ذلیل کرنا تھا کیونکہ ضیاء الحق کے صاحبزادے اعجاز الحق مارچ 1989ء سے مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے اور وہ اپنی ابتدائی سیاسی زندگی میں ہی اعلیٰ عہدے کے طلب گار تھے - بے نظیر نے اقتدار حاصل کرنے سے

قبل جنرل مرزا اسلم بیگ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضیاء الحق کے خاندان والوں کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کریں گی - اب جب ضیاء الحق کے 5 بنگلوں کی خبر ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے فوج تک پہنچی تو مجموعی طور پر فوج نے اس کا برا منایا کیونکہ حکومت نے فوج کے سابق سربراہ کو ذلیل کرنا شروع کردیا تھا۔ جنرل مرزا اسلم بیگ کو ایک مرتبہ 23 مئی 1989ء کو اطلاع ملی کہ بے نظیر آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کی تعیناتی اپنی مرضی کے مطابق چاہتی ہیں- اس اطلاع سے جنرل مرزا اسلم بیگ نے اندازہ لگایا کہ بے نظیر اب آہستہ آہستہ فوج کی طرف بھی توجہ دینے کے لئے تیاری میں لگ گئی ہیں - جنرل حمید گل ایک نہایت قابل جرنیل تھے اور بلاشبہ توقع کی جارہی تھی کہ وہ پاکستان فوج کے آئندہ سربراہ ہوں گے --- جنرل مرزا اسلم بیگ خود بھی جنرل حمید گل کی صلاحیتوں کے معترف تھے لیکن وہ ان سے کسی حد تک خوفزدہ بھی تھے - یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بے نظیر بھٹو کے فیصلے کی مخالفت نہ کی اور حکومت نے 24 مئی 1989ء کو جنرل حمید گل کی جگہ جنرل شمس الرحمٰن کلو کو آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کردیا --- جنرل مرزا اسلم بیگ نے آئی ایس آئی کا حساس نوعیت کا ریکارڈ ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کردیا اور یوں جنرل شمس الرحمٰن کلو ملکی سلامتی سے متعلق بیشتر ریکارڈ سے لاعلم رہے - ایک مرتبہ شمس الرحمٰن کلو نے جب محمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ طلب کی تو انہیں بتایا گیا کہ یہ رپورٹ "گم" ہوگئی ہے - اس طرح الذوالفقار سے متعلقہ مواد بھی انہیں فراہم نہ کیا گیا --- بے نظیر نے جنرل حمید گل کو ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی کے عہدے سے اس لئے فارغ کیا تھا انہیں اہم قسم کی معلومات فراہم نہیں ہورہی تھیں --- لیکن جنرل شمس الرحمٰن کی کارکردگی بھی کوئی قابل ستائش نہ رہی --- وہ بے نظیر کو یہ بھی نہ بتا سکے کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت کراچی اور لاہور میں الطاف حسین کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لئے کوشاں ہے --- بے نظیر کو اس معاہدے کی اطلاع 30 مئی 1989ء کو ایک اخبار نویس کے ذریعے ملی جس کے بعد انہوں نے خواجہ طارق رحیم اور احمد سعید اعوان کو کراچی دوڑا دیا --- ان دونوں وفاقی وزراء نے بے نظیر بھٹو کے نمائندے کی حیثیت سے الطاف حسین کے ساتھ مذاکرات کئے - اور بے نظیر کے لئے مشکلات کا سلسلہ وقتی طور پر رک گیا --- لیکن ابھی ایک

بڑی مشکل ان کے سامنے سر اٹھائے کھڑی تھی --- یعنی اپوزیشن نے اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ کے ساتھ معاملات طے کرنے کے بعد غلام مصطفیٰ جتوئی کو متحدہ اپوزیشن کا سربراہ بنا دیا --- اس کا اعلان یکم جون 1989ء کو کیا گیا --- بے نظیر بھٹو جب 5 جون 1989ء کو امریکہ میں صدر جارج بش کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھیں تو پاکستان میں متحدہ اپوزیشن اتحاد حکومت کے خلاف فیصلہ کن جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا --- بے نظیر امریکہ جانے سے قبل آفتاب شیرپاؤ کو اے این پی کے نمائندوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کا حکم دے کر گئی تھیں - لیکن 7 جون 1989ء کو اے این پی کے پی پی پی کے ساتھ مذاکرات ناکام ہوگئے جس کے اگلے روز نواز شریف نے اے این پی کے ساتھ بے نظیر کے خلاف تحریک چلانے اور آئندہ حکومت مل کر بنانے کے سلسلے میں ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے - بے نظیر کو اس صورتحال میں معاملات اپنے ہاتھ میں لینا پڑے اور انہوں نے ولی خاں سے مذاکرات کے بعد 13 جون 1989ء کو ولی خاں کو حکومت کے ساتھ پھر تعاون پر آمادہ کر لیا --- لیکن یہ تعاون اور یقین دہانیاں دراصل سیاسی چالیں تھیں --- بے نظیر نے 28 جون 1989ء کو جی ایچ کیو جا کر جنرل مرزا اسلم بیگ کو بتایا کہ نواز شریف اور جتوئی فوج کی حمایت کا دعویٰ کر کے سیاستدانوں کو ان کے خلاف بغاوت پر اکسا رہے ہیں --- جنرل مرزا اسلم بیگ نے دوران گفتگو بے نظیر بھٹو کو کہا کہ وہ اپوزیشن کو وفاقی کابینہ میں شامل کریں - جبکہ پنجاب کابینہ میں پی پی پی کے نمائندوں کو شامل کیا جائے - اس طرح مرکز پنجاب محاذ آرائی کا خاتمہ ہو جائے گا --- بے نظیر نے فوری طور پر اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے اپوزیشن کو وفاقی حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی --- جبکہ پنجاب میں قائد حزب اختلاف رانا شوکت محمود نے 29 جون 1989ء کو نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو اپنی رہائش گاہ پر کھانے کی میز پر مذاکرات کی دعوت دے ڈالی - رانا شوکت محمود کو نواز شریف کے ساتھ تعاون کرنے کی ہدایت بے نظیر بھٹو نے دی تھی --- 29 جون 1989ء کے دن قوم کے لئے خوشیوں کی نوید لیکر طلوع ہوا کیونکہ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان کئی ماہ سے جاری محاذ آرائی کا سلسلہ ختم ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا --- لیکن ابھی نواز شریف پی پی پی کے ساتھ تعاون کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ مخدوم الطاف نے مقصود لغاری

اور طاہرہ خاں کی مدد سے پنجاب اسمبلی میں اسلامی جمہوری اتحاد کا فارورڈ بلاک قائم کر لیا --- جس کی پشت پر پی پی پی کے سرکردہ رہنما سردار فاروق لغاری کا ہاتھ تھا --- اور یوں نواز شریف اور بے نظیر کے درمیان سیاسی محاذ آرائی ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھ گئی اور دونوں سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے کو گرانے کے لئے بلند و بانگ دعوے شروع کر دیئے -

سازشی ٹولہ، بے نظیر اور فوج

جنرل مرزا اسلم بیگ نے ضیاء الحق کی وفات کے بعد اگر مارشل لاء لگانا ہوتا تو اقتدار پر قبضہ کرنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا تھا ضیاء الحق کی موت کے ساتھ ہی دو عہدے خالی ہوگئے تھے (1) صدر مملکت کا عہدہ (2) چیف آف دی آرمی سٹاف کا عہدہ - ان دونوں عہدوں کا حصول جنرل مرزا اسلم بیگ کے لئے ممکن تھا --- وہ سازشی ٹولے کے ساتھ ساز باز کرکے مسند اقتدار پر فائز ہوسکتے تھے - لیکن انہوں نے اس وقت کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ملک کے وسیع تر مفاد میں اس کے برعکس فیصلہ کیا- ممکن ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد سیاستدانوں کے ہاتھوں بے توقیر ہونے کے بعد جنرل مرزا اسلم بیگ پچھتاتے رہے ہوں- جون 1989ء میں بے نظیر بھٹو کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ فوج کا سربراہ ان کے خلاف سازشوں میں برابر کا شریک ہے اس لئے بے نظیر نے اس سازش کا دو محاذوں پر مقابلہ کیا - پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ پی پی پی سے تعلق رکھنے والے وہ ارکان جو ترقیاتی فنڈز نہ ملنے کی وجہ سے ناراض تھے انہیں سرکاری خزانے سے وسائل فراہم کرنے کا عمل شروع کردیا گیا- دوسرا قدم انہوں نے مارشل لاء کے نفاذ کا راستہ روکنے کے لئے یہ اٹھایا کہ انہوں نے پی پی پی سے تعلق رکھنے والے ارکان کو کہا کہ وہ پنجاب اسمبلی میں مارشل لاء کے ممکنہ نفاذ کے خلاف قرارداد پاس کرائیں - اس ہدایت کی روشنی میں پی پی پی نے ایک رکن صوبائی اسمبلی ذاکر قریشی کے ذریعے 5 جولائی 1989ء کو مارشل لاء کے نفاذ کے خلاف قرارداد پیش کرائی جسکا حکومت نے ساتھ دیا کیونکہ کوئی جمہوریت پسند ایوان کے اندر بیٹھ کر تو مارشل لاء کے نفاذ کی حمایت نہ کرسکتا تھا - جنرل مرزا اسلم بیگ کو قرارداد منظور ہونے

کی اطلاع ملی تو وہ مسکرا دیئے کیونکہ بے نظیر نے اس قرارداد کے ذریعے فوج کو پیغام دیا تھا کہ اب مارشل لاء لگا تو عوام سڑکوں پر نکل آئیں گے - "بے نظیر کو تو مارشل لاء لگائے بغیر بھی فارغ کیا جاسکتا ہے" --- میاں نواز شریف نے اسی روز وزیراعلیٰ ہاؤس میں اپنے ساتھیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا---

بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں امریکی صدر جارج بش ، ماضی کی امریکی حکومتوں کی طرح پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستانہ تعلقات کے خواہاں تھے - اس لئے انہوں نے بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کو 7 جولائی 1989ء کو فون کیا کہ وہ اپنے مجوزہ دورہ پاکستان کے دوران بے نظیر بھٹو کے ساتھ بامقصد مذاکرات کریں - اسی طرح کا پیغام رابرٹ اوکلے نے بے نظیر کو بھی دیا - راجیو گاندھی نے 16 جولائی 1989ء کو پاکستان پہنچنا تھا مگر ان کا حفاظتی عملہ 13 جولائی 1989ء کو ہی پاکستان پہنچ گیا- راجیو گاندھی کے لئے مرسیڈیز گاڑی جو ظاہر ہے بلٹ پروف تھی' ایک خصوصی طیارے کے ذریعے اسلام آباد پہنچائی گئی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ راجیو گاندھی کو حکومت پاکستان پر کس قدر بھروسہ تھا- راجیو گاندھی کو پاکستانی حکام نے یقین دلایا تھا کہ ان کے دورے کے دوران سیکورٹی کے انتظامات ان کے شایان شان ہوں گے لیکن بھارتی وزیراعظم اڑے رہے کہ ان کی حفاظت کا کام ان کا اپنا عملہ کرے گا جو امریکی سی آئی اے اور اسرائیل کی انٹیلی جنس "موساد" کا تربیت یافتہ تھا- راجیو گاندھی کو پاکستان پہنچنے پر 16 جولائی 1989ء کو 21 توپوں کی سلامی دی گئی --- اور اپوزیشن نے اس روز کھل کر بے نظیر بھٹو کی خارجہ پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا --- اسی روز پاکستان کے حساس اداروں نے راجیو گاندھی کے بے نظیر بھٹو کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کی تفصیل سے فوج اور اسحاق خاں کو آگاہ کردیا - بے نظیر کے راجیو گاندھی کے ساتھ ہونے والے مذاکرات فوج اور اسحاق خاں کی تیار کردہ خارجہ پالیسی سے متصادم تھے - اس لئے 18 جولائی 1989ء کو بے نظیر کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی کی اجازت دے دی گئی --- پہلے مرحلے کے طور پر بیگم نسیم ولی خاں کی معیت میں جنرل فضل حق اور ارباب جہانگیر کو 25 ارکان اسمبلی کے ہمراہ لاہور بھجوا دیا گیا جہاں انہوں نے چوہدری شجاعت حسین کی رہائش گاہ پر اہم مذاکرات میں حصہ لیا اور چوہدری شجاعت کے گھر ہی سرحد کے

وزیر اعلیٰ آفتاب شیرپاؤ کو ہٹانے کے لئے منصوبہ بندی کی گئی - جنرل فضل حق ان تمام سازشوں میں اس لئے شریک تھے کہ انہیں اپنی گرفتاری کا خدشہ تھا کیونکہ بے نظیر کو امریکی سی آئی اے کے ذریعے منشیات کے جن بڑے بڑے سمگلروں کی فہرست بھجوائی گئی تھی اس میں جنرل فضل حق کا نام بھی شامل تھا- نواز شریف چاہتے تھے کہ بے نظیر سرحد کے ایک اہم رہنما جنرل فضل حق کو محض امریکہ کی خوشنودی کے لئے گرفتار نہ کرے --- انہوں نے 2 جولائی 1989ء کو بے نظیر بھٹو کی لاہور آمد پر ان کا استقبال کیا- اس اقدام سے وہ بے نظیر کو پیغام دینا چاہتے تھے کہ وہ ان کے حلیف سیاسی رہنماؤں کے خلاف کارروائی نہ کریں- لیکن بے نظیر نے اسی روز جنرل فضل حق اور حاجی اقبال بیگ کی گرفتاری کا حکم دے دیا --- جنرل فضل حق کو 22 جولائی 1989ء اور حاجی اقبال بیگ کو 26 جولائی 1989ء کو گرفتار کیا گیا --- جس کے بعد اپوزیشن نے بھی بے نظیر کی حکومت کے خلاف کھل کر کارروائی کا فیصلہ کرلیا --- بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اس وقت نواب اکبر بگٹی تھے - نواز شریف کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد انہوں نے بلوچستان میں پیپلز پروگرام کے تحت شروع کئے جانے والے ترقیاتی کاموں پر فوری طور پر کام رکوا دیا اور پیپلز پروگرام کے تحت بلوچستان بھجوائی جانے والی گاڑیوں کو قبضے میں لے لیا اور عملے کو تھپڑ مار کر صوبے سے نکال دیا - پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواز شریف نے پیپلز پروگرام کے تحت شروع کئے جانے والے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لئے محکمہ بلدیات اور پولیس کے ذریعے راتوں رات تعمیراتی سامان اٹھوا دیا اور مرکز کی طرف سے پنجاب میں تعیناتی کے لئے بھجوائے جانے والے بیورو کریٹس کو قبول کرنے سے انکار کردیا- یوں بلوچستان اور پنجاب نے وفاق کی اتھارٹی کو چیلنج کردیا --- جس پر بے نظیر نے اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ سے رابطہ قائم کیا --- لیکن فوج ان کی مدد کیوں کرتی --- اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بے نظیر حکومت نے منشیات کے سمگلروں کی گرفتاری کے لئے جن افراد کا انتخاب کیا تھا ان میں بیگم ضیاء الحق، سابق ائیر مارشل انور شمیم اور پی آئی اے کے منیجنگ ڈائریکٹر وقار عظیم بھی شامل تھے - بے نظیر بھٹو کے منتخب کردہ وزیر برائے انسداد منشیات مظفر شاہ امریکی سفارتکاروں کے ساتھ معلومات کا تبادلہ کرتے رہے- ڈرگ مافیا نے اس صورتحال کا حل یہی سمجھا کہ کسی نہ

کسی طرح بے نظیر کو سیاست اور حکومت سے آؤٹ کردیا جائے --- لہٰذا اپوزیشن کو بے نظیر کے خلاف احتجاجی تحریک چلانے میں فنڈز کی کمی کا کبھی بھی اس سٹیج پر احساس نہ ہوا --- اپوزیشن چاہتی تھی کہ سرحد اسمبلی تڑوا کر بے نظیر بھٹو کو ایک صوبے کی حمایت سے محروم کردیا جائے - پنجاب اور بلوچستان پہلے ہی اسلامی جمہوری اتحاد کے ساتھ تھے اور سندھ میں نواز شریف نے ایم کیو ایم کے ساتھ براہ راست مذاکرات کا سلسلہ شروع کرر کھا تھا --- مرتضیٰ بھٹو اگست 1989ء میں پاکستان آنا چاہتے تھے لیکن بے نظیر نے اپنی والدہ کے ذریعے ان سے درخواست کی کہ وہ ان حالات میں پاکستان نہ آئیں --- چنانچہ بیگم نصرت بھٹو کی مداخلت کی وجہ سے مرتضیٰ نے عین وقت پر اپنی وطن واپسی کا فیصلہ موخر کیا --- تاہم انہوں نے اپنی اہلیہ غنویٰ کو 4 اگست 1989ء کو پاکستان بھجوا دیا --- بے نظیر اگست 1989ء تک افتخار سروہی کے مسئلہ پر فوج کو ناراض کرچکی تھیں جبکہ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں بننے والی سینٹ کو بھی انہوں نے غیر نمائندہ قرار دے کر عدالت میں چیلنج کر رکھا تھا- بے نظیر کے مقرر کردہ وزیر قانون افتخار گیلانی اور اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار دونوں کا موقف یہ تھا کہ 1985ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی سینٹ غیر قانونی ہے - "بے نظیر جب چاہیں افتخار سروہی کو تبدیل کرسکتی ہیں" - افتخار گیلانی نے 17 اگست 1989ء کو کہا --- اور یہ بیان دیتے وقت انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ صدر اور فوج بھی بے نظیر کے خلاف ہوگئے تو بے نظیر کے لئے اقتدار برقرار رکھنا ناممکن ہوجائے گا --- 18 اگست 1989ء کو لاہور ہائی کورٹ نے سینٹ کی تشکیل کو آئینی قرار دے دیا - جس کے بعد اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر نواز شریف نے صدر کے اختیارات کا تحفظ کرنے کے لئے اتحاد کا سربراہی اجلاس طلب کرلیا - 21 اگست 1989ء کو اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل جماعتوں کے سربراہوں بشمول ولی خاں، جتوئی، قاضی حسین احمد، غلام مصطفیٰ کھر اور نواز شریف کے سب نے طے کیا کہ بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کردی جائے --- اجلاس میں موجود تمام سیاستدانوں نے اتفاق کیا کہ عدم اعتماد کی تحریک پیش ہونے تک ہر ممکن حد تک راز داری برتی جائے - اگرچہ بے نظیر بھٹو اہم معاملات سے آگاہ رہنے کیلئے شمس الرحمٰن کلو کو جنرل حمید گل کی جگہ آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل بنوا چکی

تھیں لیکن ماتحت عملے کا تعاون میسر نہ آنے کی وجہ سے کلو بے نظیر کو تبدیل شدہ سیاسی حالات سے باخبر رکھنے میں اکثر ناکام رہتے - حتیٰ کہ آئی ایس آئی کے سینئر افسران اپنے باس کی آنکھوں میں دھول ڈال کر بے نظیر بھٹو کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے جس پر جنرل کلو نے آئی ایس آئی کے اعلیٰ افسران کو 22 اگست 1989ء کو طلب کر کے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے مجھ پر اعتماد نہیں کرنا تو میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے مستعفی ہوجاتا ہوں" --- بے نظیر کے پاس اس وقت دو راستے تھے - اول یہ کہ فوج اور اسحاق خاں کے ساتھ لڑائی کا سلسلہ جاری رکھتیں۔ دوم یہ کہ وہ صلح جوئی کا راستہ اختیار کرتیں - بہرحال بے نظیر بھٹو نے کافی غور و خوض کے بعد فوج کے ساتھ از سر نو تعلقات استوار کرنے کا آغاز کیا - 7 ستمبر 1989ء کو راولپنڈی میں لیاقت باغ میں منعقدہ ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے بے نظیر نے کہا کہ "فوج اور عوام ایک ہیں" --- اس سے اگلے روز امریکی کانگریس کی خارجہ کمیٹی کے چیئرمین سینٹر کلیول پیل نے ذرا مزید واضح الفاظ میں کہا کہ پاکستان میں بے نظیر بھٹو کو فوج سے کوئی خطرہ نہیں --- بے نظیر بھٹو کو رابرٹ اوکلے کے ذریعے اگست 1989ء کے وسط میں ہی پتہ چل گیا تھا کہ فوج میں بعض جونیئر افسران سے ناخوش ہیں - بے نظیر سے بہتر کوئی اور شخص یہ کیسے جان سکتا تھا کہ ان سے ناخوش کیوں ہیں --- انٹیلی جنس بیورو کے اعلیٰ حکام ان دنوں فوج کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی جاسوسی میں مصروف تھے - اس کی وجہ وہ اطلاع بنی جس کے ذریعے بے نظیر کو بتایا گیا تھا کہ فوج اور آئی ایس آئی کے بعض افسر پی پی پی کی حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں - انہی دنوں یہ خبریں بھی شائع ہوئیں کہ فوج میں بے نظیر کے خلاف ہونے والی بغاوت کو ناکام بنا دیا گیا ہے --- اپوزیشن اس ساری صورتحال سے بظاہر لاتعلق ہوکر اپنے مشن میں مصروف رہی--- بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لانے کی کوششیں ستمبر 1989ء میں عروج پر پہنچ گئیں جس پر اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے بے نظیر کو مشورہ دیا کہ وہ پنجاب میں گورنر راج نافذ کردیں - اس مقصد کے لئے جو چارج شیٹ تیار کی گئی تھی اس میں واضح کیا گیا تھا کہ پنجاب میں گورنر راج نافذ کرنے کی درج ذیل وجوہات ہیں (1) فوج کو مارشل لاء لگانے کی دعوت دینا (2) وفاقی ملازمین کو تذلیل کرکے صوبے سے نکالنا (3) جرائم

پیشہ افراد اور منشیات کے سمگلروں کا تحفظ کرنا (4) سرکاری وسائل کا ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرنا (5) وفاق کی اتھارٹی کو چیلنج کرنا (6) حکومتی مشینری کا صوبے میں امن عامہ کی صورتحال کو بہتر بنانے میں ناکام ہونا --- لیکن غلام اسحاق خاں ایک مرتبہ پھر نواز شریف کی مدد کے لئے میدان میں نکلے - اور انہوں نے پنجاب میں گورنر راج کی تجویز مسترد کردی۔

بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک 23 اکتوبر 1989ء کو قومی اسمبلی میں پیش کی گئی۔ قبل ازیں 20 ستمبر 1989ء کو غلام مصطفیٰ کھر نے جنرل نصیراللہ بابر' احمد سعید اعوان اور سردار فاروق لغاری کی موجودگی میں بے نظیر سے ملاقات کی - غلام مصطفیٰ کھر پی پی پی میں شامل ہونا چاہتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ پنجاب کے کاغذی شیر نواز شریف کو چند دنوں کے اندر اقتدار سے آؤٹ کرسکتے ہیں - کھر نے ہی بے نظیر کو بتایا کہ اپوزیشن نے ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کے لئے تیاریاں شروع کر رکھی ہیں اور آئی ایس آئی کے بعض افسر اسلامی جمہوری اتحاد کا ساتھ دے رہے ہیں - کھر کی اس اطلاع کی تصدیق انٹیلی جنس بیورو نے کی - کھر اس کے بعد بے نظیر بھٹو کے ساتھ بالواسطہ اور بلا واسطہ روابط میں مصروف رہے اور آخر کار 16 اکتوبر 1989ء کو انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے خلاف اعلان بغاوت کرتے ہوئے پی پی پی میں شمولیت اختیار کرلی --- بے نظیر بھٹو کو اگرچہ شک تھا کہ کھر ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں لیکن انہوں نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کھر کو ایک اہم مشن پر پنجاب بھیج دیا --- یہ مشن نواز شریف کی وزارت اعلیٰ کا خاتمہ تھا --- کھر کو نواز شریف کی جگہ وزارت اعلیٰ دینے کا قوی امکان تھا --- لیکن کھر اپنے اس مشن میں بری طرح ناکام رہے --- بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد 23 اکتوبر 1989ء کو پیش کی گئی اور اس سے اگلے روز نواز شریف کی الطاف حسین کے ساتھ کراچی میں ملاقات ہوئی --- اسی روز بے نظیر بھٹو کو ایک اور سیاسی دھچکا اس وقت لگا جب ان کی کابینہ کے ایک وزیر طارق گمسی مستعفی ہوگئے --- یہ بڑا خوفناک کھیل تھا کیونکہ اسحاق خاں کے اشارے پر جنرل مرزا اسلم بیگ نے فوج کو ریڈ الرٹ رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی نے 30 اکتوبر 1989ء کو اسحاق خاں کو خط لکھا کہ وہ ارکان اسمبلی کی اجلاس

میں شرکت کو یقینی بنائیں - 31 اکتوبر 1989ء کو بے نظیر بھٹو نے اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ سے ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ پی پی پی کسی رکن اسمبلی کو یرغمال نہیں بنائے گی --- کیونکہ نوابزادہ نصراللہ خاں نے اسحاق خاں کو ٹیلی فون کرکے خدشہ ظاہر کیا کہ بے نظیر شکست سے بچنے کے لئے دھاندلی کریں گی --- لیکن آخری لمحات میں نواز شریف نے جنرل غلام جیلانی کے کہنے پر اپنی پالیسی تبدیل کردی کیونکہ بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور ہونے کی صورت میں جتوئی باقی ماندہ مدت کے لئے وزیراعظم بن جاتے اور ابھی بے نظیر کی حکومت بنے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا --- آخری لمحات میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکمت عملی تبدیل ہوگئی - جتوئی منہ دیکھتے رہ گئے اور بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد ناکام ہوگئی - اور بے نظیر کو سب سے پہلے جنرل بیگ اور پھر اسحاق خاں نے مبارکباد دی جبکہ امریکی صدر جارج بش نے بنفس نفیس فون کرکے بے نظیر کو ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک ناکام ہونے پر مبارکباد دی --- غلام مصطفیٰ جتوئی کو 2 اکتوبر 1989ء کو پتہ چلا کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے --- تحریک عدم اعتماد کو ناکام بنانے کے لئے غلام مصطفیٰ کھر دن رات سرگرم رہے --- وہ نواز شریف کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لانا چاہتے تھے لیکن نواز شریف نے 4 نومبر 1989ء کو اسلامی جمہوری اتحاد کی پارلیمانی پارٹی کا اجلاس طلب کرکے 140 سے زائد ارکان سے "اعتماد کا ووٹ" لے لیا -

راجیو گاندھی، سارک کانفرنس، بے نظیر اور فوج

بے نظیر بھٹو کے برسراقتدار آنے سے چند ماہ قبل ہی پاکستان اور بھارت کے درمیان زبردست کشیدگی پیدا ہوچکی تھی اور دونوں ممالک کی فوجیں ریڈ الرٹ تھیں۔ دونوں ممالک کے درمیان جاری سفارتی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ایک دوسرے کے سفارتکاروں پر جاسوسی کے الزامات عائد کرکے انہیں ملک چھوڑ جانے کا حکم دے دیا۔ سفارتی آداب کو پامال کرتے ہوئے پاکستان کے فوجی اتاشی بریگیڈیئر ظہیر الاسلام عباسی کو تشدد کا نشانہ بنا کر ملک سے نکال دیا --- اس قسم کی فضا میں بھارت کے ساتھ دوستی کی بات کرنا جرم تھا اور فوج راجیو گاندھی سے سخت نالاں تھی - راجیو گاندھی اس وقت بھارت کے وزیراعظم تھے - بے نظیر کے وزیراعظم بننے پر راجیو نے جس "محبت اور خلوص" کے ساتھ بے نظیر کو مبارکباد کا پیغام بھجوایا اس سے غلام اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ کے ذہن میں شکوک پیدا ہوگئے - لہٰذا بے نظیر کے وزیراعظم بننے کے بعد آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جنس کو خصوصی طور پر ہدایت جاری کی گئی کہ وہ بے نظیر بھٹو اور ان کے ساتھیوں کے بھارتی سفارت کاروں کے ساتھ روابط پر کڑی نظر رکھیں۔ گویا بے نظیر بھٹو کو وزارت اعظمیٰ کا منصب دے کر بھی سیکورٹی رسک سمجھا گیا۔ بے نظیر صرف نام کی وزیراعظم نہیں بننا چاہتی تھیں بلکہ وہ اپنے والد کی طرح اپنے آپ کو ایک بااختیار وزیراعظم کہلوانے کے لئے بے چین تھیں - بے نظیر کی پہلی آزمائش ان کے وزیراعظم بننے کے 2 ہفتے بعد ہی شروع ہوگئی کیونکہ 15 دسمبر 1988ء کو انہیں بتایا گیا کہ 29 اور 30 دسمبر 1988ء کو پاکستان میں چوتھی سارک سربراہی کانفرنس منعقد ہوگی جس میں سارک ممالک کے سربراہان مملکت شرکت کریں گے اور

بھارت سے نمائندگی کے لئے راجیو گاندھی اسلام آباد آئیں گے - چنانچہ بے نظیر بھٹو نے کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں بہتر انتظامات کرنے کے احکامات جاری کردیئے - آئی ایس آئی چاہتی تھی کہ راجیو گاندھی کی سیکورٹی کا انتظام کرنے کا فرض اسے سونپا جائے جبکہ راجیو گاندھی نے 25 دسمبر 1988ء کو بے نظیر کو پیغام بھیج دیا کہ ان کی حفاظت کے لئے انتظامات وغیرہ ان کا اپنا حفاظتی عملہ کرے گا - راجیو گاندھی کا یہ مطالبہ جائز نہ تھا کیونکہ انکی حفاظت پاکستان کی ذمہ داری تھی - تاہم بے نظیر نے راجیو گاندھی کی شرط منظور کرلی اور 29 دسمبر 1988ء کو جب راجیو گاندھی اسلام آباد ائرپورٹ پر اترے تو وہاں عجیب تماشا ہوا - سیکورٹی کا کنٹرول بھارتی کمانڈوز کے ہاتھ میں تھا جبکہ پاکستانی سیکورٹی حکام بے بسی کی تصویر بنے نظر آرہے تھے - راجیو گاندھی دراصل آئی ایس آئی سے خوف زدہ تھے کیونکہ اگر ان کی حفاظت کا انتظام آئی ایس آئی کے پاس ہوتا تو اس سے ان کی کوئی بھی سرگرمی خفیہ نہ رہ پاتی --- سارک کانفرنس کے موقع پر راجیو گاندھی نے کشمیر کو متنازعہ علاقہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا بلکہ انہوں نے اس کو "مردہ مسئلہ" قرار دیا --- راجیو گاندھی اور بے نظیر بھٹو نے 30 دسمبر 1988ء کو مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے تجویز کیا کہ دونوں ممالک اپنے فوجی اخراجات کم کرلیں- یہ ایک ایسی تجویز تھی جس نے افواج پاکستان کو بے نظیر سے بدظن کردیا کیونکہ بے نظیر بھارت کے ساتھ دوستی کی امیدیں لگاکر بیٹھ گئی تھیں جبکہ فوج کی فلاسفی یہ تھی کہ بھارت سے ہماری دوستی کبھی ہو ہی نہیں سکتی - بے نظیر اور راجیو گاندھی کے درمیان ہونے والی ملاقاتوں کو آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جنس نے "Bug" کیا اور دونوں رہنماؤں کے درمیان ہونے والی گفتگو اسحاق خاں اور جرنیلوں تک پہنچا دی گئی --- بے نظیر بھٹو نے راجیو گاندھی کے ساتھ 4 معاہدوں پر دستخط کئے جن میں سرفہرست ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ شامل تھا جبکہ باقی معاہدے دو طرفہ تجارت اور ثقافت کو فروغ دینے سے متعلق تھے -

مرکز پنجاب محاذ آرائی

بے نظیر بھٹو جب جلا وطنی کی زندگی گزارنے کے بعد 10 اپریل 1986ء کو پاکستان آئیں تو انہیں یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ ان کے مقابلے میں کوئی بڑی اپوزیشن جماعت موجود نہیں ہے - جماعت اسلامی کے مولانا طفیل محمد' تحریک استقلال کے اصغر خاں' جے یو آئی کے مولانا فضل الرحمٰن' اے این پی کے ولی خاں' پی ڈی پی کے نوابزادہ نصراللہ خاں اور مسلم لیگ کے پیرپگاڑا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ضیاء الحق سے قدرے دور ہوچکے تھے - چوٹی کے اپوزیشن رہنماؤں میں ضیاء الحق کے جانشین نواز شریف کا کہیں ذکر ہی نہ تھا - اس لئے بے نظیر بھٹو نے اپنی تمام تر توجہ اپنے باپ کے دشمنوں کو دوست بناکر ان سے بدلہ لینے میں صرف کردی --- بے نظیر نے کمال ہوشیاری سے ضیاء الحق کے مارشل لاء کا موجب بننے والے سیاستدانوں کو ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا شروع کردیا --- لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عوامی رابطہ مہم کچھ اس انداز میں شروع کی کہ ایم آر ڈی کا وجود پی پی پی کے بغیر بے معنی ہوکر رہ گیا --- وہ سیاستدان جو پیپلز پارٹی میں رہتے ہوئے ان کے لئے خطرے کا باعث بن سکتے تھے انہیں بے نظیر نے سائیڈ لائن کردیا --- بے نظیر کی اس منصوبہ بندی کا شکار ہونے والوں میں جتوئی' ممتاز بھٹو' عبدالحفیظ پیرزادہ' مولانا کوثر نیازی' معراج محمد خاں' مبشر حسن اور غلام مصطفیٰ کھر شامل تھے - ان کی جگہ بے نظیر نے جہانگیر بدر اور سردار فاروق لغاری جیسے ارکان کو دینا شروع کردی - بے نظیر بھٹو پنجاب میں آہستہ آہستہ قدم جمانے کے لئے کوشاں رہیں لیکن میاں نواز شریف نے غیر محسوس انداز میں ان کے خلاف ہر سطح پر کانٹے بونے شروع کردیئے - 1987ء میں بے نظیر کو احساس ہوگیا تھا کہ

میاں نواز شریف مستقبل میں ان کے لئے خطرہ بنیں گے - اس لئے انہوں نے نواز شریف کا توڑ نکالنے کے لئے مخدوم الطاف جیسے سیاستدانوں کے ساتھ روابط شروع کردیئے جو مسلم لیگ میں ہوتے ہوئے بھی نواز شریف کے خلاف تھے - 1988ء کے انتخابات کے موقع پر نواز شریف نے بے نظیر کو زچ کر کے رکھ دیا کیونکہ پنجاب میں بے نظیر کو 94 اور آئی جے آئی کو 108 نشستیں ملی تھیں اور آزاد ارکان کی آئی جے آئی میں شمولیت سے نواز شریف کی پوزیشن مستحکم ہوگئی تھی۔ 1988ء کے آخری دنوں میں صورتحال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ نواز شریف کے جلسوں میں "وزیراعظم نواز شریف" کے نعرے لگنا شروع ہو گئے --- 1988ء کے انتخابات کے بعد بے نظیر نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ پنجاب میں ان کی حکومت قائم ہوجائے اور سردار فاروق احمد خاں لغاری نے وزارت اعلیٰ کا منصب حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا لیکن نواز شریف کے سامنے ڈیرہ غازی خاں کے سردار فاروق لغاری کی ایک نہ چلی اور وزارت اعلیٰ کے منصب کے حصول سے مایوس ہو کر فاروق لغاری آخرکار مرکز میں چلے گئے جہاں بے نظیر نے انہیں پانی و بجلی کا وفاقی وزیر بنا دیا - بے نظیر کے دور حکومت کے ابتدائی دنوں میں ہی مرکز اور پنجاب (بے نظیر اور نواز شریف) کے درمیان سخت محاذ آرائی شروع ہوگئی - بے نظیر کو چاہئے تھا کہ وہ صوبے میں اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے نواز شریف کو وزیراعلیٰ مان لیتیں کیونکہ وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور پنجاب بھی پاکستان کا ہی حصہ تھا - نواز شریف کا تعلق بھارت یا اسرائیل سے نہ تھا کہ بے نظیر ان کے ساتھ چل نہ سکتی تھیں - لیکن اپنے والد کی طرح ضدی اور خود سر بے نظیر نے سوچے سمجھے بغیر پنجاب پر چڑھائی کر دی اور انہیں منہ کی کھانی پڑی - پنجاب میں بے نظیر کی ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے پیپلز پارٹی غیر مقبول ہوتی چلی گئی اور نواز شریف کی مقبولیت کا گراف اوپر جاتا چلا گیا - نواز شریف کو قومی سطح کا لیڈر بنانے میں 100 فیصد بے نظیر کا ہاتھ تھا اور نواز شریف کو اس مہربانی کے لئے عمر بھر محترمہ کا احسان مند رہنا چاہئے - اگر بے نظیر عقل سے کام لیتیں اور صوبے کے امور میں مداخلت نہ کرتیں تو عوام کا جھکاؤ مارشل لاء لگانے والے ضیاء الحق کے حواریوں کی طرف قطعاً" نہ ہوتا -

بے نظیر بھٹو جوں جوں نواز شریف کو وزارت اعلیٰ سے محروم کرنے کے لئے توانائی ضائع کرتی چلی گئیں توں توں نواز شریف عوام میں مقبول ہوتے چلے گئے - بے نظیر نے ریاستی قوت کے بل بوتے پر وفاق کے ملازمین کے ذریعے پنجاب پر قبضہ کرنے کی کئی مرتبہ غلطی کی لیکن فوج اور اسحاق خاں کا تعاون میسر ہونے کی وجہ سے نواز شریف نے یہ تمام وار خالی کردیئے --- بے نظیر پنجاب آئی جی پولیس اور چیف سیکرٹری کی اپنی مرضی کے تحت تعیناتی کے ذریعے صوبے پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں لیکن دسمبر 1988ء میں نواز شریف نے وفاق کے وار خالی کرتے ہوئے اپنی مرضی کے افسروں کو اہم عہدوں پر تعینات کردیا - اپنی چالوں میں ناکام ہونے کے بعد بے نظیر نے 24 دسمبر 1988ء کو نواز شریف کو پیغام بھیجا کہ وہ 26 دسمبر 1988ء کو لاہور میں ان سے ملاقات کریں گی - نواز شریف نے اسلامی جمہوری اتحاد کے رہنماؤں سے صلاح و مشورے اور ان دیکھی قوتوں سے رائے لینے کے بعد بے نظیر کا استقبال کرنے کا فیصلہ کر لیا - بے نظیر اگر خلوص دل کے ساتھ پنجاب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتیں تو ان کی حکومت شاید اتنی جلدی ختم نہ ہوتی لیکن دلوں میں موجود نفرتیں ایسی ملاقاتوں سے ختم نہ ہوسکیں - بے نظیر نے لاہور میں 26 دسمبر 1988ء کو نواز شریف سے ملاقات کی - سیاسی حلقوں میں اس ملاقات کی بہت اہمیت تھی کیونکہ پنجاب اور مرکز کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کی وجہ سے صوبے میں ترقیاتی کام رک گئے تھے - لیکن آخر کار وہی ہوا جس کا خدشہ تھا - ایک طرف بے نظیر نے نواز شریف کو بھائی بنایا اور ان کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا تو دوسری طرف انہوں نے پنجاب اسمبلی میں نواز شریف کے خلاف فارورڈ بلاک بنانے کے لئے رابطوں میں تیزی پیدا کردی --- یہی وجہ ہے کہ نواز شریف نے بھی بے نظیر کے خلاف اعلان جنگ کردیا - انہوں نے وولر بیراج' پانی کی تقسیم' این ایف سی ایوارڈ' پیپلز ورکس پروگرام اور سرکاری ملازموں کی تعیناتی جیسے حساس معاملات کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے ملکی سطح پر بے نظیر کے خلاف ایسی تحریک چلائی کہ جنوری 1989ء میں ہی افواہیں پھیلنا شروع ہوگئیں - ملک میں مارشل لگنے والا ہے۔

بے نظیر بھٹو، بلوچستان اور سیاسی بحران

1988ء کے انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلیوں نے ابھی زندگی کی بتدائی بہاریں بھی نہیں دیکھی تھیں کہ 15 دسمبر 1988ء کو اچانک وزیراعظم بے نظیر بھٹو کو اطلاع ملی کہ گورنر بلوچستان موسیٰ خاں نے وزیراعلیٰ ظفراللہ جمالی کے کہنے پر بلوچستان اسمبلی توڑ دی ہے - بے نظیر بھٹو کی حکومت کو ملنے والا یہ سب سے پہلا مگر بہت بڑا دھچکا تھا کیونکہ بلوچستان میں جوڑ توڑ کا عمل جاری تھا اور بے نظیر توقع کررہی تھیں کہ بلوچستان میں بھی ان کی حکومت قائم ہوجائے گی - بے نظیر بھٹو کی بلوچستان میں مخلوط حکومت بنانے کی خواہش ضرور تھی لیکن ابھی انہوں نے بلوچستان پر چڑھائی نہیں کی تھی - گورنر موسیٰ خاں کی طرف سے 15 دسمبر 1988ء کی سہ پہر جاری ہونے والے حکم میں کہا گیا کہ "بلوچستان اسمبلی کو وزیراعلیٰ جمالی کی سفارش پر آئین کے آرٹیکل 112 (1) کے مطابق توڑا گیا ہے کیونکہ صوبے میں حالات ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ کسی بھی حکومت کا برسر اقتدار رہ کر حکومت کو چلانا مشکل تھا --- ظفراللہ جمالی اسمبلی توڑنے کی سفارش لے کر گورنر کے پاس پہنچے اور گورنر نے اسمبلی توڑ دی - بلوچستان اسمبلی توڑنے کا اقدام خالصتاً" اسحاق خاں اور گورنر بلوچستان موسیٰ خاں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا - مسئلہ یہ تھا کہ صدارتی انتخابات سے قبل اسحاق خاں نے گورنر بلوچستان موسیٰ خاں کو کہا تھا کہ وہ انہیں صدارتی الیکشن میں کامیاب کرانے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں --- گورنر موسیٰ خان نے ارکان اسمبلی کو ایک ایک کرکے بلاکر اسحاق خاں کے حق میں ووٹ ڈالنے کی سفارش کی لیکن اس کے باوجود صدارتی الیکشن ہوئے تو بلوچستان اسمبلی کے 42 ارکان میں سے 28 نے نواب زادہ نصراللہ خاں

کے حق میں ووٹ ڈالا جبکہ اسحاق خاں کو 15 ووٹ ملے جبکہ ایک ووٹ مسترد ہوگیا - اگرچہ بے نظیر بھٹو کو بلوچستان میں صرف دو ارکان کی حمایت حاصل تھی لیکن اس کے باوجود وہ مسلسل کوشاں رہیں کہ مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علماء اسلام کے ساتھ ان کا معاہدہ ہوجائے - دلی طور پر تو بے نظیر بھی اسحاق خاں سے نالاں تھیں لیکن وزارت اعظمیٰ کا منصب حاصل کرنے کے لئے انہیں اسحاق خاں کو قبول کرنا ہی پڑا - صدارتی الیکشن میں مولانا فضل الرحمٰن نے کھل کر نوابزادہ نصراللہ خاں کی حمایت کی - حتیٰ کہ صدارتی امیدوار کے لئے نوبزادہ نصراللہ خاں کا نام بھی مولانا فضل الرحمٰن کی پارٹی نے ہی تجویز کیا تھا --- نواب اکبر بگتی نے بھی اسحاق خاں کے مقابلے میں نوابزادہ نصراللہ خاں کا ساتھ دیا جبکہ پی این پی اور پشتونخواہ سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی بھی اسحاق خاں کے خلاف تھے - ان حالات میں اسحاق خاں کا بلوچستان سے ناراض ہوجانا فطری عمل تھا --- بلوچستان کے گورنر موسیٰ خاں بھی اسحاق خاں کو کم ووٹ ملنے کی وجہ سے پریشان تھے اور وہ اس کی تلافی کرنے کے لئے مختلف بہانے ڈھونڈ رہے تھے - کہ 15 دسمبر 1988ء کو انہیں اطلاع ملی کہ مولانا فضل الرحمٰن کا بلوچستان نیشنل الائنس اور پختونخواہ ملی عوامی اتحاد کے ساتھ شراکت اقتدار کے لئے سمجھوتہ ہو چکا ہے اور صبح 9 بجے نواب اکبر بگتی اور مولانا فضل الرحمٰن ایک پریس کانفرنس کے ذریعے اس معاہدے کی تفصیلات بتانے والے ہیں لیکن گورنر موسیٰ خاں نے رات کے تین بجے وزیراعلیٰ ظفراللہ جمالی کو طلب کرکے انہیں اسمبلی توڑنے کے لئے تیار کی گئی دستاویز پر دستخط کرنے کے لئے کہا کیونکہ اسحاق خاں چاہتے تھے کہ بلوچستان اسمبلی کو وزیراعلیٰ کی سفارش پر توڑا جائے - وگرنہ دوسری صورت میں اسحاق خاں کے پاس بھی اختیار تھا کہ وہ گورنر موسیٰ کو اسمبلی توڑنے کا حکم جاری کردیتے - بلوچستان اسمبلی توڑنے کی اطلاع اپوزیشن پر بجلی بن کر گری کیونکہ زیادہ تر رہنماؤں کو علم ہی نہیں تھا کہ بلوچستان اسمبلی تڑوانے کے پیچھے ہاتھ کس کا ہے - میاں نواز شریف نے بلوچستان اسمبلی توڑے جانے کے خلاف لائحہ عمل اختیار کرنے کے لئے اسلامی جمہوری اتحاد سے تعلق رکھنے والے ارکان قومی اسمبلی اور سینیٹروں کا اجلاس طلب کرلیا--- اور کافی بحث کے بعد وسیم سجاد، چوہدری شجاعت حسین، غلام حیدر وائیں اور ملک نعیم خاں کی تجاویز سے اتفاق

کرتے ہوئے نواز شریف نے کہا کہ "ہم بلوچستان اسمبلی کی بحالی تک قومی اسمبلی کے سیشن کا بائیکاٹ کریں گے" - جبکہ گورنمنٹ ہاسٹل اسلام آباد میں بلوچستان نیشنل الائنس، اے این پی، پی ڈی پی اور بعض آزاد ارکان نے بلوچستان کی صورتحال پر غور کے بعد قومی اسمبلی کے بجٹ سیشن کا بائیکاٹ کرکے بلوچستان اسمبلی کی بحالی کے لئے قانونی جنگ لڑنے کا اعلان کردیا --- بے نظیر بھٹو بلوچستان میں مستحکم حکومت کے قیام کے لئے تمام جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار تھیں۔ اس تمام صورتحال پر بے نظیر بھٹو کا رد عمل نہایت معنی خیز تھا - انہوں نے کہا "بلوچستان اسمبلی توڑنے کا فیصلہ کرتے وقت گورنر موسیٰ خاں نے ان سے مشورہ نہیں کیا - شاید اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ گورنر کا مجھ سے مشورہ کرنا آئینی ضرورت نہ تھی - بہرحال گورنر بلوچستان ایک غیر سیاسی آدمی ہیں - اگر وہ سیاسی آدمی ہوتے تو بلوچستان کی صورتحال پر غور کرتے لیکن انہوں نے وزیراعلیٰ کے کہنے پر اسمبلی توڑ دی - میں نے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار سے بات چیت کی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ وزیراعلیٰ کی طرف سے مشورہ دیئے جانے کے بعد گورنر کے پاس اسمبلی توڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا --- ویسے بھی میں سمجھتی ہوں کہ بلوچستان کی صورتحال کافی متنازعہ تھی کیونکہ وہاں کسی ایک سیاسی جماعت کو برتری حاصل نہ تھی - بہتر تو یہی تھا کہ بلوچستان اسمبلی کے اجلاس میں معاملات حل کئے جاتے اور اس مقصد کے لئے بلوچستان نیشنل الائنس اور جمعیت علمائے اسلام والے اسمبلی کا اجلاس طلب کرسکتے تھے - مجھے کل رات (14 دسمبر) تک اسمبلی ٹوٹنے کی خبر نہ تھی --- آج صبح دفتر پہنچنے پر 9 بجے مجھے یہ اطلاع ملی کہ گورنر بلوچستان نے اسمبلی توڑ دی ہے - حقیقت یہی ہے کہ ہم بلوچستان کے معاملات میں بالکل غیر جانبدار تھے - اگر بلوچستان میں میری حکومت ہوتی اور ارکان کو وزیراعلیٰ سے شکایت ہوتی تو میں اس کا سیاسی بنیاد پر حل نکال لیتی لیکن بلوچستان میں ایسی صورتحال نہ تھی --- اس ساری صورتحال کے ذمہ دار شخص گورنر موسیٰ خاں نے نہایت اطمینان کے ساتھ اسمبلی توڑنے کے بعد اسلام آباد میں 15 دسمبر 1988ء کی دوپہر پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اقرار کیا کہ "اسمبلی آئین کے مطابق توڑی گئی ہے اور ایسا کرنے سے پہلے میں نے اسحاق خاں یا بے نظیر کو اعتماد میں نہیں لیا تھا" - بلوچستان کی اصل صورتحال یہ تھی

کہ 14 دسمبر 1988ء کو مولانا فضل الرحمٰن نے بے نظیر بھٹو کو کہا کہ اگر ان کی جماعت دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر بلوچستان کے وزیراعلیٰ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لائے تو ان کا کیا رد عمل ہوگا؟ اس پر بے نظیر نے مولانا فضل الرحمٰن سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر بلوچستان میں حکومت بنانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے - ظفر اللہ جمالی کو سپیکر کا کاسٹنگ ووٹ لے کر منتخب کیا گیا تھا اور اس قدر نازک صورتحال می منتخب ہونے والے وزیراعلیٰ کے لئے ایوان کو چلانا کوئی آسان کام نہ تھا - جمالی کی وزارت میں شامل ہونے والے تمام ارکان پسندیدہ وزارت چاہتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایک محکمہ صرف ایک ہی رکن کو مل سکتا تھا - یہی مسئلہ جمالی کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اختلافات کا باعث بنا - جمالی نے مولانا فضل الرحمٰن کے ذریعے اپنی حکومت مضبوط کرنے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن نواب اکبر بگٹی اور مولانا فضل الرحمٰن نے انہیں بطور وزیراعلیٰ تسلیم کرنے سے انکار کردیا --- جمالی ایک طرف مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ مل کر حکومت سازی کی کوششوں میں مصروف رہے جبکہ دوسری طرف ان کا پی پی پی کی طرف جھکاؤ بھی برقرار رہا --- جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ روابط رکھنے کی پاداش میں محمد خاں جونیجو نے جمالی کو 15 دسمبر 1988ء کو مسلم لیگ سے خارج کردیا - بقول اقبال احمد خاں "1988ء کے الیکشن کے بعد جمالی کا کردار مشکوک رہا" --- گورنر موسیٰ خاں نے اسمبلی توڑنے کے بعد جمالی کو بطور نگران وزیراعلیٰ کام کرنے کی اجازت دے کر اس بات کا اعتراف کرلیا کہ وہ غیر جانبدار نہیں ہیں - کیونکہ 30 نومبر 1988ء کو بننے والی اسمبلی کو 15 دسمبر 1988ء کو توڑ دینا کوئی دانش مندانہ کام نہ تھا - بلوچستان اسمبلی بھی دوسری اسمبلیوں کی طرح 30 نومبر 1988ء کو معرض وجود میں آئی تو اسی روز خواتین کی مخصوص نشستوں پر انتخاب ہوا جس کے نتیجے میں ایک نشست پی پی پی کی رضیہ بی بی اور دوسری بلوچستان نیشنل الائنس کو ملی - اور اس طرح اسمبلی میں اسلامی جمہوری اتحاد، پی پی پی، پاکستان نیشنل پارٹی اور آزاد ارکان پر مشتمل پارلیمانی گروپ قائم ہوئے - پی پی پی کے رکن سردار باروزئی اسمبلی کے سپیکر اور اسلامی جمہوری اتحاد کے عبدالمجید بزنجو ڈپٹی سپیکر منتخب ہوئے - جمالی کو بے نظیر نے 2 دسمبر 1988ء کو اسلام آباد طلب کرکے کہا تھا کہ وہ پی پی پی کے ساتھ اتحاد کرکے وزیراعلیٰ بن

جائیں - اس پیشکش کو منظور کرنے سے قبل جمالی نے جونیجو سے مشورہ نہیں کیا تھا - اور بے نظیر کی پیشکش قبول کرنے کے بعد جمالی نے جب جونیجو کی خدمت میں حاضری دی تو جونیجو بولے "سب کچھ طے کرنے کے بعد مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے" --- جمالی چاہتے تھے کہ جونیجو انہیں قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف مقرر کردیں جس کے بدلے میں وہ بلوچستان میں حکومت سازی سے باز رہیں گے لیکن اسلامی جمہوری اتحاد اور مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے جمالی کی اس تجویز سے اتفاق نہ کیا - 2 دسمبر 1988ء کو جب وزیراعلیٰ کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو ایوان میں سپیکر سمیت 43 ارکان موجود تھے - جمالی کو 21 ووٹ ملے اور ان کے مخالف امیدوار کو ملنے والے ووٹوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی جس پر سپیکر جس کا تعلق پی پی پی کے ساتھ تھا نے کاسٹنگ ووٹ جمالی کے حق میں ڈال کر انہیں وزیراعلیٰ بنوادیا --- ظفراللہ جمالی کا وزیراعلیٰ بننا جونیجو اور نواز شریف دونوں کے لئے باعث حیرت تھا کیونکہ انہیں امید نہیں تھی کہ وہ یہ منصب حاصل کرسکیں گے - لیکن اپنی جماعت کے رہنما کے انتخاب پر انہوں نے خوشی کا اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مظاہرہ کیا - نواب اکبر بگٹی اور مولانا فضل الرحمٰن کی دن رات کوششوں پر جمالی کی کامیابی سے پانی پھر گیا --- وہ سپیکر باروزئی سے بھی ناراض تھے کیونکہ سپیکر نے کاسٹنگ ووٹ کا استعمال کرتے وقت بے نظیر بھٹو کے مشورے کی پابندی کی تھی حالانکہ جمہوری روایات کے تحت انہیں جماعت کے نامزد کردہ شخص کے حق میں کاسٹنگ ووٹ نہیں دینا چاہئے تھا - جمالی نے 5 دسمبر 1988ء کو 8 رکنی کابینہ کا اعلان کیا - ان کی کابینہ میں 4 وزراء کا تعلق اسلامی جمہوری اتحاد' 2 کا پی پی پی اور 2 کا آزاد ارکان سے تھا - جمالی نے بیک وقت بے نظیر اور اسلامی جمہوری اتحاد دونوں کو قابو کئے رکھا - بے نظیر بھٹو بہت سمجھدار سیاستدان تھیں - وزارت اعظمیٰ کا منصب پاس ہونے کی وجہ سے انہیں بلوچستان کی تازہ ترین صورتحال سے لحہ بہ لحہ آگاہ کیا جارہا تھا - انہیں بخوبی علم تھا کہ جمالی کی حکومت خطرے میں ہے - جس پر بے نظیر نے جمالی سے کہا کہ وہ مولانا فضل الرحمٰن کو خوش کریں - جس پر ظفراللہ جمالی نے 12 دسمبر 1988ء کو مولانا فضل الرحمٰن سے مذاکرات کئے - حقیقت یہ تھی کہ جمالی کو ایوان میں اکثریت کا تعاون حاصل نہیں تھا کیونکہ ان کے پاس صرف 21 ارکان موجود

تھے جبکہ ان کے مخالفین کے ووٹوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی - ان حالات میں نہ تو اسمبلی میں قانون سازی ہوسکتی تھی اور نہ ہی ایوان کو بہتر طور پر چلایا جاسکتا تھا - اس ساری صورتحال کا اسحاق خاں بڑے غور سے جائزہ لے رہے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ موجودہ اسمبلی کو فارغ کروا کر نئے الیکشن کروا دیئے جائیں - گورنر موسیٰ خاں کا وزیراعلیٰ جمالی کے ساتھ مسلسل رابطہ تھا - ان حالات میں آئیڈیل تو یہی تھا کہ جمالی دوبارہ اعتماد کا ووٹ لیں لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ ان کی کابینہ کے ایک رکن دوست محمد حسنی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا --- جس کے بعد جمالی کے ووٹوں کی تعداد 20 رہ گئی اور نواب اکبر بگٹی اور مولانا فضل الرحمٰن کی حمایت یافتہ حکومت کے قیام کے روشن امکانات پیدا ہوگئے - ان حالات میں جب جمہوریت کا پودا ابھی نیا تھا جمالی نے صرف اور صرف اپنے اقتدار کی خاطر اسمبلی کی قربانی دے دی۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خلاف بلوچستان اسمبلی توڑ کر ایک سازش کی گئی تھی جس کا کئی ماہ بعد بے نظیر کو احساس ہوا - بلوچستان اسمبلی توڑنے کے خلاف اپوزیشن نے قومی اسمبلی کے بجٹ سیشن کا بائیکاٹ کردیا تو بے نظیر نے نوابزادہ نصراللہ خاں' جتوئی' غلام حیدر وائیں' اور مولانا فضل الرحمٰن سے ملاقاتوں کے لئے اعتزاز احسن کو فرائض سونپ دیئے جو اس وقت بے نظیر کی کابینہ میں وزیر قانون کے عہدہ پر فائز تھے - اعتزاز احسن قسمیں اٹھا اٹھا کر اپوزیشن کے رہنماؤں کو یقین دلاتے رہے کہ بلوچستان اسمبلی تڑوانے میں بے نظیر کا ہاتھ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اپوزیشن لیڈر بجٹ سیشن کا بائیکاٹ ختم کرنے پر تیار نہ ہوئے --- اسلامی جمہوری اتحاد کا مطالبہ تھا کہ جمالی اور ان کی نگران کابینہ کو فوری طور پر فارغ کرکے غیر جانبدار وزیراعلیٰ کا تقرر کیا جائے - جس پر بے نظیر نے گورنر موسیٰ خاں کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپوزیشن کے مشورے کے مطابق کسی غیر متنازعہ شخص کو نگران وزیراعلیٰ نامزد کروالیں --- لیکن گورنر موسیٰ خاں نے وزیراعظم بے نظیر کے احکامات کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا - جس پر بے نظیر بھٹو نے مولانا فضل الرحمٰن کو کہا کہ "مولانا! آپ بلوچستان اسمبلی توڑنے کے خلاف عدالت میں جائیں ہم آپ کی عدالت میں مخالفت نہیں کریں گے" --- بلوچستان اسمبلی ٹوٹنے کے دو روز بعد بے نظیر نے 17 دسمبر 1988ء کو اسحاق خاں سے دن میں 2 مرتبہ ملاقات

کی - بے نظیر نے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار اور وزیر قانون اعتزاز احسن کی موجودگی میں اسحاق خاں سے مذاکرات کئے اور انہیں بلوچستان میں وزیراعلیٰ تبدیل کرانے کا مشورہ دیا - جس پر اسحاق خاں نے کہا کہ "میں آئینی امور کے ماہرین سے مشورے کے بعد آپ کو اپنے فیصلوں سے آگاہ کروں گا" ---

بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت (90-1988ء) کے ابتدائی ایام میں جب بلوچستان میں اسمبلی توڑ دی گئی اور اپوزیشن کی طرف سے بلوچستان اسمبلی کی بحالی کے مطالبے نے زور پکڑنا شروع کیا تو بے نظیر نے مولانا فضل الرحمٰن کو کہا "مولانا! آپ بلوچستان اسمبلی کی بحالی چاہتے ہیں؟" --- جواباً" مولانا فضل الرحمٰن نے گردن اور داڑھی کو اثبات میں ہلایا - "تو پھر میرا ساتھ دیں" --- بے نظیر گویا ہوئیں --- بے نظیر بھٹو نے یہی بات نوابزادہ نصراللہ سے بھی کہی جو صدارتی الیکشن میں پی پی پی کا تعاون نہ ملنے کی وجہ سے بے نظیر سے ناراض تھے - بے نظیر نے 18 دسمبر 1988ء کو نوابزادہ نصراللہ خاں' مولانا فضل الرحمٰن اور نواب اکبر بگٹی کے سامنے ایک نکاتی فارمولہ رکھا یعنی 1973ء کے آئین کی اس کی اصل حالت میں بحالی - بے نظیر چاہتی تھیں کہ اپوزیشن 8 ویں ترمیم ختم کرنے میں ان کا ساتھ دے اور جواباً" حکومت پارلیمنٹ میں ایسا مسودہ قانون پیش کردے گی جس سے بلوچستان اسمبلی بحال ہوجائے گی - اسلامی جمہوری اتحاد کی مرکزی قیادت کو اس تجویز پر ہاں کہنے کی جرات اور ہمت نہ ہوسکی کیونکہ اس کی تو تمام سیاست ہی ایوان صدر کے اردگرد گھوم رہی تھی - مولانا فضل الرحمٰن نے بے نظیر کو کہا کہ آپ پہلے بلوچستان اسمبلی کی بحالی کے لئے ترمیمی بل پارلیمنٹ میں پیش کریں - اگر اسمبلی بحال ہوگئی تو ہم آپ کے ساتھ مزید تعاون پر غور کریں گے - حکومت کے اپوزیشن کے ساتھ ہونے والے ان مذاکرات سے اسلامی جمہوری اتحاد نے اسحاق خاں کو لحہ بہ لحہ باخبر رکھا - جب بے نظیر نے اپوزیشن کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی تو اسحاق خاں کے کان کھڑے ہوگئے اور انہوں نے 18 دسمبر 1988ء کی دوپہر اچانک اعتزاز احسن کو ایوان صدر طلب کیا - اسحاق خاں کی اعتزاز احسن کے ساتھ ایک بجکر 15 منٹ پر ملاقات ہوئی --- صدر مملکت اسحاق خاں سخت برہم تھے لیکن انہوں نے اپنا ناراضگی کا اظہار بڑھکیں لگاکر نہیں کیا - بلکہ وہ آئینی امور

پر ایک منجھے ہوئے قانون دان کی طرح اعتزاز احسن کے ساتھ بات چیت کرتے رہے جو دراصل بے نظیر کے نمائندے کی حیثیت سے ایوان صدر میں موجود تھے - اسحاق خاں کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ بے نظیر آئین میں "غیر آئینی ترامیم" سے باز رہیں - بلوچستان اسمبلی ٹوٹنے کے بعد صوبے میں سنگین مالی بحران پیدا ہوگیا تھا کیونکہ آئین کے مطابق برطرف شدہ اسمبلی مالیاتی اخراجات کی منظوری نہیں دے سکتی تھی جبکہ نگران حکومت کو بھی بجٹ منظور کرنے کا اختیار نہ تھا جس پر اسحاق خاں نے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کے ذریعے سپریم کورٹ میں ایک ریفرنس دائر کیا - سپریم کورٹ نے اس ریفرنس پر فیصلہ کرتے ہوئے حکومت کو بلوچستان کے فنڈز سے اخراجات کی اجازت دے دی - بلوچستان کا مسئلہ جب شدت اختیار کرگیا اور بے نظیر نے اپنی توپوں کا رخ چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسحاق خاں کی طرف کردیا تو اسحاق خاں نے بھی بڑی سرعت کے ساتھ اپنے گھوڑے دوڑانے شروع کردیئے - انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں نواز شریف کو بے نظیر کے ساتھ لڑوا دیا --- بے نظیر بھٹو نے جب دیکھا کہ بلوچستان میں ہونے والی سازشوں کا سلسلہ پنجاب تک پھیل گیا ہے تو انہوں نے 21 دسمبر 1988ء کو نوابزادہ نصراللہ خاں' ولی خاں اور مولانا فضل الرحمٰن کو پرائم منسٹر سیکرٹریٹ میں آنے کی دعوت دی - ان تین اپوزیشن رہنماؤں نے ایک وفد کی شکل میں بے نظیر سے مذاکرات کئے - بے نظیر کی اس موقع پر معاونت کرنے والوں میں ملک معراج خالد' نصیراللہ بابر' اعتزاز احسن' فاروق لغاری' ملک قاسم اور راؤ رشید تھے - بے نظیر نے 21 دسمبر 1988ء کو اپوزیشن رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کے دوران کھل کر کہا کہ "اسحاق خاں نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں - آپ میرے ہاتھ مضبوط کریں اور 8 ویں ترمیم ختم کرنے میں میری مدد کریں - اس کے جواب میں میں بلوچستان اسمبلی کو بحال کروا دوں گی" --- بے نظیر نے واضح کیا کہ وہ جمالی کی حمایت نہیں کریں گی - "میں نے اسحاق خاں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ جمالی کی جگہ غیر جانبدار شخص کو وزیراعلیٰ نامزد کروائیں" --- اسی روز بے نظیر نے کہا کہ خدا بخش مری 22 دسمبر 1988ء کو کراچی میں بلوچستان کے گورنر کی حیثیت سے ایک تقریب کے دوران حلف اٹھائیں گے - اور مزے کی بات یہ ہے کہ بلوچستان کے وزیراعلیٰ سے حلف لینے کیلئے

گورنر بلوچستان موسیٰ خاں کو کراچی بھجوایا گیا۔

بلوچستان اسمبلی کو جس انداز میں توڑا گیا تھا اس سے 15 دسمبر 1988ء کو ہی عیاں ہوگیا تھا کہ اگر کسی نے اس اقدام کو عدالت میں چیلنج کیا تو اسمبلی بحال ہوجائے گی۔ بلوچستان اسمبلی توڑنے کے خلاف عدالت میں 7 جنوری 1989ء کو سماعت شروع ہوئی اور 22 جنوری 1989ء کو بلوچستان اسمبلی بحال کردی گئی --- جس کے بعد جمالی کے پاس مستعفی ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کیونکہ اسلامی جمہوری اتحاد نے بلوچستان نیشنل الائنس اور جے یو آئی کے ساتھ اتحاد کرلیا --- بلوچستان اسمبلی میں بے نظیر کے صرف دو تین پکے ووٹ تھے اور باقی ادھار پر لئے ہوئے ارکان سے کب تک حکومت چل سکتی تھی۔ بلوچستان اسمبلی کے سپیکر باروزئی نے عدالتی فیصلے کے بعد عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ عزت کے ساتھ الگ ہوجائیں۔ لہٰذا انہوں نے 2 فروری 1989ء کو سپیکر شپ سے استعفیٰ دے دیا۔ نواز شریف کی نواب اکبر بگٹی اور مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ ملاقاتوں کا حل نکالنے کے لئے بے نظیر بھٹو نے اپنے نمائندے کوئٹہ بھجوائے لیکن کھیل اب بے نظیر کے ہاتھ سے نکل چکا تھا لہٰذا 5 فروری 1989ء کو نواز شریف اور فضل الرحمٰن کے امیدوار نواب اکبر بگٹی 43 میں سے 32 ووٹ حاصل کرکے وزیر اعلیٰ منتخب ہوگئے اور باروزئی کی جگہ محمد اکرم کو بلا مقابلہ اسمبلی کا سپیکر منتخب کرلیا گیا --- اس سے اگلے روز نواب اکبر بگٹی نے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا جس کے بعد انہوں نے 13 رکنی کابینہ کا اعلان کیا۔ بلوچستان کی اس کابینہ میں آئی جے آئی کے 5 بلوچستان نیشنل الائنس کے 4 اور پشتونخواہ کے 3 ارکان شامل تھے۔ بے نظیر کی سیاسی محاذ پر بلوچستان میں یہ بہت بڑی شکست تھی۔

وسیم سجاد کی بطور چیئرمین سینٹ کامیابی

1988ء کے انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلیوں میں بے نظیر بھٹو کو واضح اکثریت حاصل نہ تھی جس کی وجہ سے انہیں 24 دسمبر 1988ء کو چیئرمین سینٹ کے انتخاب میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ نواز شریف اور اسحاق خاں کی خواہش تھی کہ پی پی پی کی حکومت وسیم سجاد کی مخالفت نہ کرے کیونکہ وہ ایک شریف انسان اور قابل سینیٹر تھے۔ تاہم سینیٹر طارق چوہدری نے وسیم سجاد کا مقابلہ کرنے کا اعلان کردیا --- وسیم سجاد کو اسحاق خاں، نوابزادہ نصراللہ خاں، نواب اکبر بگٹی، اسلامی جمہوری اتحاد اور متعدد آزاد ارکان کا اعتماد حاصل تھا چنانچہ 24 دسمبر 1988ء کو جب چیئرمین سینٹ کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو بے نظیر کے منظور نظر "طارق چوہدری کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی"۔ وسیم سجاد کو 53 اور طارق چوہدری کو 25 ووٹ ملے۔ وسیم سجاد کا بطور چیئرمین سینٹ بننا سیاسی محاذ سے بے نظیر کی بہت بڑی شکست تھی۔ چیئرمین سینٹ کا عہدہ اسحاق خاں کے 17 اگست 1988ء کو قائم مقام صدر بننے کے بعد خالی ہوگیا تھا۔ لیکن اسحاق خاں نے ڈپٹی چیئرپرسن سینٹ نورجہاں پانیزئی کے ذریعے ایوان کی کارروائی چلائے رکھی کیونکہ انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ 1988ء کے انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلیاں ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ وسیم سجاد کو چیئرمین سینٹ منتخب کروانے میں جنرل مرزا اسلم بیگ نے بھی بقدر کے توفیق کردار ادا کیا کیونکہ ان کا قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان پر خاصا اثر و رسوخ تھا۔ وسیم سجاد کا تعلق اگرچہ مسلم لیگ کے ساتھ تھا لیکن بطور چیئرمین سینٹ اپنے طرز عمل سے انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو غیر متنازعہ شخص ثابت نہ ہونے دیا --- انہیں پی پی پی کے ارکان بھی

قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے - یہی حالت ملک معراج خالد کی تھی جو قومی اسمبلی کے سپیکر تھے اور اپنے طرزِ عمل سے اسمبلی کی کارروائی کے دوران وہ اکثر ایسے فیصلے کرتے جس سے یہ تاثر تو ضرور ملتا تھا کہ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے حمایتی ہیں لیکن یہ کبھی کسی نے محسوس نہ کیا کہ وہ پی پی پی کے ایک جیالے ہیں - وسیم سجاد اور ملک معراج خالد نے مرکز پنجاب میں محاذ آرائی ختم کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی - ویسے بھی ان پر دسمبر 1988ء میں ہی عیاں ہو گیا تھا کہ اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ اسلامی جمہوری اتحاد اور پی پی پی کے درمیان سیز فائر نہیں ہونے دیں گے -

بے نظیر بھٹو کے بطور وزیر اعظم آخری 8 ماہ

محترمہ بے نظیر بھٹو کو محدود اختیارات دے کر شریک اقتدار کیا گیا تھا لیکن ان کی خواہشات لامحدود ہوتی چلی گئیں - محترمہ نے اپنے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو کا دور اقتدار دیکھا ہوا تھا - بھٹو نے اپنی صاحبزادی کی سیاسی تربیت اس انداز میں کی تھی کہ وقت آنے پر یہ ان کے جانشین کی حیثیت سے سیاسی منظر پر چھا جائیں - ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بے نظیر بھٹو ان غلطیوں سے اجتناب کرتیں جو غلطیاں ان کے والد محترم سے سرزد ہوئیں لیکن افسوس کہ انہوں نے ماضی سے کچھ نہ سیکھا بلکہ وہ دوسروں کے لئے نشانِ عبرت بن گئیں --- لالچ اور دھونس دھاندلی کے ذریعے مخالفین کو اپنی حمایت پر مجبور کرنا کسی بھی طور پر قابل تحسین نہیں جانا جاتا لیکن 90-1988ء کے دوران یہ صورتحال برقرار رہی - بے نظیر بھٹو کے خوشدلی مشیر بریف کیس میں لاکھوں روپے رکھ کر اسلامی جمہوری اتحاد کے ارکان اسلامی کو توڑنے میں مصروف رہے اور اسلامی جمہوری اتحاد کے چند ارکان کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا تو ہارس ٹریڈنگ کا دفاع کرتے ہوئے بے نظیر بھٹو نے 2 جنوری 1990ء کو کہا "جن ارکان اسمبلی نے اسلامی جمہوری اتحاد سے الگ ہو کر میری حکومت میں شمولیت اختیار کی ہے' ان پر فلور کراسنگ کی شق کا اطلاق نہیں ہوتا" -

یہ بڑی عجیب منطق تھی --- ارکان اسمبلی کو وفاداریاں تبدیل کرانے کا عمل بڑی ڈھٹائی سے جاری تھا اور بے نظیر بھٹو اس مکروہ فعل کو "عین جمہوری عمل" قرار دے رہی تھیں --- محترمہ بے نظیر بھٹو کی ذاتی کوششوں سے اسلامی جمہوری اتحاد کے ایک اہم رکن غلام اکبر لاسی نے پی پی پی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو جتوئی' نصراللہ' شجاعت

حسین اور ولی خاں نے بے نظیر کے خلاف طبل جنگ بجا دیا - غلام مصطفیٰ جتوئی نے ہنگامی بنیادوں پر 6 جنوری 1990ء کو کراچی میں متحدہ اپوزیشن کا اجلاس طلب کرلیا - اس موقع پر جتوئی' الطاف حسین' نوابزادہ نصراللہ خاں' غلام احمد بلور' سیدہ عابدہ حسین' نوازشریف' چوہدری شجاعت حسین' زاہد سرفراز اور عمران فاروق نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا --- "سندھ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے" --- تقریباً" ہر اپوزیشن لیڈر نے یہ فقرہ استعمال کیا --- اور آخر کار کئی گھنٹوں کی بحث و تکرار کے بعد متحدہ اپوزیشن اس نتیجے پر پہنچی کہ بے نظیر بھٹو کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کردی جائے - جس روز متحدہ اپوزیشن نے پی پی پی کی حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا بے نظیر بھٹو اس روز اسلام آباد میں تھیں --- اس کی وجہ یہ تھی کہ فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ کی طرف سے انہیں پیغام بھجوایا گیا تھا کہ وہ انہیں ملنے آرہے ہیں - بے نظیر اور جنرل اسلم بیگ کے درمیان ہونے والی یہ پہلی ملاقات تھی جس میں فوج کے سربراہ نے وزیراعظم بے نظیر کو مشورہ دیا کہ وہ سیاسی بحران کا سیاسی انداز میں حل نکالنے کے لئے وسیع البنیاد قومی حکومت قائم کریں --- اور بے نظیر نے اس تجویز سے اتفاق کیا کیونکہ وہ تو کئی ماہ سے اپوزیشن کو وفاقی کابینہ میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کے لئے کوشاں تھیں --- جنرل مرزا اسلم بیگ نے ہنستے ہنستے بے نظیر کو کہا کہ میری تجویز کے مطابق اپوزیشن کے ارکان کو ان کے قائدین کے مشورے سے کابینہ میں شامل کیا جائے - جنرل بیگ نے یہ فقرہ اس لئے چست کیا تھا کہ بے نظیر نے اپوزیشن جماعتوں کے چیدہ چیدہ ارکان توڑ توڑ کر کابینہ میں شامل کرنے کا سلسلہ شروع کررکھا تھا اور وہ ایسا کرنے کے بعد یہ دعویٰ کرنا چاہتی تھیں کہ ان کی کابینہ میں تمام جماعتوں کو نمائندگی حاصل ہے --- بہرحال مڈٹرم الیکشن قریب آنے کے اشارے ستمبر 1989ء میں ہی ملنا شروع ہوگئے تھے جس پر تحریک استقلال' عوامی تحریک اور تحریک جعفریہ نے پاکستان عوامی محاذ کے نام سے 9 جنوری 1990ء کو ایک نیا سیاسی اتحاد بنالیا - بے نظیر بھٹو کو اس اتحاد کے بارے میں انٹیلی جنس بیورو کی طرف سے جو رپورٹ بھجوائی گئی اس کا لب لباب یہ تھا کہ تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خاں نے نیا سیاسی اتحاد آئندہ چند ماہ کے اندر متوقع سیاسی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قائم کیا ہے --- اس کی بنیادی وجہ یہ

تھی کہ غلام مصطفیٰ جتوئی نے چوٹی کے سیاستدانوں کو سمجھانا شروع کردیا تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو 20 مارچ 1990ء کے بعد اپنے عہدے پر فائز نہیں رہیں گی - اس کی تشریح جتوئی نے یہ کی کہ بے نظیر کا وزیراعظم بننا 1985ء میں ہونے والے انتخابات کا تسلسل تھا اور وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہنے کے لئے بے نظیر کو ایوان سے دوبارہ اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا پڑے گا --- جتوئی نے اس طرح کا آئینی مسئلہ بڑے اعتماد سے اٹھایا تھا لیکن یہاں مصیبت یہ پیدا ہوگئی کہ خود اسحاق خاں بھی جتوئی کے فارمولے کا شکار ہوتے تھے - لہٰذا بے نظیر نے نہایت اطمینان سے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ وہ بے فکر ہوکر "ترقیاتی کاموں" میں مگن رہیں کیونکہ اسحاق خاں مجھے اعتماد کا ووٹ لینے کا حکم جاری کرکے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہیں ماریں گے - "جناب صدر! 20 مارچ 1990ء کا ایشو آپ کے خلاف بھی سازش کا حصہ ہے" --- بے نظیر نے 25 جنوری 1990ء کو اسحاق خاں کو کہا --- اور ظاہر ہے کہ اسحاق خاں کا جواب یہ تھا کہ "میں آئین اور قانون کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں" --- 26 جنوری 1990ء کو کراچی میں منعقدہ اپوزیشن کے ایک جلسہ عام میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے ذریعے اسحاق خاں کو کہا گیا کہ وہ بے نظیر بھٹو کو دوبارہ اعتماد کا ووٹ لینے کا حکم جاری کریں - یہی وہ جلسہ تھا جس میں جتوئی اور نوازشریف وزارت عظمیٰ کے امیدوار بن کر سامنے آئے کیونکہ لاہور سے متحدہ اپوزیشن کے جلسے میں شرکت کے لئے جانے والے مسلم لیگی کارکنوں سے "وزیراعظم نوازشریف --- وزیراعظم نوازشریف" کے نعرے لگوائے گئے - جلسہ کے دوران جب نوازشریف کے حکم میں نعرے لگتے تو نوازشریف کا چہرہ فرط مسرت سے سرخ ہوجاتے اور جتوئی کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوجاتے تاہم سندھ سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکن "وزیراعظم جتوئی" کے نعرے لگاتے تو غلام مصطفیٰ جتوئی مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھو جاتے اور انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے پیچھے ان کا ملٹری سیکریٹری بیٹھا ہے --- جتوئی اور نوازشریف کے درمیان وزارت عظمیٰ کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے بلی اور چوہے کا کھیل جاری رہا --- پاکستان کی سیاسی' داخلی اور خارجی صورتحال اس وقت عجیب صورتحال اختیار کرتی جارہی تھی - ایک طرف بھارت نے پاکستان کی سرحدوں پر فوج کو اکٹھا کرنا شروع کردیا تھا تو دوسری

طرف اندرون ملک تخریب کاری کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوگیا تھا
--- خصوصاً" مسئلہ کشمیر پر بھارت نے انتہائی اشتعال انگیز رویہ اختیار کرلیا جس کو مد نظر
رکھتے ہوئے بے نظیر نے 5 فروری 1990ء کو ملک بھر میں کشمیریوں سے اظہار یکجہتی
کے لئے ہڑتال کی کال دے دی --- یہ پہلا موقع تھا کہ اپوزیشن اور حکومت کے
درمیان کسی بھی اہم مسئلہ پر اتفاق رائے ہوا چونکہ بے نظیر بھٹو زچگی کی وجہ سے
اپوزیشن کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر ہونے والے مذاکرات میں شرکت سے قاصر تھیں لہذا
بیگم نصرت بھٹو نے 4 فروری 1990ء کو اسلام آباد میں اپوزیشن کو بریفنگ کی غرض
سے بلائے جانے والے ایک اہم اجلاس کی صدارت کی - بیگم نصرت بھٹو اس وقت
سینئر وزیر تھیں - حکومت نے اپوزیشن رہنماؤں کے لئے مسئلہ کشمیر پر 4 فروری 1990ء
کو ایک ٹاپ سیکرٹ بریفنگ کا اہتمام کیا تھا جس میں نواز شریف اور جتوئی سمیت چوٹی
کے سیاستدانوں نے شرکت کی - ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی شمس الرحمٰن کلو نے شرکاء
اجلاس اور فوجی نمائندوں کی موجودگی میں اپوزیشن کو کشمیر میں بڑھتی ہوئی بھارتی
مداخلت کے متعلق بریفنگ دی اور قومی قائدین سے درخواست کی کہ وہ آزمائش کے
ان لمحات میں حکومت کا ساتھ دیں - چنانچہ 5 فروری 1990ء کو کشمیریوں کے ساتھ
اظہار یکجہتی کے لئے ملک بھر میں ہڑتال ہوئی تو اپوزیشن نے حکومت کا بھرپور ساتھ دیا
--- فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ خود بھی سرحدوں پر اگلے مورچوں کے دورے
کررہے تھے - خطے پر جنگ کے خطرات منڈلا رہے تھے۔ ابھی حکومت اور اپوزیشن کے
درمیان قومی مسائل پر اتفاق رائے ہوئے 24 گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ کراچی میں
نامعلوم تخریب کاروں نے وسیع پیمانے پر دہشت گردی کا سلسلہ شروع کردیا اور 7
فروری 1990ء کو جب اخبارات شائع ہوئے تو قوم کو پتہ چلا کہ کراچی میں نامعلوم شر
پسندوں نے فائرنگ کرکے 50 کے قریب افراد کو ہلاک کردیا ہے --- اس صورتحال میں
اسحاق خاں نے بے نظیر بھٹو کو کہا کہ "حکومت عوام کی جان و مال کا تحفظ کرے۔" فضا
کو سازگار دیکھ کر متحدہ اپوزیشن کے سربراہ غلام مصطفیٰ جتوئی نے 8 فروری 1990ء کو
اسحاق خاں سے درخواست کی کہ وہ ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں - چنانچہ اس ملاقات
کے لئے 10 فروری کی تاریخ مقرر ہوئی - "صدر صاحب ! آپ اپنے اختیارات استعمال

کریں" --- جتوئی نے ولی خاں' نصراللہ خاں' عابدہ حسین اور مولانا عبدالستار نیازی کی
موجودگی میں ایوان صدر میں اسحاق خاں سے ملاقات کے دوران مطالبہ کیا کہ بے نظیر کو
ازسرنو اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کو کہا جائے۔ یہی ایام تھے جب بے نظیر کی ایک
سہیلی امریکی سینیٹر باربرا میک نے انہیں پیغام بھجوایا "محترمہ ! آپ کی حکومت کو فوج
سے خطرہ ہے" --- اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے فوج کے
سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ کی تجویز پر فرانس کے صدر متراں کو ایک خط ارسال کیا تھا
جس میں انہوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا دفاع کرتے ہوئے فرانس سے مطالبہ کیا
تھا کہ وہ ان کے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ کئے جانے والے معاہدے کے
مطابق پاکستان کو ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ فراہم کرے - فرانس کے صدر متراں نے
21 فروری 1990ء کو پاکستان پہنچنا تھا اور بے نظیر کی کوشش تھی کہ فرانسیسی صدر کی
اسلام آباد آمد سے قبل ہی دونوں ممالک کے درمیان ایٹمی پلانٹ کے مسئلہ پر مذاکرات
نتیجہ خیز شکل اختیار کرجائیں۔ پاکستان کو ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ ملنے سے بھارت'
امریکہ اور اسرائیل سمیت تمام ملک دشمن عناصر کو تکلیف پہنچ رہی تھی - لہذا بھارت
نے صدر متراں کی پاکستان آمد سے قبل ملک کے مختلف حصوں میں بڑے پیمانے پر
فسادات اور ہنگامے کرانے کی کوشش کی تاکہ فرانسیسی صدر اپنا دورہ پاکستان ملتوی کردیں
- اس مقصد میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی "را" کافی حد تک کامیاب رہی۔ کراچی میں
قتل و غارت گری کے واقعات کے بعد بے نظیر نے ایم کیو ایم کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا کہ
وہ سندھ کے وزیراعلیٰ قائم علی شاہ کی جگہ کسی "نیوٹرل" شخص کو وزیراعلیٰ مقرر کریں
گے - بے نظیر نے قائم علی شاہ کی جگہ آفتاب شعبان میرانی کو وزیراعلیٰ مقرر کرنے کا
فیصلہ 20 فروری 1990ء کو ہی کرلیا تھا لیکن فرانسیسی صدر کی آمد کی وجہ سے اس فیصلے
پر تین روز تک عمل درآمد نہ کیا گیا - بے نظیر کے صدر متراں کے ساتھ مذاکرات
کامیاب رہے کیونکہ فرانسیسی صدر متراں کے ساتھ مذاکرات ہوئے تو انہوں نے کہا کہ
وہ اپنے وعدے کے مطابق پاکستان کو ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ فراہم کرنے کی پوری
کوشش کریں گے --- یہی ایک مسئلہ تھا جس پر بھٹو اور امریکہ کے درمیان نہایت
سخت اختلافات پیدا ہوئے تھے اور ایسی حساس نوعیت کے ایشو کو بے نظیر نے بھی چھیڑ

دیا - چنانچہ پاکستان میں متعین امریکی سفیر رابرٹ اوکلے کی طرف سے امریکی صدر جارج
بش کو ایک رپورٹ بھجوائی گئی جس میں یہ واضح طور پر اشارہ موجود تھا کہ بے نظیر بھی
اپنے والد کی طرح ایٹمی پروگرام کے حوالے سے غیر لچک دار رویے کا مظاہرہ کر رہی
ہیں - چنانچہ امریکہ نے ایک طرف اسلام آباد پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ حکومت پاکستان
فرانس سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے حصول سے باز رہے اور دوسری طرف
واشنگٹن نے فرانس پر دباؤ ڈالا کہ وہ خطے میں طاقت کا توازن خراب ہونے سے بچانے
کے لئے پاکستان کو ایٹمی پلانٹ نہ دے -

بہرحال امریکی سینیٹر باربرا میک لسکی کی طرف سے بے نظیر بھٹو کو بھجوائے جانے
والے پیغام کے بعد اسحاق خاں نے 26 فروری 1990ء کو دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ ”
ملک میں جمہوریت فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ کی وجہ سے ہے“ - اسحاق خاں
کا یہ بیان بڑا معنی خیز تھا کیونکہ اس قسم کا بیان دے کر اسحاق خاں نے بے نظیر کو پیغام
دیا تھا کہ وہ اور فوج ایک ہیں - اسحاق خاں کے اس بیان کی اہمیت اس لحاظ سے بہت
زیادہ تھی کہ اس سے اگلے روز گوجرانوالہ چھاؤنی میں کور کمانڈروں کی کانفرنس ہو رہی
تھی - فوج کی ہائی کمان نے 27 فروری 1990ء کو ملکی صورتحال پر تفصیلاً“ غور کیا اور
مسائل کے حل کے لئے مارشل لاء کے نفاذ‘ بے نظیر کی تبدیلی‘ بھارت کی طرف سے
ممکنہ حملے اور ملک کی مجموعی سیاسی و امن عامہ کی صورتحال سمیت ہر مسئلہ زیر بحث آیا
--- کور کمانڈر کانفرنس کے دوران جنرل مرزا اسلم بیگ نے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ
فوج اس مرتبہ مارشل لاء نہ ہی لگائے تو اچھا ہوگا اور ان کے اس موقف سے 90 فیصد
کور کمانڈر حضرات نے اتفاق کیا --- تاہم ملک کی خراب سیاسی صورتحال کی وجہ سے
فوج نے فیصلہ کیا کہ بے نظیر کو پیغام دیا جائے کہ وہ دفاعی اخراجات میں اضافے کے
لئے ضروری کارروائی کریں - کور کمانڈر کانفرنس میں یہ بات طے ہوگئی تھی کہ 20 مارچ
1990ء کو بے نظیر بھٹو کو دوبارہ اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے نہیں کہا جائے گا
کیونکہ فوج کے ماہرین قانون کے مطابق جتوئی کا موقف غلط فہمی پر مبنی تھا - کور کمانڈر
کانفرنس کے اختتام پر جنرل بیگ نے اسحاق خاں کی موجودگی میں بے نظیر بھٹو سے
ملاقات کی اور وزیراعظم کو فوج کے فیصلوں سے آگاہ کیا گیا --- جس پر بے نظیر نے کہا

کہ کراچی میں شرپسندوں کے خلاف اپریشن کے لئے فوج کو اختیارات دینے کے لئے
جلد ہی وہ ایک سمری صدر کو ارسال کریں گی - بے نظیر بھٹو پر ان دنوں پریشر ڈالا جا رہا
تھا کہ وہ نظام بچانے کے لئے اپنی جگہ مخدوم امین فہیم یا سردار فاروق لغاری کو وزارت
عظمیٰ کا امیدوار نامزد کر کے 20 مارچ 1990ء کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ چھوڑ دیں ---
لیکن انہوں نے ان تمام چالوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا --- بے نظیر بھٹو نے 20
مارچ 1990ء کو مینار پاکستان کے سائے تلے ایک عظیم الشان جلسہ عام سے خطاب کیا
--- اور دوران خطاب انہوں نے کہا ”فوج عوام کی قربانی کا احترام کرے“ --- بے نظیر
بھٹو کا یہ فقرہ بڑا معنی خیز تھا کیونکہ یہ جانتے ہوئے کہ فوج سے متعلق ان کی زبان سے
ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کی بڑی اہمیت ہے انہوں نے فوج کے متعلق اس قسم کا
لہجہ اختیار کیا جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ انہیں فوج کی طرف سے اپنے خلاف ہونے والی
سازشوں کا علم ہے - اگرچہ بے نظیر نے 20 مارچ 1990ء کو اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ
حاصل نہ کیا لیکن ایک بڑا جلسہ کر کے انہوں نے ثابت کر دیا کہ عوام کی قوت ان کے
ساتھ ہے - بے نظیر نے کامیاب جلسے کے ذریعے اسحاق خاں اور فوج کو اپنی قوت سے
آگاہ کیا تو اپوزیشن نے بھی لاہور میں ایک بڑا جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لئے 23
مارچ 1990ء کی تاریخ مقرر کی گئی - متحدہ اپوزیشن کا جلسہ اگرچہ خاصا بڑا تھا لیکن جلسہ
گاہ میں ملک کی تمام اپوزیشن جماعتیں مل کر بھی بے نظیر بھٹو کے مقابلے میں کامیاب
جلسہ نہ کر سکیں - محترمہ بے نظیر بھٹو اس لحاظ سے ابھی تک خوش قسمت تھیں کہ
عوام میں انکی مقبولیت کے گراف میں نمایاں کمی نہیں آئی تھی --- بین الاقوامی سطح پر
ان کا قد کاٹھ ابھی تک اونچا ہو گیا تھا اور ان کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر عمومی
تاثر یہی تھا کہ وہ جمہوریت کی بحالی کا سبب بنی ہیں - لیکن ملکی سطح پر صورتحال یہ تھی
کہ تمام قابل ذکر چھوٹی بڑی سیاسی و مذہبی جماعتوں نے بے نظیر کے خلاف اعلان جنگ
کر رکھا تھا - اور بے نظیر بھٹو اپنی سوجھ بوجھ سے کام لینے کی بجائے اپنے خوشامدی
مشیروں اور بین الاقوامی اداروں کے وفادار ملازمین کے چنگل میں پھنس کر رہ گئی تھیں -
ان حالات کا فائدہ بھارت اور امریکہ کو پہنچ رہا تھا‘ ان حالات کا فائدہ وہ تمام پاکستان
دشمن قوتیں اٹھا رہی تھیں جنہیں پاکستان کی ناگفتہ بہ صورتحال کا بالواسطہ یا بلا واسطہ

فائدہ پہنچ سکتا تھا --- "جنگ ہوئی تو فوج کی کمان کس کے ہاتھ میں ہوگی" --- علماء نے
جنرل مرزا اسلم بیگ کو خطوط لکھنا شروع کردیئے - ظاہر ہے کہ پاک بھارت جنگ کی
صورت میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے ہی بطور وزیراعظم افواج پاکستان کی قیادت کرنا تھی -
اپریل 1990ء میں فوج پر مذہبی جماعتوں کی طرف سے دباؤ ڈالا جانے لگا کہ وہ محترمہ
بے نظیر بھٹو کی ہی جماعت کے کسی شخص کو وزیراعظم نامزد کردیں کیونکہ عورت کی
سربراہی میں جنگ نہیں لڑی جاسکتی - غرض کہ بے نظیر بھٹو پر طرح طرح کے الزامات
لگائے جاتے اور ان پر مختلف اطراف سے حملے کرنے کا سلسلہ جاری رہا --- اور جب
جنگ کے خطرات سر پر منڈلانے لگے تو 7 مئی 1990ء کو اسحاق خاں کو فوج نے جی ایچ
کیو میں طلب کیا - جہاں انہوں نے سرحدی صورتحال کے حوالے سے کور کمانڈر
حضرات کے ساتھ کھل کر گفتگو کی - فوج کو دفاعی ضروریات کی فکر تھی کیونکہ نئے مالی
سال کے بجٹ میں انہوں نے جس قدر فنڈز کی ڈیمانڈ کی تھی اسے پورا کرنا بے نظیر کے
لئے ایک انتہائی مشکل مرحلہ بن گیا تھا --- بے نظیر بھٹو نے وزارت خزانہ کو دو ٹوک
الفاظ میں احکامات جاری کر رکھے تھے کہ دفاعی ضروریات کو ہر چیز پر فوقیت دی جائے گی
کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ فوج کی ضروریات پوری نہ ہوئیں تو بھٹو خاندان کے خلاف
نفرت پھیلے گی کیونکہ فوج میں ایسے افسران کی ابھی تک بڑی تعداد موجود تھی جس کے
نزدیک بھٹو خاندان کی محب الوطنی مشکوک تھی - ایک طرف فوج نے اسحاق خاں کو کور
کمانڈر کانفرنس میں شرکت کرنے کا موقع دیا تو دوسری طرف بے نظیر بھٹو کو دفاعی کمیٹی
کے اجلاس کی صدارت کے لئے پیغام بھجوایا گیا --- جرنیلوں نے بے نظیر بھٹو کو دفاعی
کمیٹی کے اجلاس کے دوران ممکنہ پاک بھارت جنگ کے بارے میں جو بریفنگ دی
اس سے یہی لگتا تھا کہ پاکستان پر بھارت کی طرف سے کسی بھی وقت حملہ ہوسکتا ہے
--- بے نظیر نے فوج کو 12 مئی 1990ء کو حکومت کے اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ دفاعی
بجٹ میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی --- فوج کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد
بے نظیر بھٹو نے 15 مئی 1990ء کو 8 ممالک کا دورہ شروع کیا ---

بے نظیر بھٹو بیرون ملک دورے پر گئیں تو ان کی عدم موجودگی میں ملک میں
دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا --- 18 مئی 1990ء کو لاہور میں بم دھماکے کے نتیجے میں 9

افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہوگئے - 21 مئی 1990ء میں کشمیر میں مولوی فاروق سمیت
100 کشمیری مجاہدین کو بھارتی افواج نے شہید کردیا - اس طرح بے نظیر بھٹو کو اندرونی
اور بیرونی سطح پر کئی محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑا --- اور اس صورتحال میں شدت اس
وقت آئی جب کراچی میں خون کی ہولی کھیلی گئی اور دہشت گردوں نے 70 افراد کو
فائرنگ کرکے کراچی اور حیدر آباد میں ہلاک کردیا - بیگم نصرت بھٹو نے اس دہشت
گردی کا ذمہ دار ایم کیو ایم کو ٹھہرا دیا- سندھ میں امن عامہ کی صورتحال اس قدر
خراب ہوچکی تھی کہ کراچی اور حیدرآباد جیسے پررونق علاقوں میں سرشام ہی یہ
صورتحال پیدا ہوجاتی کہ وہاں دور دور تک کسی انسان کا سایہ تک نظر نہیں آتا تھا ---
سندھ میں امن عامہ کی صورتحال کو خراب کرنے کا واحد مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ بے
نظیر کو سندھ کارڈ کھیلنے سے روکا جائے- محترمہ بے نظیر بھٹو کو آئی ایس آئی اور انٹیلی
جنس بیورو کی طرف سے کراچی اور حیدرآباد میں ہونے والے خون ریزی کے حوالے
سے جو رپورٹیں موصول ہوئیں ان سے یہی لگتا تھا کہ اس سانحے کی ذمہ دار ایم کیو ایم
ہے - لیکن بے نظیر بھٹو نے ایم کیو ایم کو تنقید کا نشانہ بنانے سے گریز کیا بلکہ وہ خواجہ
طارق رحیم اور احمد سعید اعوان کے ذریعے الطاف حسین، عظیم طارق اور عمران فاروق
کے ساتھ روابط میں مصروف رہیں - لیکن جب انہیں یقین ہوگیا کہ اس شیطانی کھیل
میں ایم کیو ایم ملوث ہے تو انہوں نے 23 جون 1990ء کو اعلان کیا کہ سندھ میں دوسرا
مجیب الرحمٰن پیدا ہوگیا ہے - اور نئے مجیب الرحمٰن سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی مراد
الطاف حسین تھے جو 1987ء کے بعد تیزی سے سیاسی افق پر چھاگئے --- محترمہ بے نظیر
بھٹو کے مسائل میں کسی حد تک اضافے کی ذمہ داری ڈاکٹر شیرافگن پر بھی عائد ہوتی
تھی کیونکہ انہوں نے قومی اسمبلی کے سپیکر ملک معراج خالد کے خلاف سپریم کورٹ
میں رٹ دائر کردی جس کی وجہ سے انہوں نے یہ بیان دیا کہ ملک معراج خالد نے فلور
کراسنگ کے مرتکب ارکان اسمبلی کے خلاف بھجوائے جانے والے ریفرنسوں کو جان
بوجھ کر دبا کر رکھا ہوا ہے --- اور ڈاکٹر شیرافگن کی وجہ سے بے نظیر بھٹو کو صدر اسحاق
سے خطرہ محسوس ہونے لگا --- کیونکہ اسحاق خاں نے اپوزیشن کے ساتھ جس تیزی کے
ساتھ روابط پیدا کئے تھے اس سے یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ بے نظیر کا بستر گول

کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔سندھ کی صورتحال کی اصلاح کے حوالے سے اعلیٰ سطح پر کئی تجاویز پر غور کیا گیا۔ان تجاویز میں سے ایک تجویز سندھ اسمبلی توڑ کر صوبے میں گورنر راج نافذ کرنے سے متعلق تھی جسے بے نظیر نے مسترد کردیا کیونکہ ان کے نزدیک پنجاب میں بھی امن عامہ کی صورتحال کوئی زیادہ بہتر نہ تھی۔بے نظیر نے اسحاق خاں پر واضح کردیا تھا کہ اگر سندھ میں گورنر راج کا نفاذ ضروری ہے تو پھر پنجاب بھی اس سے محفوظ نہیں رہے گا۔یکم جولائی 1990ء کو فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے بے نظیر بھٹو کو کہا کہ وہ فوج کو جرائم پیشہ افراد کی گرفتاری کے لئے قانونی اختیارات دیں۔فوج کے اس مطالبے پر 9 جولائی 1990ء کو دفاعی کمیٹی کے اجلاس میں غور کیا گیا۔اس اجلاس کی صدارت محترمہ بے نظیر بھٹو نے کی۔اور بے نظیر نے فوج کو بتایا کہ سندھ میں اپریشن کلین اپ مکمل کرنے کے لئے فوج کو اس کی خواہش کے مطابق قانونی اختیارات مل جائیں گے۔9 جولائی 1990ء کو دفاعی کمیٹی کے اجلاس کے دوران ہی فوج سے مشورے کے بعد بے نظیر نے فیصلہ کیا کہ وہ 10 جولائی 1990ء کو کویت اور عراق کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو حل کرانے کے لئے بغداد اور کویت کا دورہ کریں گی --- چنانچہ محترمہ سرکاری دورے پر 10 جولائی 1990ء کو بغداد روانہ ہوگئیں۔لیکن انہیں اندازہ نہ تھا کہ جس چنگاری کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے وہ دو ماہ کے اندر انہیں آگ کے بگولے کی شکل اختیار کرکے اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔

بہرحال بغداد پہنچ کر بے نظیر بھٹو نے عراق کے صدر صدام حسین کے ساتھ مذاکرات کئے۔اگلے روز بے نظیر نے کویت کے سربراہ سے ملاقاتیں کی اور وہاں سے 13 جولائی کو وہ مراکش کے شاہ حسین سے ملاقات کے لئے روانہ ہوئیں اور شاہ حسین سے مل کر وہ الجزائر پہنچیں۔بے نظیر کے اس دورے کا پہلا اور آخری مقصد خلیج کی جنگ کے امکان کو ختم کرانا تھا --- لیکن وہ یہ بھول گئی تھیں کہ خلیج میں جنگ امریکہ کے مفادات کے تحفظ کی ضمانت ہے اور جس کھیل کو وہ اتنا آسان سمجھ رہی ہیں وہ ان کی اپنی حکومت کو لے ڈوبے گا --- امریکی صدر جارج بش کو 12 جولائی 1990ء کو سی آئی اے کے توسط سے اطلاع ملی کہ بے نظیر بھٹو نے صدام حسین کو بغداد پر ممکنہ

امریکی حملے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ حساس نوعیت کی معلومات فراہم کی ہیں --- یہی وجہ تھی کہ جب بے نظیر بھٹو وطن واپس آئیں تو 15 جولائی 1990ء کو کراچی اور حیدر آباد میں 50 افراد کی دہشت گردوں کی فائرنگ کی وجہ سے ہلاکت ہوچکی تھی۔محترمہ نے 17 جولائی 1990ء کو غلام اسحاق خاں کو فوج کو آئین کی دفعہ 245 کے تحت اختیارات دینے کے لئے ایک سمری ارسال کی --- اس کے ساتھ ہی بے نظیر بھٹو نے بھارتی حکام سے مذاکرات کا سلسلہ تیز کردیا --- بھارت کے سیکرٹری خارجہ نے 18 جولائی 1990ء کو پاکستان کے سیکرٹری خارجہ تنویر احمد کے ساتھ مذاکرات کئے اور اسلام آباد نے بھارت کے سیکرٹری خارجہ پر واضح کیا کہ حکومت پاکستان کے پاس پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری میں بھارت کے ملوث ہونے کے بارے میں ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں۔بھارت کے وزیراعظم اس وقت وی پی سنگھ تھے جنہیں بے نظیر نے 20 جولائی کو فون کرکے پاکستانی سرحدوں پر پر بھارتی فوج کی موجودگی کے متعلق اپنی تشویش سے آگاہ کیا --- وی پی سنگھ اور بے نظیر بھٹو کے درمیان بالواسطہ اور بلا واسطہ ہونے والے مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکے جس کی وجہ سے جنرل مرزا اسلم بیگ نے 21 جولائی 1990ء کو جی ایچ کیو میں کور کمانڈر کانفرنس کی صدارت کی --- کور کمانڈروں نے اس تجویز سے اتفاق کی کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کرکے 3 ماہ کے لئے نگران حکومت قائم کردی جائے --- اور اس اقدام کے لے تاریخ اور وقت کا تعین کرنے کے لئے تمام اختیارات جنرل بیگ کو دے دیئے گئے جنہوں نے قومی اسمبلی کے سپیکر ملک معراج خالد کو انتہائی خفیہ طریقے سے بتایا کہ آئندہ ماہ بے نظیر بھٹو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے معزول کردی جائیں گی --- سیاستدانوں میں ملک معراج خالد پہلے سیاست دان تھے جنہیں جنرل مرزا اسلم بیگ نے بے نظیر بھٹو کو ہٹانے کے متعلق فوج کے فیصلے سے آگاہ کیا --- جنرل مرزا اسلم بیگ کی خواہش تھی کہ ملک معراج خالد پیپلزپارٹی کے سینئر رہنماؤں کی مدد سے بھٹو پارٹی کو ہائی جیک کرلیں لیکن معراج خالد اس قدر بڑا اور اہم فیصلہ کرنے کی ہمت نہ کرسکے حالانکہ غلام اسحاق خاں بھی ان کی مدد کرنے کے لئے تیار تھے۔ملک معراج خالد کے انکار کے بعد جنرل مرزا اسلم بیگ نے غلام مصطفیٰ جتوئی سے رابطہ قائم کیا --- محترمہ بے نظیر بھٹو خاصی حد تک اپنے خلاف ہونے والی

سازشوں سے آگاہ ہوچکی تھیں اور انہیں علم تھا کہ اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ نے ان کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے --- لیکن اس بات کا نہیں قطعاً" اندازہ نہ تھا کہ فوج اور اسحاق خاں اس قدر عجلت میں ان کو وزیراعظم ہاؤس سے نکال باہر کریں گے --- بے نظیر بھٹو نے اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کی بو سونگھ کر 24 جولائی 1990ء کو اپنے ایک ترجمان کے ذریعے اخبارات کو ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے کہا کہ متحدہ اپوزیشن کی طرف سے 1977ء جیسے حالات پیدا کرنے کی سازش ہورہی ہے" --- محترمہ بے نظیر بھٹو کے پاس دو راستے تھے اول یہ کہ وہ اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ کے دباؤ میں اپنی پارٹی کے کسی لیڈر کو وزارت عظمیٰ کا منصب سونپ دیں۔دوم یہ کہ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوجائیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے دوسرے حل کو بہتر سمجھا۔ انہوں نے لاہور کے کور کمانڈر عالم جان محمود کو جنرل مرزا اسلم بیگ کو فارغ کرکے فوج کا نیا سربراہ بنانے کی ایک ناکام کوشش کی۔بے نظیر بھٹو کی سب سے بڑی سیاسی غلطی یہ تھی کہ وہ 1988ء کے انتخابات کے بعد اپنے حلیفوں کا اعتماد کھو بیٹھیں اور اس کے ساتھ ہی دوسرا ان کے ساتھ ظلم یہ ہوا کہ ایم کیو ایم نے سندھ اور مرکزی سطح پر ان کے خلاف بغاوت کردی --- اور اس کا سارا کریڈیٹ غلام اسحاق خاں کو جاتا ہے --- آخری کارڈ کے طور پر بے نظیر نے سندھ کے گورنر فخرالدین جی ابراہیم اور یحییٰ بختیار کو لندن بھیجا۔27 جولائی 1990ء کو لندن میں فخرالدین جی ابراہیم اور یحییٰ بختیار نے بے نظیر بھٹو کے معتمد خاص کی حیثیت سے لندن میں الطاف حسین کے ساتھ مذاکرات کئے --- الطاف حسین کو اس وقت پتہ چل گیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت 5 سے 10 اگست 1990ء کے درمیان ختم ہوجائے گی' اس لیے انہوں نے حکومتی ٹیم کو ٹرخا دیا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو اب آہستہ آہستہ ان تمام لوگوں کی یاد ستانے لگی تھی جنہیں بعض وجوہات کی بنا پر وہ ماضی میں فراموش کربیٹھی تھیں۔جولائی 1990ء میں جتوئی ان کے سب سے بڑے مخالف بن کر سامنے آئے تھے۔بے نظیر ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتی تھیں مگر اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود محترمہ نے 22 جولائی 1990ء کو غلام مصطفیٰ جتوئی سے ان کی اقامت گاہ پر ملاقات کی۔ اس

ملاقات کا بظاہر مقصد یہی بتایا گیا کہ محترمہ جتوئی سے ان کی والدہ کے انتقال پر اظہار افسوس کرنا چاہتی ہیں لیکن سیاسی حلقوں کے نزدیک یہ تعزیتی ملاقات نہ تھی بلکہ بے نظیر نے جتوئی کے گھر جاکر ان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی ایک ناکام کوشش کی۔بے نظیر بھٹو کور کمانڈر لاہور عالم جان محمود اور جنرل ایم ایچ زیدی کی مدت ملازمت میں توسیع کرنا چاہتی تھیں اور وزارت دفاع نے بے نظیر کے کہنے پر اسحاق خاں کو ایک سمری ارسال کی تھی جس کے ذریعے ان دونوں جرنیلوں کو دوبارہ ملازمت دینا مقصود تھا --- لیکن اسحاق خاں نے جنرل مرزا اسلم بیگ کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد دونوں جرنیلوں کی مدت ملازمت میں توسیع کرنے سے انکار کردیا --- اسحاق خاں کا یہ فیصلہ بھی اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ اب بے نظیر بھٹو کو مزید وقت نہیں دیا جائے گا اور ان لمحات میں بے نظیر کی جتوئی سے ملاقات "سیاسی لحاظ" سے انتہائی اہمیت کی حامل تھیں۔22 جولائی 1990ء کو بے نظیر بھٹو نے اسحاق خاں کے ساتھ ملاقات کے دوران پوری کوشش کی تھی کہ وہ انہیں قائل کرسکیں کہ جرنیلوں کی ملازمت میں توسیع کرنے کا اختیار وزیراعظم کو حاصل ہے لیکن اسحاق خاں نے ان کے سامنے 8 ویں ترمیم کے تحت صدر کو ملنے والے اختیارات کی تفصیل رکھ دی اور انہیں کہا کہ "بی بی! میں آئین کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کروں گا"۔

23 جولائی 1990ء کو 29 ذوالحجہ تھی اور دو روز بعد محرم کا مہینہ شروع ہورہا تھا --- غالب امکان یہی تھا کہ محرم کے موقع پر شیعہ سنی فسادات کا بہانہ بناکر فوج بے نظیر کو اقتدار سے فارغ کردے گی۔اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے بے نظیر بھٹو نے یوسف رضا گیلانی کو نواز شریف کے پاس بھجوایا تاکہ محرم کے ایام میں امن عامہ کی صورتحال قابو میں رکھنے کے لئے مشترکہ حکمت عملی اختیار کی جاسکے۔یوسف رضا گیلانی نے قومی اسمبلی کے سپیکر ملک معراج خالد کے چیمبر میں 23 جولائی 1990ء کو میاں منظور وٹو' ملک نعیم اور غلام حیدر وائیں کے ساتھ مذاکرات کئے۔مرکزی حکومت نے پنجاب کے نمائندوں کو انٹیلی جنس ایجنسیوں کی رپورٹوں کے حوالے سے اپنی تشویش سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی "را" کی طرف سے محرم کے ایام میں وسیع پیمانے پر فسادات کرائے جانے کا خدشہ موجود ہے اس لئے امن عامہ کی

صورتحال بہتر بنانے کے لئے پنجاب مرکز کے ساتھ تعاون کرے۔ظاہر ہے کہ قومی اہمیت کے معاملات پر پنجاب نے مرکز کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادگی ظاہر کردی --- غلام اسحاق خاں نے پنجاب حکومت کے نمائندوں کو پی پی پی کے ساتھ شیر شکر ہوتے دیکھا تو انہوں نے مرکز اور پنجاب کے درمیان مصالحت کی غرض سے قائم کی جانے والی پنجاب کمیٹی کے ارکان میاں منظور وٹو' ملک نعیم اور غلام حیدر وائیں کو ایوان صدر طلب کیا --- اسحاق خاں کے ساتھ ملاقات کے بعد مصالحت کی غرض سے قائم کی جانے والی مرکز اور پنجاب کی کمیٹی کا آپس میں رابطہ ختم ہوگیا --- غلام مصطفیٰ کھر نے اسی روز اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے پیپلزپارٹی کی حکومت پر ہارس ٹریڈنگ اور کرپشن کے الزامات لگائے اور بے نظیر بھٹو حیران تھیں کہ پی پی پی میں شامل ہونے کے لئے منت سماجت کرنے والے کھر کو راتوں رات کیا ہوگیا ہے --- غلام مصطفیٰ کھر ان دنوں اپنے دست راست غلام مصطفیٰ جتوئی کے اشارے پر بے نظیر بھٹو کے خلاف جہاد کے لئے میدان میں اترے تھے۔ اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بے نظیر بھٹو نے 29 جولائی 1990ء کو اسحاق خاں اور امریکی سفیر رابرٹ اوکلے سے ملاقات کی --- رابرٹ اوکلے بے نظیر کے ساتھ ملاقات کے لئے 29 جولائی 1990ء کو صبح سے ہی بے تاب تھے کیونکہ اس روز اسحاق خاں کی بے نظیر سے ملاقات متوقع تھی۔اوکلے نے بے نظیر کو کہا کہ وہ پہلے اسحاق خاں سے ملاقات کرلیں اور وہ انہیں اس کے بعد ملنے آئیں گے۔رابرٹ اوکلے اس وقت ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کررہے تھے۔

30 جولائی 1990ء کو متحدہ اپوزیشن کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں عابدہ حسین ' جتوئی ' حاجی قدر گل ' مولانا سمیع الحق ' غلام حیدر وائیں ' نواز شریف ' جنرل مجید ملک ' مولانا عبدالستار نیازی ' نوابزادہ نصراللہ خاں ' چوہدری شجاعت حسین اور غلام احمد بلور نے شرکت کی۔اس روز متحدہ اپوزیشن کے ارکان کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے کی خوشخبری سنا دی گئی ہے - یکم اگست 1990ء کا دن پاکستان کے لئے اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل تھا کہ اس روز سعودی عرب میں عراق اور کویت کے نمائندوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات ناکام ہوگئے --- اگلے روز عراق نے کویت پر چڑھائی کردی جس پر سلامتی کونسل نے عراق کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ وہ فوراً" کویت سے اپنی فوجیں واپس بلائے --- جبکہ امریکہ نے جنگی جہازوں کو خلیج پہنچنے کا حکم دے دیا --- بین الاقوامی سطح پر ہونے والی اس قدر اہم ترین تبدیلی کے بعد بے نظیر بھٹو کو ان کے مخلص ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ وہ مڈٹرم انتخابات کروانے کے لئے اپوزیشن کے مطالبات کو تسلیم کرلیں۔کیونکہ فوج اور اسحاق خاں خلیج کی صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی حکومت کو ختم کرسکتے ہیں۔محترمہ بے نظیر نے آئی ایس آئی اور انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ اپنی مرضی سے مقرر کئے تھے لیکن آئی ایس آئی اور انٹیلی جنس بیورو کی طرف سے حیرت انگیز طور پر بحران کے دنوں میں جب عام کارکن کو بھی حالات کی سنگینی کا اندازہ تھا انہیں سب "اچھا" ہے کی رپورٹیں وصول ہونا شروع ہوگئیں۔4 اگست 1990ء کو بے نظیر بھٹو نے اپنے رفقاء سے مشاورت کا سلسلہ شروع کیا --- خواجہ طارق رحیم اور احمد سعید اعوان ان دنوں بے نظیر بھٹو کے مشیر خاص کی حیثیت رکھتے تھے۔ان مشیروں کی رائے یہ تھی کہ اپوزیشن ایوان کے اندر تبدیلی کے ذریعے بے نظیر کو اقتدار سے محروم کرنے کا ٹارگٹ حاصل نہیں کرسکتی --- حالانکہ اس وقت مسئلہ عدم اعتماد کی تحریک کا نہیں بلکہ اسمبلی بچانے کا تھا ---

محترمہ بے نظیر بھٹو نے غلام مصطفیٰ کھر کو پی پی پی میں تو شامل کرلیا تھا لیکن انہوں نے کھر کو ان کی خواہش کے مطابق پنجاب میں نواز شریف کو وزارت اعلیٰ سے محروم کرنے کی صورت میں یہ منصب سنبھالنے کی اجازت نہ دی۔ اور اس چیز کا کھر کو بہت رنج تھا چنانچہ کھر نے پی پی پی میں شامل ہوکر وفاقی کابینہ میں نقب لگائی۔ان کے پی پی پی کے ساتھ تعلقات میں گرمجوشی کبھی بھی نہ آسکی کیونکہ انٹیلی جنس بیورو اور آئی ایس آئی کی طرف سے کھر کے بارے میں بے نظیر بھٹو کو مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہ ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کررہے ہیں۔کھر نے جب دیکھا کہ بے نظیر بھٹو ان پر اعتماد نہیں کررہیں تو انہوں نے ان کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ شروع کردیا --- کھر کے جتوئی اور نواز شریف کے ساتھ خفیہ روابط بے نقاب ہوئے تو وہ کھل کر بے نظیر کے خلاف میدان میں اتر آئے۔کھر کے بقول 1977ء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد فوج نے انہیں گرفتار کرکے کئی روز بعد جی ایچ کیو میں رکھا۔"مجھے یہ کہا گیا کہ اگر

آپ بھٹو کو سیاسی طور پر تباہ کرنے پر آمادہ ہوجائیں تو آپ کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کیا جائے گا اور اس کے بدلے جس قسم کا آپ منصب چاہیں اس کا بھی بندوبست کردیا جائے گا۔ لیکن میں نے بھٹو کے ساتھ غداری نہ کی اور فوج کی طرف سے کی جانے والی پیشکش ٹھکرا دی۔ اور یوں میں نے جلا وطنی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ مارشل لاء ختم ہونے کے بعد جب وطن واپس آیا تو مجھے پھر دوبارہ اس قسم کی پیشکش کی گئی کہ میں پی پی پی کے خلاف کام کروں --- لیکن اس مرتبہ بھی میرا یہی جواب تھا کہ میں بھٹو کے ساتھ غداری نہیں کروں گا۔ لیکن اس کے باوجود نجانے مجھے کس کس کا ایجنٹ کہا جارہا ہے۔ جب میں نے ایوب خاں کا ساتھ چھوڑا تھا تو مجھے سی آئی اے کے ایجنٹ کے خطاب سے نوازا گیا۔ جب بھٹو کا ساتھ چھوڑا تو اس وقت بھی امریکی سی آئی اے کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔ اور اب مجھے فوج کا ایجنٹ کہا جارہا ہے اور کہا جارہا ہے کہ فوج کے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ میرے روابط ہیں۔ اس قصے میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ جنرل درانی ایک مرتبہ مجھے ہوائی جہاز میں ملے تھے۔ اور حال ہی میں میں نے فوج کے سربراہ جنرل بیگ کی صاجزادی کی شادی میں شرکت کی تو کہا گیا کہ فوج نے مجھے کلیرنس دے دی ہے۔ میں نے پی پی پی میں شمولیت اختیار کرتے وقت کہا تھا کہ میں کرپشن کے خلاف جہاد کروں گا اور آج میں اس جہاد کا آغاز کررہا ہوں۔ موجودہ صورتحال کا بے نظیر بھٹو کو جائزہ لینا چاہئے کیونکہ وزراء اور بعض دوسرے افراد جو کچھ کر رہے ہیں اس کی ذمہ داری وزیراعظم پر عائد ہوگی کیونکہ وہ سربراہ ہیں۔ میں پاکستان پیپلزپارٹی میں رہ کر اس پارٹی کو زیادہ فعال' موثر اور پسے ہوئے کارکنوں کو ان کے حقوق دلانا چاہتا تھا۔ میں نے پارٹی کے اندر کوئی پریشر گروپ نہیں بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی اسمبلی کے بعض ارکان نے لاہور میں مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ کوئی 13- 14 ارکان تھے جن میں راؤ سکندر اقبال ، انوارالحق اور بعض دوسرے ارکان شامل تھے۔ اس سے پہلے اسلام آباد میں آمنہ پراچہ کی صدارت میں بھی ایک اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں ارکان اسمبلی اور وزراء نے پارٹی کی داخلی صورتحال اور حکومت کی پالیسیوں پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ یہ اسی قسم کا اجلاس تھا۔ جب لندن سے واپس آیا تو ان ارکان اسمبلی اور وزراء نے کہا کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ آپ میرے گھر

آئیں۔ میں آپ کو کھانا کھلاؤں گا کیونکہ میں زمیندار ہوں اور زمیندار لوگ گھر میں آنے والے کو کھانا کھلاتے ہیں۔ چنانچہ لاہور میں' میں نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ بعد میں قومی اسمبلی کے رکن ملک اسلم نے کہا میرے گھر میں ائرکنڈیشنر ہے۔ آپ وہاں چلیں چنانچہ ہم ملک اسلم کے گھر چلے گئے جہاں ہم نے مل کر موجودہ سیاسی صورتحال پر غور کیا اور اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ اس وقت پارٹی کے کارکنوں میں مایوسی ہے۔ جب میں لندن سے واپس آیا تو بجٹ اجلاس کے دوران ارکان قومی اسمبلی میں ہر طرف مایوسی نظر آئی اور کئی ارکان قومی اسمبلی ناراض بھی نظر آتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ وزراء کے خلاف تیس تیس چالیس چالیس ارکان اجلاس کررہے تھے۔ وزراء کے کھانوں کے بائیکاٹ کررہے تھے اور وزراء کی کرپشن پر تنقید کررہے تھے۔ میں اس صورتحال کے پیش نظر وزیراعظم سے ملنا چاہتا تھا تاکہ انہیں بتاسکوں کہ صورتحال کیا ہے۔ اس دوران وزیراعظم سے ایک کھانے پر ملاقات ہوئی لیکن اس وقت تمام وزراء موجود تھے۔ اس لئے اس وقت بات نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ جن وزراء کے خلاف بات کرنا تھی وہ سب وہاں موجود تھے۔ میں نے ملٹری سیکرٹری سے وزیراعظم سے ملاقات کا وقت مانگا۔ بعد میں جب مسٹر جتوئی کی والدہ کی وفات پر فاتحہ خوانی کے لئے گیا تو کراچی میں ملٹری سیکرٹری نے مجھے فون کیا کہ آپ وزیراعظم سے ملاقات کریں۔ لیکن بدقسمتی سے اس رات خراب موسم کے باعث جہاز لینڈ نہ ہوا اور ملاقات نہ ہوسکی۔ اس دوران مجھ سے لاہور میں ارکان قومی اسمبلی ملنے کے لئے چلے آئے۔ میں نے ان کی باتیں سنیں تو مجھے تشویش ہوئی - اگر وزیراعظم یا پارٹی کے خلاف کوئی سازش کرنا ہوتی تو وہ اس طرح نہ ہوتی کہ کھلے بندوں سب کچھ کیا جائے۔ ارکان اسمبلی سے میرا تعلق ہے تو ان کی مجھ سے توقعات ہیں - ان منتخب نمائندوں نے جب صورتحال کا تذکرہ کیا تو میں نے انہیں کہا کہ حوصلہ رکھیں۔ آپ منتخب نمائندے ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں ساری صورتحال سے وزیراعظم کو آگاہ کروں گا کیونکہ میں نے وزیراعظم سے نہ کسی فائل پر ہی دستخط کرائے ہیں اور نہ ہی میں کسی سے خوفزدہ ہوں۔ میں وزارت کا بھی امیدوار نہیں۔ میں وزیراعظم سے پارٹی کے مفاد میں ملنا چاہتا تھا۔ اس اجلاس کے بعد اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ میں

نے پریشر گروپ تشکیل دیا ہے جو سراسر غلط خبر تھی اور میں نے اس خبر کی تردید کی۔میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ میں وزیراعظم کو ساری صورتحال سے آگاہ کروں گا۔انہوں نے کہا کہ بدقسمتی سے میں نے سنا کہ وزیراعظم نے اس اجلاس سے متعلق ناراضگی کا اظہار کیا۔مجھے توقع نہیں تھی کہ وزیراعظم یا پارٹی لیڈر ایسی صورتحال میں اس طرح کا ردعمل کا اظہار کرے گا کیونکہ سیاست میں ایسا ہوتا ہے اور لیڈر کو سب کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ایسے حالات میں کئی مرتبہ ہم نے ماضی میں لوگوں سے براہ راست بات کرکے ان کے مسائل حل کیے۔اس اجلاس سے کوئی سازش نہیں ہوئی۔کوئی پارٹی لیڈر یا وزیراعظم اس طرح الگ تھلگ ہوجائے اور وہ لوگوں کو ملنے جلنے سے گریز کرے تو پھر جمہوریت آمریت میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے میرا گہرا تعلق ہے۔ وہ میرے دوست کی بیٹی ہیں۔مجھے پتہ نہیں کہ آج میں ہوں یا نہیں' لیکن کل تک تو میں پنجاب میں پیپلزپارٹی کا انچارج بھی تھا - میں ایک سیاستدان ہوں۔صورتحال کا مشاہدہ کررہا ہوں۔جو کچھ پارٹی کے اندر ہورہا ہے اس پر بھی میری نظر ہے۔اس وقت پیپلزپارٹی اور آئی جے آئی میں بھی دو دھڑے ہیں۔میں جانتا ہوں کہ سیاسی نظام صرف سیاسی جماعتوں سے چل سکتا ہے۔پیپلزپارٹی ایک قومی جماعت ہے اور اس کو تباہ کرنا سیاسی نظام کو تباہ کرنے کے مترادف ہے - جب میں نے پیپلزپارٹی میں شمولیت اختیار کی اس وقت میرے علاوہ غیر مشروط طور پر پارٹی میں کون شامل ہوا تھا۔ اگر میں ارکان اسمبلی کو پیپلزپارٹی میں شامل کرکے انہیں وزیر بنوا سکتا ہوں تو کیا میں خود کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔میں پیپلزپارٹی کی ملک کے چاروں صوبوں میں جڑیں مضبوط بنانا چاہتا تھا۔جب میں نے پارٹی میں شمولیت اختیار کی تو اس وقت ایم کیو ایم علیحدہ ہوگئی تھی اور اب تو پارلیمنٹ میں وزیراعظم کو اکثریت حاصل ہے۔اب کوئی شمار نہیں ہے۔اس کے بعد جب وزیراعظم کو اکثریت حاصل ہے تو پھر انہیں اگلے قدم کے طور پر عوام کی خدمت کرنا چاہیے تھی۔صورتحال یہ ہے کہ اس وقت پیپلزپارٹی کمزور ہوئی ہے اور مخالف دھڑا مضبوط ہوا ہے۔ایک طرف وزراء صاحبان مزے لوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف کارکن ٹکٹکی پر ہیں اور وہ پولیس کے تشدد کا نشانہ بن رہے ہیں۔ان پر جھوٹے مقدمات بنائے جارہے ہیں۔اس وقت جو مرکز اور پنجاب میں مصالحت کی

بات ہورہی ہے یہ سب فراڈ ہے - مصالحت کرنا ہوتی تو تین ماہ کی ضرورت نہیں تھی۔صرف تین دن میں مصالحت ہوسکتی تھی - آپ دیکھیں گے کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔جب مرکز پنجاب مذاکرات ہورہے ہیں تو ان میں کارکنوں کا کوئی ذکر نہیں کیا جارہا ' جن کے خلاف پنجاب پولیس انتقامی کارروائیاں کررہی ہے اور جھوٹے مقدمات بنائے جارہے ہیں۔میں صرف 2 سال اقتدار میں رہا ہوں اور عوام سے چار مرتبہ ووٹ لے چکا ہوں۔اپنی ایک نشست جتوئی کو جتواکر لایا ہوں لیکن پیپلزپارٹی کو اگر کل انتخابات لڑنا پڑیں تو اس کے پاس نہ تو بھٹو کی لاش ہے اور نہ کوئی دوسرا کارنامہ اور کارکن جو پیپلزپارٹی کی اصلی قوت ہیں' وہ مایوس ہیں - آخر پارٹی کس بنیاد پر انتخابات جیت سکے گی۔اس وقت ایم این اے اور وزرا آپس میں لڑ رہے ہیں۔لوگوں کی فلاح اور بھلائی کا کوئی کام نہیں ہورہا۔وزرا اور ارکان کا آپس میں کوئی رابطہ یا تعلق نہیں۔وزراء جنہیں ملک کی بات کرنا چاہیے وہ صرف اپنے حلقے کی بات کرتے ہیں۔ہماری جماعت غریب اور متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔11 سال تک مار کھاکر مالی لحاظ سے تباہ ہوچکے ہیں۔انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔جہاں وہ پہلے تھے اب بھی وہیں ہیں۔اس صورتحال میں میرا فرض بنتا ہے کہ میں وزیراعظم کو بتاؤں کہ آپ کی پارٹی کے مخلص کارکن انتہائی دل شکستہ اور مایوس ہے۔بھٹو کی موت نے پارٹی کو زندگی دی تھی۔11 سال میں پیپلزپارٹی کے کارکن مارشل لاء کے ہاتھوں شاید اتنا بے عزت نہیں ہوئے جتنا کہ وہ آپ بے عزت ہورہے ہیں۔اس وقت وہ ایک امید' ایک نظریئے کی خاطر مصائب برداشت کرتا تھا کہ لیکن اب وہ اپنوں کی بدسلوکی برداشت نہیں کرسکتا۔یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک میں کرپشن ہر سطح پر پھیل چکی ہے۔ایک طرف اگر پنجاب میں زمینیں بانٹی جارہی ہیں تو دوسری طرف وفاقی حکومت نے بنکوں کے دروازے کھول رکھے ہیں۔گزشتہ انتخابات میں مسٹر بھٹو کی موت کا پنجاب کے عوام پر قرض تھا جو انہوں نے اتار دیا ہے۔ اس کے ساتھ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کا امیج تھا۔اب اگر یہ امیج داغدار ہوجائے تو وہ اگلے انتخابات میں عوام کو کیا بتائیں گے؟ ارکان اسمبلی اور وزراء میں پھوٹ ہے۔اگر سیاست ڈرگ مافیا اور کروڑ پتیوں کے حوالے کرنی چاہیے تو پھر میرے جیسے لوگوں کو گھر بیٹھ جانا چاہیے -

بے نظیر بطور اپوزیشن لیڈر

بے نظیر بھٹو نے عوامی تائید و حمایت سے اقتدار حاصل کیا تھا لیکن انہیں عوامی حمایت میسر ہونے کے باوجود پہلے 1990ء اور پھر 1996ء میں اقتدار سے الگ کردیا گیا --- بے نظیر بھٹو کو قائد حزب اقتدار سے اختلاف بنانے میں صدر مملکت‘ سیاسی جماعتوں اور فوج نے انتہائی اہم کردار ادا کیا --- غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیراعظم بننے کے بعد بے نظیر کو انتخابی عمل سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے سیاستدانوں کو نااہل قرار دلوانے کے لئے خصوصی ٹریبونل بنائے --- بے نظیر بھٹو کے لئے یقیناً یہ آزمائش کا وقت تھا --- یہ ان کی سیاسی سمجھ بوجھ کا امتحان تھا کیونکہ وہ صرف سابق وزیراعظم ہی نہ تھیں بلکہ ایک جمہوری اور عوامی سیاسی جماعت کی سربراہ بھی تھیں --- وہ ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی بھی تھیں --- ان کے غلط فیصلے پیپلزپارٹی کی موت کا باعث بن سکتے تھے --- غلام مصطفیٰ جتوئی نے اپنے دست راست کھر کے ذریعے بے نظیر بھٹو تک پیغام پہنچایا کہ ان کے خلاف بدعنوانی کے ثبوت اکٹھے کرلئے گئے ہیں - ”آپ نہ صرف انتخابات میں حصہ لینے سے نااہل قرار دے دی جائیں گی بلکہ آپ کے شوہر کو مختلف مقدمات میں ہمیشہ کے لئے جیل میں مقید کردیا جائے گا --- خود‘ آپ کی اپنی گرفتاری کسی بھی وقت عمل میں آسکتی ہے“ جتوئی نے بے نظیر بھٹو کو پیغام بھیجا‘ جتوئی چاہتے تھے کہ بے نظیر پاکستان چھوڑ جائیں۔ ”میں پاکستان نہیں چھوڑوں گی“ بے نظیر نے جتوئی کے ایجنٹوں کو جواب دیا --- خود بے نظیر کے بعض قریبی رفقاء نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کرنے کا عمل شروع کردیا تھا --- وہ حکومت سے ہدایت لے کر بے نظیر کو ہر آنے والے کل کے بارے میں خوف زدہ کرتے رہے

- اقتدار سے علیحدگی کے ایک ہفتے بعد ہی بے نظیر نے انکشاف کردیا کہ مجھے سیاست چھوڑنے کی صورت میں معافی کی یقین دہانی کرائی گئی ہے لیکن میں نہ تو سیاست چھوڑوں گی اور نہ ہی ملک - میرا جینا میرا مرنا پاکستان کے ساتھ ہے --- جتوئی نے بے نظیر بھٹو کے دور میں بنائے جانے والے آئی ایس آئی اور انٹیلی جنس بیورو کے سربراہوں کو تبدیل کردیا --- شمس الرحمٰن کلو کی جگہ پر جنرل اسد درانی کو ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی بنا دیا گیا ---

20 اگست 1990ء کو بے نظیر بھٹو نے اسحاق خاں سے ملاقات کی۔ اس موقع پر ان کے شوہر آصف زرداری موجود تھے - ”میں سمجھتی ہوں کہ نگران حکومت احتساب کے نام پر الیکشن ملتوی کروانے کی کوشش کرے گی“ بے نظیر بھٹو نے اسحاق کے سامنے خدشہ ظاہر کیا - ”میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ الیکشن کے پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوگی اور سرکاری میڈیا کو اپوزیشن کی کردار کشی کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی - بے نظیر نے 20 اگست 1990ء کو اسحاق خاں سے اور جتوئی نے مسلح افواج کے سربراہوں سے ملاقات کی --- یہ دونوں ملاقاتیں اس لحاظ سے بہت اہم تھیں کہ مسلح افواج کے نمائندوں نے جتوئی کو پروگرام کے مطابق انتخابات کو یقینی بنانے کے لئے مشورہ دیا - بے نظیر بھٹو نے کھر کی بے وفائی کا نوٹس لیتے ہوئے انہیں پیپلزپارٹی سے نکالنے کے لئے شوکاز نوٹس جاری کردیا --- اسی دن پشاور ہائی کورٹ نے پیپلزپارٹی کی طرف سے اسمبلیاں توڑنے کے فیصلے کے خلاف دائر کی جانے والی رٹ کو سماعت کے لئے منظور کرکے فل بنچ تشکیل دینے کا اعلان کردیا --- 23 اگست 1990ء کو جتوئی نے احتساب کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کردیں --- 26 اگست 1990ء کو بے نظیر بھٹو نے انتخابی مہم کے دوران اسحاق خاں کو وارننگ دیتے ہوئے کہا ”اسحاق خاں کان کھول کر سن لو‘ ہم پھر آرہے ہیں“ سکھر میں اپنے دورے کے دوران کی جانے والی بے نظیر بھٹو کی اس تقریر نے اسحاق خاں کو مزید چوکنا کردیا اور بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے دور رکھنا ان کی زندگی کا واحد اور واحد مشن بن کر رہ گیا ---

سیاسی یتیموں کی بے وفائیاں

بے نظیر بھٹو کو 6 اگست 1990ء کو اقتدار سے علیحدہ کیا گیا اور جس سازش کے تحت ان کی حکومت ختم کی گئی اس سازش میں زیادہ تر سیاسی یتیم شریک تھے --- ان سیاسی یتیموں میں غلام مصطفیٰ کھر اور غلام مصطفیٰ جتوئی سرفہرست تھے جبکہ پس پردہ قوتوں میں وفاقی حکومت کے بعض بیورو کریٹس' فوج کے سربراہ جنرل اسلم بیگ' آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جنس کے بعض افسران شامل تھے --- بے نظیر بھٹو ایک سال' آٹھ ماہ اور 4 دن برسراقتدار رہیں - 29 مئی 1988ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ منتخب وزیراعظم کو غیر جمہوری انداز میں وزیراعظم ہاؤس سے اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا --- بے نظیر بھٹو کو 6 اگست 1990ء کی سہ پہر اسحاق خاں کے فیصلے سے 45 منٹ پہلے احساس ہوا کہ معاملہ ختم ہونے والا ہے --- مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کے باوجود ان کے سامنے 1977ء والا منظر گھوم گیا --- انہیں معلوم تھا کہ اسمبلی توڑنے سے پہلے فوج کس طرح حرکت میں آتی ہے - "ابھی موقع ہے' آپ اسحاق خاں کو اسمبلی توڑنے کی ایڈوائس ارسال کردیں" فاروق لغاری نے بے نظیر بھٹو کو مشورہ دیا کیونکہ فاروق لغاری کو وقت دینے کے باوجود اسحاق خاں نے ان سے ایوان صدر میں ملاقات کرنے سے انکار کردیا تھا - ایوان صدر میں داخل ہونے والی شخصیات کے متعلق بے نظیر کو شمس الرحمٰن کلو نے جو رپورٹیں ارسال کیں وہ یہ سمجھ لینے کے لئے کافی تھیں کہ معاملہ گڑ بڑ ہے - "پنڈی والوں کے عزائم کیا ہیں" --- بے نظیر نے آئی ایس آئی کے سربراہ شمس الرحمٰن کلو سے فوج کے فیصلے کے بارے میں پوچھا - تو انہیں بتایا گیا کہ ٹروپس ریڈ الرٹ ہیں اور کسی بھی وقت فوج حرکت میں آسکتی ہے" --- کلو نے بے

نظیر کو بتایا کہ یہ وقت بڑے بڑے فیصلے کرنے کے لئے موزوں ہے --- بے نظیر بھٹو کا ایک بھی بڑا فیصلہ ان کے سیاسی قد کو بڑھانے میں مدد دے سکتا تھا لیکن بے نظیر ڈر گئیں --- وہ اس وقت تنہا ہوچکی تھیں --- سیاسی یتیموں نے ان کے ساتھ ہاتھ کردیا تھا --- اسمبلیاں ٹوٹنے والی تھیں - "یہ جتوئی اور نواز شریف کدھر ہے" - بے نظیر نے اپنے زیر کنٹرول اداروں سے پوچھا - "جتوئی اور نواز شریف کے اسحاق خاں کے ساتھ ٹیلی فون پر روابط برقرار ہیں۔ خصوصاً" جتوئی ایوان صدر جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں" --- بے نظیر کو بتایا گیا۔ بیبی منوالہ اسحاق خاں سے مل کر آئے تو بے نظیر نے امید بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا "کیا رپورٹ ہے" --- بے نظیر نے پوچھا --- "اسحاق خاں نے مجھے تسلی دی ہے کہ قومی اسمبلی کا معاملہ گڑ بڑ لگ رہا ہے" بیبی منوالہ نے بے نظیر کو بتایا --- خواجہ طارق رحیم خود کو اسحاق خاں کا دوست سمجھتے تھے - انہوں نے بھی بے نظیر کے پاس بیٹھے بیٹھے اسحاق خاں سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ایوان صدر کے عملے نے ان کی اسحاق سے کال ملانے سے انکار کردیا جس پر وہ مشتعل ہوگئے۔ بے نظیر بھٹو کو سمجھ ہی نہ آسکی کہ خواجہ طارق رحیم ڈرامہ کر رہا ہے۔ بے نظیر نے کراچی میں اپنے شوہر آصف زرداری کو جو اس وقت بلاول ہاؤس ٹھہرے ہوئے تھے فون کرکے کہا کہ "اسحاق اسمبلیاں توڑ رہا ہے" --- "آپ اسحاق کو خود فون کریں" --- آصف زرداری نے بے نظیر کو مشورہ دیا --- چنانچہ اس وقت جب صحافیوں کو ایوان صدر یہ بتائے بغیر طلب کیا جارہا تھا کہ اسحاق ایک اہم اعلان کرنے والے ہیں' بے نظیر نے اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ وہ ان کی صدر سے بات کرائیں - اسحاق خاں نے لائن پر آنے میں کچھ دیر لگادی اور بے نظیر کے پوچھنے پر انہوں نے اس خبر کی تصدیق کردی کہ میں نے اسمبلیاں توڑ دی ہیں - "صبح آپ نے کہا تھا کہ میں اسمبلیاں نہیں توڑ رہا" --- بے نظیر نے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا --- "میں نے یہ فیصلہ ابھی کیا ہے" اسحاق نے دلیل دی --- "کیا مجھے گرفتار کرلیا جائے گا" --- فوراً" بے نظیر کے ذہن میں خوف میں مبتلا کردینے والا خیال ابھرا - کیا میرے بچوں اور شوہر کو بھی پکڑ لیا جائے گا" --- بے نظیر نے یہ سوچتے ہوئے رابرٹ اوکلے کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کدھر ہیں لیکن رابرٹ اوکلے سے ان کی بات نہ ہوسکی --- رابرٹ اوکلے نے رات گئے بے

نظیر سے فون پر بات کی - ”ہمیں اسحاق نے یقین دہانی کرائی ہے کہ آپ کو گرفتار نہیں کیا جائے گا اور پیپلز پارٹی کو آئندہ الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی“ - اوکلے نے بے نظیر کو تسلی دی --- ”پورا ملک داؤ پر لگا دیا گیا ہے ہم عوام کی عدالت میں جائیں گے اور عوام کا فیصلہ آج کے فیصلے پر غالب آجائے گا“ - بے نظیر نے اقتدار سے علیحدگی کے بعد محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے اخبار نویسوں کو بتایا --- بے نظیر بھٹو کو دھوکہ دینے والوں میں کھر سر فہرست تھے۔ کھر کو علم تھا کہ اسمبلیاں ٹوٹ رہی ہیں لیکن انہوں نے بے نظیر کو پنجاب کے ساتھ محاذ آرائی میں الجھائے رکھا اور 6 اگست 1990ء کو جتوئی نے نگران وزیراعظم کے طور پر حلف لیا تو کھر ان چند وزراء میں شامل تھے جنہوں نے پہلی کھیپ میں حلف اٹھایا --- ”کھر کی سیاست بکواس ہے“ --- بے نظیر نے کھر کی کابینہ میں شمولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا --- ایوان صدر میں 6 اگست 1990ء کی سہ پہر فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ اقتدار کی منتقلی کے عمل کو دیکھنے کے لئے بذات خود موجود تھے - جتوئی جس وقت نگران وزیراعظم کے طور پر حلف لے رہے تھے تو جنرل مرزا اسلم بیگ متفکر انداز میں مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے --- کیونکہ ملک میں ہنگامی حالت نافذ کردی گئی تھی - اگرچہ آئین نہیں توڑا گیا تھا لیکن آئین کی دفعات کو مذاق بنا دیا گیا تھا جن کے تحت صدر مملکت کو اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات حاصل ہیں - ”بدعنوان سیاستدانوں کو انتخابی عمل میں حصہ لینے کا حق حاصل نہیں ہوگا“ --- جتوئی نے حلف لیتے ہی اعلان کیا - جبکہ انتخابات کے لئے 24 اکتوبر کی تاریخ مقرر کردی گئی - ”میں نے آئین کے آرٹیکل 58 کی دفعہ 2 بی کے تحت اپنے اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے آج قومی اسمبلی توڑ دی ہے اور وزیراعظم بے نظیر بھٹو اور ان کی کابینہ کو برطرف کردیا گیا ہے صوبوں میں گورنر حضرات نے اسمبلیاں توڑ دی ہیں - قومی اسمبلی کے انتخابات 24 اکتوبر اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 27 اکتوبر کو منعقد ہوں گے“ --- اسحاق خاں نے ایوان صدر میں حیرت میں مبتلا اخبار نویسوں کو بتایا --- لیکن اسحاق خاں نے اسمبلی توڑنے کے متعلق جو چارج شیٹ جاری کی اس کو درست ثابت نہ کیا جاسکا۔ 7 اگست 1990ء کو بے نظیر بھٹو نے وزیراعظم ہاؤس چھوڑ دیا --- وہ کراچی روانگی سے قبل امریکی سفیر رابرٹ اوکلے سے ملیں - رابرٹ اوکلے نے

بے نظیر کو بتایا کہ ملک میں مارشل لاء نافذ نہیں ہوگا کیونکہ امریکی حکومت نے پاکستان میں جمہوریت کے تسلسل کی حمایت کی ہے --- جس وقت بے نظیر نے اسلام آباد چھوڑا“ جتوئی اس وقت نگران کابینہ کے اجلاس میں مصروف تھے ”انتخابات سے پہلے احتساب ہوگا“ جتوئی نے اعلان کیا --- جتوئی نے اس دن بے نظیر بھٹو کے خلاف نااہلی کا ریفرنس تیار کرنے کے لئے حساس اداروں کے ذمہ ڈیوٹیاں لگادیں --- جتوئی انتخابات کو مارچ 1991ء تک ملتوی کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے تیارہ کردہ فارمولے کے تحت تین ماہ کے اندر احتساب کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا تھا --- ے تاہم اسحاق اور جنرل اسلم بیگ نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا کیونکہ آئین میں یہ واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ اسمبلی ٹوٹنے کی صورت میں صدر مملکت 90 روز کے اندر انتخابات کرائیں گے۔

مسلم لیگ کی بے نظیر کے خلاف صف بندی

بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمہ کے ایک ماہ بعد نگران وزیراعظم مصطفیٰ جتوئی نے عام انتخابات کے لئے شیڈول کا اعلان کیا جس کے تحت قومی اسمبلی کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے لئے آخری تاریخ 12 اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے 15 ستمبر مقرر کی گئی۔ جتوئی انتظامیہ نے الیکشن کمیشن کے ذریعے انتخابات کے شیڈول کے اعلان سے پہلے بے نظیر بھٹو کے خلاف صف بندی مکمل کر لی تھی۔ اسحاق خاں نے جس دن بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے الگ کیا اسی دن مسلم لیگ میں دو افراد وزارت عظمیٰ کے عہدے کے امیدوار بن گئے۔ ان میں سے ایک محمد خاں جونیجو اور دوسرے میاں محمد نواز شریف تھے جبکہ ایسے مسلم لیگی رہنماؤں کی کمی نہ تھی جن کے دل میں یہ عہدہ حاصل کرنے کی خواہش مچل رہی تھی۔ لیگ کے صدر محمد خان جونیجو کا خیال تھا کہ ان کی جماعت کو کسی قسم کی بیساکھی کے بغیر 24 اکتوبر 1990ء کو ہونے والے انتخابات میں حصہ لینا چاہئے جبکہ نواز شریف اس کے حق میں نہ تھے کیونکہ ''اسحاق خاں اور جنرل بیگ پلان'' کے تحت اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل جماعتوں کو ایک ہی پلیٹ فارم اور ایک ہی انتخابی نشان کے تحت الیکشن میں حصہ لینا تھا۔ جتوئی اور نواز شریف دونوں ایک دوسرے سے خائف تھے۔ ان حالات میں بے نظیر بھٹو نے بھی اپنے دیرینہ ساتھیوں کے ساتھ از سر نو تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسلامی جمہوری اتحاد نے اپنا منشور تک تیار کر لیا تھا۔ جب انتخابی اتحاد بنانے کے لئے بے نظیر بھٹو نے ملک محمد قاسم کی مسلم لیگ کو اعتماد میں لیا۔ ملک محمد قاسم سیاسی افق پر موجود تو تھے لیکن ان کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بے نظیر بھٹو کے ساتھ اتحاد کر کے ان کا

قد کاٹھ بڑھ گیا۔ اس کے بعد بے نظیر نے ملک حاکمین کو اصغر خاں کے پاس بھجوایا تاکہ وہ ان کے ساتھ اتحاد کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کر سکیں۔ پی پی پی میں شامل بعض ارکان نے اصغر خاں کے ساتھ مذاکرات کرنے پر بے نظیر بھٹو کی سخت مخالفت کی۔ ''آپ اپنے والد کے قاتل کے ساتھ مذاکرات کریں گی تو ہماری کیا حیثیت رہے گی''۔۔۔۔ پی پی کے جیالے کارکنوں نے بے نظیر کے سامنے احتجاج کیا جس پر آصف زرداری نے انہیں ڈانٹا اور کہا کہ ''پہلے تم لوگوں نے بھٹو کو پھانسی لگوا دی اور اب بے نظیر کو پھانسی پر لٹکوانا چاہتے ہو؟ ہم اصغر خاں کے ساتھ مذاکرات کریں گے''۔۔۔۔۔۔
چنانچہ بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری نے خورشید قصوری اور بیگم مہناز رفیع کے ذریعے تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خاں کے ساتھ سیاسی اتحاد کے قیام کے لئے مذاکرات شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ بے نظیر بھٹو نے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے ساتھ بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ یوں ستمبر 1990 کے وسط میں بے نظیر بھٹو پیپلز ڈیموکریٹک الائنس کے نام سے اسلامی جمہوری اتحاد کے مقابلے میں ایک سیاسی اتحاد بنانے میں کامیاب ہو گئیں۔ بے نظیر بھٹو تو ایم کیو ایم کے ساتھ بھی صلح کرنے کے لئے تیار تھیں لیکن نواز شریف ان کی نسبت زیادہ تیز نکلے اور ان کی ایم کیو ایم سے پے در پے ملاقاتیں سود مند ثابت ہوئیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد سے باہر جماعتوں کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خاں نے بھی سیاسی صورتحال کو دیکھتے ہوئے الگ سیاسی اتحاد بنانے کا عمل شروع کر دیا۔ کیونکہ ان کا سیٹوں کی تقسیم کے مسئلہ پر اسلامی جمہوری اتحاد کے ساتھ تنازعہ ہو گیا تھا۔ بے نظیر بھٹو نے 10 ستمبر 1990ء کو بلاول ہاؤس میں اصغر خاں سے ملاقات کے بعد اپنے امیدواروں کا اعلان کر دیا۔ ''میں لاہور سے الیکشن نہیں لڑوں گی جبکہ میری جگہ اصغر خاں نواز شریف کے حلقے سے الیکشن لڑیں گے۔'' بے نظیر بھٹو نے اعلان کیا اور وقت نے ثابت کیا کہ بے نظیر بھٹو کا یہ فیصلہ درست نہ تھا اور اس کی وجہ سے پارٹی کو خاصا نقصان ہوا۔ جتوئی نے ملک معراج خالد اور غلام مصطفیٰ کھر کے ذریعے بے نظیر کو سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ تاہم بے نظیر نے اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کے بعد ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا جس پر ان کے خلاف 10 ستمبر 1990ء کو دو ریفرنس دائر کر دیئے گئے۔ اور اگلے دن

غلام مصطفیٰ کھر نے نواب زادہ نصراللہ خاں کے مقابلے میں الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔

یہ بڑی دلچسپ صورتحال تھی۔ سیاسی جماعتوں کے مرکزی دفاتر میں انتخابات میں حصہ لینے والوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ سیاسی جماعتیں اپنی مقبولیت کے گراف کو مدنظر رکھتے ہوئے امیدواروں سے "پارٹی فنڈز" کے نام پر رشوت وصول کر کے انہیں پارٹی ٹکٹ جاری کرنے میں مصروف تھیں۔ پی پی پی اور مسلم لیگ کے بعض رہنماؤں نے بعض امیدواروں سے لاکھوں روپے وصول کر کے انہیں ٹکٹ دلوائے۔ گویا انتخابات سے قبل ہی سیاستدانوں نے رشوت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ لیکن اس ساری صورتحال سے آنکھیں بند کئے اسحاق خاں، جتوئی اور جنرل مرزا اسلم بیگ۔ بے نظیر بھٹو کے خلاف کرپشن کے ثبوت اکھٹے کرنے میں مصروف تھے۔ جس پر 11 ستمبر 1990ء کو امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے باضابطہ طور پر حکومت پاکستان کو مشورہ دیا کہ بے نظیر بھٹو کے خلاف کارروائی سے قبل الزامات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لی جائے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے امریکی سیاستدانوں سے مدد طلب کی۔ امریکہ نے ستمبر 1990ء کو پاکستان پر واضح کر دیا تھا کہ اگر انتخابات میں دھاندلی ہوئی تو وہ پاکستان کو ملنے والی امداد پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی 1988ء میں منتخب ہونے والے ارکان اسمبلی کا احتساب چاہتے تھے جبکہ بے نظیر احتساب کا دائرہ اختیار 1985ء کی پارلیمنٹ تک بڑھانا چاہتی تھیں اور اس سلسلے میں انہوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر زبردست لابنگ کی جس کی وجہ سے 11 ستمبر 1990ء کو پاکستان میں متعین امریکی سفیر رابرٹ اوکلے نے کہا کہ پاکستان میں احتساب 1985ء سے کیا جائے۔ اگرچہ امریکی سفیر کا یہ بیان ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت تھی لیکن اس کے باوجود بے نظیر نے رابرٹ اوکلے کی تجویز سے اتفاق کیا۔ اب بے نظیر بھٹو کے خلاف وقفے وقفے سے ریفرنس دائر کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ 12 ستمبر 1990ء کو بے نظیر کے خلاف دو اور ریفرنس دائر ہوئے تو بے نظیر نے بھی اسحاق خاں کے احتساب کا مطالبہ کر دیا۔

جتوئی کی نگران حکومت

عوام نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو 1988ء کے انتخابات کے نتیجے میں 5 برس کے لئے منتخب کیا تھا لیکن فوج، اسلامی جمہوری اتحاد اور اسحاق خاں کی سازشوں کی وجہ سے پی پی پی کی حکومت ایک سال 8 ماہ اور 4 دن بعد ہی ختم کردی گئی --- اور بے نظیر بھٹو کے سیاسی حریف غلام مصطفیٰ جتوئی کو 3 ماہ کے لئے نگران وزیراعظم کا عہدہ دے دیا گیا۔ جنرل مرزا اسلم بیگ کی پہلی ترجیح قومی اسمبلی کے سپیکر ملک معراج خالد تھے لیکن معراج خالد نے اپنی روایتی وضع داری کی وجہ سے جنرل بیگ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا --- یوں غلام مصطفیٰ جتوئی کی زندگی بھر کی خواہش پوری ہو گئی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کا ختم ہونا جمہوری اداروں کے لئے خطرناک تھا لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت اپنے ہی ہاتھوں سے جمہوریت کے آشیانے کو آگ لگاکر خوشیاں منارہی تھی اور مسلم لیگی حضرات نواز شریف کو مبارکبادیں دے رہے تھے اور مستقبل کے حالات سے بے خبر نواز شریف خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ اس کی شاید وجہ یہ تھی کہ نواز شریف کو اب وزارت اعظمیٰ کے حصول کی منزل بہت قریب نظر آرہی تھی --- لیکن یہ محض فریب نظر تھا اور حقیقت حال سے بے خبر نواز شریف اس حقیقت کو فراموش کر کے فوج اور اسحاق خاں کے ساتھ مل کر بے نظیر کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے کہ یہ وقت ان پر بھی آسکتا ہے۔

پاکستان میں اسمبلیوں کا ٹوٹنا اب باعث حیرت نہیں رہا۔ بلکہ وہ وزیراعظم شاید نوبل انعام کا حق دار ٹھہرایا جائے گا جس نے آئندہ آنے والے سالوں میں اپنی مدت پوری کی۔ اور اگر کسی منتخب وزیراعظم کو آنے والے ایام میں 5 برس کا عرصہ حکومت

کرنے کو میسر آگیا تو سمجھ لیں کہ جمہوری آمریت کا دور ختم ہوگیا اور ملک میں
جمہوریت خود بخود بحال ہوجائے گی - وگرنہ جمہوریت کے نام پر جمہوریت کے ساتھ
مذاق کا سلسلہ جاری رہے گا - سیاستدانوں کو شیروانی پہنا کر وزارت اعظمٰی کا عہدہ جس
قدر عزت سے دیا جاتا رہے گا اسی قدر تذلیل کرکے انہیں اقتدار سے بھی محروم کیا
جائے گا --- اور اس قسم کے حالات ہمیں ایک بدقسمت قوم کہلانے کے لئے کافی نہیں
ہیں؟ - بہرحال بے نظیر بھٹو کو بیک جنبش قلم اسحاق خاں نے اقتدار سے محروم کرنے
کے بعد جتوئی کو یہ مشن سونپا کہ وہ 29 اکتوبر 1990ء کو قومی اور 27 اکتوبر 1990ء کو
صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائیں - جتوئی کو کرنا کرانا کیا تھا، سارا کام تو غلام اسحاق
خاں، فوج اور آئی ایس آئی کے ہاتھ میں تھا --- باقی سب لوگ تو مہرے تھے اور ان
سے بقدر ضرورت کام لے کر انہیں فارغ کر ہی دیا جاتا تھا - سیاستدانوں اور جمہوریت کا
پاکستان میں جو انجام ہوتا ہے اس سے ہر باشعور پاکستانی باخبر ہے لیکن باشعور پاکستانیوں کو
آنے والے دنوں میں تلاش معاش میں اس قدر مصروف کردیا جائے گا کہ وہ امور
حکومت سے لاتعلق ہوجائیں گے --- پھر ان کی بلا سے کوئی آئے اور کوئی جائے --- اور
اس طرح کی صورتحال کسی بھی طور سانحے سے کم نہ ہوگی ---

جتوئی نے 6 اگست 1990ء کو اس لئے اقتدار نہیں سنبھالا تھا کہ انہیں 90 روز
کے بعد انتخابات ہوجانے کی صورت میں اقتدار سے الگ ہونا ہوگا - وہ تو اس امید پر
نگران وزیراعظم بنے تھے کہ اب سندھ سے بھٹو خاندان کی بجائے وزارت وزارت
اعظمٰی کے عہدے کے لئے قرعہ فال ان کے نام نکلے گا --- یہی وجہ ہے کہ جتوئی نے
اقتدار ملتے ہی اسلامی جمہوری اتحاد کی مرکزی قیادت اور اپنے حلیف سیاسی دوستوں کو
ٹیلی فون کرنا شروع کردیئے ---- وہ آنے والے دنوں کے لئے فضا کو سازگار بنانے کے
لئے کوشاں تھے --- جنرل مرزا اسلم بیگ اس سارے کھیل میں بظاہر ان کے ساتھ تھے
--- جتوئی کی زیر صدارت منعقدہ نگران وفاقی کابینہ کے پہلے ہی اجلاس میں انتخابات
ملتوی کرانے کے متعلق بہت ساری تجاویز پر غور ہوا کیونکہ نگران حکومت میں شامل
ہونے والے اکثر وزراء کا خیال تھا کہ اگر احتساب کے بغیر انتخابات منعقد ہوئے تو پی پی
پی کو دوبارہ اقتدار مل جائے گا --- "یہ آپ بھول جائیں! بے نظیر کو اب دوبارہ

وزیراعظم بننے کا موقع نہیں ملے گا" - جتوئی مختلف مواقع پر اپنے ساتھیوں کو یقین دہانی
کراتے رہے --- جنرل مرزا اسلم بیگ نے نگران کابینہ کو انتخابات ملتوی کرانے کے لئے
سازشوں میں مصروف پایا تو انہوں نے 9 اگست 1990ء کو اعلان کیا کہ انتخابات کسی
صورت میں ملتوی نہیں ہوں گے --- غلام مصطفیٰ جتوئی نے جنرل مرزا اسلم بیگ کے
اس بیان کو سنجیدگی سے نہ لیا کیونکہ اسحاق خاں سے مل کر انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ
نگران حکومت پہلے احتساب کا مرحلہ مکمل کرے گی اور انتخابات کی باری بعد میں آئے
گی - جتوئی نگران وزیراعظم بنے تو کئی روز تک انہیں اقتدار کی بھول بھلیوں کے
متعلق علم ہی نہ ہوسکا - ان کے سیاسی شریک سفر غلام مصطفیٰ کھر خوشی سے پھولے نہ
سماتے تھے کیونکہ جتوئی کا وزیراعظم بننا حقیقتاً" کھر کا ہی وزیراعظم بننا تھا - پرائم منسٹر
ہاؤس کے دروازے کھر کے لئے 24 گھنٹے کھلے رہتے --- اور پرائم منسٹر ہاؤس کے عملے کو
محض یہ دکھانے کے لئے کہ کھر کے ساتھ ان کے کس قسم کے تعلقات ہیں، جتوئی نے
10 اگست 1990ء کو وزیراعظم ہاؤس کے لان میں کھر کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلی - جتوئی
اور کھر اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل جماعتوں کو مسلم لیگ سے زیادہ ٹکٹیں
حاصل کرنے کے لئے اکساتے رہے - جتوئی کو یقین تھا کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی ٹکٹ
کسی بھی امیدوار کی کامیابی کی ضمانت ہوگی - اس لئے وہ اپنے ہم خیال سیاستدان
حضرات کو اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ دلوانا چاہتے تھے - دوسری طرف نواز شریف بھی
اس سازش سے آگاہ تھے - جونیجو 24 اور 27 اکتوبر 1990ء کو منعقدہ انتخابات میں مسلم
لیگ کے پلیٹ فارم سے حصہ لینے کے حق میں تھے - نواز شریف بھی ذاتی طور پر اس
تجویز کے حق میں تھے لیکن اسحاق خاں اور فوج کے ساتھ ساتھ آئی ایس آئی اور ملٹری
انٹیلی جنس کی طرف سے انہیں پیغامات اور تجاویز ملنا شروع ہوگئیں کہ اسلامی جمہوری
اتحاد میں نفاق کی وجہ سے پی پی پی کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے -

غلام مصطفیٰ جتوئی نے اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے
سب سے پہلے جونیجو کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ محمد خاں جونیجو
بھی وزارت اعظمٰی کے امیدوار ہیں --- جتوئی کی جونیجو کے ساتھ ملاقات 26 اگست
1990ء کو ہوئی --- اس ملاقات کا ایک نکاتی ایجنڈا انتخابات کے انعقاد سے متعلق تھا ---

غلام مصطفیٰ جتوئی نے آئی ایس آئی کی طرف سے موصول ہونے والی رپورٹوں کا حوالہ دیتے ہوئے جونیجو کو کہا کہ ٹکٹوں کی تقسیم پر اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل جماعتوں کو اگر نظرانداز کیا گیا تو بے نظیر بھٹو دوبارہ ہمارے سروں پر مسلط ہوجائیں گی --- جتوئی ہی کی تجویز پر جونیجو نے طے کیا کہ اس مسئلے کا حل ایک ہفتے کے اندر اسلامی جمہوری اتحاد کا اجلاس طلب کرکے نکالنے کی کوشش کی جائے گی - چنانچہ جتوئی کی دعوت پر اسلامی جمہوری اتحاد کا سربراہی اجلاس طلب کرلیا گیا --- اسلامی جمہوری اتحاد کے اجلاس میں نوازشریف اور جونیجو نے نئے انتخابی اتحاد کے لئے مختلف تجاویز پر غور کیا --- نوازشریف نے جب دیکھا کہ اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل جماعتیں زیادہ سے زیادہ ٹکٹیں حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم اتحاد میں شامل مرکزی رہنماؤں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے نہیں کریں گے کیونکہ جس قدر ہم سے ٹکٹیں مانگی جارہی ہیں اس مطالبے کو پورا کردیا جائے تو مسلم لیگ کے پاس اپنے امیدواروں کو دینے کیلئے ایک بھی ٹکٹ باقی نہیں رہے گا۔ اور یوں اسلامی جمہوری اتحاد کا یہ اجلاس کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگیا--- دوسری طرف محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی سمجھ آگئی تھی کہ سیاسی حلیفوں کے بغیر الیکشن میں کامیابی اب ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور بن گئی ہے - لہٰذا انہوں نے تحریک استقلال' تحریک نفاذ فقہ جعفریہ اور قاسم لیگ کے ساتھ مذاکرات کا ڈول ڈال دیا --- بے نظیر نے ولی خاں' مولانا فضل الرحمٰن اور نوابزادہ نصراللہ خاں سے بھی اتحاد کے لئے روابط کئے لیکن انہیں حوصلہ افزا جواب نہ مل سکا - ایک طرف محترمہ بے نظیر بھٹو نے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے جوڑ توڑ کا سلسلہ جاری رکھا تو دوسری طرف انہوں نے عدالتی جنگ بھی لڑنے کا فیصلہ کرلیا---

19 اگست 1990ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کے کہنے پر سرحد کے سابق وزیراعلیٰ آفتاب شیرپاؤ نے اپنی برطرفی اور قومی اسمبلی توڑے جانے کے خلاف پشاور ہائی کورٹ میں آئینی درخواست دائر کردی --- اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بیبی منوالہ کے ذریعے اسحاق خاں کے ساتھ روابط کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ جس کے نتیجے میں ان کی اسحاق خاں کے ساتھ 20 اگست 1990ء کو ملاقات ہوئی --- محترمہ بے نظیر بھٹو نے

اسحاق خاں سے ملاقات کی خواہش خود ظاہر کی تھی جسے اسحاق خاں نے جنرل مرزا اسلم بیگ کے ساتھ مشاورت کے بعد منظور کرلیا اور یوں بے نظیر اپنی برطرفی کے بعد سیاسی مصلحتوں کی خاطر پہلی مرتبہ آصف زرداری کے ہمراہ ایوان صدر گئیں --- بطور معزول وزیراعظم اسحاق خاں سے یہ ان کی پہلی ملاقات کوئی زیادہ خوشگوار نہ تھی --- بے نظیر بھٹو نے اسحاق خاں کے ساتھ یہ ملاقات اس امید پر کی تھی کہ ان کے خلاف احتساب کا عمل روک دیا جائے گا لیکن اسحاق خاں نے جتوئی کے ذریعے بھٹو خاندان اور پی پی پی کے جیالوں کے خلاف مقدمات دائر کرنے کے لئے کوششیں تیز کرنے کے احکامات جاری کردیئے --- تینوں مسلح افواج کے سربراہ بھی اس روز جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین افتخار سروہی کی قیادت میں نگران وزیراعظم جتوئی کو ملے - تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کی جتوئی سے اسی روز ملاقات کرنا بہت بامعنی اقدام تھا کیونکہ اس "کرٹسی کال" کے ذریعے بے نظیر بھٹو کو یہ پیغام پہنچانا مقصود تھا کہ فوج نگران حکومت کے اقدامات کی حمایت کرے گی --- اسحاق خاں سے ملاقات کے بعد جب بے نظیر بھٹو کو مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکے تو انہوں نے احتجاجی جلسوں سے خطاب کے دوران اسلامی جمہوری اتحاد کی مرکزی قیادت کے ساتھ ساتھ اسحاق خاں پر بھی حملے کرنا شروع کردیئے - "اسحاق! کان کھول کر سن لو --- ہم پھر آرہے ہیں" - بے نظیر بھٹو نے 22 اگست 1990ء کو یعنی اسحاق خاں سے ملاقات کے ٹھیک دو روز بعد بیان داغ ڈالا - اسی روز ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین علاج کرانے کے بعد لندن سے کراچی پہنچے --- بے نظیر بھٹو کی اس دھمکی کے بعد اسحاق خاں نے جتوئی اور اسلامی جمہوری اتحاد کے دوسرے مرکزی رہنماؤں کو جلد از جلد انتخابی اتحاد اور ٹکٹوں کی تقسیم کا مسئلہ حل کرنے کا حکم جاری کردیا ---

بے نظیر بھٹو سیاسی منظر پر موجود رہنا چاہتی تھیں جبکہ ان کے مخالف انہیں سیاسی منظر سے غائب کرنے کے لئے کوشاں تھے - اور اب تو الطاف حسین نے وطن پہنچ کر اسلامی جمہوری اتحاد کو کمک فراہم کردی تھی - جتوئی نے اسلامی جمہوری اتحاد کے رہنماؤں سے "فردا" فردا" رابطہ قائم کرکے انہیں 26 اگست 1990ء کو لاہور پہنچنے کی ہدایت کی تاکہ آئی جے آئی کے سربراہی اجلاس میں انتخابی اتحاد کے اعلان کو یقینی بنایا

جاسکے - 26 اگست 1990ء کو لاہور میں منعقدہ آئی جے آئی کے اجلاس میں جتوئی، جونیجو، نواز شریف، غلام حیدر وائیں، شجاعت حسین، قاضی حسین احمد، اور فخر امام وغیرہ نے شرکت کی اور کئی گھنٹوں کی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ مسلم لیگ الگ پلیٹ فارم سے الیکشن میں حصہ نہیں لے گی - اسی روز غلام مصطفیٰ جتوئی کو اسلامی جمہوری اتحاد کا صدر منتخب کرلیا گیا - جتوئی نے آئی جے آئی کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتے ہی احتساب کا تازیانہ پی پی پی کے رہنماؤں پر چلانا شروع کردیا --- خصوصاً انہوں نے بے نظیر بھٹو، جہانگیر بدر اور خواجہ طارق رحیم کو احتساب کے کٹہرے میں لاکھڑا کیا - کرپٹ سیاستدانوں کے احتساب کیلئے خصوصی عدالتیں قائم کردی گئیں۔ اس صورتحال میں بے نظیر نے ملک حاکمین کو اصغر خاں سے ملاقات کرکے ابتدائی بات چیت کا سلسلہ مکمل کرنے کی ہدایت کی - کیونکہ اصغر خاں بھی کافی عرصہ سے سیاسی منظر سے غائب رہنے کے بعد عملی سیاست میں آنے کا سوچ رہے تھے - ملک حاکمین کی اصغر خاں کے ساتھ ملاقاتیں کامیاب ثابت ہوئیں لیکن اس مرحلے پر پی پی پی کے بعض رہنماؤں نے بے نظیر پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل (اصغر خاں) کے ساتھ اتحاد نہ کریں - آصف زرداری نے جب دیکھا کہ ان کی اہلیہ پر پی پی پی کے مخصوص رہنماؤں نے دباؤ ڈال کر فوج اور نگران حکومت کے مقاصد کی تکمیل کا سلسلہ شروع کردیا ہے تو وہ اپنی بیگم کے شانہ بشانہ نئے سیاسی اتحاد کے قیام کے لئے روابط میں مصروف ہوگئے --- اور یوں اصغر خاں اور بے نظیر کی 30 اگست 1990ء کو ملاقات ہوئی جس کے دوران دونوں رہنماؤں نے پی ڈی اے کے نام سے ایک نیا پلیٹ فارم بنانے کا فیصلہ کرلیا --- یکم دسمبر 1990ء کو جتوئی نے بے نظیر کے مخالف پیر پگاڑا سے ملاقات کی تاکہ سندھ سے تعلق رکھنے والے جید سیاستدانوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کیا جاسکے - اب صورتحال یہ تھی کہ ایک طرف آئی جے آئی ایم کیو ایم کے ساتھ انتخابی اتحاد کے لئے کوشاں تھی تو دوسری بے نظیر اپنے نمائندوں کے ذریعے ایک مضبوط انتخابی اتحاد بنانے کیلئے کوشاں تھیں۔ تاہم الطاف حسین نے دونوں سیاسی جماعتوں کے ساتھ کھل کر انتخابی اتحاد کرنے سے انکار کردیا کیونکہ وہ ایم کیو ایم کی محفوظ سیٹوں میں سے کسی ایک پر بھی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے - حالانکہ نواز شریف کراچی کی

ایک قومی اسمبلی کی سیٹ کے بدلے میں انہیں پنجاب سے دو ٹکٹیں دینے کے لئے تیار تھے - پی پی پی اور ایم کیو ایم کے درمیان بھی محض اس لئے مذاکرات کامیاب نہ ہوسکے کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنا علاقہ دوسرے فریق کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ تھا --- ٹکٹوں کی تقسیم کے مسئلہ پر ہر بڑی سیاسی جماعت مسائل سے دوچار تھی - اور اختلافات یہاں تک جاپہنچے کہ جماعت اسلامی نے اسلامی جمہوری اتحاد سے الگ ہونے کی دھمکی دے ڈالی جبکہ مسلم لیگ نے آئی جے آئی کی تیار کردہ امیدواروں کی فہرست کو مسترد کردیا --- سرحد، سندھ اور پنجاب میں مسلم لیگ نے اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہونے کے باوجود اپنے امیدواروں کو الگ الگ کھڑا کرنا شروع کردیا --- بے نظیر بھٹو نے ان حالات میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر روابط کا سلسلہ جاری رکھا - خصوصاً بیگم نصرت بھٹو نے لندن اور امریکہ جاکر نگران حکومت کی مخالفت کی اور بعد ازاں اسلامی جمہوری اتحاد نے الزام عائد کیا کہ بیگم نصرت بھٹو پاکستان کے لئے امریکی امداد بند کرانے کے لئے کوششوں میں مصروف ہیں - بہرحال امریکہ نے 12 ستمبر 1990ء کو حکومت پاکستان کو پیغام بھیجا کہ وہ 24 اکتوبر 1990ء کو منعقد ہونے والے انتخابات کو شفاف بنائے --- اسلامی جمہوری اتحاد نے 14 ستمبر 1990ء کو قومی اسمبلی کی 240 نشستوں میں سے 189 نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا اعلان کردیا --- نواز شریف چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی کراچی اور حیدر آباد میں ایم کیو ایم کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے نہ کرے لیکن جماعت اسلامی نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ خود نواز شریف کو مسلم لیگ کے اندر مخالفت کا سامنا تھا اور ٹکٹوں کی تقسیم کے مسئلہ پر جونیجو کے ساتھ ان کے اختلافات اس حد تک پہنچ گئے کہ 19 ستمبر 1990ء کو مسلم لیگ کے ایک اجلاس کے دوران شرکاء اجلاس میں ہاتھاپائی ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے پر ٹماٹر اور انڈے پھینکے -

اس ساری صورتحال کی وجہ سے فوج بھی پریشان تھی کیونکہ اسلامی جمہوری اتحاد کے اندر ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے پی پی پی کو بالواسطہ فائدہ پہنچ رہا تھا --- محترمہ بے نظیر بھٹو کو اس بات کا خدشہ تھا کہ نگران حکومت ملک میں امن عامہ کی خراب صورتحال کو جواز بناکر انتخابات ملتوی کردے گی یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مخصوص حد سے

بڑھ کر حکومت پر تنقید سے گریزاں تھیں - اور ساتھ ہی انہوں نے کور کمانڈر کراچی جنرل آصف نواز سے (جو بعد میں فوج کے سربراہ بھی بنے) قائم علی شاہ کے ذریعے مذاکرات کا سلسلہ شروع کردیا کیونکہ وہ اب جان بھی گئی تھیں کہ فوج کے ساتھ ٹکر لینا آسان نہیں اور افسوس کہ انہیں اس بات کا احساس حکومت گنواکر ہوا --- 19 ستمبر 1990ء کو جب کور کمانڈر کانفرنس منعقد ہوئی فوج کو شہریوں اور مخصوص سیاستدانوں کے ذریعے خطوط مل رہے تھے کہ احتساب کے عمل کو مکمل کرنے کے لئے انتخابات ملتوی کردیئے جائیں --- انتخابات سے ایک ماہ بعد مارشل لاء کے نفاذ کی باتیں زبان زد عام تھیں لیکن کور کمانڈر کی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے جنرل مرزا اسلم بیگ نے اس روز اعلان کیا کہ انتخابات طے شدہ تاریخ پر ہی منعقد ہوں گے اور احتساب کے عمل کو تیزی کے ساتھ مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی -

جنرل اسلم بیگ نے 20 ستمبر 1990ء کو اسحاق خاں کو کور کمانڈروں کی کانفرنس میں ہونے والے اہم فیصلوں سے آگاہ کیا --- جنرل مرزا اسلم بیگ اور اسحاق خاں کو یقین تھا کہ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ بے نظیر بھٹو کی حکومت بحال نہیں کرے گی - تاہم ان کی توقع کے برعکس 26 ستمبر 1990ء کو پشاور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے سرحد اسمبلی کو بحال کردیا اور ابھی آفتاب شیرپاؤ وزیراعلیٰ ہاؤس اور سرحد اسمبلی پہنچ بھی نہیں پائے تھے کہ جسٹس افضل ظلہ نے سرحد اسمبلی کی بحالی کے خلاف حکم امتناعی جاری کردیا اور بعد ازاں پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا گیا --- بے نظیر بھٹو نے جب دیکھا کہ فوج انتخابات کرواکر ہی رہے گی تو انہوں نے جنرل مرزا اسلم بیگ کو پیغام بھیجا کہ وہ غلام اسحاق خاں کی جگہ وسیم سجاد کو قائم مقام صدر بنائیں کیونکہ اسحاق خاں اب ایک متنازعہ صدر بن چکے ہیں - لیکن 10 اکتوبر 1990ء کو فوج کے سربراہ نے کور کمانڈروں کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد اسحاق خاں سے استعفیٰ لینے کی تجویز مسترد کردی --- بلکہ اس کے برعکس فوج نے یہ فیصلہ کرلیا کہ بے نظیر بھٹو کی پارٹی کو اقتدار سے ہمیشہ کے لئے الگ کردیا جائے - نگران حکومت عجلت میں بے نظیر بھٹو اور ان کے ساتھیوں کو نااہل قرار دینا چاہتی تھی لیکن بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے فیصلے پر عملدرآمد نہ کیا گیا کیونکہ امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر نے اسحاق خاں کو صاحبزادہ

یعقوب خاں کے ذریعے آگاہ کیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کے بغیر ہونے والے الیکشن امریکہ کیلئے قابل قبول نہیں ہوں گے اور ایسے انتخابات کے نتائج امریکہ تسلیم نہیں کرے گا --- امریکہ نے اس فیصلے کے سلسلے میں 5 اکتوبر 1990ء کو پاکستان کو امریکی امداد بند کردی اور اسلام آباد کو اس سلسلے میں رسمی طور پر آگاہ کردیا گیا --- جتوئی نے بطور نگران وزیراعظم 13 اکتوبر 1990ء کو یہ الزام لگایا کہ "بیگم نصرت بھٹو نے امریکی امداد بند کرانے میں اہم کردار ادا کیا" --- لاہور ہائی کورٹ نے امریکی امداد کی بندش کے متعلق جتوئی کے بیان کی اشاعت کے اگلے ہی روز خواجہ طارق رحیم کی طرف سے قومی اسمبلی بحال کرنے کے متعلق دائر کی جانے والی درخواست مسترد کردی اور اسحاق خاں کے فیصلے کو درست قرار دیتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا کہ نگران حکومت انتخابات کے مقررہ وقت پر انعقاد کو یقینی بنائے گی - لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے بعد جی ایچ کیو اور ایوان صدر میں انتخابات کے نتائج کو حتمی شکل دینے کے لئے خصوصی سیل قائم کردیئے گئے --- بے نظیر کی پارٹی کو ایک عبرت ناک شکست دینے کے تمام تر انتظامات مکمل کرلئے گئے تھے -

امریکی صدر بش، بے نظیر اور فوج

غلام مصطفیٰ جتوئی کی نگرانی میں بننے والی حکومت اور اسلامی جمہوری اتحاد کی قیادت نے 24 اکتوبر 1990ء کو ہونے والے انتخابات سے بے نظیر بھٹو کو باہر رکھنے کے لئے وہ ہر فیصلہ کیا جس سے بے نظیر کی انتخابی عمل سے دوری کو ممکن بنایا جاسکے --- لیکن بے نظیر بھٹو نے کامیاب عوامی جلسوں اور بین الاقوامی سطح پر زبردست لابنگ کے ذریعے حکومتی سازشوں کو ناکام بنا دیا --- خصوصاً" امریکی سفیر رابرٹ اوکلے نے بے نظیر بھٹو کو نااہل قرار دینے کی تجویز کی مخالفت کی۔ 6 اگست 1990ء کو اسحاق خاں نے بے نظیر بھٹو کی اقتدار سے علیحدگی کا فیصلہ فوج کے مشورے سے کیا تھا اور امریکہ نے اس فیصلے کی توثیق کی تھی کیونکہ بے نظیر بھٹو خلیج میں ہونے والی ممکنہ جنگ کے حوالے سے امریکہ کے ساتھ اس کی خواہش کے مطابق تعاون کرنے کے لئے تیار نہ تھیں --- لیکن امریکہ پاکستان میں "ڈمی" قسم کی اپوزیشن کا وجود نہیں چاہتا تھا - پاکستان میں مضبوط اپوزیشن ہی امریکی مفادات کے تحفظ کی ضامن تھی کیونکہ حکمران وقت پر مضبوط اپوزیشن کے ذریعے ہی دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔ امریکی سفیر رابرٹ اوکلے جب کھل کر بے نظیر کے حق میں بیان بازی پر اتر آئے تو اس وقت کے وزیر داخلہ زاہد سرفراز نے انتہائی سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے امریکی صدر جارج بش کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان میں رابرٹ اوکلے کی جگہ کسی ہوش مند سفارتکار کو تعینات کریں - انتخابات سے قبل امریکہ نے پاکستان کے لئے اقتصادی امداد ایک طے شدہ پلان کے تحت روک لی تھی جبکہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے بھی نگران حکومت کو قرضوں کی فراہمی روک دی --- اقتصادی اعتبار سے پاکستان کو اس وقت بڑی مشکل صورتحال کا سامنا تھا - خود امریکہ،

صدر جارج بش نے انتخابات سے قبل اعلان کیا کہ بے نظیر بھٹو کے بغیر پاکستان میں ہونے والے انتخابات منصفانہ نہیں ہوں گے - رابرٹ اوکلے نے بے نظیر کو انتخابی عمل سے دور رکھنے کے سلسلے میں تیار کی جانے والی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے اہم کردار ادا کیا - انہوں نے اسحاق خاں' جتوئی اور جنرل مرزا اسلم بیگ کے ساتھ ملاقاتیں کیں - امریکی کانگریس کے 53 سے زائد ارکان نے پاکستان کے انتخابی عمل کو شفاف بنانے کے لئے بے نظیر کے خلاف دائر کئے جانے والے مقدمات کا فیصلہ میرٹ پر کرنے کی اہمیت پر زور دیا --- اپوزیشن نے امریکہ کی طرف سے بے نظیر کے حق میں دیئے جانے والے بیانات کو عوامی رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے خوب استعمال کیا - "امریکہ ننگا ہوکر سامنے آگیا ہے" اسلامی جمہوری اتحاد کے رہنماؤں نے شور مچایا --- جبکہ 17 اکتوبر 1990ء کو کوئٹہ میں فوجی افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے بھی بے نظیر بھٹو کے خلاف زبردست تقریر کی - انہوں نے بے نظیر بھٹو کا نام لئے بغیر کہا کہ عوام بیرون ملک سے سیاسی راہنمائی حاصل کرنے والوں کو مسترد کردیں" - جنرل مرزا اسلم بیگ کا بیان اپوزیشن کے لئے حوصلہ افزاء تھا - فوج اور اسحاق خاں نے بے نظیر بھٹو کی جماعت کو اقتدار سے دور رکھنے کے لئے جی ایچ کیو اور ایوان صدر میں خصوصی سیل قائم کردیئے --- ایوان صدر میں بننے والا سیل بھی جنرل رفاقت کی نگرانی میں کام کررہا تھا --- "مرکز اور صوبوں میں حکومت ہماری بنے گی" --- جتوئی نے 19 اکتوبر کو اعلان کیا --- پی ڈی اے اور آئی جے آئی نے 22 اکتوبر 1990ء کو انتخابی مہم کے آخری روز لاہور میں زبردست قوت کا مظاہرہ کیا - اسلامی جمہوری اتحاد کا ایک بڑا جلوس نواز شریف کی قیادت میں فیصل چوک سے موچی دروازے تک کئی گھنٹوں بعد پہنچا - جبکہ بے نظیر جس جلوس کی قیادت کرتی ہوئی 22 اکتوبر 1990ء کی رات لاہور میں داخل ہوئیں وہ 1986ء کے بعد ان کا سب سے بڑا جلوس تھا --- بلاشبہ بے نظیر کے انتخابی جلسوں میں موجود عوام کی تعداد اسلامی جمہوری اتحاد کے جلوس میں شرکت کرنے والے افراد سے بہت زیادہ تھی --- عوام نے تو بے نظیر کے حق میں فیصلہ انتخابی مہم کے دوران ہی دے دیا تھا --- اور خصوصاً" بے نظیر بھٹو کا 22 اکتوبر 1990ء کا جلسہ اپوزیشن کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی تھا --- لیکن اپوزیشن کو عوام کی

طاقت کے ساتھ ساتھ کسی اور کا تعاون بھی حاصل تھا --- یہ طاقت اسحاق خاں اور فوج کی تھی --- جنرل مرزا اسلم بیگ نے اسحاق خاں اور جتوئی کی مدد سے 24 اور 27 اکتوبر 1990ء کو منعقد ہونے والے انتخابات میں بڑے منظم انداز میں دھاندلی کرائی - ضلعی انتظامیہ نے اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدواروں کو کامیاب کرانے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا --- اسلامی جمہوری اتحاد کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے حکومت نے تمام سیاسی جماعتوں کو پی پی پی کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی بھرپور کوشش کی اور "ون ٹو ون" کی پالیسی کی وجہ سے بے نظیر بھٹو کی مخالف قوتوں کے ووٹ اسلامی جمہوری اتحاد کو ملے --- یوں بے نظیر بھٹو کو اقتدار سے باہر کردیا گیا - اور بے نظیر نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے 24 اکتوبر 1990ء کے انتخابی فیصلے کو تسلیم کرکے اپوزیشن بینچوں پر بیٹھنے کا اعلان کردیا - اگرچہ پاکستان میں قومی اسمبلی کے انتخابات میں بے نظیر بھٹو کی جماعت کو شکست ہوگئی --- اور یہ شکست بہت سارے لوگوں کے لئے حیرت کا باعث نہ تھی لیکن 25 اکتوبر 1990ء کو یعنی الیکشن کے انعقاد سے ایک روز بعد امریکی سینٹ نے ایک قانون کی منظوری دی جس کے تحت پاکستان کو اس وقت تک فوجی یا اقتصادی امداد فراہم کرنے پر پابندی کو برقرار رکھنے کی استدعا کی گئی جب تک غلام اسحاق خاں ملک سے ہنگامی حالت کے قوانین کو ختم نہیں کرتے --- جتوئی نے اسی روز امریکی سفیر سے ملاقات کرکے ان سے امریکی سینٹ میں ہونے والی قانون سازی کے بارے میں تفصیلات حاصل کیں --- جتوئی اب امریکہ کو خوش کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کررہے تھے - "میں کسی منتخب رکن کو سیاسی عناد کے تحت نشست سے محروم نہیں کروں گا جبکہ ایمرجنسی بھی ختم کی جارہی ہے" - لیکن جتوئی کو یہ علم نہ تھا کہ کھیل ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے --- اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ نے 25 اکتوبر 1990ء کو ہی نواز شریف کو وزیراعظم بنانے کی تجویز پر غور شروع کردیا تھا - حالانکہ جتوئی کی خواہش تھی کہ وہ اقتدار کو نصف مدت کے لئے تقسیم کرلیں - جتوئی پہلے دو سال خود اور اگلے تین سال کے لئے نواز شریف کو وزارت اعظمیٰ کا عہدہ دینے کے لئے تیار تھے - الیکشن سے قبل شہباز شریف نے اس تجویز پر خوشی کا اظہار کیا تھا لیکن انتخابات کے نتائج آنے کے بعد نواز شریف نے اقتدار میں شریک کار

کی حیثیت قبول کرنے سے انکار کردیا --- اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں جب پیپلزپارٹی کا چاروں صوبوں میں صفایا ہوگیا' اور پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کو 240 میں سے 226 نشستیں مل گئیں تو اقتدار پر نواز شریف کا حق ثابت ہوگیا --- امریکہ اور فوج کے ساتھ ساتھ اسحاق خاں نے بھی نواز شریف کی بطور وزیراعظم نامزدگی کی تجویز پر خوشی کا اظہار کیا --- اور جتوئی دکھی دل سے وزیراعظم ہاؤس سے باہر نکل آئے -

اگر بے نظیر بھٹو بھی قتل کر دی گئیں تو۔۔۔۔؟

4 اپریل 1979ء کی صبح جب سابق وزیراعظم اور پی پی پی کے بانی سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو پاکستان قومی اتحاد میں شامل اکثر جماعتوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکنوں نے بھنگڑے ڈالے' حلوے تقسیم ہوئے' خوشیاں منائی گئیں' دیگیں چڑھائی گئیں' منتیں اتاری گئیں اور مارشل لاء حکام کی سرپرستی میں عوام میں یہ تاثر پھیلانے کی دانستہ کوشش ہوئی کہ "بھٹو خاندان کی سیاست کا باب ختم ہوگیا ہے"۔ اور اس قسم کی سوچ رکھنے والے اور اس قسم کا دعویٰ کرنے والے کسی حد تک حق بجانب بھی تھے کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اپنی ذات میں خود ایک ادارہ تھے۔ ان کی نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سیاست پر بھی گہری نظر تھی اور وہ سیاسی اسرار و رموز کو نہایت باریک بینی سے جانتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو عوام کے نبض شناس تھے اور یہ ان ہی کی شخصیت تھی' جس نے 1970ء کی دہائی میں نظام بدل ڈالا' مزدور کو فیکٹری مالک کے سامنے کھڑا کر دیا اور ایک ایسے نظام کو متعارف کرایا جس پر عمل در آمد کے ذریعے ملک کی تقدیر بدلنا مقصود تھا۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو کا مشن ادھورا رہ گیا جس کے کسی حد تک وہ خود بھی ذمہ دار تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے ساتھ ایسے ایسے افراد کو بھی شامل کرلیا جن کا واحد اور واحد مقصد لوٹ کھسوٹ کرنا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک جمہوری نظام کو چلانا چاہتے تھے اسی لئے انہوں نے ملک کو آئین دیا لیکن اس آئین میں وزیراعظم کو اس قدر اختیارات دیئے گئے تھے کہ صدر کا عہدہ ربڑ سٹمپ کی سی حیثیت اختیار کرگیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپوزیشن کے ساتھ اپنے ابتدائی دور میں تعلقات بہتر بنانے کی کوشش ہی نہ کی اور جب انہوں

نے اپوزیشن کی اہمیت کو محسوس کیا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ بھٹو جھکنے کے عادی نہ تھے حالانکہ سیاسی محاذ پر Compromise کو جھکنا نہیں کہا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حالات تبدیل ہوئے تو نہ صرف ضیاء الحق بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کی قسمت بھی بدل گئی اور جی ایچ کیو میں بیٹھے ایک فور سٹار جنرل کو راتوں رات اقتدار منتقل ہوگیا' جس نے 10 برس تک حکومت کی۔ 4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی شب ضیاء الحق نے جب مارشل لاء لگایا تو اس وقت خدا کے سوا کسی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ آنے والے 20 برس بھٹو خاندان پر کس قدر بھاری ہوں گے اور ان دو دہائیوں میں بھٹو خاندان کو کیا کیا کچھ کھونا پڑے گا۔ 1979ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے باعث قومی اتحاد کی لیڈر شپ کے راستے میں موجود سب سے بڑی رکاوٹ بھی ختم ہوگئی اور بھٹو مخالف سیاستدانوں کو اقتدار کی منزل قریب نظر آنے لگی لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ضیاء الحق اتنی آسانی سے انتخابات نہیں کرائیں گے اور انہیں ضیاء الحق سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے تحریک چلانا پڑے گی۔

ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے فوراً بعد پورے ملک میں انتہائی سخت حفاظتی انتظامات کر دیئے گئے تاکہ عوامی ردعمل کے نتیجے میں کہیں کوئی خون خرابہ نہ ہو۔ مارشل لاء حکام اس سلسلے میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بھٹو خاندان کے دو اہم افراد (شاہ نواز بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو) ملک سے باہر تھے جبکہ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو قید میں تھیں۔ ان حالات میں جبکہ ضیاء الحق کے حمایت یافتہ افراد پی پی پی پر قبضہ کرنے کے لئے پر تول رہے تھے' بھٹو خاندان سے تعلق رکھنے والی دو خواتین نے انتہائی پامردی سے حالات کا مقابلہ کیا اور وقت کے جبر نے ان کے پائے استقلال میں کمی نہ آنے دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں بحالی جمہوریت کے حق میں تحریک چلی' جسے ایم آر ڈی کا نام دیا گیا۔ 1981ء سے شروع ہونے والی یہ تحریک 1983ء میں عروج پر پہنچی جس کے نتیجے میں ضیاء الحق مرحلہ وار بنیادوں پر انتخابات کرانے پر مجبور ہوگئے۔ ضیاء الحق کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس بات کا خطرہ لاحق رہا کہ کہیں بھٹو خاندان کا کوئی فرد ان کو یا ان کے اہل خانہ کو جانی نقصان نہ پہنچا دے۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق نے اپنے صاحبزادوں اعجاز الحق اور

انوارالحق کے لئے خصوصی حفاظتی انتظامات کئے ہوئے تھے اور سیکورٹی حکام ہمیشہ ان کے دونوں صاحبزادوں کے ساتھ چپکے رہتے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کو تختہ دار پر چڑھائے جانے کے بعد عملاً" پی پی پی کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی جس کے باعث چار پانچ برس کے اندر وہ اس قابل ہوگئیں کہ احتجاجی تحریک کی قیادت کر سکیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو 1985ء میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے تیار تھیں لیکن ان کا مطالبہ تھا کہ پہلے ملک سے مارشل لاء اٹھایا جائے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے اس مطالبے میں یقیناً" حق بجانب تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ فوج کی موجودگی میں ہونے والے انتخابات میں پی پی پی کو حصہ لینے کی اجازت نہیں ہوگی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو 1985ء میں ملک سے باہر تھیں۔ ایم آر ڈی نے غلام مصطفیٰ جتوئی کے ذریعے بھٹو خاندان سے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لینے کے متعلق مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کو سمجھایا کہ وہ انکل جتوئی کے چکر میں نہ آئیں جو محض وزیراعظم بننے کے لئے ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ 1985ء میں اگر بھٹو خاندان کے افراد پاکستان میں ہوتے تو یقیناً" بے نظیر انتخابات میں حصہ لیتیں لیکن مصلحتوں کے باعث انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے متعلق ایم آر ڈی کے فیصلے کو قبول کرلیا۔ ظاہر ہے کہ پی پی پی کے میدان سے باہر ہونے کے باعث وہ لوگ بھی سیاست میں آگئے جنہوں نے اسمبلیوں میں بیٹھنے کا خواب تک نہ دیکھا تھا۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کے باعث ہی جمہوری نظام کو ہارس ٹریڈنگ جیسی بیماری لگی کیونکہ غیر سیاسی لوگوں کی اکثریت نے جب دیکھا کہ محض وفاداری بدلنے سے اچھی خاصی آمدن ہو جاتی ہے تو انہوں نے مینڈک کی طرح اچھل کود شروع کر دی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ اس صورتحال کو انتہائی بے بسی سے دیکھ رہی تھیں اس لئے انہوں نے 17 جولائی 1985ء کو فرانس کے شہر Canes میں اکٹھے ہو کر مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے کا فیصلہ کیا۔ 17 جولائی 1985ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی والدہ کی موجودگی میں کہا کہ میں وطن واپس جانے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوں کیونکہ اب ضیاء الحق کے خلاف فیصلہ کن تحریک چلانے کا وقت آگیا ہے۔ خاندان کے افراد نے اس روز کھل کر گپ شپ کی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ شاہ نواز

بھٹو کے لئے یہ آخری رات ہوگی اور انہیں زہر دے کر قتل کر دیا جائے گا۔ بے نظیر بھٹو کی زندگی میں یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ شاہ نواز بھٹو کی موت ان کے خاندان کو تباہ کرنے کی سازش کا حصہ تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی اولاد میں سے بے نظیر بھٹو اور شاہ نواز ہی ایسے افراد تھے جو سیاست کو سمجھتے تھے اور ان میں اتنی اہلیت تھی کہ وہ وقت آنے پر پارٹی کی کمان اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ شاہ نواز بھٹو کی ناگہانی موت نے بھٹو خاندان کی کمر توڑ دی لیکن عوام کی محبت اور جوش و جذبے کو دیکھ کر بے نظیر بھٹو کو نئی ہمت ملی۔ 1985ء میں جب وہ اپنے بھائی شاہ نواز بھٹو کی لاش لے کر کراچی پہنچیں تو ہزاروں افراد نے ان کا استقبال کیا حالانکہ مارشل لاء حکام نے "المرتضیٰ" "نوڈیرو" اور "گڑھی خدا بخش" جانے والے تمام راستے بند کر رکھے تھے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے بارے میں ضیاء الحق کی سوچ یہ تھی کہ وہ ایک دبلی پتلی سی جذباتی لڑکی ہیں۔ ضیاء الحق کو اگر اندازہ ہوتا کہ بے نظیر بھٹو میں اس قدر صلاحیتیں موجود ہیں کہ وہ وزارت اعظمیٰ جیسے منصب کو بھی حاصل کر سکیں تو شائد وہ ان کا کوئی بندوبست بھی کر لیتے۔ لیکن ہوتا آخر کار وہی ہے جو تقدیر کو منظور ہو اور بھٹو خاندان کی شائد تقدیر یہ تھی کہ اسے اقتدار کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے سانحوں سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ 1985ء میں جب محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے چھوٹے بھائی شاہ نواز کی لاش لے کر وطن آئیں اور بعدازاں انہوں نے جذباتی تقریریں کیں تو پہلی مرتبہ ضیاء الحق کو اندازہ ہوا کہ "یہ لڑکی تو سیاستدان بن گئی ہے"۔ ضیاء الحق 1985ء میں ہی بے نظیر بھٹو کے انداز سیاست سے اس حد تک خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے سندھ انتظامیہ کے ذریعے بے نظیر بھٹو کو ان کی رہائش گاہ پر نظربند کر دیا۔ ان دنوں میر مرتضیٰ بھٹو کے تربیت یافتہ کارکن 24 گھنٹے بے نظیر بھٹو کی قیام گاہ کے قریب موجود رہتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو خطرہ تھا کہ کہیں ان کی بہن کو گولی نہ مار دی جائے۔ ضیاء الحق نے 1985ء میں کئی ماہ تک بے نظیر کو نظر بند رکھا حالانکہ امریکی سفیر کئی مرتبہ ان کی رہائی کی سفارش کر چکے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان میں نظربندی کے دوران مسلسل یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں انہیں بھی زہر دے کر ہلاک نہ کر دیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے ایک ہمدرد

نے انہیں پیغام بھیجا تھا کہ وہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے ملک چھوڑ دیں کیونکہ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو اس طرح 1985ء کے آخر میں ایک مرتبہ پھر ملک چھوڑنے کی اجازت ملی۔ لیکن اس مرتبہ جب وہ ملک چھوڑ کر جا رہی تھیں تو وہ یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ وہ جلد ہی دوبارہ وطن واپس آئیں گی۔ تاہم وطن واپسی سے قبل بے نظیر بھٹو نے نہ صرف امریکی بلکہ روسی حکام کے ساتھ بھی ملاقاتیں کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اسلامی ممالک کے ساتھ روابط استوار کئے کیونکہ اگست 1985ء میں شاہ نواز بھٹو کی تدفین کے موقع پر عوامی اجتماعات سے خطاب کرنے کے دوران وہ یہ بات محسوس کر چکی تھیں کہ عوام ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں اور غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں بننے والی اسمبلیاں اپنی مدت پوری نہیں کر پائیں گی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو مارچ 1986ء میں وطن واپس آنا چاہتی تھیں لیکن بعض مصروفیات کی وجہ سے انہوں نے اپنی واپسی 10 اپریل 1986ء تک موخر کر دی اور 10 اپریل 1986ء کو جب انہوں نے لاہور ایئر پورٹ پر قدم رکھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ عوام کا سمندر ان کے استقبال کے لئے موجود ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی کے موقع پر ضیاء الحق اور محمد خاں جونیجو میں اختلاف رائے پیدا ہوا کیونکہ ضیاء الحق کا خیال تھا کہ بے نظیر بھٹو کو لاہور ایئر پورٹ پر ہی گرفتار کرلیا جائے اور اس مقصد کیلئے تمام انتظامات مکمل تھے۔ تاہم محمد خاں جونیجو نے کہا کہ ”جنرل صاحب! اب چونکہ ہم جمہوری دور سے گزر رہے ہیں اس لئے بے نظیر کو گرفتار کرنے سے بین لاقوامی سطح پر ہمیں رسوائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا“۔ محمد خاں جونیجو اپنی رائے میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے کیونکہ بے نظیر بھٹو کے استقبال کو کوریج دینے کے لیے بین الاقوامی میڈیا کئی روز پہلے ہی پاکستان پہنچ چکا تھا جبکہ بے نظیر بھٹو کا کہنا تھا کہ ”میں یہ دیکھنے پاکستان جا رہی ہوں کہ ابھی ملک میں جمہوریت بحال ہوئی ہے یا نہیں“۔ محمد خاں جونیجو کے مسلسل اصرار کے باعث ضیاء الحق آخر کار اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ بے نظیر بھٹو کو گرفتار نہ کیا جائے۔ تاہم انہوں نے جونیجو کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ”اگر ملک میں بے نظیر بھٹو کی وجہ سے کوئی گڑ بڑ ہوئی تو اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہوگی“۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی سے قبل انٹیلی جینس ایجنسیوں نے جو جائزہ رپورٹیں تیار کی تھیں ان سے تو یہ قطعاً ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ عوام کا سمندر بے نظیر بھٹو کے استقبال کے لئے لاہور ایئر پورٹ پر موجود ہوگا۔ پنجاب سپیشل برانچ اور انٹیلی جینس بیورو نے 4 اپریل 1986ء کو ہی حکومت کو پی پی پی کے ان کارکنوں اور رہنماؤں کی فہرست ارسال کر دی تھی جن کی گرفتاری کے ذریعے بے نظیر بھٹو کے استقبالی جلوس کو ناکام بنایا جاسکتا تھا۔ اگرچہ میاں نواز شریف نے، جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے، ضیاء الحق کی خواہش کے مطابق امن عامہ کی صورتحال کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے تمام تر انتظامات مکمل کر رکھے تھے لیکن عین آخری وقت پر پالیسی تبدیل کر دی گئی اور بے نظیر بھٹو کو گرفتار کرنے کی بجائے انہیں سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرانے کے انتظامات بھی مکمل کر لئے گئے۔ 1977ء اور 1986ء کے درمیان اگرچہ صرف 9 برس کا عرصہ محیط تھا لیکن ان 9 برسوں کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو اس قابل ہو چکی تھیں کہ وہ اپنے والد کی جانشین بن سکیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نہایت اچھی طرح جانتی تھیں کہ جوں جوں امریکہ کی افغانستان میں دلچسپی کم ہوتی جائے گی، توں توں ضیاء الحق کو لاحق خطرات میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وطن واپسی کے بعد عوام سے رابطہ رکھنے کے ساتھ ساتھ سفارتی سطح پر بھی خود کو سرگرم رکھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت رابطہ عوام مہم جاری رکھی کیونکہ انہیں 1987ء ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ مڈٹرم الیکشن اب کوئی زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں فوجی قیادت تبدیل کرانے کے لئے 1986ء کے بعد جو سازشیں شروع ہوئی تھیں 17 اگست 1988ء کو ضیاء الحق کے طیارے کی تباہی اس کا تسلسل تھی کیونکہ نئی فوجی قیادت کو سامنے لائے بغیر ضیاء الحق سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ ضیاء الحق کو بھی 1987ء کے آخر میں پتہ چل چکا تھا کہ ان کو قتل کرنے کی سازش تیار ہے۔ اگرچہ ملک کے حساس اداروں نے اس سازش میں بے نظیر بھٹو کی شمولیت کا پتہ چلانے کے لئے بھرپور کوشش کی لیکن کہیں سے کوئی ایسا Clue نہ مل سکا جس سے یہ پتہ چل پاتا کہ الذوالفقار یا پی پی پی کا اس سازش سے کوئی تعلق ہے جس کی اطلاع ایک اسلامی ملک کے سربراہ نے خود فون کر کے ضیاء الحق کو دی تھی۔

فوجی قیادت کو 1988ء میں اتنا تو یقین ہو گیا تھا کہ بے نظیر بھٹو الیکشن کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہیں اور نئے انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لئے انہوں نے غیر ملکی سفارت کاروں سے بھی مذاکرات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے لیکن کسی بھی سطح پر اس بات کا پتہ نہ چلایا جا سکا کہ بے نظیر بھٹو نے ضیاء الحق کو قتل کرانے کے لئے کوئی کردار ادا کیا ہے۔

بے نظیر بھٹو نے تو جلاوطنی کے دوران میں بھی اپنی تقریروں میں ضیاء الحق کو قتل کرانے کی کبھی دھمکی نہیں دی تھی۔ البتہ میر مرتضیٰ بھٹو کا معاملہ مختلف تھا' جو بچپن ہی سے غصیلے تھے اور بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد وہ ضیاء الحق سے بدلہ لینے کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ ضیاء الحق نے اپنی زندگی میں بلاشبہ ملک کو دفاعی اعتبار سے ناقابل تسخیر بنانے کی مقدور بھر کوشش کی اور وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب رہے۔ اپنی زندگی کے آخری مہینوں میں ضیاء الحق نے نیوکلیئر پروگرام کو بالکل اسی طرح عجلت میں مکمل کرنے کی کوشش کی تھی جس طرح ذوالفقار علی بھٹو نے ایٹمی پروگرام پر عمل درآمد کرایا تھا۔ ضیاء الحق کی نیوکلیئر پالیسی کے باعث ان کو درپیش خطرات میں اضافہ ہو گیا اور خطرات سے دوچار آدمی اکثر اوقات ایسے اقدامات بھی کر گزرتا ہے جس کی اس سے نارمل حالات میں توقع نہیں ہوتی۔ ضیاء الحق نے بھی اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہی کچھ کیا۔ انہوں نے حساس اداروں کے ذریعے بھٹو خاندان کے الذوالفقار کے ساتھ روابط اور اپنے خلاف ہونے والی سازشوں میں بے نظیر بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کی شمولیت کا پتہ چلانے کے لئے سینئر انٹیلی جینس افسروں پر مشتمل ایک خصوصی ٹیم تشکیل دی۔ واقفان حال کا کہنا ہے کہ اگر بے نظیر بھٹو کی ضیاء الحق کے خلاف سازش میں شمولیت کی تصدیق ہو جاتی تو عین ممکن ہے کہ انہیں کسی بھی عوامی اجتماع میں تخریب کاری کے ذریعے قتل کروا دیا جاتا۔ 17 اگست 1988ء کی سہ پہر کو جب ضیاء الحق بہاولپور کے نزدیک ایک طیارے کے حادثے میں ہلاک ہوئے تو فوج کے حساس اداروں نے ایسے افراد کو شامل تفتیش کیا تھا جو بھٹو خاندان کے انتہائی قریب تھے۔ تاہم معمول کی کارروائی کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا جس کے باعث 1988ء کے انتخابات کے بعد بے نظیر بھٹو کو اقتدار ملا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو 1988ء کے انتخابات کے بعد بعض شرائط پر شریک اقتدار کیا گیا تھا لیکن انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ بھی اپنے والد کی طرح ایک مضبوط وزیراعظم بن گئی ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ بے نظیر بھٹو نے جب بلا شرکت غیرے حکومت کرنے کی کوشش کی تو انہیں سازشی سیاستدانوں کے ساتھ لڑوا کر اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ مارشل لاء دور حکومت کے خاتمے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ فوج کے ساتھ تعلق رکھنے کے لئے مشہور بعض سیاستدانوں نے بے نظیر بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ ملک چھوڑ جائیں ورنہ انہیں قتل کروا دیا جائے گا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو جانتی تھیں کہ حکومت (نواز شریف' غلام اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ) انہیں سیاست سے آؤٹ کرنا چاہتی ہے۔ 1990ء میں ان کی حکومت ختم کرنے کے بعد غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام اسحاق خاں نے جتنی تعداد میں ان کے خلاف ریفرنس تیار کئے تھے ان سے صاف ظاہر تھا کہ حکمران یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ بے نظیر بھٹو کو لمبے عرصے کے لئے کرپشن کے الزامات کے تحت سیاست میں حصہ لینے سے نااہل قرار دے دیا جائے گا۔ لیکن بے نظیر بھٹو ان سازشوں سے مرعوب ہونے کی بجائے ڈٹ گئیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کی تربیت کسی معمولی آدمی نے نہیں بلکہ خود ذوالفقار علی بھٹو نے کی تھی۔ بھٹو مرحوم نے جیل میں ہی بے نظیر کو بتا دیا تھا کہ آنے والے برسوں میں عوام انہیں مسند اقتدار پر ضرور بٹھائیں گے لیکن "جب کبھی بھی تمہاری حکومت ختم ہو' تم گھبرانا نہیں بلکہ حالات کا مقابلہ کرنا"۔ بے نظیر بھٹو کو جب کبھی بھی یہ ڈرایا جاتا کہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے' ان کے بچوں اور ان کے شوہر کی زندگی ختم ہو سکتی ہے' تو وہ خوفزدہ ہونے کی بجائے مزید ہمت اور جوش کے ساتھ میدان میں اتر آتیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں ان پر یہ الزام لگا کہ انہوں نے سکھ حریت پسندوں کی فہرستیں راجیو گاندھی کے حوالے کی ہیں اور اس سلسلے میں اعتزاز احسن کے دورۂ بھارت کا خصوصی طور پر ذکر آیا لیکن اپوزیشن یہ الزامات ثابت نہ کر سکی۔ سکھوں کی فہرستیں راجیو گاندھی کے حوالے کرنے کے بارے میں اخبارات تک خبریں پہنچانے میں لیفٹیننٹ جنرل حمید گل نے نمایاں کردار ادا کیا تھا جنہیں بے نظیر نے ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی کے عہدے سے ہٹا کر ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل

شمس الرحمٰن کلو کو ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی لگا دیا تھا۔ سکھوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے قاتل کو چاہے 20، 50 یا 100 برس بعد قتل کریں، بدلہ لیتے ضرور ہیں۔ اس لئے جب بے نظیر بھٹو پر سکھوں کی فہرستیں بھارت کے حوالے کرنے کے متعلق الزام لگا تو پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل بعض رہنماؤں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ بے نظیر بھٹو کو درپیش خطرات میں اب اضافہ ہوگیا ہے۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے بے نظیر بھٹو نے خالصتان تحریک کی اعلیٰ قیادت کو پیغامات بھجوائے کہ ان پر لگائے جانے والے الزامات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ اس طرح بے نظیر بھٹو نے خود کو سکھوں کی طرف سے لاحق خطرات سے محفوظ کیا۔ اس کے علاوہ بے نظیر بھٹو کی زندگی کو سب سے زیادہ خطرہ ڈرگ مافیا سے تھا کیونکہ اپنے پہلے دور حکومت میں بے نظیر بھٹو نے حاجی اقبال بیگ جیسے بین الاقوامی سمگلروں کو امریکہ کے حوالے کیا تھا اور ان کے دور حکومت میں منشیات کی سمگلنگ کو ختم کرنے کے لئے حکومتی سطح پر زبردست کارروائی کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈرگ مافیا نے انہیں Hit List پر رکھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے پہلے دور حکومت میں اقتدار سے محروم ہونے کے بعد بے نظیر بھٹو نے الزام عائد کیا تھا کہ ان کے خلاف سازشیں کرنے والوں کو ڈرگ مافیا بھاری رقوم فراہم کرتا رہا ہے۔

1988-90ء کے دوران بے نظیر بھٹو کو جہاں دیگر مقامات سے خطرات کا سامنا تھا وہیں پر انہیں ایم کیو ایم اور سندھ کی انتہا پسند تنظیموں کی بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں چوہدری اعتزاز احسن وزیر داخلہ تھے اور انہوں نے ایم کیو ایم اور سندھ کی انتہا پسند تنظیموں کے کئی ایسے کارکنوں کو گرفتار کرایا تھا جو بے نظیر بھٹو کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ بے نظیر بھٹو نے اپنی مہم جو طبیعت کی وجہ سے پاکستان میں موجود عرب باشندوں کے خلاف کارروائی کر کے اپنے لئے مصیبت کا سامان پیدا کرلیا۔ یہ وہی عرب باشندے تھے جنہوں نے افغانستان کی جنگ میں امریکی سی آئی اے اور پاکستان کی آئی ایس آئی کی بلاواسطہ مدد کے ذریعے روسی فوجوں کو مار بھگایا تھا۔ کیا یہ عرب باشندے اس قابل نہ تھے کہ بے نظیر بھٹو کو قتل کر سکتے؟ یقیناً" وہ اس پوزیشن میں تھے لیکن ان سے بھی زیادہ تجرکار شخص (میر مرتضیٰ

بھٹو) اپنی بہن کی سلامتی کے بارے میں فکر مند تھا اور بیگم نصرت بھٹو کے اصرار پر بے نظیر بھٹو کی حفاظت پر مامور عملے میں ایسے نوجوانوں کو بھی شامل کیا گیا جو جلا وطنی کے زمانے میں الذوالفقار سے تربیت حاصل کر چکے تھے۔ یہ نوجوان 93-1990ء کے دوران بے نظیر کی حفاظت کرتے رہے۔ اس دوران 26 مارچ 1991ء کو ہائی جیکروں نے سنگا پور ایئرلائنز کے طیارے کو کوالالمپور کے ہوائی اڈے سے اغوا کرلیا۔ طیارے میں 130 مسافر سوار تھے۔ ہائی جیکروں نے پہلے خود کو پی پی پی اور پھر الذوالفقار کے کارکنوں کے طور پر متعارف کرایا اور وہ پی پی پی کے ان کارکنوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے جنہیں نواز شریف (جو اس وقت وزیراعظم تھے) نے جیلوں میں ڈال رکھا تھا۔ ان ہائی جیکروں نے کہا کہ ہماری بے نظیر بھٹو سے بات کراؤ۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے خود کو اس معاملے سے دور رکھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ 1981ء میں پی آئی اے کے طیارے کی ہائی جیکنگ کی وجہ سے مرتضیٰ بھٹو کو کس قدر بدنامی اٹھانا پڑی تھی۔ سنگاپور کے کمانڈوز نے چاروں ہائی جیکروں کو ہلاک کر کے مسافروں کو رہا کرالیا۔ طیارے کے اغواء کے سلسلے میں جب بے نظیر بھٹو پر الزامات لگے تو انہوں نے بھی جوابی حملہ کرتے ہوئے اسے جام صادق (جو اس وقت سندھ کے وزیراعلیٰ تھے) اور بریگیڈیئر امتیاز احمد (ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو) کی سازش قرار دیا۔ 5 مئی 1991ء کو بے نظیر بھٹو لندن گئیں تو انہیں پتہ چلا کہ جنوبی ایشیا میں ایک بڑے سیاستدان کو قتل کر دیا جائے گا۔ بے نظیر بھٹو کو اس اطلاع پر فکر لاحق ہوئی کیونکہ 1991ء کے وسط تک وہ بھی جنوبی ایشیا کے چوٹی کے رہنماؤں میں شامل ہو چکی تھیں۔ جنوبی ایشیا میں لیڈر شپ کو قتل کرنے کی صورتحال یہ تھی کہ بھارت اور پاکستان دونوں کے بڑے لیڈر سیاسی منظر سے ہٹائے جا چکے تھے۔ (بھٹو کی پھانسی اور اندرا گاندھی کا قتل) اور اب ان دونوں رہنماؤں کی اولاد کی زندگی خطرے میں تھی۔ بے نظیر بھٹو نے یہ اطلاع میر مرتضیٰ بھٹو تک بھی پہنچا دی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو کا زندہ رہنا خاندان کو بچانے اور بھٹو کی نسل کو برقرار رکھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ پریشانی اور تجسس کے ان لمحات کا خاتمہ 21 مئی 1991ء کو اس وقت ہوا جب بھارت میں انتخابی مہم کے دوران راجیو گاندھی کو قتل ر دیا گیا۔ پاکستان کو خطرہ تھا کہ کہیں بھارت راجیو گاندھی کے قتل کا الزام عائد کر کے

پاکستان پر حملہ ہی نہ کر دے۔ اس لئے 21 مئی 1991ء کو پاکستان کی سرحدوں پر اسی طرح کے غیر معمولی انتظامات کئے گئے جس طرح کے انتظامات بھارت نے اس وقت کئے تھے جب ضیاء الحق کا طیارہ 1988ء میں تباہ ہوا۔ بے نظیر بھٹو نے خطے میں تبدیل ہونے والی صورتحال کے باعث نواز شریف کے خلاف مہم تیز کر دی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ آئندہ ایک برس کے دوران محنت کر کے نواز شریف کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے فضا تیار کی جاسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ نے نواز شریف کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ امریکہ اور نواز شریف کے درمیان موجود اختلافات اس وقت منظر عام پر آئے جب 18 اپریل 1991ء کو امریکی کانگریس نے پاکستان کے لئے امداد بحال کرنے کی تجویز مسترد کی جبکہ امریکی پالیسی اس وقت مزید واضح ہوئی جب یہ معاملہ دوبارہ کانگریس کے سامنے 13 جون 1991ء کو پیش ہوا اور کانگریس نے نواز شریف کی حکومت کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکی کانگریس کے اس فیصلے کے بعد بے نظیر بھٹو اور امریکی سفارتکاروں کے درمیان روابط میں تیزی دیکھنے میں آئی جبکہ مجموعی طور پر ملک میں امن عامہ کی صورتحال بگڑ رہی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھر میں دہشت گردی کی لہر دوڑ گئی۔ خصوصاً" اسلام پورہ لاہور اور شیخوپورہ میں بے گناہ افراد کو قتل کیا گیا۔ نواز شریف دراصل امریکی امداد بند ہونے کی وجہ سے پریشان ہو کر جون 1991ء کے آخر میں جاپان جا رہے تھے۔ تاہم دہشت گردی کے باعث ملک بھر میں امن عامہ کی صورتحال اس قدر خراب ہوگئی کہ انہیں اپنا دورۂ جاپان ملتوی کرنا پڑا۔ انہی دنوں میاں نواز شریف کو اطلاع ملی کہ تخریب کاروں اور دہشت گردوں نے اعلیٰ شخصیات کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ جن افراد کو اس سلسلے میں Hit List پر رکھا گیا تھا ان میں بے نظیر بھٹو بھی شامل تھیں۔ بے نظیر بھٹو پر 15 جولائی 1991ء کو قاتلانہ حملے کا خطرہ تھا۔ حکومت نے اس سلسلے میں بے نظیر کو قبل از وقت ہی مطلع کر دیا تھا۔ حفاظتی اقدامات سخت ہونے کے باعث تخریب کاروں نے بے نظیر بھٹو کو تو نشانہ نہ بنایا تاہم 17 جولائی 1991ء کو انہوں نے فیصل آباد جانے والی ٹرین کو بم دھماکے کے ذریعے اڑا دیا۔ دراصل امن عامہ کی صورتحال جس قدر خراب کر دی گئی تھی اس کا ایک مقصد جنرل اسلم بیگ کو مارشل لا لگانے کے لئے جواز فراہم کرنا تھا۔ میاں نواز شریف بھی

اس صورتحال سے اچھی طرح آگاہ تھے اس لئے انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق نیا آرمی چیف لانے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ تاہم غلام اسحاق خاں نے آئین کے تحت اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے جنرل آصف نواز مرحوم کو جنرل مرزا اسلم بیگ کی جگہ فوج کا سربراہ بنا دیا جنہوں نے 17 اگست 1991ء کو اپنے عہدے کا چارج سنبھالا۔ بے نظیر بھٹو کو اس طرح اندازہ ہوگیا کہ شارٹ کٹ کے ذریعے نواز شریف کی معزولی اب ممکن نہیں اس لئے انہوں نے احتجاجی تحریک کو ادھورا چھوڑ کر تھوڑا سا Rest کرنے کا فیصلہ کرلیا اور وہ 14 ستمبر 1991ء کو امریکہ چلی گئیں جبکہ نواز شریف نے 23 ستمبر 1991ء کو بیگم عابدہ حسین کو امریکہ میں پاکستان کا سفیر نامزد کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد نواز شریف نے ایک ایک کر کے ان افراد کے خلاف کارروائی شروع کر دی جنہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہونے کے باوجود ان کے خلاف بے نظیر کا ساتھ دیا تھا۔ ان میں آغا مرتضیٰ پویا بھی شامل تھے جنہیں 29 ستمبر 1991ء کو آئی جے آئی سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد نواز شریف نے جنرل اسد درانی کی جگہ جنرل جاوید ناصر کو آئی ایس آئی کا سربراہ بنا دیا۔ ان تمام اقدامات کے بعد ظاہر ہے کہ بے نظیر بھٹو کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ نواز شریف کی حالات پر گرفت مضبوط ہو رہی ہے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے ان ایام میں ہی وطن واپس آنے کی تیاریاں شروع کر دیں جس کے باعث بے نظیر عجلت میں دوبئی گئیں جہاں انہوں نے مرتضیٰ بھٹو سے بالواسطہ اور بلاواسطہ مذاکرات کئے اور انہیں وطن واپس آنے سے روکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو وطن واپس آنے کے بعد پی پی پی کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے سکتے تھے کیونکہ انہیں بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ حالات کا رخ نواز شریف کے خلاف ہے اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں ملک میں بڑی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مرتضیٰ بھٹو پر بنائے جانے والے مقدمات کا تعلق تھا' وہ ان مقدمات کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے۔ نواز شریف جانتے تھے کہ فرانس سے نیوکلیئر ری پروسسنگ پلانٹ لینے کی کوششوں کے باعث ذوالفقار علی بھٹو کے امریکہ کے ساتھ تعلقات خراب ہوئے تھے۔ ویسے بھی ایٹمی ری پروسسنگ پلانٹ 1992ء تک پرانی ٹیکنالوجی کے زمرے میں آچکا تھا جس کے باعث نواز شریف نے

جنوری 1992ء میں دورۂ فرانس کے دوران اس پلانٹ کی خریداری میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ چونکہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور غلام مصطفیٰ جتوئی کے درمیان اس وقت تک ورکنگ ریلیشن شپ بحال ہو چکی تھی اور جتوئی نے نواز شریف کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لانے کے لئے تیاریاں شروع کر رکھی تھیں اس لئے نواز شریف نے 13 مارچ 1992ء کو جتوئی کے صاحبزادے کو وفاقی کابینہ سے نکال دیا جبکہ 18 مارچ 1992ء کو جتوئی کو ان کی پارٹی سمیت آئی جے آئی سے نکال دیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد نواز شریف نے 4 اپریل 1992ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کو مذاکرات کی دعوت دی اور اس سلسلے میں ان کے ایلچی نے بے نظیر بھٹو تک ان کا خط پہنچایا۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے نواز شریف کے ساتھ صلح کرنے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 11 مئی 1992ء کو نیوی نے کراچی میں کھلے سمندر میں مقابلہ کے دوران الذوالفقار کے پانچ کارکنوں کو ہلاک کر دیا جبکہ متعدد کارکن گرفتار ہوئے۔ الذوالفقار کے یہ کارکن مبینہ طور پر بھارت فرار ہو رہے تھے۔ بھارتی قونصلر راجیش مٹیل کو 24 مئی 1992ء کو ناپسندیدہ شخص قرار دے کر ملک سے نکال دیا گیا۔ راجیش مٹیل نے پاکستان میں خون ریزی بپا کرنے کے لئے جو منصوبہ تیار کر رکھا تھا اس میں بے نظیر بھٹو پر قاتلانہ حملہ کرانا بھی شامل تھا۔ جبکہ اس کے علاوہ ان کے ایم کیو ایم کے ساتھ روابط کی بھی تصدیق ہو چکی تھی۔ پاکستان نے بھارتی سفارتکار کو ملک چھوڑنے کے لئے کہا تو بھارتی حکومت نے انہیں واپس لے جانے کے لئے دہلی سے خصوصی طیارہ بھیجنے کی درخواست کی جسے پاکستان نے مسترد کر دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ راجیش مٹیل کے پاس اس قدر حساس مواد تھا کہ وہ اسے اپنے سفارتخانے سے نکال کر پاکستان کے کسی جہاز میں رکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو سرکاری طور پر جون 1992ء میں آگاہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے سیکورٹی حکام کے ساتھ تعاون کریں کیونکہ کراچی اپریشن کی وجہ سے دہشت گرد ملک بھر میں پھیل گئے تھے اور اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ حکومتی توجہ کراچی سے ہٹانے کے لئے اہم شخصیات کو نشانہ بنائیں گے۔ فوج اور سول کی انٹیلی جنیس ایجنسیوں کو جون 1992ء تک بہرحال اتنا ضرور پتہ چل گیا تھا کہ محترمہ بے نظیر

بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے درمیان کئی ایشوز پر اختلافات ہیں۔ سندھ اپریشن کے دوران الذوالفقار اور ایم کیو ایم کے کارکنوں نے دوران تفتیش فوجی حکام کو آگاہ کیا تھا کہ انہیں بھارت میں تربیت دی گئی تھی۔ ایم کیو ایم نے اپریشن کلین اپ کے باعث جولائی 1992ء میں خود کو مرکز اور سندھ حکومت سے الگ کرلیا جس کے بعد نواب زادہ نصراللہ خاں نے بے نظیر بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ 16 جولائی 1992ء کو پی ڈی اے کے اجلاس میں صلاح و مشورے کے بعد استعفیٰ دے دیں۔ تاہم بے نظیر نے پارلیمینٹ سے استعفیٰ نہ دیا جس کے باعث نواب زادہ نصراللہ خاں نے اگست 1992ء میں این ڈی اے کے نام سے ایک نیا سیاسی اتحاد بنا لیا جبکہ دوسری طرف بے نظیر بھٹو اور جنرل آصف نواز مرحوم کے درمیان بالواسطہ اور بلاواسطہ مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان حالات میں اگر بے نظیر بھٹو کو قتل کر دیا جاتا تو سیاسی قیادت جتوئی اور نواب زادہ نصراللہ خاں کے ہاتھ میں آجاتی کیونکہ نواز شریف کے خلاف اپوزیشن کی تحریک عروج پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فوج کی ایک انٹیلی جنیس ایجنسی نے 1992ء کے وسط میں بے نظیر بھٹو کی حفاظت کے لئے اہم کردار ادا کیا جس سے لگتا ہے کہ اعلیٰ سطح پر یہ خطرہ موجود تھا کہ کہیں بھٹو مرحوم کی صاحبزادی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

میاں نواز شریف بہرحال اس وقت ملک کے وزیراعظم تھے اور انہیں فوج اور بے نظیر بھٹو کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے بارے میں اچھا خاصا علم تھا۔ اس لئے 14 اگست 1992ء کو یوم آزادی کے موقع پر جب مسلم لیگ اور پاکستان پیپلزپارٹی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں نے مینار پاکستان کے سائے تلے جلسہ عام کرنے کی کوشش کی اور دونوں فریق ڈٹ گئے تو اس بات کا خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں مسلم لیگ اور پی پی پی کے کارکنوں کے درمیان تصادم نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس صورتحال کا حل یہ نکالا گیا کہ مسلم لیگ نے مینار پاکستان پر جلسہ منعقد کرنے کا پروگرام منسوخ کر دیا اور حکومت نے پیپلز پارٹی کو دعوت دی کہ وہ مینار پاکستان کے سبزہ زار میں جلسہ کرے۔ تاہم پی پی پی اور دوسری اپوزیشن جماعتوں نے حکومتی پیشکش مسترد کر دی اور یوں بے نظیر نے لاہور کے ناصرباغ کے باہر 14 اگست 1992ء کی شام جلسہ کیا۔ اس رات تمام انٹیلی جنیس ایجنسیاں اور پولیس کی بھاری نفری ناصرباغ کے قریب واقع عمارتوں پر قابض تھیں

کیونکہ حکومت کے پاس مصدقہ اطلاع موجود تھی کہ بھارتی انٹیلی جنیس ایجنسی RAW کے ایجنٹ پی پی پی کے جلسے کو خراب کرنے کی کوشش کریں گے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے 14 اگست 1992ء کو ناصر باغ کی جلسہ گاہ میں دھواں دار تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''آج سے میری نواز شریف کی حکومت کے ساتھ کھلی دشمنی ہے'' بے نظیر بھٹو کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اس وقت کے وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں نے کہا کہ '' الذوالفقار کی سربراہ اگر سمجھتی ہے کہ وہ مسلم لیگ کی منتخب حکومت کو گرا سکتی ہے تو وہ غلطی پر ہے' میں بے نظیر کا چیلنج قبول کرتا ہوں''۔ اپوزیشن جماعتوں کا بے نظیر بھٹو پر دباؤ تھا کہ وہ یوم پاکستان کے موقع پر منعقدہ جلسہ عام سے خطاب کے موقع پر حکومت کے خلاف لانگ مارچ کرنے اور پارلیمنٹ سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیں۔ تاہم بے نظیر نے ان دونوں تجاویز سے اتفاق نہ کیا کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ ابھی اس طرح کے فیصلے کرنے کا وقت نہیں آیا۔ ستمبر اور اکتوبر 1992ء میں بے نظیر بھٹو کے جنرل آصف نواز مرحوم کے ساتھ بالواسطہ اور بلاواسطہ رابطوں کا سلسلہ جاری رہا۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کی خواہش تھی کہ لانگ مارچ اکتوبر 1992ء میں کیا جائے۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے لانگ مارچ کے لئے 18 نومبر 1992ء کی تاریخ مقرر کر دی۔

ملک بھر کی اپوزیشن جماعتیں حیران تھیں کہ آخر بے نظیر بھٹو کو اکتوبر 1992ء میں لانگ مارچ کرنے کی بجائے نومبر 1992ء میں ایسا کرنے میں کیا دلچسپی ہے۔ بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کو اس سوال کا جواب نہ مل سکا۔ تاہم غلام حیدر وائیں نے 13 نومبر 1992ء کو یہ معمہ حل کرتے ہوئے کہا کہ ''لانگ مارچ کا ڈھونگ بی بی (بے نظیر) نے بیرونی طاقت کے اشارے پر رچایا ہے''۔ ظاہر ہے کہ بیرونی طاقت سے مراد امریکہ ہی ہو سکتا ہے۔ نواب زادہ نصراللہ خاں کی سربراہی میں بننے والے سیاسی اتحاد این ڈی اے کی خواہش تھی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو لانگ مارچ شروع کرنے سے پہلے پارلیمنٹ سے استعفیٰ دیں یا کم از کم ان کے وزراء بلوچستان حکومت سے مستعفی ہو جائیں' لیکن بے نظیر بھٹو اور این ڈی اے کے درمیان اس مسئلہ پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بے نظیر بھٹو بلوچستان حکومت سے علیحدہ ہونے کے لئے ایک خاص وقت کی منتظر تھیں۔ 14 نومبر 1992ء کو نواز شریف نے پہلے جنرل آصف نواز اور

پھر غلام اسحاق خاں سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ حکومت اپوزیشن کو اسلام آباد پر قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ نواز شریف نے لانگ مارچ کے نتیجے میں ہونے والے متوقع ہنگامے سے نبرد آزما ہونے کے لئے جو حکمت عملی مرتب کی تھی اس کے مطابق پہلے مرحلے میں رینجرز سے مدد لی گئی جبکہ دوسرے مرحلے میں حساس مقامات پر فوج کے جوان تعینات کر دیئے گئے۔ 15 نومبر کو غلام مصطفیٰ جتوئی' عبدالحفیظ پیرزادہ' غلام مصطفیٰ کھر اور مولانا کوثر نیازی نے غیر مشروط طور پر لانگ مارچ میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ انہیں اس وقت سمجھ آچکی تھی کہ بے نظیر بھٹو نے لانگ مارچ کے لئے 18 نومبر کی تاریخ کیوں طے کی ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ امریکی فوج کے سربراہ جوزف پی ہور 16 نومبر 1992ء کو پاکستان پہنچے اور انہوں نے اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے مذاکرات کرنے کے لئے فوجی حکام سے بھی دفاعی معاملات پر بات چیت کی۔ اگلے روز حکومت نے لانگ مارچ کو ناکام بنانے کے لئے اٹک کے پل پر دیوار تعمیر کر دی جبکہ چاروں صوبوں سے اسلام آباد جانے والی سڑکوں پر ٹریفک بند کر دی گئی' اس طرح مواصلات کے ذریعے چاروں صوبوں کا ایک دوسرے سے رابطہ قائم ہوگیا۔ لاہور سے جب لانگ مارچ میں شرکت کے لئے پی پی پی کے جیالے روانہ ہوئے تو ان پر وحشیانہ تشدد کیا گیا۔ 18 نومبر 1992ء کو بیگم بھٹو کو لاہور کے قریب اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ لانگ مارچ میں شرکت کے لئے راولپنڈی جا رہی تھیں۔ اسی روز جتوئی بھی گرفتار ہوئے جبکہ بے نظیر بھٹو کو گرفتار کر کے کراچی بھیج دیا گیا۔ لانگ مارچ کے موقع پر اس بات کا خطرہ موجود رہا کہ کہیں پولیس فائرنگ کے باعث بے نظیر بھٹو کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ لانگ مارچ کے موقع پر بے نظیر بھٹو کے کارکن اگر جی ٹی روڈ پر ایک دفعہ قبضہ کر لیتے تو پھر ممکن ہے کہ فوج اپنا کردار ادا کرتی اور حکومت کو مڈٹرم الیکشن کے انعقاد پر مجبور کر دیا جاتا۔ لانگ مارچ کے موقع پر پولیس نے پی پی پی کے کارکنوں پر جس طرح تشدد کیا اس کی بین الاقوامی سطح پر سخت مذمت کی گئی' خصوصاً امریکی کانگریس نے اس پر سخت تشویش کا اظہار کیا جس کے باعث شہباز شریف نے امریکی سفیر جان سی مونجو کے اعزاز میں ڈنر دیا اور غلام حیدر وائیں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکی سفیر کو بتایا کہ اگر پولیس اور سیکورٹی حکام لانگ مارچ کو ناکام

نہ بناتے تو اسلام آباد میں ہزاروں لوگ قتل ہو جاتے کیونکہ بے نظیر بھٹو نے ایوان صدر، وزیراعظم ہاؤس اور دیگر اہم مقامات پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ سفارتخانوں کو بھی نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ بہرحال محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے خلاف ہونے والی تمام تر سازشوں کے باوجود پہلے لانگ مارچ، ٹرین مارچ اور پھر روڈ مارچ کیا لیکن بھارت میں بابری مسجد کے سانحہ کی وجہ سے ملک کی سیاسی صورتحال تبدیل ہوگئی اور اپوزیشن جماعتوں نے اپنی بندوق کا رخ نواز شریف کی بجائے بھارت کی طرف کر دیا لیکن یہ وقتی بات تھی اور چند دنوں بعد ہی وہی سیاسی ہنگامہ آرائی دوبارہ شروع ہوگئی۔ حیرت کی بات ہے کہ وہی بے نظیر بھٹو جنہیں 1990ء میں حکومت نے سیاست سے ریٹائرمنٹ لینے پر مجبور کیا تھا، 1992ء میں اس پوزیشن تک پہنچ گئی تھیں کہ وہ ہر طرح سے حکومت کو بلیک میل کر کے اپنے مطالبات منوا سکیں۔ جبر اور خوف کے ان لمحات میں ہی الطاف حسین نے 15 دسمبر 1992ء کو سیاست سے ریٹائرمنٹ لینے کا اعلان کیا تھا۔ الطاف حسین کی سیاست سے ریٹائرمنٹ کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ ایم کیو ایم کی قیادت عظیم طارق کے حوالے کر دی جائے۔ اگرچہ بے نظیر بھٹو اور جنرل آصف نواز کے درمیان کافی حد تک معاملات طے پا چکے تھے اور جنرل آصف نواز مرحوم انقلاب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مرحوم جنرل آصف نواز ملک میں موجود بدعنوان عناصر کی سرکوبی چاہتے تھے اور ممکن ہے کہ وہ مخصوص عرصے کے لئے مارشل لاء بھی لگا دیتے لیکن ان کے عزائم قدرت کے نظام کے سامنے فیل ہوگئے۔ انہوں نے 7 جنوری 1993ء کو کہا کہ فوج کے خلاف ڈس انفارمیشن ہو رہی ہے اس کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا اور اگلے دن 8 جنوری 1993ء کو وہ حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ جنرل آصف نواز مرحوم کے انتقال کے بعد یہ افواہ پھیل گئی کہ انہیں زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا الزام تھا جس نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ بے نظیر بھٹو کو جنرل آصف نواز مرحوم کی وفات کے باعث یقین ہوگیا تھا کہ اب نواز شریف چند ماہ کے لئے محفوظ ہوگئے ہیں اس لئے انہوں نے نواز شریف کی طرف سے صلح کے لئے بھجوائے جانے والے پیغامات کا مثبت جواب دیا جس کے بعد انہیں قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ برائے امور خارجہ کا سربراہ بنا دیا گیا۔ بے نظیر بھٹو نے یہ حکومتی

عہدہ قبول کرنے سے پہلے کسی اپوزیشن لیڈر کو اعتماد میں نہ لیا کیونکہ وہ کسی کی حمایت کی محتاج نہ تھیں۔ 28 جنوری 1993ء کو فوج کے نئے سربراہ جنرل عبدالوحید نے کہا کہ فوج کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگلے روز محترمہ بے نظیر بھٹو سرکاری خرچ پر علاج کے لئے لندن چلی گئیں۔ جہاں 2 فروری 1993ء کو ان کے ہاں آصفہ پیدا ہوئیں۔ حکومت نے آصف زرداری کو 6 فروری 1992ء کو انہڑ کیس میں رہا کر کے 10 فروری 1992ء کو لندن بھجوا دیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی زندگی کے یہی وہ خوشگوار ایام تھے جو انہوں نے 1990ء میں اپنی حکومت ختم ہونے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ گزارے۔ فروری اور مارچ 1993ء میں اس وقت جبکہ اپوزیشن جماعتیں بے نظیر بھٹو کی "بے وفائی" پر سر پکڑے بیٹھی تھیں، پاکستان پیپلزپارٹی کی شریک چیئرپرسن نواز شریف کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کے لئے غلام اسحاق خاں کے ساتھ میر افضل خاں اور مولانا کوثر نیازی کی وساطت سے مذاکرات میں مصروف تھیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی زندگی کے یہ بڑے عجیب دن تھے کیونکہ ان کے پاس وقت کم تھا۔ ایک طرف وہ نواز شریف کو جھانسا دیئے ہوئے تھیں تو دوسری طرف انہوں نے غلام اسحاق خاں کو بھی بے وقوف بنا رکھا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کا گیم پلان فیل ہوگیا تو غلام اسحاق خاں اور میاں نواز شریف دونوں انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اس لئے انہوں نے تمام چالیں بڑی ہی احتیاط کے ساتھ چلیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سندھ میں الطاف حسین نے دوبارہ ایم کیو ایم کی قیادت سنبھال لی تھی اور عظیم طارق کو ایم کیو ایم سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سندھ کے شہری علاقوں میں وہ ایک مرتبہ پھر غیر محفوظ ہوگئی تھیں۔ اسی اثناء میں محمد خاں جونیجو امریکہ میں 18 مارچ 1993ء کو ایک مہلک بیماری کے باعث انتقال کر گئے، جس کے بعد ٹانگ کھینچنے کی سیاست ایک مرتبہ پھر چل پڑی اور سازشی ٹولے، جس میں حامد ناصر چٹھہ سرفہرست تھے، نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ روابط قائم کر لئے اور کوشش یہ کی گئی کہ کسی نہ کسی طرح بے نظیر کو پارلیمینٹ سے اپنے ساتھیوں سمیت مستعفی ہونے کے لئے آمادہ کر لیا جائے اور بے نظیر بھٹو اس وقت تک ایسا کرنے کے لئے تیار نہ تھیں جب تک انہیں غلام اسحاق خاں ضمانت نہ دیتے کہ ان کے مستعفی ہونے کے بعد اسمبلی توڑ دی جائے گی۔ آخر کار

جنرل اسد درانی کے توسط سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو پیغام ملا کہ نواز شریف کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ ہوگیا ہے' لہٰذا وہ وطن تشریف لے آئیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے جنرل اسد درانی کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے 15 اپریل 1993ء کو میر افضل خاں کے ذریعے غلام اسحاق خاں کو پیغام دیا کہ وہ 17 اپریل 1993ء کو وطن واپس آرہی ہیں۔ سازشوں کے اس ماحول میں کسی کو اندازہ نہ تھا کہ آنے والے لمحوں میں ملک پر کیا گزرے گی کیونکہ نواز شریف کے خصوصی ایلچی چوہدری نثار امریکہ میں ناکام مذاکرات کے بعد وطن واپس آچکے تھے۔ ملک کی سیاسی صورتحال تو اس وقت خراب تھی ہی' ان ایام میں اس بات کا خطرہ بھی بدستور موجود تھا کہ کہیں دیکھتے ہی دیکھتے کوئی ایسا سانحہ نہ ہو جائے جس کے باعث بے نظیر بھٹو کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ بے نظیر بھٹو کو سب سے زیادہ خطرہ بریگیڈیئر امتیاز احمد سے تھا جن کے ان کے ناراض بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ روابط کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ یہ وہی بریگیڈیئر امتیاز احمد تھے جن پر جنرل آصف نواز مرحوم کی بیوہ نے الزام لگایا تھا کہ انہوں نے ان کے شوہر کو جنرل گل حسن کی طرح ریٹائر کرنے کی سازش تیار کی تھی۔ بیوہ آصف نواز کے مطابق بریگیڈیئر امتیاز احمد نے ان کے شوہر کے بارے میں کہا تھا کہ "میں آرمی چیف کی کھڑے کھڑے پتلون اتار سکتا ہوں"۔ یہ وہ فضا تھی جس فضا میں بے نظیر بھٹو نے نواز شریف پر فیصلہ کن وار کیا۔ جنرل آصف نواز مرحوم کی بیوہ کے الزامات کے باعث فوج کے لئے نواز شریف کی حمایت جاری رکھنا ناممکن ہوگیا تھا اس لئے جنرل عبدالوحید نے غلام اسحاق خاں کو کہا کہ وہ آئین کے مطابق جو چاہیں کریں' فوج کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور غلام اسحاق خاں نے آئین کی کتاب کھول کر دفعہ 58 (2 بی) کو پڑھا اور قومی اسمبلی توڑنے کے فیصلے پر دستخط کر دیئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو گویا اس طرح اپنے ایک سیاسی مخالفت سے نجات مل گئی لیکن غلام اسحاق خاں کی حمایت کر کے انہوں نے جس سیاسی دشمنی کی بنیاد رکھی تھی اس کا بدلہ چکانے کے لئے میاں نواز شریف نے سردار فاروق احمد خاں لغاری کو 1996ء میں استعمال کیا اور سردار فاروق احمد خاں لغاری نے اس حقیقت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہ انہیں ایوان صدر تک پہنچانے میں محترمہ بے نظیر بھٹو کا ہاتھ تھا' 5 نومبر 1996ء کو پی پی پی کی حکومت ختم کر کے اپنی

محسن (بے نظیر) کو ایوان وزیراعظم میں قید کرلیا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اگر محترمہ بے نظیر بھٹو نے نواز شریف کو دھوکہ دے کر غلام اسحاق خاں کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آنے والے دنوں میں نواز شریف بھی ان کو ہٹانے کے لئے سردار فاروق احمد خاں لغاری کی حمایت نہ کرتے کیونکہ پاکستان میں سیاست کا کوئی اصول نہیں ہے۔ جس سیاستدان کو جہاں کہیں اپنا مفاد نظر آتا ہے وہ مینڈک کی طرح اچھل کود کر کے وہاں پہنچ جاتا ہے اور بڑے بڑے سیاستدان بھی اس قسم کی حرکتوں کا مظاہرہ کر کے شرمندہ ہونے کی بجائے فخر سے' بلکہ سر اٹھا کر کہتے ہیں کہ "ٹھیک ہے جی! یہی تو سیاست ہے"۔ سیاست کے انہی اصولوں پر عمل درآمد کرتے ہوئے محترمہ بے نظیر بھٹو نے نواز شریف کو اقتدار سے محروم کرایا حالانکہ چند ماہ پہلے ہی انہیں قومی اسمبلی کی امور خارجہ کمیٹی کی صدارت دی گئی تھی اور انہیں سرکاری خرچ پر علاج کے لئے بیرون ملک بھجوایا گیا تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے سرکاری خرچ پر لندن میں علاج بھی کرایا اور سرکاری خرچ پر ہی حکومت کے خلاف سازشیں بھی کیں لیکن ان کی تمام تر پلاننگ اس وقت دھری کی دھری رہ گئی جب سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت کو 26 مئی 1993ء کو بحال کر دیا اور نواز شریف اسی روز دوبارہ ایوان وزیراعظم پہنچ گئے۔ بے نظیر بھٹو نے صورتحال کو بگڑتا ہوا دیکھ کر اچانک ایک نئی چال چلی اور انہوں نے 31 مئی 1993ء کو نواز شریف کے ساتھ مفاہمت کرنے کا اعلان کر دیا۔ بے نظیر کے اس اقدام کا ایک فوری انہیں فائدہ یہ پہنچا کہ نواز شریف نے ایک مرتبہ پھر ان پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی توپوں کا رخ صرف اور صرف غلام اسحاق خاں کی طرف کر دیا۔ اس طرح بے نظیر بھٹو کو تبدیل شدہ سیاسی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی صفیں درست کرنے کا موقع مل گیا اور ایک ماہ کے اندر ہی انہوں نے مفاہمت کے فارمولے کو ایک طرف رکھ کر نواز شریف سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر مستعفی ہو کر نئے الیکشن کے انعقاد کو یقینی بنائیں۔ جس پر غلام اسحاق خاں نے 27 جون 1993ء کو ایوان صدر میں نواز شریف کے ساتھ اپنی ملاقات کے دوران کہا کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ معاملات درست کریں۔ غلام اسحاق خاں کے دل میں اپوزیشن کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہونا قابل فہم تھا کیونکہ اسی ہمدردی کو Cash کروا کر ہی وہ نواز شریف سے نجات حاصل کر سکتے تھے۔

میاں منظور احمد وٹو ان دنوں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور انہوں نے غلام حیدر وائیں کے خلاف بغاوت کر کے یہ عہدہ حاصل کیا تھا۔ وٹو صاحب کا چونکہ تعلق حامد ناصر چٹھہ گروپ کے ساتھ تھا اس لئے جب چٹھہ صاحب اور بے نظیر کے درمیان تعلقات کار قائم ہوئے تو لامحالہ بے نظیر بھٹو اور وٹو کو بھی قریب ہونے کا موقع مل گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے نظیر کو پنجاب میں نواز شریف پر حملہ کرنے کے لئے ایک مضبوط پلیٹ فارم میسر آگیا۔ 1993ء میں اگر پنجاب میں نواز شریف اور میاں منظور احمد وٹو کے درمیان شراکت اقتدار کا کوئی فارمولہ طے پا جاتا تو عین ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں پاکستان کی سیاسی تاریخ مختلف ہوتی کیونکہ نواز شریف کو سب سے زیادہ یہی مشکل درپیش تھی کہ پنجاب ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور ان کی سب سے بڑی مخالف وزیراعلیٰ ہاؤس میں بیٹھ کر ان کے خلاف سازشوں میں مصروف تھیں۔ ان دنوں جبکہ میاں نواز شریف وزارت اعظمیٰ کے عہدے پر دوبارہ بحال ہو چکے تھے، بریگیڈیئر امتیاز احمد اپوزیشن کی تحریک کو کچلنے کے لئے حکمت عملی مرتب کرنے میں مصروف رہے۔ لیکن انہیں اس وقت سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب نواز شریف نے بریگیڈیئر امتیاز احمد کو دراصل اس لئے آئی بی کا سربراہ نہیں بنایا تھا کہ ان پر جنرل آصف نواز مرحوم کے خلاف سازشیں کرنا کا الزام تھا۔

نواز شریف نے وزارت اعظمیٰ کا منصب حاصل کرنے کے بعد جب پنجاب پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کی تو وٹو نے 29 مئی 1993ء کو اسمبلی توڑ دی اور گورنر نے انہیں نگران وزیراعلیٰ مقرر کر دیا۔ تاہم ہائی کورٹ نے 28 جون 1993ء کو پنجاب اسمبلی بحال کر دی جس کے چند منٹ کے اندر ہی وٹو نے ایک مرتبہ پھر اسمبلی توڑ دی۔ میاں منظور احمد وٹو نے یہ اقدام محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد کیا اور نواز شریف کو اس کا علم تھا۔ اس لئے انہوں نے آئین کی دفعہ 234 کے تحت پارلیمینٹ سے ایک قرار داد منظور کرائی اور پنجاب کا نظم و نسق میاں اظہر کے حوالے کر دیا جنہیں پارلیمینٹ نے ایڈمنسٹریٹر کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ میاں منظور احمد وٹو کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ نواز شریف ان کو ہٹانے کے لئے پارلیمینٹ سے قرارداد منظور کرانے والے ہیں اس لئے وہ بھاگم بھاگ ایوان صدر پہنچے جہاں غلام

اسحاق خاں نے ان کا استقبال کیا۔ میاں منظور احمد وٹو نے اپنے خصوصی سٹائل میں غلام اسحاق خاں کو کہا کہ وہ ان نازک لمحات میں شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس قرار داد پر دستخط نہ کریں جو پارلیمینٹ منظور کر کے انہیں بھجوانے والی ہے۔ غلام اسحاق خاں نے بے ساختہ وٹو کو کہا کہ "میں تو آئین کے مطابق ہی کام کروں گا"۔ غلام اسحاق خاں کا یہ فقرہ سن کر میاں منظور وٹو اور ان کے ساتھیوں کے چہرے لٹک گئے کیونکہ وہ کئی ماہ سے ایوان صدر سے ملنے والی ہدایات کی روشنی میں نواز شریف کے خلاف محاذ آرائی کا بازار گرم کئے ہوئے تھے اور جب انہیں ایوان صدر کی مدد کی ضرورت پڑی تو غلام اسحاق خاں نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ میں تو آئین کے مطابق ہی چلوں گا۔ دوسری طرف میاں نواز شریف کو اندازہ تھا کہ غلام اسحاق خاں پارلیمینٹ کی قرار داد پر دستخط نہیں کریں گے۔ اب یہ وٹو صاحب اور بے نظیر صاحبہ کی خوش قسمتی تھی کہ میاں نواز شریف نے آئینی تقاضے کو پورا کئے بغیر پارلیمینٹ کی 29 جون 1993ء کو پنجاب کا کنٹرول وفاق کے حوالے کرنے کے سلسلے میں پاس کردہ قرار داد کو ایوان صدر نہ بھیجا۔ چونکہ صدر کے دستخط کے بغیر اس قرار داد کی کوئی اہمیت نہ تھی اس لئے وٹو ہاری ہوئی بازی ایک مرتبہ پھر جیت گئے اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے لئے نواز شریف کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے آسانی پیدا ہوگئی۔ چونکہ حکومت نے پارلیمینٹ کی منظور کردہ قرار داد کو ایک طے شدہ طریقہ کار کے مطابق ایوان صدر نہ بھیجا تھا اس لئے فوج نے عین وقت پر رینجرز کے ذریعے پنجاب پر قبضہ کرنے کی کوشش میں نواز شریف کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ان دنوں نواز شریف سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کس قدر بے چین تھیں اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے 5 جولائی 1993ء کو قاضی حسین احمد سے ملاقات کر ڈالی۔ جنرل عبدالوحید کے پاس ان دنوں مارشل لاء لگانے کا تمام تر جواز موجود تھا لیکن مشکل درپیش یہ تھی کہ امریکہ بہادر نے 6 جولائی 1993ء کو دو ٹوک الفاظ میں پاکستان کو پیغام دیا کہ اگر ملک میں مارشل لاء لگا تو امریکہ پاکستان کو دی جانے والی ہر قسم کی امداد بند کرنے کے لئے پاکستان سے کاروباری معاملات بھی ختم کر دے گا۔ امریکی حکام کے اس پیغام کا کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ فوج نے مارشل لاء لگانے کے Option کو ترک کر

دیا۔ میاں نواز شریف 10 جولائی 1993 کو غلام اسحاق خاں سے ملاقات کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے ایوان صدر رابطہ بھی قائم کیا لیکن انہیں جواب ملا کہ "صدر صاحب آرام کر رہے ہیں"۔ نواز شریف نے اس صورتحال کے باعث قوم سے خطاب کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ جانتے تھے کہ لاہور میں میاں منظور احمد وٹو نے اپوزیشن رہنماؤں کو اکٹھا کر رکھا ہے اور ان کی حکومت گرانے کے لئے لانگ مارچ کی تاریخ طے کی جا رہی ہے۔ جنرل عبدالوحید کو جب پتہ چلا کہ نواز شریف 10 جولائی کی رات قوم سے خطاب کے دوران غلام اسحاق خاں کے مواخذے کا اعلان کرنے والے ہیں تو انہوں نے نواز شریف کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا خطاب منسوخ کر دیں۔ آل پارٹیز کانفرنس میں شامل جماعتوں کو 10 جولائی 1993ء کی رات نواز شریف کے قوم سے خطاب کا انتظار تھا اس لئے انہوں نے لانگ مارچ کی تاریخ طے نہ کی۔ تاہم اگلے روز لانگ مارچ کے لئے 16 جولائی 1993ء کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا جس کے بعد 12 جولائی 1993ء کو نواز شریف نے غلام اسحاق خاں سے دو مرتبہ ملاقات کی اور اس ملاقات میں نواز شریف نے کہا کہ "صدر صاحب! اگر آپ اپوزیشن کی حمایت ترک کر دیں تو میں انہیں 24 گھنٹے کے اندر سیدھا کر دوں گا"۔ لیکن غلام اسحاق خاں نے نواز شریف کو تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے منع کر دیا۔ 12 جولائی 1993ء کی رات جب غلام اسحاق خاں اور نواز شریف اپنے اختلافات ختم کرنے میں ناکام ہوگئے تو 13 جولائی 1993ء کو پہلی مرتبہ جنرل عبدالوحید نے دو بڑوں کے درمیان صلح کرانے کی کوششوں کا آغاز کیا لیکن جنرل عبدالوحید کو شٹل ڈپلومیسی کے دوران اندازہ ہوگیا کہ غلام اسحاق خاں اور نواز شریف اکٹھے نہیں چل سکتے۔ 15 جولائی 1993ء کو جنرل عبدالوحید نے جب نواز شریف سے ملاقات کی تو اس موقع پر مسائل کے حل کے لئے کئی تجاویز زیر غور آئیں' جن میں ایک یہ بھی تھی کہ غلام اسحاق خاں سے استعفیٰ لیا جائے۔ میاں نواز شریف نے کہا غلام اسحاق خاں چاہتے ہیں کہ میں گھر چلا جاؤں' اگر ایسی صورت پیدا ہوئی تو اکیلا میں نہیں جاؤں گا بلکہ غلام اسحاق خاں کو بھی جانا پڑے گا۔ جنرل عبدالوحید نے جوش و جذبے سے بھرپور نواز شریف کے الفاظ غور سے سنے اور وہ اپنی گفتگو کو مختصر کر کے فوراً" راولپنڈی چلے گئے جہاں انہوں نے کور کمانڈروں کے سامنے یہ تجویز

رکھی کہ نواز شریف استعفیٰ دینے کے لئے تیار ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ غلام اسحاق خاں بھی جائیں۔ کور کمانڈروں نے نواز شریف کی اس تجویز کو بہترین حل قرار دیتے ہوئے فوج کے سربراہ کو اختیار دیا کہ وہ دو بڑوں (صدر اور وزیراعظم) سے استعفے حاصل کریں۔ 15 جولائی 1993ء کو بے نظیر بھٹو کو بھی پتہ چل گیا کہ فوج نے نواز شریف اور غلام اسحاق خاں دونوں سے استعفے لینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ اطلاع اخبارات تک بھی پہنچ گئی جس کے بعد مسلم لیگی ارکان کی اکثریت نے نواز شریف کو کہا کہ "یہ آپ نے کس قسم کا معاہدہ کرلیا ہے"۔ نواز شریف نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ انہوں نے کئی تجاویز کے ساتھ مستعفی ہونے کا بھی ذکر کیا تھا لیکن ابھی اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا۔ فوج کے سربراہ نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو جو اس وقت لاہور میں موجود تھیں ایک خصوصی فوجی طیارہ بھیج کر اسلام آباد بلایا اور ان سے پوچھا کہ آخر وہ کیا چاہتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ بے نظیر کا جواب تھا کہ جنرل صاحب! ہم مڈٹرم الیکشن کا انعقاد چاہتے ہیں' جس پر جنرل عبدالوحید نے کہا کہ آپ لانگ مارچ منسوخ کر دیں' مڈٹرم الیکشن بھی کروا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ جنرل عبدالوحید سے ملاقات کے بعد بے نظیر بھٹو نے لانگ مارچ ملتوی کرنے کا اعلان کر کے اپوزیشن جماعتوں کو ہکا بکا کر دیا کیونکہ کسی کو علم نہ تھا کہ بے نظیر نے فوج کے ساتھ کیا معاہدہ کیا ہے۔۔۔۔۔ اس طرح 16 جولائی 1993ء کو فوج نے غلام اسحاق خاں اور نواز شریف دونوں کو کہا کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔ جس پر نواز شریف نے غلام اسحاق خاں کی موجودگی میں کہا کہ "میرے ساتھی نہیں مانتے"۔ نواز شریف کے اس موقف کو سن کر جنرل عبدالوحید نے سپاٹ چہرے سے کہا کہ میاں صاحب! اب تو بات ہو چکی ہے اور کور کمانڈروں کی اکثریت نے آپ کی تجویز سے اتفاق کیا ہے۔ اس لئے آپ کو استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ جرنیلوں اور نواز شریف کے درمیان ہونے والی اس ملاقات کے بارے میں بعدازاں کئی قصے مشہور ہوئے کسی نے کہا کہ ایک کور کمانڈر نے نواز شریف کی طرف اپنی چھڑی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مسٹر نواز شریف! اب آپ وزیراعظم نہیں رہے"۔ جبکہ بے نظیر بھٹو نے کہا کہ "ایک ہی تھپڑ پر استعفیٰ دینے والے میرا کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں"۔ بہرحال 17 جولائی 1993ء کو صدر اور وزیراعظم

دونوں کی چھٹی ہوگئی اور 18 جولائی 1993ء کو وسیم سجاد قائم مقام صدر اور معین قریشی نگران وزیراعظم بن گئے۔ دراصل گذشتہ کئی ماہ سے جاری سیاسی سازشوں کا یہ ڈراپ سین تھا۔ لیکن نواز شریف کی حکومت ختم ہونے کے چند ہی روز بعد بے نظیر کو ایک نئی مشکل نے آن گھیرا یعنی میر مرتضیٰ بھٹو نے 26 جولائی 1993ء کو اعلان کیا کہ وہ وطن واپس آ رہے ہیں۔ "میں واپس آکر پاکستان پیپلز پارٹی کو ہائی جیک نہیں کروں گا"۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے اخبارات کو جاری کئے جانے والے اپنے پہلے بیان میں کہا۔ میر مرتضیٰ بھٹو 1988ء سے مسلسل کوشاں تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ جائیں لیکن بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں انہیں وطن واپس آنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بے نظیر بھٹو کو اپنے پہلے دور حکومت میں ایک دن بھی چین سے حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اور ظاہر ہے کہ نواز شریف کے دور حکومت میں وطن لوٹ کر میر مرتضیٰ بھٹو کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے علاوہ اور کیا ملنا تھا؟ اگر انہیں جیل میں نہ ڈالا جاتا تو یہ بات کھل جاتی کہ وہ نواز شریف کے ساتھ معاہدے کی روشنی میں وطن واپس آئے ہیں اور اس صورت میں ان کو ہمدردی کا ووٹ کبھی نہ ملتا۔ اس لئے نواز شریف کی حکومت ختم ہونے کے بعد جب معین قریشی کی سربراہی میں قائم ہونے والی نگران حکومت نے نئے انتخابات کے لئے الیکشن شیڈول کا اعلان کیا تو ان کے لئے کاغذات نامزدگی حاصل کرنے والوں میں خود بیگم نصرت بھٹو شامل تھیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے پاس اس وقت دو راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ پاکستان پہنچ کر خود اپنی الیکشن مہم چلائیں۔ دوم یہ کہ وہ شام میں ہی بیٹھ کر الیکشن لڑیں۔ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے درمیان میر مرتضیٰ بھٹو کی انتخابات میں شمولیت کے ایشو پر سخت اختلافات پیدا ہوئے۔ بے نظیر بھٹو کو خطرہ تھا کہ اگر میر مرتضیٰ بھٹو انتخابات میں حصہ لینے کے لئے خود پاکستان آگئے تو ان کے مخالفین انتخابات کی گہما گہمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں نقصان پہنچائیں گے۔ آخر کار بیگم نصرت بھٹو نے بڑی مشکل سے مرتضیٰ کو راضی کیا کہ وہ الیکشن کے انعقاد سے پہلے وطن نہ آئیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور انہوں نے سندھ اسمبلی کے علاوہ قومی اسمبلی کا الیکشن لڑنے کا بھی اعلان کر دیا۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ مرکز میں اہم

عہدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے پرانے ساتھی ان کی انتخابی مہم چلانے کے لئے اگست، ستمبر 1993ء میں پاکستان پہنچ گئے۔ تاہم مرتضیٰ نے قومی اسمبلی کی نشستوں پر قسمت آزمانے کی بجائے سندھ اسمبلی کی نشستوں پر الیکشن لڑا اور کامیاب قرار پائے۔

میر مرتضیٰ بھٹو انتقال اقتدار کی تقریب میں شرکت کے لئے 15 اکتوبر 1993ء کو پاکستان پہنچنا چاہتے تھے لیکن بھٹو خاندان نے انہیں بمشکل اس بات پر راضی کیا کہ وہ 15 دن تک اپنی واپسی موخر کر دیں۔ 15 اکتوبر 1993ء کو قومی اسمبلی کے 186 ارکان نے حلف لیا۔ پی پی پی کے نامزد کردہ امیدوار سید یوسف رضا گیلانی 17 اکتوبر 1993ء کو 115 ووٹ لے کر قومی اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوگئے جبکہ 19 اکتوبر 1993ء کو بے نظیر بھٹو 121 ووٹ لے کر وزیراعظم بنیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو سندھ کے وزیراعلیٰ بننا چاہتے تھے لیکن خاندانی تنازعات کی وجہ سے وہ یہ عہدہ حاصل نہ کر سکے اور بے نظیر نے سندھ میں عبداللہ شاہ کو وزیراعلیٰ بنوا دیا۔ بے نظیر بھٹو اقتدار حاصل کرنے کے تین دن بعد قبرص گئیں جہاں انہوں نے دولت مشترکہ کے اجلاس سے خطاب کیا اور واپسی پر وہ 23 اکتوبر کو سعودی عرب میں عمرہ کرنے کے بعد دوبئی میں شیخ زید بن سلطان النہیان سے ملیں جنہیں علم تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو بھی اپنے والد کے جانشین کی حیثیت سے جلد وطن لوٹ رہے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو صدارتی انتخابات اور میر مرتضیٰ بھٹو کی واپسی جیسے مسائل کا سامنا تھا۔ غلام اسحاق خاں چاہتے تھے کہ بے نظیر بھٹو انہیں صدارتی امیدوار نامزد کریں جبکہ بے نظیر بھٹو اس شخص کو صدارتی امیدوار نامزد کرنے کے لئے تیار نہ تھیں جس نے 1990ء میں ان کی حکومت ختم کی تھی۔ اس لئے 2 نومبر 1993ء کو بے نظیر نے جنرل وحید کو بتایا کہ ان کی جماعت غلام اسحاق خاں کو صدارتی امیدوار نامزد نہیں کرے گی۔ جنرل وحید نے خود بھی اس سے اتفاق کیا۔ آئی ایس آئی نے صدارتی عہدے کے لئے جن امیدواروں پر اعتراض نہیں کیا تھا ان میں سردار فاروق احمد خاں لغاری بھی شامل تھے" اس لئے 2 نومبر 1993ء کو بے نظیر اور فوج میں سردار فاروق احمد خاں لغاری کو صدارتی امیدوار نامزد کرنے کا معاملہ طے پا گیا۔ 2 نومبر 1993ء کو ہی محترمہ بے نظیر بھٹو کو انٹر سروسز انٹیلی جنس نے اطلاع دی

کہ میر مرتضیٰ بھٹو شام میں صدر حافظ الاسد سے ملاقات کے بعد پاکستان روانہ ہونے والے ہیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کا جہاز پاکستان کی فضا میں 3 نومبر 1993ء کو داخل ہوا لیکن انہیں پاکستانی حکام نے کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جس کے بعد مرتضیٰ کا جہاز دوبئی گیا جہاں سے وہ رات ایک بجکر 55 منٹ پر شیخ زید کے خصوصی طیارے میں پاکستان پہنچے۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس میر مرتضیٰ بھٹو کی کراچی آمد کے موقع پر حساس اداروں نے ویڈیو فلم بنوائی اور انہیں ایک خفیہ مقام پر منتقل کر دیا گیا جہاں فوج کے حساس اداروں نے ان سے تفتیش کی۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے اسی روز کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا لیکن حکومت کے منفی رویئے کی وجہ سے جلسے کے انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مرتضیٰ نے شیڈول کے مطابق 6 نومبر 1993ء کو سندھ اسمبلی جاکر اپنے عہدے کا حلف اٹھانا تھا لیکن انہیں ایسا کرنے کی 8 نومبر 1993ء کو اجازت ملی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے بھائی سے سیاسی محاذ پر ہمیشہ خوفزدہ رہیں لیکن وہ یہ قطعاً" نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے خاندان کے واحد مرد کو قتل کر دیا جائے۔ وہ تو یہ چاہتی تھیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو معمول کے مراحل سے گزر کر صاف شفاف طریقے سے اپنے اوپر عائد الزامات سے بری ہو۔ لیکن دونوں بہن بھائیوں کے درمیان غلط فہمیاں پھیلانے والوں کی کوششیں رنگ لائیں اور محترمہ نے اپنے سیاسی مستقبل کو غیر محفوظ سمجھ کر 5 دسمبر 1993ء کو لاہور میں پاکستان پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس طلب کر کے خود کو پارٹی کا سربراہ بنوالیا۔ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے 35 میں سے 25 ارکان نے بے نظیر بھٹو کو پارٹی کا سربراہ بنانے کے لئے پیش کی جانے والی قرار داد کی حمایت کی جبکہ بیگم نصرت بھٹو نے روتے ہوئے یہ فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے 6 دسمبر 1993ء کو پی پی پی کی سنٹرل کمیٹی کے فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے ذوالفقار علی بھٹو نے تاحیات چیئرپرسن نامزد کیا تھا"۔ تاہم بے نظیر بھٹو نے اپنی والدہ کے موقف سے اتفاق نہ کیا جس پر ماں بیٹی کے درمیان اختیارات کی ایک نئی جنگ شروع ہو گئی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے پارٹی کی قیادت محض اس خوف سے اپنے ہاتھ میں لی تھی کہ کہیں میر مرتضیٰ ضمانت پر رہا ہونے کے بعد اپنی والدہ کے

اشارے پر پارٹی کی قیادت اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں۔ محترمہ کے ان خدشات کی وجہ ایک تو بیگم صاحبہ کا رویہ بنا اور دوسری اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں ایک انٹیلی جینس ایجنسی کے ذریعے مصدقہ رپورٹ ملی تھی کہ بیگم نصرت بھٹو بیماری کے باعث پارٹی قیادت اپنے صاحبزادے کے حوالے کرنے والی ہیں۔ 5 دسمبر 1993ء کو جب پی پی پی نے بیگم نصرت بھٹو کو ہٹا کر ان کی صاحبزادی کو پارٹی کا سربراہ بنایا تو اس وقت مرتضیٰ بھٹو کراچی جیل میں بند تھے۔ بیگم نصرت بھٹو نے مرتضیٰ بھٹو سے 9 دسمبر 1993ء کو کراچی جیل میں ملاقات کی۔ اس روز مرتضیٰ بہت غصے میں تھے۔ انہوں نے اپنی والدہ کے ذریعے اپنے گروپ سے تعلق رکھنے والے کارکنوں کو پیغام دیا کہ وہ ان کی رہائی کے لئے ہلکے پھلکے مظاہرے کریں' چنانچہ اگلے ہی روز پی پی پی (مرتضیٰ گروپ) کے کارکنوں نے اپنے لیڈر کی رہائی کے لئے کراچی میں مظاہرے کئے اور 11 دسمبر 1993ء کو جب میر مرتضیٰ بھٹو کو کراچی کی ایک خصوصی عدالت میں پیش کیا گیا تو خواتین کارکنوں نے سینہ کوبی کی' بے نظیر بھٹو کے خلاف نعرے لگے اور پولیس نے سینکڑوں افراد کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے اس پر اپنی اہلیہ غنویٰ کو پیغام بھیجا کہ وہ وطن لوٹ آئیں۔ چنانچہ غنویٰ اپنے بچوں (فاطمہ اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر) کے ہمراہ 17 دسمبر 1993ء کو کراچی پہنچیں۔ مرتضیٰ چاہتے تھے کہ ان کی والدہ کی تیمار داری کے لئے کوئی تو ان کے پاس رہے۔ مرتضیٰ کے بچوں اور بیوی کے پاکستان آنے کے باعث بیگم نصرت بھٹو کی صحت پر کافی مثبت اثر پڑا اور وہ اکثر بچوں سے کھیلتی رہتی تھیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے درمیان شروع ہونے والی سرد جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی ضمانت میں اچھی خاصی رکاوٹیں ڈال دی گئیں۔ وگرنہ انڈرسٹینڈنگ یہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو 5 جنوری 1994ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر رہا کر دیا جائے گا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کی سالگرہ سے ایک ماہ پہلے ہی پارٹی کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ ان کی والدہ ذوالفقار علی بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر سندھ میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کے دوران پارٹی قیادت مرتضیٰ کے حوالے کر دیں گی۔ اگر ایک مرتبہ ایسا ہو جاتا تو بے نظیر بھٹو کے لئے صورتحال پر قابو پانا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

اس لئے جب ذوالفقار علی بھٹو کی سالگرہ قریب آئی تو بے نظیر بھٹو نے خصوصی طور پر اس قسم کے انتظامات کئے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو پیرول پر بھی رہا نہ کیا جاسکا اور 5 جنوری 1994ء کو نوڈیرو میں زبردست حفاظتی انتظامات میں منعقدہ بھٹو کی سالگرہ کی سرکاری تقریب کے دوران کیک کاٹا گیا اور اس تقریب میں شرکت کرنے والوں کو خصوصی پاس جاری کئے گئے۔ جن افراد کے پاس خصوصی اجازت نامے نہ تھے انہیں جلسہ گاہ کے قریب بھی نہ آنے دیا گیا۔ اس روز گڑھی خدا بخش میں بکتر بند گاڑیاں گردش کر رہی تھیں اور لاڑکانہ میں پولیس نے مرتضیٰ کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو نے اپنے شوہر کی سالگرہ کا کیک نوڈیرو میں کاٹنے کی بجائے المرتضیٰ میں منعقدہ ایک سادہ تقریب میں کاٹا جس کے بعد پی پی پی اور مرتضیٰ کے ساتھیوں میں تصادم ہوگیا اور ایک کارکن ہلاک اور درجنوں نوجوان زخمی ہوئے۔ مرتضیٰ بھٹو نے اس واقعہ کے خلاف جیل میں بھوک ہڑتال کر دی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو لاڑکانہ کے اس واقعے کی ایک سیشن جج سے تحقیقات کرانا چاہتی تھیں لیکن بیگم صاحبہ نے مطالبہ کیا کہ اس قدر سنگین معاملے کی تحقیقات کے لئے سپریم کورٹ کے جج کو نامزد کیا جائے۔ گویا اس طرح مرتضیٰ کی آمد کے 2 ماہ بعد ہی بہن بھائی کے درمیان کھلی جنگ شروع ہوگئی۔ حکومت نے الذوالفقار کے ایک کارکن خالد خاں کو 15 جنوری 1994ء کو کراچی میں ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جنہوں نے اپنے تحریری بیان میں اعتراف کیا کہ ان کو بھارت میں RAW نے تخریب کاری کی ٹریننگ دی تھی۔ دراصل محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے تمام اقدامات سے یہ ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ ان کا الذوالفقار کی دہشت گردی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ حکومت نے جب سرکاری میڈیا کے ذریعے الذوالفقار کے خلاف کارروائی شروع کی تو مرتضیٰ بہت سیخ پا ہوئے کیونکہ ان کو جیل میں مسلسل ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ خصوصی عدالت میں ان کے خلاف درج مقدمات کو ست روی سے نپٹایا جا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 29 جنوری 1994ء کو جب وہ علی احمد جونیجو کی عدالت میں پیش ہوئے تو بیگم نصرت بھٹو نے اپنی نشست پر کھڑے ہو کر کہا کہ "تم مقدمے کی کارروائی درست انداز میں نہیں چلا رہے"۔ خصوصی عدالت کے جج علی احمد جونیجو خود پر بھری عدالت میں لگائے جانے والے

الزامات کے باعث مشتعل ہوگئے اور انہوں نے مزید کارروائی کئے بغیر میر مرتضیٰ بھٹو کی درخواست ضمانت مسترد کر دی۔ بیگم نصرت بھٹو اور خصوصی عدالت کے جج کے درمیان ہونے والی تلخی کی اطلاع جب بے نظیر بھٹو کو پہنچی تو وہ اپنی والدہ سے سخت ناراض ہوئیں کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ مرتضیٰ بھٹو کے کیس کو جذباتی پن سے خراب کیا جا رہا ہے۔ چونکہ بے نظیر بھٹو کے عملی اقدامات اس قسم کے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مرتضیٰ کو سیاست سے دور رکھنا چاہتی ہیں اس لئے بیگم نصرت بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو نے کبھی بھی بے نظیر کے اس موقف سے اتفاق نہ کیا کہ "میں اپنے بھائی کی بہتری چاہتی ہوں"۔ بیگم نصرت بھٹو نے خصوصی عدالت کے اس واقعہ کے بعد دوبارہ کبھی کسی جج کے ساتھ پھڈے بازی نہ کی کیونکہ مرتضیٰ کے وکلاء کا بھی یہی موقف تھا کہ ججوں کے ساتھ محاذ آرائی سے فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہوگا۔ بیگم نصرت بھٹو اور غنویٰ بھٹو ان دنوں ایک طرف تھیں جبکہ بے نظیر بھٹو دوسری طرف تھیں۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے بھٹو مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی صنم بھٹو نے بے نظیر اور غنویٰ بھٹو کے درمیان ملاقاتیں کرائیں اور چند ایک ملاقاتوں میں آصف علی زرداری کو بھی بلوایا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر مرتضیٰ اور بے نظیر بھٹو کے درمیان بالواسطہ مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ہمیشہ مرتضیٰ کو یہ کہا کرتی تھیں کہ میں تمہاری خیر خواہ ہوں لیکن حالات و واقعات یہ ثابت کرتے تھے کہ محترمہ سیاسی مصلحتوں کی بناء پر میر مرتضیٰ بھٹو کو قومی سطح کی سیاست میں آنے سے روکنا چاہتی تھیں۔ اس کا عملی مظاہرہ انہوں نے پی پی پی پر قبضہ کر کے کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ سٹریٹ پاور محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہاتھ میں تھی لیکن کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ انہیں عوام نے شروع میں محض اس لئے پذیرائی بخشی تھی کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو 1988ء کے انتخابات میں ہمدردی کے ووٹ ملے تھے حالانکہ انہوں نے ایسے ایسے افراد کو ٹکٹ دیئے تھے جن کی پاکستان پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان کے ساتھ وفاداری مشکوک تھی۔ اگر میر مرتضیٰ بھٹو 1988ء کے انتخابات کے بعد وطن واپس آجاتے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نہ کہ وہ سال ڈیڑھ سال مقدمات میں الجھے رہتے۔ ظاہر ہے کہ انہیں سیاست سے زیادہ عرصہ تک دور تو نہیں رکھا

جاسکتا تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو 1988ء کے انتخابات کے بعد اس لئے وطن نہیں آئے تھے کہ انہیں ان کی والدہ اور بہن نے کہا تھا کہ فوج ان کی پاکستان واپسی کے حق میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ضیاء الحق کی طیارے کے حادثے میں ہلاکت کا واقعہ ابھی نیا نیا ہے اور عین ممکن ہے کہ ضیاء الحق کے خاندان میں سے کوئی نہ کوئی فرد الذوالفقار کو سانحہ بہاولپور کا ذمہ دار قرار دے ڈالے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں بے نظیر بڑی کٹھن آزمائش سے دوچار ہو جاتیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے سانحہ بہاولپور کے فوراً" بعد فوج کو بالواسطہ اور بلاواسطہ پیغام بھجوائے تھے کہ ان کا یا ان کی کسی تنظیم کا ضیاء الحق کی ہلاکت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے بیرون ملک بیٹھ کر ان افراد کا پتہ چلانے کی کوشش کی تھی جو سانحہ بہاولپور کا باعث بنے۔ تاہم چند ماہ بعد ہی انہوں نے اس سازش کا پتہ چلانے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ انٹرنیشنل مافیا اور دہشت گرد تنظیموں سے تعلق رکھنے والے ان کے قریبی ساتھیوں اور جاننے والوں کا انہیں مشورہ تھا کہ وہ ضیاء الحق کی موت کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو اس طرح کے مشورے ان کی والدہ نے بھی دیئے جو جانتی تھیں کہ ضیاء الحق کے قاتل اس قدر بااثر ہیں کہ اگر مرتضیٰ ان تک پہنچ بھی گئے تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکے گی۔ البتہ اس صورت میں میر مرتضیٰ بھٹو کو درپیش مشکلات میں اضافہ ضرور ہو سکتا تھا۔ اس پس منظر میں جب دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے وطن واپسی کے بعد دوران تفتیش فوج اور سول سے تعلق رکھنے والی انٹیلی جنیس ایجنسیوں کے سینئر حکام کو متعدد مرتبہ یقین دلایا کہ سانحہ بہاولپور کے ساتھ ان کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں البتہ میر مرتضیٰ بھٹو نے یہ ضرور اعتراف کیا کہ اپنے والد کو پھانسی دیئے جانے کے بعد انہوں نے کئی مرتبہ ضیاء الحق کی جان لینے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے منصوبے ناکام رہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جس سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف تھا اور خود میر مرتضیٰ بھٹو نے کئی مرتبہ جلاوطنی کے دوران اعتراف کیا تھا کہ وہ اپنے والد کے قاتلوں کو کیفر انجام تک پہنچانے کے لئے بے چین ہیں۔ اس طرح میر مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کے بعد ان کی فوج کے متعلق اور فوج کی ان کے متعلق رائے میں مثبت تبدیلی آئی۔ میر

مرتضیٰ بھٹو اور ان کی بہن بے نظیر بھٹو کے درمیان بہرحال کشیدگی برقرار رہی جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو چاہتے تھے کہ ان کی والدہ کو دوبارہ پارٹی کا سربراہ بنا دیا جائے۔ کشیدگی کی اس فضا میں جنوری' فروری اور مارچ کے مہینے گزر گئے۔ اس دوران اگرچہ صنم بھٹو نے خاندان میں ناراضگی ختم کرانے کی کوششیں جاری رکھیں لیکن اس کے باوجود بنیادی معاملات جوں کے توں رہے اور ان بنیادی معاملات میں ذوالفقار علی بھٹو کے اربوں روپے کے اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ بھی تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو ان کی والدہ اپنے شوہر کی برسی کے موقع پر 4 اپریل 1994ء کو اپنا جانشین نامزد کرنا چاہتی تھیں لیکن مرتضیٰ کی کئی مقدمات میں ضمانت نہ ہو سکی اس لئے 4 اپریل 1994ء کو ملک میں موجود ہونے کے باوجود انہیں اپنے والد کی قبر پر پھول چڑھانے کا موقع نہ مل سکا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے سرکاری وسائل کا استعمال کر کے 4 اپریل 1994ء کو گڑھی خدا بخش میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا اور اس جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے ملک بھر سے ہزاروں کارکنوں کو سندھ لے جایا گیا۔ اس کے برعکس بیگم نصرت بھٹو نے اس روز 70 کلفٹن پر اپنے شوہر کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے قرآن خوانی کی۔ یہ بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ جو خاندان ضیاء الحق کے زمانے میں اس وقت جب بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے میں ناکام رہا' اسی خاندان کے افراد کئی سال بعد بھی ذاتی جھگڑوں میں الجھے رہے اور انہیں بھٹو کی قبر پر ایک مرتبہ بھی اکٹھے ہو کر فاتحہ پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ میر مرتضیٰ بھٹو اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بھی اپنی بہن بے نظیر بھٹو کے ہمراہ ذوالفقار علی بھٹو کی قبر پر نہ گئے حالانکہ جلاوطنی کے زمانے میں وہ گھنٹوں اکٹھے بیٹھ کر سوچا کرتے تھے کہ جب مارشل لاء اٹھ جائے گا تو وہ وطن واپس جا کر اپنے والد کی پارٹی کے سینئر ساتھیوں اور مخلص کارکنوں کو دوبارہ اکٹھا کریں گے۔ دوسروں کو پارٹی میں شامل کرانا تو دور کی بات ہے' بھٹو خاندان کے افراد خود اکٹھے نہ ہو سکے۔ بیگم نصرت بھٹو کے لئے یہ صدمہ کیا کم تھا کہ اگر وہ مرتضیٰ سے اظہار محبت کرتیں تو بے نظیر بھٹو ناراض ہوتی تھیں اور اگر وہ بے نظیر بھٹو کے قریب جانے کی کوشش کرتیں تو غنویٰ بھٹو گلے شکوے کرنا شروع کر دیتیں۔ اس سارے مرحلے میں صرف اور صرف صنم بھٹو کا کردار مثبت رہا جس نے 15 اپریل

1994ء کو بلاول ہاؤس میں بے نظیر بھٹو کی غنویٰ کے ساتھ ملاقات کرائی۔ اسی روز غنویٰ کو یقین دلایا گیا کہ حکومت (بے نظیر) مرتضیٰ کو جیل میں رکھنا نہیں چاہتی اور جلد ہی ان کی ضمانت ہو جائے گی۔ اس یقین دہانی پر اعتماد کرتے ہوئے غنویٰ بھٹو 23 اپریل 1994ء کو لاہور آئیں کیونکہ 25 اپریل 1994ء کو مرتضیٰ بھٹو کی ظہور الٰہی قتل کیس میں انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالت میں پیشی متوقع تھی۔ غنویٰ کو کئی روز پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ لاہور کی عدالت مرتضیٰ کو ضمانت پر رہا کر دے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور 25 اپریل 1994ء کو انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالت نے مرتضیٰ کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ تاہم مرتضیٰ کی رہائی اس لئے عمل میں نہ آ سکی کہ وہ ابھی شاہ بندر کیس میں پولیس کو مطلوب تھے اور اس مقدمے کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اپنے صاحبزادے کو جیل کی سلاخوں سے باہر دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں۔
بے نظیر بھٹو نے اس دوران اتنا ضرور کیا کہ مرتضیٰ کی مرضی کے مطابق ان کی اپنے دوستوں کے ساتھ جیل میں ملاقاتیں کروانا شروع کر دیں جبکہ بیگم نصرت بھٹو اکثر و بیشتر اپنے بیٹے کے ہمراہ دوپہر کا کھانا کھایا کرتی تھیں۔ آخر کار 5 جون 1994ء کو مرتضیٰ کی شاہ بندر کیس میں بھی ضمانت ہو گئی۔ جس کے بعد پہلی مرتبہ مرتضیٰ کراچی سے لاڑکانہ کے لئے 10 جون 1994ء کو روانہ ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادے کا سندھ میں شاندار استقبال ہوا اور ہزاروں لوگ انہیں سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ مرتضیٰ کی سندھ میں دستار بندی ہوئی اور انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی جگہ خاندانی معاملات سنبھال لئے۔ 18 جولائی 1994ء کو میر مرتضیٰ بھٹو نے پہلی مرتبہ اپنی والدہ کے ساتھ پاکستان میں اپنے چھوٹے بھائی شاہ نواز بھٹو کی برسی کے موقع پر منعقدہ قرآن خوانی میں شرکت کی۔ جس کے بعد وہ 20 جولائی 1994ء کو لاہور آئے جہاں انہوں نے کئی تقریبات میں شرکت کی اور اعلان کیا کہ وہ اپنے والد کا ادھورا مشن پورا کریں گے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو لاہور کی انسداد دہشت گردی عدالت نے 3 اکتوبر 1995ء کو ظہور الٰہی قتل کیس میں بری کر دیا۔ سیاسی لحاظ سے میر مرتضیٰ بھٹو کی یہ ایک بڑی کامیابی تھی کیونکہ انہیں تقریباً 2 سال تک قتل کیس کی سماعت کے سلسلے میں عدالت میں حاضری دینا پڑی۔ جب میر مرتضیٰ بھٹو کے خلاف ظہور الٰہی کیس ختم ہوا تو اس وقت ملکی سطح

پر صورتحال یہ تھی کہ اپوزیشن میاں نواز شریف کی قیادت میں نئے انتخابات کا مطالبہ کر رہی تھی، کراچی میں دہشت گردی کا سلسلہ جاری تھا جبکہ مجموعی طور پر پورے ملک میں امن عامہ کی صورتحال انتہائی ناگفتہ بہ تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف ستمبر 1995ء میں فوجی بغاوت ناکام ہوئی تھی جس کے سرغنہ میجر جنرل ظہیرالاسلام عباسی تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ان دنوں صحیح معنوں میں کٹھن آزمائش سے گزر رہی تھیں کیونکہ ستمبر 1995ء میں اگر فوجی بغاوت کامیاب ہو جاتی تو نہ صرف کئی سینئر جرنیلوں کو قتل کر دیا جاتا بلکہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو ان کے بچوں سمیت اسی طرح ہلاک کر دیا جاتا جس طرح شیخ مجیب الرحمٰن کا صفایا کیا گیا تھا۔ اس سازش کے بے نقاب ہونے کے بعد بے نظیر بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے درمیان صلح کرانے کی سنجیدہ کوششیں شروع ہوئیں اور اس مرتبہ محض صنم بھٹو یا بیگم صاحبہ کی خواہش نہ تھی بلکہ خود مرتضیٰ اور بے نظیر دونوں اپنے اختلافات ختم کرنا چاہتے تھے۔
بے نظیر بھٹو کی زندگی کو صرف ناکام فوجی بغاوت میں شریک افراد سے ہی خطرہ نہ تھا بلکہ انہیں ایم کیو ایم سے تعلق رکھنے والے ان سینکڑوں نوجوانوں سے بھی خطرہ تھا جنہیں جنرل نصیراللہ بابر (وزیر داخلہ) نے کراچی میں امن بحال کرنے کے لئے شروع کئے جانے والے اپریشن کے دوران اذیتیں دے کر اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ پیشہ ور قاتل یا چور ڈاکو بن جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پولیس نے نوجوانوں سے رشوت وصول کرنا معمول بنا لیا تھا اور جو نوجوان یا ان کے اہل خانہ رشوت ادا نہ کر پاتے انہیں اذیتیں دے دے کر قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح کراچی اپریشن کلین اپ کے متاثرین نے وہ تمام حربے استعمال کئے جن سے حکومت کو گرایا جا سکے اور اس صورتحال کا فائدہ اٹھانے میں بھارتی انٹیلی جینس ایجنسی RAW پیش پیش تھی۔
یہ محترمہ بے نظیر کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں جنرل عبدالوحید کی شکل میں ایک ایسا جرنیل ملا جو 1993ء میں نواز شریف اور غلام اسحاق خاں کو فارغ کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ جنرل عبدالوحید دوبارہ غلطی کرنے کے لئے تیار نہ تھے ورنہ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں معیشت تباہ ہو چکی تھی، امن عامہ کی صورتحال انتہائی خراب تھی اور عوام ایک مستقل قسم کے عذاب میں مبتلا تھے۔ یہ تمام حالات حکومت تبدیل

کرنے کے لئے کافی تھے لیکن جنرل عبدالوحید نے عافیت اسی میں سمجھی کہ باعزت طریقے سے مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائرمنٹ لے لی جائے۔ جنرل عبدالوحید اچھی طرح جانتے تھے کہ آنے والے دنوں میں حالات کی خرابی کا نہ صرف بے نظیر بھٹو کو بلکہ خود انہیں بھی ذمہ دار قرار دیا جائے گا اور اس کا مظاہرہ ستمبر 1995ء میں چند سینئر فوجی افسران کے خلاف ناکام سازش کے دوران کر چکے تھے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے دور حکومت میں کس کس سے دشمنی مول لے رکھی تھی اس کی ایک مثال الطاف حسین کے بھائی اور بھتیجے (ناصر حسین اور عارف حسین) کے قتل سے ملتی ہے' جنہیں 9 دسمبر 1995ء کو کراچی میں اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کا خیال تھا کہ یہ قتل الطاف حسین نے خود کرائے ہیں جبکہ الطاف حسین نے اپنے بھائی اور بھتیجے کے قتل کی ذمہ داری بے نظیر بھٹو' نصیراللہ بابر اور عبداللہ شاہ پر ڈال دی جو سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ عبداللہ شاہ کے بھائی سید احسان علی شاہ کو سندھ میں 23 نومبر 1995ء کو قتل کیا گیا تھا اور بظاہر یہ لگتا تھا کہ عبداللہ شاہ نے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے الطاف حسین کے بھائی کو مروایا ہے۔ خوف اور دہشت گردی کی اس فضا میں بے نظیر بھٹو نے آخری لمحے میں یہ کوشش کی کہ کسی طرح جنرل عبدالوحید مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع کرانے پر آمادہ ہو جائیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو دراصل جنرل جہانگیر اشرف قاضی کو فوج کا سربراہ بنانا چاہتی تھی' جو ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی کے عہدے پر فائز تھے۔ چونکہ ان کے پاس کور کمانڈر کا تجربہ نہ تھا اس لئے عجلت میں انہیں گوجرانوالہ کا کور کمانڈر لگایا گیا۔ اگر جنرل عبدالوحید ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ واپس لے لیتے تو بے نظیر بھٹو جنرل جہانگیر کرامت کی بجائے جنرل جہانگیر اشرف قاضی کو فوج کا سربراہ بنواتیں لیکن سردار فاروق احمد خاں لغاری نے بطور صدر اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس فہرست کو ترجیح دی جو سینیارٹی کی بنیاد پر تیار کی گئی تھی اور جنرل جہانگیر کرامت کا نام سرفہرست تھا۔ حکومت نے جنرل جہانگیر کرامت کو 18 دسمبر 1995ء کو فوج کا سربراہ نامزد کیا کیونکہ فوج کی روایات کے مطابق سبکدوش ہونے والے آرمی چیف کو ریٹائرمنٹ سے قبل ملک بھر میں کور کمانڈروں کی طرف سے دی جانے والی دعوتوں میں شریک ہونا ہوتا ہے۔ جہانگیر کرامت کی بطور آرمی چیف

نامزدگی کے دو دن بعد ناکام فوجی بغاوت میں حصہ لینے والوں پر فرد جرم عائد کر دی گئی جس سے یہ واضح ہوگیا کہ جنرل جہانگیر کرامت باغی فوجی افسروں کو معاف نہیں کریں گے اور بعدازاں ان افسروں کا کورٹ مارشل کر کے انہیں سزائیں دی گئیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو 1995ء میں ہی خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ کہیں سردار فاروق احمد خاں لغاری ان کی چھٹی نہ کرا دیں۔ اس لئے انہوں نے نواز شریف کو پیغامات بھجوائے کہ وہ آئینی اصلاحات کے لئے ان کے ساتھ تعاون کریں۔ آئینی اصلاحات سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی مراد 8 ویں ترمیم کی متنازعہ شقوں کا خاتمہ تھا' یعنی وہ چاہتی تھیں کہ نواز شریف ان کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے انہیں سردار فاروق احمد خاں لغاری کے شر سے محفوظ کر دیں۔ کیا یہ ممکن تھا؟ یقیناً" یہ ممکن نہ تھا کیونکہ محترمہ بے نظیر بھٹو کوئی زیادہ عرصہ نہیں محض تین سال قبل ہی نواز شریف کے ساتھ سیاسی چالیں چل کر انہیں اقتدار سے محروم کروا چکی تھیں۔ اب نواز شریف کے پاس موقع تھا کہ وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ وہی کچھ کرتے جو ان کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اس لئے نواز شریف نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی طرف سے آنے والے پیغامات سیدہ عابدہ حسین کے ذریعے سردار فاروق احمد خاں لغاری تک پہنچانا شروع کر دیئے۔ بے نظیر بھٹو نے بھی 93-1992ء میں یہی کیا تھا۔ نواز شریف نے جب اپنے دور حکومت کے آخری مہینوں میں (93-1992ء) بے نظیر بھٹو کو کہا کہ وہ 8 ویں ترمیم ختم کرنے کے لئے ان کی مدد کریں تو بے نظیر نے نواز شریف کی اس نیک خواہش کے بارے میں غلام اسحاق خاں کو آگاہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ آنے والے دنوں میں بے نظیر بھٹو کو نواز شریف سے بھی بھلائی کی امید نہیں رکھنا چاہئے تھی۔ یہ تو تھے ملک کے سیاسی حالات' جبکہ بین الاقوامی سطح پر صورتحال یہ تھی کہ پاکستان نے چین کی مدد سے جدید ترین میزائل بنانے کے لئے ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے لئے کوششیں شروع کر رکھی تھیں' فرانس سے جدید جنگی طیاروں کی خریداری کے معاملات طے پا چکے تھے اور دیگر فوجی سازوسامان کی خریداری کے لئے کئی ممالک کے ساتھ مذاکرات جاری تھے۔ اس فضا میں جب امریکہ نے ایران پر یکم جنوری 1996ء کو اقتصادی پابندیاں لگائیں تو پاکستان نے فوری طور پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے امریکہ کی بزدلانہ کارروائی قرار دیا۔ اس

صورتحال میں امریکی صدر بل کلنٹن نے تھامس سائمنز (Mr. Thosmos Simons) کو پاکستان میں 6 جنوری 1996ء کو اپنا نیا سفیر مقرر کر دیا جو جب پاکستان پہنچے تو جنرل جہانگیر کرامت اپنے فرائض سنبھال چکے تھے۔ 16 فروری 1996ء کو نواز شریف ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لئے امریکہ گئے جہاں ان کی امریکی محکمہ خارجہ کی ایک اہم خاتون آفیسر رابن رافیل سے بھی ملاقات ہوئی جو امریکی سی آئی اے کے ساتھ خصوصی تعلقات کی وجہ سے مشہور تھیں۔ امریکہ میں نواز شریف اور رابن رافیل کے درمیان کیا گفتگو ہوئی یہ تو نواز شریف اور رابن رافیل کو ہی معلوم ہوگا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ جب نواز شریف وطن واپس آئے تو وہ انتہائی پر اعتماد تھے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ "اب انتخابات کا انعقاد دور کی بات نہیں"۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے امریکی مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے چین سے ایٹمی پاور پلانٹ کی تنصیب کے لئے جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کی جبکہ امریکی سی آئی اے نے بل کلنٹن کو اطلاع دی کہ پاکستان کے سائنسدان ایٹمی دھماکے کے لئے بلوچستان کی پہاڑیوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ان بہت سارے بین الاقوامی عوامل کی وجہ سے بے نظیر بھٹو کا امریکہ کے ذیلی اداروں (آئی ایم ایف اور عالمی بنک) کے ساتھ پھڈا ہو جانا کوئی خلاف توقع بات نہ تھی' ظاہر ہے کہ پاکستان میں حکومت تبدیل کرانے کے لئے امن عامہ کی صورتحال کو خراب کرنا بہت ضروری تھا۔ اس لئے یہ فریضہ بھارتی RAW' مقامی اور غیر ملکی تخریب کاروں نے بڑی خوبصورتی سے انجام دیا جبکہ اس کے ساتھ ہی بے نظیر بھٹو سے غلطیاں کرانے کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی حکومت اور عدلیہ کے درمیان ہونے والی محاذ آرائی تھی جو ججوں کے تقرر کے مسئلہ پر شروع ہوئی۔ عدلیہ نے 20 مارچ 1996ء کو اپنے تاریخی فیصلے میں قرار دیا کہ صدر مملکت ججوں کا تقرر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سے مشورے کے بغیر نہیں کر سکتا۔ نواز شریف نے ان دنوں چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ کی بھرپور حمایت کی جس کے باعث حکومت عدلیہ کے فیصلوں پر عمل درآمد پر مجبور ہوگئی۔ بے نظیر جانتی تھیں کہ یہ سارا کھیل انہیں مڈٹرم الیکشن کرانے کے لئے مجبور کرنے کے لئے رچایا گیا ہے۔ "میں مڈٹرم الیکشن نہیں کراؤں گی" بے نظیر بھٹو نے 7 اپریل 1996ء کو یہ اعلان کیا

کیونکہ انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ آنے والے دنوں میں ملک دہشت گردی کی لپیٹ میں آنے والا ہے اور وہی ہوا جس کا خطرہ تھا' یعنی 14 اپریل 1996ء کو عمران خان کینسر ہسپتال میں بم کا دھماکہ ہوا جس نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کی ساکھ کو بین الاقوامی سطح پر متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد دہشت گردی کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان حالات میں رابن رافیل نے 17 اپریل 1996ء کو نواز شریف کے ساتھ ملاقات کی۔ رابن رافیل دراصل جائزہ مشن پر پاکستان آئی تھیں۔ رابن رافیل کے دورۂ پاکستان کے ایک ہفتے بعد عمران خاں نے 25 اپریل 1996ء کو تحریک انصاف کے نام سے نئی سیاسی جماعت قائم کرلی جس کے تین روز بعد پھول نگر پنجاب میں دہشت گردی کی ایک خوفناک واردات ہوئی جس کے باعث ایک بس میں سوار 70 افراد زندہ جل گئے۔ اس بس کو 2 زبردست بم دھماکوں کے بعد آگ لگی۔ جس پر بے نظیر بھٹو نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "بعض لوگ مجھے گھر بھیجنا چاہتے ہیں"۔

تاہم 5 مئی 1996ء کو اسلام آباد میں پارلیمانی پارٹی کا اجلاس طلب کر کے انہوں نے ارکان اسمبلی کو کہا کہ وہ یہ ڈر اپنے دل سے نکال دیں کہ اسمبلی ٹوٹ جائے گی۔ "سردار فاروق احمد خاں لغاری اسمبلی نہیں توڑے گا کیونکہ اس نے صدر کا عہدہ حاصل کرنے سے پہلے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ 58 (2 بی) جیسی آئین کی قاتل دفعہ کا استعمال نہیں کرے گا"۔ تاہم بے نظیر بھٹو یہ نہیں جانتی تھیں کہ جس فاروق لغاری کو 1993ء میں انہوں نے صدر بنوایا تھا وہ اب باقی نہیں رہے اور ایوان صدر میں بیٹھے شخص میں ضیاء الحق اور غلام اسحاق خاں کی روح حلول کر گئی ہے۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے بے نظیر بھٹو سے اپنے اختلافات کا اعتراف کرتے ہوئے 16 مئی 1996ء کو سپریم کورٹ کو ایک ریفرنس بھیجا جس کا مقصد چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ کے اختیارات کو چیلنج کرنا تھا۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری نے اس ریفرنس پر دستخط نہیں کئے تھے جس کی وجہ سے سپریم کورٹ نے یہ ریفرنس فنی اعتراض لگا کر حکومت کو واپس کر دیا۔ ملک کی سیاسی صورتحال سے صاف لگتا تھا کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری حکومت ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اب صرف بعض معاملات کو حتمی شکل دی جا

رہی ہے۔ جماعت اسلامی نے فضا کو سازگار دیکھ کر 24 جون 1996ء کو اسلام آباد میں
دھرنا دینے کا اعلان کر دیا۔ تاہم حکومت نے زبردست لاٹھی چارج اور فائرنگ کر کے
جماعت اسلامی کے جلوس کو راولپنڈی سے اسلام آباد جانے سے روک دیا جس کے
اگلے روز بزرگ سیاستدانوں نے نواب زادہ نصراللہ خاں کی سربراہی میں پارلیمینٹ کے
اندر آزاد گروپ کے نام سے ایک پریشر گروپ قائم کرلیا۔ اس آزاد گروپ میں جتوئی'
میر بلخ شیر مزاری اور مولانا فضل الرحمن شامل تھے۔ جماعت اسلامی نے 20 جولائی
1996ء کو ٹرین مارچ شروع کیا جس کے 48 گھنٹوں کے اندر لاہور ایئرپورٹ پر
زبردست بم دھماکہ ہوا۔ نواز شریف نے صورتحال کو دیکھتے ہوئے 24 جولائی 1996ء کو
اسلام آباد میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کر کے بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کرنے کا
مطالبہ کر دیا۔ اس مرحلے پر نواز شریف اور جماعت اسلامی کے درمیان صلح ہو گئی اور 6
اگست 1996ء کو جب حکومت کے خلاف منصوبہ بندی پر غور کرنے کے لئے جماعت
اسلامی کی طرف سے آل پارٹیز کانفرنس طلب کی گئی تو اس میں نواز شریف بھی شریک
تھے۔ بے نظیر بھٹو پر سیاسی جماعتوں کی طرف سے دباؤ تو موجود تھا ہی' حالات کا فائدہ
اٹھاتے ہوئے ایک امریکی وزیر نے 6 ستمبر 1996ء کو اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے
خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان میں کرپشن کی حد ہو گئی ہے"۔ یہی وہ موقع تھا جب
بے نظیر بھٹو نے نواز شریف سے صلح کی خود کوششیں شروع کیں اور انہوں نے اپنی
غلطیوں پر معذرت بھی کی لیکن نواز شریف نے کہا کہ اب وقت گزر گیا ہے۔ اس کی
وجہ یہ تھی کہ عالمی بنک کے صدر نے اپنا دورہ پاکستان منسوخ کر دیا تھا اور صورتحال یہ
تھی کہ سردار فاروق احمد خاں لغاری اور بے نظیر بھٹو کے درمیان بات چیت بند ہو
چکی تھی۔ بے نظیر بھٹو جانتی تھیں کہ نواز شریف اور سردار فاروق احمد خاں لغاری میں
بعض عہد و پیمان ہو چکے ہیں۔ انہوں نے جب صورتحال کی نزاکت کو دیکھ کر سید سجاد
علی شاہ کے ساتھ صلح کرنے کی کوشش کی تو انہیں اندازہ ہوا کہ سید سجاد علی شاہ بھی
کسی اور کے ہاتھوں استعمال ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں بے نظیر بھٹو کے پاس آخری
حل یہی رہ جاتا تھا کہ وہ از سرنو انتخابات کرائیں۔ اس سے پہلے کہ بے نظیر اپوزیشن کو
عام انتخابات کرانے کے لئے باضابطہ مذاکرات کی دعوت دیتیں' 20 ستمبر 1996ء کی رات

ان کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں ایک جعلی پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا گیا۔
جس کے بعد سردار فاروق احمد خاں لغاری اور سید سجاد علی شاہ نے کھل کر حکومت پر
حملے کئے اور میاں نواز شریف نے انہیں کھل کر داد دی۔ میر مرتضیٰ بھٹو کا قتل
دراصل اس سازش کا حصہ تھا جس کا مقصد بھٹو خاندان کی سیاست ختم کرنا تھا اور بے
نظیر بھٹو کو اس سازش کا جب پتہ چلا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی اور وہ بے بس
تھیں۔ ان کی بے بسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس شخص کو انہوں نے
ایوان صدر بھیجا تھا اس نے میاں نواز شریف کے ساتھ مل کر ان کی حکومت ختم کر
دی۔ مرتضیٰ بھٹو کا قتل اور 5 نومبر 1996ء کو بے نظیر بھٹو کی حکومت کا خاتمہ مذکورہ
سازش کا نکتہ عروج تھا جس کا اختتام شائد اس وقت ہو جب بے نظیر بھٹو سیاست سے
کنارہ کشی اختیار کرلیں یا انہیں سیاسی منظر سے ہٹا دیا جائے اور اگر کبھی ایسا ہوا تو یہ
بھٹو خاندان کی سیاسی تاریخ کا ایک خوفناک انجام ہوگا کیونکہ 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کو
پھانسی دیئے جانے کے بعد میر مرتضیٰ بھٹو' شاہ نواز بھٹو' صنم بھٹو اور بے نظیر بھٹو بچ
گئے تھے۔ مرتضیٰ اور شاہ نواز کو پراسرار انداز میں خفیہ ہاتھ ختم کروا چکے ہیں جبکہ صنم
بھٹو کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بیگم بھٹو سیاست میں اپنی زندگی پوری کر چکی
تھیں جبکہ پی پی پی کی کامیابی کا دارومدار محض اور محض بے نظیر بھٹو کی زندگی کے
ساتھ ہے' کیونکہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے بچے اور میر مرتضیٰ بھٹو کی اولاد 1998ء تک
کم سنی کی حدود میں تھی۔ مرتضیٰ بھٹو کی بیوہ غنویٰ کا سیاسی قد کاٹھ اتنا نہیں کہ وہ بھٹو
کے نعم البدل کے طور پر سامنے آسکیں۔ پی پی پی اور بھٹو خاندان دراصل لازم و
ملزوم تھا اور لازم و ملزوم رہے گا اور جب تک بھٹو خاندان کا ایک فرد بھی زندہ ہے
بھٹو کی سیاست باقی رہے گی!